READING SECTION
Online Library For Pakistan
WWW.PAKSOCIETY.COM

ماہنامہ
# پاکیزہ
کراچی
اکتوبر 2015





READING SECTION
Online Library For Pakistan
WWW.PAKSOCIETY.COM



☆ نگہت سیما، قیصرہ حیات اور دُرِ ثمن بلال کے سلسلے وار ناول

☆ شیریں نوا گلوکارہ، سارہ رضا خان بنی ہماری مہمان

☆ قارئین کی دلچسپی کے نئے خصوصی سلسلے




ماہنامہ
# پاکیزہ
کراچی

نگرانِ اعلیٰ: معراج رسول
مدیرۂ اعلیٰ: عذرا رسول
مدیرہ: انجم انصار
معاون: آمنہ حماد






رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی

ماڈل: رانیہ خان
میک اپ: روز بیوٹی پارلر
فوٹو گرافر: موسیٰ رضا

شعبہ اشتہارات

منیجر اشتہارات محمد شہزاد خان 0333-2256789
نمائندہ کراچی محمد رمضان خان 0333-2168391
رانا اے حمید 0323-2895528
نمائندہ لاہور سید افراز علی نازش 0332-4214400

قیمت فی پرچا (پاکستان) 60 روپے
قیمت فی پرچا (سعودی عرب) 12 ریال یا مساوی متحدہ عرب امارات

## اداریہ

مجھے کچھ کہنا ہے — مدیرہ — 15

## سلسلے وار ناول

اعتبارِ وفا — نگہت سیما — 24
اے عشق ترے ہیں کھیل عجب — دُرِ ثمن بلال — 98
آخری امید — قیصرہ حیات — 166

## منی ناول

زندگی خاک نہ تھی — شیریں حیدر — 132

## ناولٹ

متاعِ دل — نبیلہ ابر راجا — 70
دلہن کو میں لے کے جاؤں گا — اقبال بانو — 187
شناخت — اُمِ ایمان قاضی — 201

## مکمل ناول

حقیقت — سحر ساجد — 228

## افسانے

وہ طلب گار تھا — عنیقہ محمد بیگ — 64
اگر چیاں دل کی — شمیم فضل خالق — 93
ایک حقیقت ایک فسانہ — رفاقت جاوید — 119
وقعت — صدف آصف — 125
جیت — غزالہ عزیز — 155
اک کہانی محبت کی — فاطمہ خان — 225

## خصوصی مضامین

یادوں کی مالا — ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی — 18
شمعِ ہدایت — اختر شجاعت — 260
شادی کی رسمیں — رفعت شبانہ — 268
پاکیزہ کے مہمان — شائستہ زریں — 270

## مستقل عنوانات

دین کی باتیں — ادارہ — 16

پبلشر و پرو پرائٹر: ذیشان رسول مقامِ اشاعت: گراؤنڈ فلور C-63 فیز II ایکس ٹینشن، ڈیفنس، مین کورنگی روڈ کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی




بہنوں کی محفل مدیرہ 279
پاکیزہ ڈائری عظمیٰ آفاق سعید 288
جلترنگ انجم انصار 291
میں اکثر گنگناتی ہوں صغریٰ زیدی 294
خوش ذائقہ پاکیزہ بہنیں 295
حسن نکھار آئیے ماہ جبیں 297
بزم پاکیزہ پاکیزہ بہنیں 298
روحانی مشورے ادارہ 300
ہومیو کلینک 302


قارئین کے لیے خصوصی سلسلہ صفحہ نمبر 95 پر

Office: 63-C, Phase-II (Ext), D.H.A. Commercial Area, main Korangi Road Karachi.
Postal Address: Box No. 662, G.P.O., Karachi-74200
Phone: (021)35895313, Fax: 3580255[illegible] E-mail address: jdpgroup@hotmail.com




عام طور پر حج کی تیاری کا مطلب یہ سمجھا جاتا ہے کہ کوئی مہنگا قسم کا پیکج لے لیا جائے۔ جس میں بہترین ہوٹلوں کی رہائش ہو..... سامانِ سفر بہترین ہو، احرام کا کپڑا عمدہ ہو...... اور خورد ونوش کی سہولت اتنی اچھی ہو کہ زبان کے چٹخارے سے محروم نہ ہونا پڑے...... اور پھر واپسی پر اتنی شاپنگ کر کے آیا جائے کہ لوگ حیران رہ جائیں اور اگر حج کے ایام میں کسی دوسرے کو ان کی وجہ سے کوئی تکلیف ہو جائے تو وہ اس کی پروا بھی نہیں کرتے...... (بس انہیں تکلیف نہیں ہونی چاہیے) جبکہ حج نام ہے اپنے والہانہ عشق و محبت کے اظہار اور اپنی بے تابانہ حاضری کا...... حج مسلمانوں کا وہ سالانہ روح پرور اجتماع ہے جس میں تمام بدنی اور روحانی عبادات کی بھر پور جھلک نظر آتی ہے، یہ ایک جامع عبادت ہے کیونکہ اس میں تمام عبادات کامل روحانیت کے ساتھ یک جا ہو جاتی ہیں۔ اسی لیے خاتم الانبیاء ﷺ نے فرمایا۔ ”حج نام ہے انہماک اور عجز کے ساتھ تلبیہ کرنے کا...... اے اللہ میں حاضر ہوں، اے اللہ میں حاضر ہوں...... تیرا کوئی شریک نہیں...... میں حاضر ہوں۔ تمام تعریفیں اور تمام ملک تیرے ہیں، تیرا کوئی شریک نہیں۔“ اور حج کے دنوں میں یہی صدائیں نہ صرف دلی طمانیت کا سبب بنتی ہیں بلکہ اپنے مسلمان ہونے پر ایک فخر سا ہوتا ہے......

حج کی ادائیگی میں جہاں بے شمار حکمتیں پنہاں ہیں وہاں اس کی ایک بڑی حکمت اتحاد امت مسلمہ بھی ہے۔ دنیا کے گوشے، گوشے کے مسلمان اس موقع پر جمع ہوتے ہیں جن میں ہر رنگ و نسل کے لوگ ایک ہی جگہ، تمام تفرقات سے بالاتر ہو کر ایک ہی صف میں ایک ہی امام کے پیچھے کھڑے ہو کر نماز ادا کرتے ہیں۔

بلاشبہ یہ نظارہ دنیا کا خوب صورت ترین نظارہ ہوتا ہے کہ انسانوں کا ایک سمندر ہے، جس پر ایک وارفتگی کا عالم ہے، کسی کو کسی سے کوئی مطلب نہیں، چاہت ہے تو صرف اللہ تعالیٰ کو منانے کی...... جلالِ کبریائی سے قلوب پگھل، پگھل کر پانی ہو رہے ہیں۔ دعائیں ہیں، التجائیں ہیں، گناہوں کا اقرار ہے اور توبہ و استغفار ہے، یہ موقع زندگی میں خوش نصیبوں کو ہی ملا کرتا ہے کہ جو مانگنا ہے مانگ لو...... دین کے لیے بھی، دنیا کے لیے بھی، اپنوں کے لیے بھی دوسروں کے لیے بھی...... اور آج ہماری بھی یہی دعا ہے کہ یا رب العالمین ہر مسلمان کو حج کی توفیق اور استطاعت عطا فرمانا اور ہم سب کے گناہ معاف فرمانا، آمین۔ اس کے ساتھ آپ سب کو عید الاضحیٰ مبارک ہو۔

مدیرہ
انجم انصار

# دین کی باتیں

اور جب میں نے حواریوں کو الہام کیا کہ مجھ پر اور میرے رسول پر ایمان لاؤ انہوں نے کہا ہم ایمان لائے اور تو گواہ رہ کہ بے شک ہم مسلمان ہیں (۱۱۱) جب حواریوں نے کہا کہ اے عیسیٰ ابن مریم کیا تمہارا پروردگار یہ کرسکتا ہے کہ ہم پر آسمان سے ایک خوان نازل کرے (عیسیٰ نے) کہا کہ اللہ سے ڈرو اگر تم مسلمان ہو (۱۱۲) کہنے لگے ہم یہ چاہتے ہیں کہ اس میں سے کھائیں اور ہمارے دل مطمئن ہو جائیں اور ہم جان لیں کہ تم نے سچ بیان کیا اور ہم اس پر گواہ رہیں (۱۱۳) (تب) عیسیٰ ابن مریم نے عرض کی کہ ہمارے پروردگار ہم پر آسمان سے ایک خوان نازل فرما کہ وہ (دن) ہمارے اگلوں اور ہمارے پچھلوں کی عید ہو جائے اور تیری ایک نشانی ہو اور (اے پروردگار) ہمیں روزی دے اور تو اچھا روزی دینے والا ہے (۱۱۴) اللہ نے فرمایا بے شک میں اسے تم پر نازل کرنے والا ہوں پھر اس کے بعد تم میں سے جو کوئی کفر کرے گا تو اس کو ایسا (سخت) عذاب دوں گا کہ سارے جہان میں کسی کو ایسا عذاب نہ کروں گا (۱۱۵) اور (وہ وقت بھی یاد کرو) جب اللہ فرمائے گا اے عیسیٰ ابن مریم کیا تم نے لوگوں سے کہا تھا کہ اللہ کو چھوڑ کر مجھے اور میری ماں کو الہٰ بنالو۔ (عیسیٰ) کہیں گے کہ (میں) تیری پاکی (بیان کرتا ہوں اور تو پاک ہے) مجھے ہرگز (سزاوار) نہیں کہ میں وہ بات کہوں جس کا مجھے (کسی طرح) حق نہیں اگر میں نے یہ کہا ہوگا تو بے شک تو اسے جانتا ہوگا (کیونکہ) تو جانتا ہے جو کچھ میرے دل میں ہے اور میں نہیں جانتا جو کچھ تیری ذات میں ہے (اس لیے کہ) بے شک چھپی ہوئی باتوں کا جاننے والا تو ہی ہے (۱۱۶)

(سورۂ مائدہ آیت نمبر ۱۱۱ تا ۱۱۶)



## سیدنا محمود ﷺ

۳۔ محمد ﷺ انسانی سانچے (وجود) میں خدائی صفات کے مظہر تھے اور اس وجود کے دو نمایاں پہلو ہیں جو مثلث کے آغاز اور انتہا تک ساتھ ساتھ چلتے ہیں اور یہ شرافت و پاکبازی ہیں۔ شرافت میں سخاوت اور قوت کا عنصر ملا ہوا ہے جبکہ تقویٰ اور پرہیز گاری میں دانشمندی کا تقدس یکجا ہے۔
(شاؤن)

۴۔ حضرت محمد ﷺ جمال کبریائی کی وہ شعاع رنگ و نور ہے جو ایک پیکر انسانی میں جلوہ گر ہو کر ظلمت کدہ جہاں کو رشک صد جہاں بنانے آئی تھی۔ اور بنا گئی انسانیت کا وہ مظہر اتم جس کی انسانیت کے سامنے فرشتوں کی گردنیں جھک گئیں وہ نادر روزگار ہستی جس کے مافوق الفطرت کمالات کو سمجھنے سے عقل انسانی باوجود اپنی بلند پروازیوں کے یکسر قاصر رہے گی۔
(حکیم پنڈت کرشن کنور دت شرما)

۵: الاعداد

اسم مبارک 'محمود' حروف: ۵

م + ح + و + م + د =

۴ + ۸ + ۶ + ۴ + ۶ + ۴ = ۸۲

خصوصیت عدد ۸:

یہ نمبر قابل عزت اور قابل تعظیم لوگوں کا نمبر ہے۔ یہ لوگ مفکرانہ ذہنیت اور بردبارانہ صلاحیتوں سے انسانیت کی مشکلات کا حل سوچتے رہتے ہیں اور اپنے مقصد حیات میں کامیاب ہونا جانتے ہیں۔ لوگ ان کے قول و فعل کے اثرات کی وجہ سے ان کی عزت کرنے پر مجبور ہوتے ہیں ایسے لوگ زیادہ تر اپنی نسبت دوسروں کی بھلائیوں اور خوشیوں کو ترجیح دیتے ہیں۔

قیصرہ حیات کی کتاب انوار اسماالنبی ﷺ سے اقتباس

# یادوں کی مالا

ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی



## پُرعقیدت روحانی سفر کی حیرت انگیز رُوداد

یہ داستان جو میں رقم کررہی ہوں یہ کوئی عام داستان نہیں...... نہ ہی عام لوگوں کے لیے کشش کا باعث ہوگی۔ یہ داستانِ عشق ہے۔ اس عشق کی داستان جو اللہ کی کتاب سے کیا گیا۔

قارئینِ کرام......! آپ کی پُرزور فرمائش پر ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی کی آپ بیتی ''یادوں کی مالا'' دوبارہ شائع کی جارہی ہے۔ یہ ایک روحانی سفر کی رُوداد ہے جس سے پڑھنے والے بھی یقیناً بہت کچھ سیکھیں گے۔ ہمارے اصرار پر ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی نے اس میں مزید یادداشتیں شامل کردی ہیں۔ ہمیں قوی امید ہے کہ موتی، ہیرے جیسی تحریر پڑھ کر آپ کی اپنی زندگی میں مثبت تبدیلیاں ضرور آسکتی ہیں...... اگر آپ چاہیں تو......

(مدیرہ)

☆☆☆

میں اتر پردیش کی رہنے والی ہوں۔ میں یوپی کے ایک قصبے بلگرام میں پیدا ہوئی۔ یہ قصبہ ہردوئی میں واقع ہے۔ ہردوئی سے بلگرام کا فاصلہ 16 میل ہے۔ میرے والد کے دادا سید قربان احمد بلگرامی ایک قابل وکیل تھے۔ انہوں نے میٹرک، ایف اے، بی اے اور ایل ایل بی میں ٹاپ کیا تھا۔ انہوں نے اپنی زندگی میں بہت کمایا اور بہت سارے گاؤں اور زمینیں خریدیں۔ میرے دادا بیرسٹر سلطان احمد بلگرامی نے 1910ء میں انگلینڈ سے بارایٹ لا کیا تھا۔ میرے والد نے اگرچہ اکاؤنٹس میں ڈگری لی تھی مگر چند سال کی سروس کے بعد دادا کی زمینیں سنبھال لیں اور کاشت کاری

کرنے لگے۔ وہ گنے اور گیہوں کی کاشت کرتے تھے۔

ہم پانچ بھائی بہن ہیں۔ سب سے بڑی ایک بہن اس کے بعد تین بھائی اور سب سے چھوٹی میں۔ ہم سب نے ایک زمین دار گھرانے میں آنکھ کھولی۔ قصبوں میں بڑے، بڑے گھر ہوتے ہیں۔ ہمارا گھر بھی بہت بڑا تھا، نوکر چاکر کی افراط تھی۔ ہم سب بھائی بہنوں کی اپنی، اپنی بوائیں تھیں۔ میرے والد یامین احمد بلگرامی غصے کے تیز مگر رحم دل انسان تھے جبکہ میری امی بہت خاموش طبیعت، صابر وشاکر خاتون تھیں۔ انہیں کتابیں پڑھنے کا شوق تھا۔ شعر وشاعری سے بھی لگاؤ تھا۔ وہ شاعری کی کتب شوق سے پڑھتی تھیں اور خود بھی شعر کہتی تھیں۔ اگرچہ امی کے پاس کوئی دنیاوی ڈگری نہیں تھی پھر بھی ان کا مطالعہ وسیع تھا اور مذہب کی بھی اچھی معلومات رکھتی تھیں۔ بچپن میں ہم امی سے نبیوں‘ پیغمبروں کے واقعات سنتے تھے۔ وہ باتوں، باتوں میں ہمیں زمانے کی اونچ نیچ سمجھایا کرتی تھیں۔ میری امی نے سیکڑوں ناولز پڑھے اور اسی حساب سے افسانے بھی...... میں نے بھی امی کی تقلید میں وہ سب کچھ کم عمری ہی میں پڑھ ڈالا جو امی پڑھا کرتی تھیں۔ میری سب سے بڑی بہن سیدہ فاطمہ‘ دادا میاں کے گھر ہر دوئی میں رہتی تھیں۔ وہ کبھی اسکول‘ کالج نہیں گئیں۔ ان کی مکمل تعلیم گھر پر ہوئی۔ انہوں نے بہت قابل لوگوں سے علم حاصل کیا۔ انگریزی ادب‘ اردو اور فارسی میں ڈگریاں حاصل کیں وہ بہت عمدہ ستار بجاتی تھیں۔ استاد کلن ہمارے خاندانی استاد تھے جو سب کو ستار بجانا سکھاتے تھے۔ ستار بجانا‘ گیت گانا...... یہ سب کوٹھی کے اندر ہوتا تھا۔

ہمارے گھرانے میں پردہ تھا بلگرام میں خواتین ڈولیوں میں بیٹھ کر ایک دوسرے کے گھر جایا کرتی تھیں۔ خواہ وہ گھر چند قدم کے فاصلے پر ہی کیوں نہ ہو۔ میری امی کو جب کبھی کسی کے گھر جانا ہوتا تھا تو کہار ڈولی لے کر آتے تھے۔ ڈولی کے گرد پردہ باندھا جاتا تھا۔ امی ڈولی میں بیٹھ جاتیں اور ہم ڈولی کے ساتھ، ساتھ بھاگ کر چلتے۔ جس گھر جانا ہوتا وہ بالکل قریب ہی ہوتا تھا جب کبھی بلگرام سے ہر دوئی جانا ہوتا تو بیل گاڑی میں پردہ باندھا جاتا اور ہم سب اس پر سوار ہو جاتے۔ اگرچہ ہر دوئی کا فاصلہ صرف 16 میل تھا مگر ان دنوں یہ بہت زیادہ سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ آدھی دور پر ایک مقام تھا منجھلا...... ہم وہاں قیام کرتے تھے۔ یہاں پر ایک بڑھیا کا گھر تھا۔ درختوں کی ٹھنڈی چھاؤں کے نیچے بان کے پلنگ پڑے ہوتے تھے۔ وہیں بیٹھ کر ہم کھانا کھاتے جو ہم ساتھ لے کر چلتے تھے۔ کھا پی کر تازہ دم ہو کر بیل گاڑی پر سوار ہو جاتے۔

ہر دوئی پہنچتے تو وہاں ماحول دوسرا تھا۔ یہ شہر تھا اور دادا بیرسٹر تھے۔ ان کا بڑا نام تھا۔ ان کی کوٹھی بھی بہت شاندار تھی۔ لوگ بھی بہت رہتے تھے۔ ان کا دستر خوان وسیع تھا۔ رشتے ناتے کے بے شمار لڑکے ان کے گھر رہ کر تعلیم حاصل کر رہے تھے یعنی اپنے، اپنے اسکول‘ کالج اپنے خرچ پر جاتے تھے اور رہنا کھانا فری تھا۔ دادا میاں کے گھر رہنے اور کھانے، پینے کی اجازت کی ضرورت نہیں تھی جس کا دل چاہتا وہ وہاں قیام کرتا تھا۔

میری سگی دادی کا انتقال اس وقت ہوا تھا جب میرے والد چار سال اور میرے چچا دو سال کے تھے اس کے بعد دادا کی دوسری شادی ہوئی...... دوسری بیوی سے دو لڑکے اور چار لڑکیاں ہوئیں اس طرح یہ کل آٹھ بھائی بہن تھے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ میرے دادا کے گھر بہت لوگ تھے۔ خوب رونق ہوتی تھی جبکہ میرے اپنے گھر میں یعنی بلگرام میں...... ہم تین بھائی بہن ہی رہتے تھے۔ بڑی بہن دادا کے گھر اور ایک سب سے بڑے بھائی ہمارے چچا کے گھر شاہ جہاں پور میں رہتے تھے۔ ان کی تعلیم وہیں ہو رہی تھی۔ بلگرام میں مجھ سے بڑے دو بھائی بی جی آر اسکول میں پڑھتے تھے اور میری تعلیم گھر پر ہو رہی تھی۔ میرے والد کا خیال تھا کہ لڑکے سائنس کی تعلیم حاصل کریں اور لڑکیاں آرٹس پڑھیں گی۔ چنانچہ بڑی بہن کی طرح مجھے بھی اسی لائن پر ڈالا جا رہا تھا۔ میں صبح سویرے ڈرائنگ سیکھنے جاتی۔ بی جی آر اسکول کے ڈرائنگ ماسٹر مجھے ڈرائنگ

سکھاتے تھے۔ اس وقت میری عمر مشکل سے چھ سال تھی۔ دس بجے مولوی صاحب آجاتے جو اردو، حساب اور ہندی پڑھاتے تھے۔ دوپہر کے بعد حافظ جی آجاتے جو قرآن شریف پڑھایا کرتے تھے۔ شام کے وقت استاد کلن آجاتے جو مجھے ستار بجانا سکھا رہے تھے۔ میں اتنی چھوٹی تھی کہ مجھ سے ستار نہیں اٹھتا تھا۔ اس وجہ سے ستار کو لٹا کر بجاتی۔ میرے لیے منی سی مضراب بنوائی گئی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے میں اس مضراب کو انگلی میں پہن کر دادرا، دادرا کی مشق کرتی تھی۔

گھر میں ہم تینوں بھائی بہن طرح، طرح کے کھیل کھیلتے تھے۔ ہمارے ساتھ ملازموں کے بچے کھیلتے تھے۔ کھیلوں میں پہل دوج، چھپن چھپائی، اونچ نیچ اور گلی ڈنڈا کھیلتے۔ مجھے گڑیاں اچھی لگتی تھیں۔ میرے پاس بہت سی کپڑے کی گڑیاں تھیں۔ ہم سب مل کر گڑیا کی شادی خوب دھوم سے کرتے۔ گڑیا کا جہیز تیار کیا جاتا۔ ریشمی گوٹا لگے کپڑے بنتے۔ ایک بار میری پیاری گڑیا کی ٹانگ مجھ سے بڑے بھائی جی نے کاٹ دی تھی، میں خوب روئی...... پھر انہوں نے مجھے بہلانے کے لیے ایک خوب صورت سی گڑیا خود بنا کر دی۔ وہ خود بھی اس وقت بہت چھوٹے تھے۔ گڑیا کے خوب لمبے، لمبے بال لگائے۔ اس گڑیا کو اچھے، اچھے کپڑے پہنائے گئے۔ میں بہت خوش ہوئی۔ بچپن کی یہ چھوٹی، چھوٹی یادیں ہیں جو ذہن کے گوشے میں چھپی بیٹھی ہیں۔ جب چھٹیاں ہوتیں تو میرے بڑے بھائی بھی شاہ جہاں پور سے بلگرام آجاتے۔

ہمارے گھر کا آنگن بہت بڑا سا تھا اور پھلواری بھی بڑی سی تھی جس میں بیلا، موگرا، چنبیلی اور جوہی کے پودے تھے۔ ہار سنگھار کے درخت تھے اور مہندی کے بھی دو درخت تھے۔ ابا نے پھلواری میں چھ درخت انار کے لگوائے تھے۔ سب بھائی بہنوں کا ایک، ایک درخت تھا۔ جب انار کے درخت لگے تھے تب ہم تین بہنیں اور تین بھائی تھے۔ مجھ سے چھوٹی بہن جس کا نام پھول تھا وہ بے حد حسین تھی بالکل پری لگتی تھی۔ وہ چار سال کی عمر میں انتقال کر گئی تھی۔ عجیب اتفاق یہ ہوا کہ اس کے انتقال کے بعد اس کے نام کا انار کا درخت سوکھ گیا تھا۔

پھلواری کے اندر کنارے پر کنواں تھا ہم سب چھوٹے، چھوٹے ڈول ڈال کر پانی بھرتے اور پودوں میں ڈالتے۔ یہ ہمارا مشغلہ تھا۔ چکنی مٹی سے کھلونے بنانا اور غلیل کے لیے غلے بنانا بھی اچھا لگتا تھا۔ پتنگ بازی بھی خوب ہوتی تھی گھر میں کبوتر بھی پلے ہوئے تھے اور مرغیاں بھی بلگرام کی جس کوٹھی میں ہم رہتے تھے، وہاں جن بھی رہتے تھے جس کا تجربہ سب گھر والوں کو بارہا ہوا تھا۔ ایک بار دوپہر کو میری ملازمہ سہیلی رشدیا مجھے آتی نظر آئی۔ میں نے بہت آوازیں دیں مگر اس نے ایک نہ سنی بس چلتی چلی گئی۔ میں نے بھاگ کر باہر جا کر دیکھا تو آہنی دروازہ بند تھا۔ ظاہر ہے جب کسی نے دروازہ کھولا ہی نہیں تو وہ آئی کیسے پھر دوسری طرف غائب بھی ہو گئی۔

جب ہم لوگ پاکستان آگئے تو اس گھر میں ہندو رہنے لگے تھے مگر وہ بس نہ سکے۔ ان کے پلنگ الٹ جاتے، کرسیاں اوندھی ہو جاتیں۔ وہ گھر چھوڑ کر بھاگ گئے۔ بات نہ جانے کدھر نکل گئی۔ میں اپنے بچپن کی بات کر رہی تھی۔ بچپن کے وہ آٹھ برس جو میں نے بلگرام میں گزارے۔ جیسا کہ میں کہہ رہی تھی ہمارا آنگن بڑا سا تھا۔ گرمیوں میں وہاں صحن میں سونے کا رواج تھا۔ سب کے پلنگ بچھا دیے جاتے اور سفید چادریں بچھ جاتیں۔ بیلے اور جوہی کی خوشبو بسی ہوتی اور ہم سب آرام سے سوتے۔ صبح آنکھ کھلتی تو امی برآمدے میں بیٹھی قرآن پاک پڑھ رہی ہوتی تھیں۔ وہ بلند آواز میں سورۂ رحمٰن اور سورۂ فتح کی تلاوت کرتی تھیں، میں نے ہوش سنبھالنے پر یہی دیکھا۔

مجھے یہ یاد نہیں کہ میں نے قرآن پاک کب ختم کیا۔ میری امی نے مجھے بتایا تھا کہ میں نے چھ سال کی عمر میں قرآن پاک ختم کر لیا تھا۔ مجھے تو صرف ایک

سپارہ روزانہ کے حساب سے دُہرانا یاد ہے۔ 1952ء کے شروع میں ہم لوگ پاکستان چلے آئے۔ اس وقت تک ایک محتاط اندازے کے مطابق میں... بارہ مرتبہ قرآن پاک ختم کر چکی تھی۔ ہم لوگ کراچی سیٹل ہو گئے۔

میری بڑی بہن انڈیا سے اپنی تعلیم ختم کر کے آئی تھیں۔ بڑے بھائی ڈی جے سائنس کالج میں پڑھنے لگے باقی سب اسکول میں تھے۔ میں نے لڑکیوں کے جیکب لائن اسکول سے تعلیم حاصل کی۔ اس زمانے میں یہ بہت اچھا اسکول تھا۔ لڑکوں کے لیے جیکب لائن اسکول علیحدہ تھا۔ میں نے ابتدائی تعلیم انڈیا میں گھر پر ہی حاصل کی تھی۔ پاکستان آ کر جیکب لائن اسکول میں پانچویں جماعت میں نام لکھا۔

میری اردو اچھی تھی۔ میں بہت اچھے مضامین لکھا کرتی تھی۔ میری اردو کی ٹیچر کو یقین نہیں تھا کہ میں اس طرح کے افسانوی مضامین لکھ سکتی ہوں۔ جب میں ساتویں جماعت میں پڑھتی تھی تو باقاعدہ افسانے نما کہانیاں لکھنا شروع کر دی تھیں۔ میٹرک کرنے تک میں بے شمار ناولز اور افسانے پڑھ چکی تھی اور تب مجھے خیال ہوا کہ اس طرح کے ناول میں خود بھی لکھ سکتی ہوں لیکن چونکہ میں سائنس کی طالب علم تھی اس وجہ سے چھ سال تک یعنی ایم ایس سی کرنے تک وقت نہیں مل سکا لیکن 1965ء میں جوں ہی میں ایم ایس سی کے امتحان سے فارغ ہوئی میں نے قلم، کاغذ سنبھال لیا اور اکیس سال کی عمر میں اپنا پہلا ناول ''غمِ دل'' صرف دس روز میں مکمل کر لیا۔ یوں ناول نگاری کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ایم ایس سی کا امتحان دینے کے بعد جبکہ رزلٹ بھی نہیں نکلا تھا۔ سرسید کالج میں میرا تقرر ہو گیا۔ میرا مضمون نباتیات تھا۔ میں وہاں پڑھانے لگی۔ ساتھ ہی ساتھ میں زولوجی پریکٹیکل بھی کرواتی تھی۔ فرسٹ ایئر سائنس کے کورس میں مینڈک ہوتا ہے چنانچہ مینڈک سے خوب اچھی شناسائی ہو گئی۔ ہر سال گرمیوں کی چھٹیوں میں ہم کہیں نہ کہیں کسی چچا یا پھوپی، ماموں وغیرہ کے گھر کسی دوسرے شہر چھٹیاں گزارنے جاتے تھے۔

1966ء میں جب چھٹیاں ہوئیں تو میں اپنے منجھلے بھائی کے ساتھ چھٹیاں گزارنے بہاول پور گئی۔ ان دنوں میرے چچا ڈاکٹر حامد حسن بلگرامی بہاول پور اسلامک یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے۔ مجھ سے... بے حد محبت کرتے تھے۔ ان دنوں وہ قرآن حکیم پر کام کر رہے تھے۔ انہوں نے قرآن پاک کا بہت اچھا ترجمہ کیا ہے جو 1968ء میں شائع ہوا۔ فیوض القرآن کے نام سے۔

جب چچا جان قرآن حکیم کے ساتھ مصروف ہوتے تو میں ان کے پاس چپک کر بیٹھ جاتی اور غور سے ان کے کام کو دیکھا کرتی۔ وہ میرے شوق کو تاڑ گئے اور پھر انہوں نے مجھے ایک قرآن حکیم تحفے میں دیا اور دعائیہ کلمات لکھے۔

چچا جان لے جو دعائیہ الفاظ قرآن حکیم پر تحریر کیے وہ یہ ہیں۔

''اپنی پیاری بیٹی حور کو ان دعاؤں کے ساتھ کہ اللہ تعالیٰ اس کلامِ پاک کی لذت اس کی حلاوت سے اس کا قلب معمور فرمائے اور اسے ہدایت اور مقامات سے نوازے۔''

احقر حامد بلگرامی

۲۳۔ ربیع الثانی ۱۳۸۶ھ

مطابق

۱۱ اگست ۶۶ء، جمعرات

(میرا گھر کا نام حور ہے) یہی قرآن پاک جہیز میں میرے ساتھ گیا اور جب سے انہوں نے مجھے دیا تبھی سے میں نے باقاعدہ قرآن پاک پڑھنا شروع کیا۔ یہی نسخہ مولانا شمس الحق افغانی نے چچا جان کو تمغۂ پاکستان ملنے پر تحفے میں دیا تھا۔ یہ میری زندگی کا پہلا قابلِ ذکر تحفہ ہے جس نے میری زندگی پر گہرے اثرات دکھائے۔ میں نے ترجمہ اور تفسیر کے ساتھ قرآن پاک کو پڑھنا شروع کیا پھر یہ سلسلہ مختلف

انداز سے جاری و ساری رہا جو آج تک میری زندگی میں اسی طرح شامل ہے جس طرح جسم کے ساتھ روح ہوتی ہے۔ روح نکل جائے تو جسم بے جان ہو جاتا ہے۔ میری زندگی سے قرآن پاک کو مائنس کر دیں تو کچھ بھی نہیں بچے گا۔

میں نے قرآن حکیم پابندی سے اور بہت زیادہ پڑھنا شروع کر دیا تھا پھر مجھے اچانک خیال پیدا ہوا کہ اگر میں پورا قرآن پاک پڑھ کر کسی خاص مقصد کے لیے ختم کر کے دعا کروں تو وہ دعا ضرور پوری ہو جائے گی اور ایسا کئی بار ہوا۔ ایک ہفتے کے اندر قرآن پاک پڑھا، دعا مانگی، پوری ہو گئی اب میرے ہاتھ ایک نسخہ آ گیا۔ میں ایسا ہی کرنے لگی۔

جیسا کہ میں پہلے ذکر کر چکی ہوں۔ سرسید گرلز کالج میں باٹنی کے ساتھ مجھے زولوجی بھی لینی پڑی تھی۔ یہ پہلے سال ہوا تھا یعنی 66-1965ء میں۔ دوسرے سال عجب تماشا ہوا۔ ہماری پرنسپل نے کہا کہ ہمیں ایسی ٹیچر کی ضرورت ہے جو کیمسٹری کے پریکٹیکل کروا سکے اور ہمیں ایک لڑکی مل گئی ہے وہ کیمسٹری میں ایم ایس سی ہے اور باٹنی پریکٹیکل بھی کروالے گی اس کے پاس آنرز میں باٹنی تھا یعنی انہیں اب میری ضرورت نہیں تھی۔ میں نے کہا کیمسٹری پریکٹیکل کا تو کوئی مسئلہ ہی نہیں، میں کروا دوں گی۔ بی ایس سی میں میرے پاس کیمسٹری تھی۔ اگر وہ لڑکی باٹنی کروا سکتی ہے تو میں کیمسٹری کیوں نہیں کروا سکتی۔ قصہ مختصر پرنسپل مجبور ہو گئیں اور مجھے فارغ کرنے کا ان کے پاس کوئی جواز نہیں تھا۔ اس طرح 67-66ء میں' میں باٹنی کے ساتھ کیمسٹری ڈیپارٹمنٹ میں کام کرنے لگی لیکن تیسرے سال میرے ذمے پھر زولوجی تھوپ دی گئی۔ واضح رہے کہ ان دنوں تمام کالجز پرائیویٹ تھے اور ٹیچر سے خوب کام لیا جاتا تھا اور جس کو چاہے فارغ کر دینا عام سی بات تھی۔ میں یہاں یہ بات اس لیے بیان کر رہی ہوں کہ مجھے قرآن حکیم کی برکت سے دعا کا تذکرہ کرنا مقصود ہے۔

مجھے فرسٹ ایئر کی زولوجی کے ساتھ، ساتھ سیکنڈ ایئر کا بھی ایک گروپ دے دیا گیا جس میں کاکروچ اور ارتھ وارم کا ڈائی سیکشن کروایا جاتا ہے۔ میں نے وائس پرنسپل جو کہ زولوجی کی تھیں بہت منع کیا مگر وہ نہ مانیں۔ میرے ساتھ یہ مسئلہ تھا اور آج بھی ہے کہ کاکروچ سے شدید الرجی ہے۔ میں یہ کام نہیں کر سکتی تھی۔ چنانچہ میں نے ملازمت چھوڑ دینے کا فیصلہ کر لیا۔ کورس میں کلاسیفکیشن کا بھی پورشن ہوتا ہے (ٹرائی سیکشن) عارضی طور پر میں نے وہ شروع کروا دیا اور لڑکیوں سے کہا یہ کر لو تمہارا ٹرائی سیکشن دو ماہ بعد شروع ہوگا۔ دو ماہ پلک جھپکتے گزر گئے اب میرے پاس صرف ایک ہفتہ تھا۔ یعنی اگلے ہفتہ سے لازمی طور پر مجھے کاکروچ کا ڈائی سیکشن کروانا تھا اور میں نے دل میں تہیہ کر لیا تھا کہ استعفیٰ دے دوں گی پھر اچانک مجھے قرآن پاک کا خیال آیا۔ میں نے جلدی، جلدی قرآن پاک پڑھنا شروع کیا اور چند دن کے اندر ختم کیا اس نیت کے ساتھ کہ اللہ تعالیٰ میرے لیے بہتری پیدا کر دے اور مجھے مشکل سے نکال دے۔

اگلے دن ورکنگ ڈے پر جب میں کالج پہنچی تو مجھے پتا چلا کہ وائس پرنسپل جنہوں نے مجھ پر زبردستی سیکنڈ ایئر تھوپی تھی وہ کالج سے چلی گئی ہیں اور اب زولوجی کی کوئی نئی لڑکی اپائنٹ کی جائے گی...... میری حیرت، خوشی اور تعجب سے عجب حالت تھی۔ اسی دن سے میں نے وہ کلاس چھوڑ دی اب مجھ پر کوئی زبردستی کرنے والا نہیں تھا۔ قرآن حکیم کی بدولت مجھے جس کرب سے نجات ملی اور وہ بھی ایک دن کے اندر اس کا اندازہ کوئی دوسرا نہیں کر سکتا۔ اگر میں اپنی پوری زندگی پر نظر دوڑاؤں تو میری زندگی میں دو چیزیں اہم ہیں، ایک قلم اور دوسری قرآن شریف۔ ان ہی دو چیزوں کے اردگرد پوری زندگی گھوم رہی ہے۔ میں نے ہمیشہ لکھنے کا عمل جاری رکھا۔ جیسا کہ میں نے بتایا کہ ایم ایس سی کے بعد ہی میں نے 1965ء میں پہلا ناول ''غم دل'' لکھا تھا اس کے بعد دوسرا ناول ''اپنی منزل'' بھی لکھ ڈالا..... سرسید گرلز کالج میں باٹنی پڑھانے کے

دوران میں نے فرسٹ ایئر اور سیکنڈ ایئر کی طلبا کے لیے ایک پریکٹیکل کی کتاب لکھی جس کا نام ہے ''بائنی اسپاٹنگ'' اسے میں نے صرف تین دن میں زبانی تحریر کیا۔ اس زمانے میں چھپے ہوئے جرنل نہیں ملتے تھے۔ چنانچہ یہ کتاب بے حد مقبول ہوئی۔ پہلا ایڈیشن ایک ہفتے میں ختم ہوگیا۔ دوسرا ایڈیشن شائع کروانا پڑا۔ ایس ایم کالج کے پرنسپل ڈاکٹر حشمت اللہ لودھی ہمارے کالج میں ہیڈ ایگزامنر بن کر آئے تو انہوں نے اس کتاب کے بارے میں ایک بات کہی کہ اس کتاب کی یہ خوبی ہے کہ اس میں کوئی غلطی نہیں ہے نہ ہی اسپیلنگ کی اور نہ بائنیکل میرے لکھنے کی رفتار بہت تیز ہے جو کام کرتی ہوں بہت جلدی کرتی ہوں جس چیز کو لکھنے میں لوگ سال یا مہینے لگاتے ہیں میں ہفتوں اور دنوں میں ختم کرتی ہوں...... یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے میرے لیے کوئی خاص انعام ہی معلوم ہوتا ہے۔

یادوں کا اکٹھا کرنا مشکل کام ہے یادوں کی مالا بکھری ہوئی ہے۔ ہر موتی الگ، الگ کوئی سفید' کوئی سرخ' کوئی نیلا اور کوئی سیاہ...... کسی پر دھول پڑی ہوئی اور کوئی نور کی طرح روشنی بکھیرتا ہوا...... مجھے ان موتیوں سے صرف خوب صورت موتی ہی چننا ہیں۔ خصوصاً وہ موتی جس سے نور کی شعاعیں نکل رہی ہیں اور میری روح کو منور کر رہی ہیں۔ یادوں کی ایک خوب صورت مالا تیار کرنی ہے جس میں نہ کوئی سیاہ موتی اپنی جگہ بنائے گا اور نہ ہی دھول میں اٹا ہوا یا داغدار موتی۔

میرے دونوں ناول ''غم دل'' اور ''اپنی منزل'' شادی سے قبل ہی شائع ہو گئے تھے۔ 1968ء میں میری شادی طے ہوگئی۔ میرے شوہر عبدالرحمٰن بلگرامی میری امی کے ماموں زاد تھے اور اپنی تعلیم علی گڑھ یونیورسٹی سے مکمل کر کے 1965ء میں پاکستان آئے تھے۔ مجھ سے عمر میں پانچ سال بڑے تھے۔ میرے دونوں ناول شائع کروانے والے وہی تھے۔ انہیں میری ادبی دلچسپیاں پسند تھیں کیونکہ ان کا تعلق بھی علمی اور ادبی گھرانے سے تھا۔ وہ خود بھی بہت کتابیں

پڑھتے تھے اور اشعار تو ہزاروں کی تعداد میں یاد تھے۔ علی گڑھ یونیورسٹی میں طالب علمی کے دور میں انہوں نے بہت سارے ایوارڈز حاصل کیے۔ ٹیبل ٹینس اور کیرم کے اچھے کھلاڑی تھے۔ باغبانی اور فوٹو گرافی میں اول انعام کے سرٹیفکٹ رکھتے تھے۔ بیت بازی میں بھی اول آنے کا سرٹیفکٹ موجود ہے۔ ان کے والد قاضی عزیز الدین بلگرامی ماہر قانون دان تھے، قانون بنانے پر 1930ء میں انہیں خان بہادر کا خطاب ملا۔ انڈیا میں آج بھی یہی قانون نافذ ہے۔ مختلف اعلیٰ سرکاری عہدوں پر فائز رہے۔ بھرت پور میں وزیر تعلیم بھی رہے۔ علی گڑھ یونیورسٹی میں Acting V.C رہے آنریری ٹریژرر کئی سال تک رہے (اپنی وفات تک) انہوں نے علی گڑھ یونیورسٹی کی بلا معاوضہ خدمت کی۔ میرے شوہر ان کے سب سے چھوٹے بیٹے تھے جب یہ نویں کلاس میں تھے تبھی ان کے والد کا انتقال ہوگیا تھا۔ قاضی صاحب نے 1920ء میں ایک کتاب لکھی تھی۔ ''کھلا خط مہاتما گاندھی کے نام'' جسے انہوں نے اپنے چھوٹے بھائی عبدالقدیر کے نام سے شائع کروایا کیونکہ وہ سرکاری ملازمت (ڈپٹی کلکٹری) کی وجہ سے اپنے نام سے شائع نہیں کروا سکتے تھے۔ اس کتابچے میں ہندوستان کی صوبہ جاتی تقسیم کا ایک انتہائی مکمل اور بہترین نقشہ لکھا ہے۔ ہندوستان کی تقسیم کا یہ سب سے پہلا منصوبہ ہے اس بات کو ہسٹوریکل سوسائٹی آف پاکستان نے شائع کیا۔ جس میں پبلشر محمد مقتدی خاں شیروانی کا خط بھی شائع کیا گیا ہے کہ دراصل یہ کتاب قاضی عزیز الدین بلگرامی کی لکھی ہوئی ہے۔ انہوں نے اپنے بھائی عبدالقدیر کے نام سے شائع کروائی۔ یہ کتاب اور پبلشر کا خط میرے پاس موجود ہے۔

پروفیسر رشید احمد صدیقی کی لکھی ہوئی کتاب ''گنج ہائے گراں مایہ'' میں قاضی عزیز الدین بلگرامی پر مضمون شامل ہے جو ان کے قریبی دوستوں میں سے تھے۔

(جاری ہے)



# اعتبارِ وفا

قسط 14

نگہت سیما

یہ سچ ہے کہ محبت میں وقت کا وزن نہیں ہوتا... گفتگو کا وزن نہیں ہوتا، ہر طرف تو کیا دل و دماغ تک پر ایک بے وزن سی کیفیت محسوس ہوا کرتی ہے... کہ دل و دماغ کو کوئی دوسری بات سُجھائی تک نہیں دیتی۔

ایسے حالات میں کسی بھی انسان کے پاؤں جمے نہیں رہتے اور وہ ہر وقت لڑھکتا رہتا ہے۔

مگر خود کو سنبھال کر متوازن رکھنا ہی محبت کا اصل پلیٹ فارم ہے... لیکن اس سے بھی اہم بات یہ ہے کہ اس بے وزنی کے اصول کو بھی محسوس کر لیا جائے... اور مان لیا جائے... کہ محبت کا اوّلین قانون اعتبار ہے... اور وفا کے غنچے وہیں کھلتے ہیں... جس گلشن میں اعتبار کا بیج بویا جاتا ہے۔

گلاب چہروں پہ دھول کتنی مسافتوں کی جمی ہوئی ہے
چراغ آنکھوں میں جانے کتنے سفر کے جالے تنے ہوئے ہیں
نہ چھاؤں جیسی کوئی کہانی نہ جلتی دھوپوں کا کوئی حصّہ
کہاں کا ذکرِ سفر کہ پہلے قدم پہ ہم تو رُکے ہوئے ہیں

''ثمر تم صوفی نصیر کے بیٹے تھے، مہذب، دین دار، تعلیم یافتہ لیکن میری وجہ سے تم کیا بن گئے۔''
''تمہاری وجہ سے نہیں فرحی، ہماری تقدیر میں یہی لکھا تھا۔''
''تم کچھ بھی کہو ثمر لیکن میں نے اس کے لیے ہمیشہ خود کو ہی قصوروار جانا...... میری ایک ذرا سی لغزش، ذرا سی جذباتیت نے ہماری زندگی کے دھارے بدل دیے...... لیکن اب نہیں...... اب تم میری وجہ سے قاتل نہیں بنو گے...... میں نے اپنا قتل معاف کیا...... وعدہ کرو ثمر کہ میرے بیٹے کو لے کر اس زندگی سے کہیں دور چلے جاؤ گے۔ کسی ایسی جگہ جہاں اس زندگی کی پرچھائی تک میرے بیٹے پر نہ پڑے۔ وعدہ کرو تم قاتل نہیں بنو گے...... میرا بیٹا ایک قاتل کا بیٹا نہیں کہلائے گا۔'' اس کی سانس اکھڑنے لگی تھی لیکن وہ ملتجی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔
''میں وعدہ کرتا ہوں فرحی کہ میں تمہارے بیٹے کو لے کر کہیں کسی اور ملک میں چلا جاؤں گا۔ میں یہاں نہیں رہوں گا فرحی، ہم تینوں اس ملک سے چلے جائیں گے۔ تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔ تم ٹھیک ہو جاؤ گی۔'' اور فرحی کے ہونٹوں پر ایک آسودہ سی مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی اور اس کی آنکھیں بند ہوگئی تھیں۔
اس کا پورا وجود ایک ان دیکھی آگ سے جل اٹھا اس نے مٹھیاں بھینچ کر زور سے بیڈ کی پٹی پر ماریں اور مضطرب ہو کر ایک بار پھر کمرے میں اِدھر سے اُدھر ٹہلنے لگا۔ اندر جلتی آگ ٹھنڈی نہیں ہوتی تھی۔ ایک الاؤ تھا جو بھڑکتا تھا اور شعلے چاروں اور لپکتے جیسے اسے بھسم کیے دیتے ہوں۔ وہ ٹہلتے، ٹہلتے تھک گیا تو نڈھال ہو کر بیڈ پر بیٹھ گیا۔ اس کی آنکھیں نم ہونے لگی تھیں بہت دنوں بعد آج اس کی آنکھیں نم ہوئی تھیں۔ اس نے جھک کر جوتے اتارے اور بیڈ کراؤن سے ٹیک لگاتے ہوئے ہاتھوں کی انگلیوں سے آنکھوں کو دبایا جیسے وہ آنکھوں میں پھیلتی نمی کو باہر آنے سے روکنا چاہتا ہو...... آنسو باہر تو نہیں نکلے تھے لیکن اندر گرنے لگے تھے قطرہ، قطرہ کر کے، اندر بھڑکتے الاؤ کو ان آنسوؤں نے مدھم کر دیا تھا لیکن نم آنکھوں کے آئینے میں ماضی کے بہت سارے منظر جھلملانے لگے تھے۔
ان دنوں زندگی کتنی خوب صورت ہوگئی تھی۔ آنے والے بچوں کے اور ان کے مستقبل کے متعلق باتیں کرتے ہوئے وہ تھکتے نہ تھے۔ جلیل خان نے اس کے لیے فیصل آباد میں ایک چلتا ہوا ہوزری کا کارخانہ خریدنے کا فیصلہ کیا تھا...... کارخانے کا مالک، ملک چھوڑ کر جا رہا تھا۔
''اس چھوٹے سے کارخانے سے ابتدا کرو ثمر انشاء اللہ ایک دن بڑے بزنس مین بنو گے۔'' جلیل خان کو اس کی صلاحیتوں پر اعتبار تھا اور فرحی کو یقین......
''بہت جلد ہم اپنا تلخ ماضی بھول جائیں گے ثمر، ہمارا ایک گھر ہوگا، ہمارے بچے ہوں گے اور ہم نارمل لوگوں کی طرح زندگی بسر کریں گے۔ عام لوگوں جیسی زندگی...... جیسی زندگی سیکڑوں، ہزاروں، لاکھوں لوگ گزار رہے ہیں۔'' فرحی کی آنکھوں میں ان دنوں ہزاروں خواب سج گئے تھے۔ وہ خود بھی تو ان خوابوں میں اس کا شریک تھا۔ بچوں کے ناموں سے لے کر انہوں نے ان کی تعلیم تک پر بحث کر ڈالی تھی کہ وہ کہاں اور کس، کس ادارے میں اپنے بچوں کو پڑھائیں گے۔



وہ بہت خوش اور مطمئن تھا۔ وہ ایک بوجھ سا جو ہمیشہ اس کے سینے پر دھرا رہتا تھا، سینہ اب اس بوجھ سے خالی تھا۔ وہ بوجھ کیسا تھا۔ اس نے کبھی کھوجنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ شاید غلط راستے پر چلنے کا بوجھ تھا کسی احساسِ جرم جیسا لیکن اب وہ اس بوجھ سے آزاد تھا۔
لیکن کبھی، کبھی وہ اماں اور ابا کو یاد کر کے اداس ہو جاتا، وہ ہوتے تو کتنا خوش ہوتے اور اماں فرحی کے کتنے لاڈ اٹھاتیں...... اس روز اماں کو یاد کر کے بے اختیار ہی اس کے لبوں پر شکوہ آ گیا تھا۔
''ہمارے اتنے نقصان ہوئے فرحی کیا تھا اگر اللہ اماں کو ہمارے پاس رہنے دیتا...... صرف اماں ہمارے پاس

ہوتیں تو ....... یہ زندگی نے ہمارے ساتھ کیسا مذاق کیا ہے فرحی ...... بے جرم کی سزا کاٹ رہے ہیں ہم۔'' اس روز اسے وہ ساری زیادتیاں یاد آئی تھیں جو اُن کے ساتھ ہوئی تھیں۔ وہ سارے دکھ جو انہوں نے اٹھائے تھے ...... وہ ظلم جو ماموؤں نے کیا تھا۔

''لیکن شکر کرو ثمر اللہ نے ہمیں تھام لیا، بچالیا، کچھ اور بھی تو ہو سکتا تھا۔ کچھ اس سے بھی بھیانک، تمہیں پولیس پکڑ کر لے گئی تھی۔ میں اکیلی رہ گئی تھی۔ اگر خان بابا اچھے نہ ہوتے ...... اگر ان کے دل میں میرے لیے رحم نہ پیدا ہوتا تو میں کہاں ہوتی۔ اللہ نے مجھے محفوظ رکھا ...... میری عزت بچائی تو اللہ کا شکر ہے۔'' فرحی ڈر گئی تھی۔

''جو ہو گیا سو ہو گیا ثمر ...... اسے مت یاد کرو بس آئندہ کے لیے دعا کیا کرو کہ سب اچھا ہو۔''

اس نے فرحی کی بات سن لی تھی اور خاموش ہو گیا تھا لیکن دل کے اندر شکوے جاری تھے۔

''اگر یوں نہ ہوتا اللہ ...... یوں ہو جاتا تو ......''

اور فرحی اسے خاموش دیکھ کر اپنی اون سلائیاں لے آئی تھی ...... وہ چھوٹا سا سوئیٹر بن رہی تھی۔ وہ اس کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔ کتنے دنوں سے وہ اسے چھوٹی، چھوٹی ٹوپیاں اور سوئیٹر بنتے دیکھ رہا تھا۔ خالہ زیتون بھی ہر وقت مصروف نظر آتی تھیں۔ کبھی مشین کے آگے بیٹھی ہوتیں، کبھی سوئی دھاگا اور اون سلائیاں لیے ہوتیں کچھ دیر وہ اسے یوں ہی دلچسپی سے بُنتا دیکھتا رہا پھر اس کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔

''سب کچھ بازار سے مل جاتا ہے فرحی ...... اتنے ڈھیروں اونی سیٹ تو لایا ہوں میں ...... کیوں تھکتی ہو، کل شاپنگ کے لیے چلتے ہیں جو کچھ اور لینا ہے لے آتے ہیں۔''

''نہیں، مجھے اپنے بچوں کے لیے اپنے ہاتھوں سے سوئیٹر بنانا اچھا لگتا ہے ثمر ......'' اس کے چہرے پر اس وقت ممتا کی الوہی روشنی تھی اور اس روشنی نے اس کے چہرے کو ایسا نکھار بخشا تھا کہ وہ مبہوت سا ہو کر اسے دیکھنے لگا تھا۔

''میں نے خالہ سے سیکھا ہے بُننا ...... مجھے نٹنگ نہیں آتی تھی لیکن میں نے سیکھ لی ...... بازار سے لائے گئے شاید اس سے خوب صورت ہوں گے ثمر لیکن ان میں ممتا کی وہ گرمی نہیں ہو گی جو ان میں ہو گی ...... ان میں میری ممتا کی گرمی اور محبت بھی شامل ہے۔''

اس نے نظریں اٹھائی تھیں اس کے ہاتھ ابھی تک اس کے ہاتھوں میں تھے۔ اور وہ وارفتگی سے اسے تک رہا تھا۔

''میری اماں بھی میرے لیے اپنے ہاتھ سے سوئیٹر بناتی تھیں فرحی ...... اور وہ مجھے بازاری جرسیوں اور سوئیٹروں سے زیادہ اچھے لگتے تھے۔ اور گرم بھی تم صحیح کہتی ہو ان میں ممتا کی گرمی بھی شامل ہو گی تب ہی تو۔'' اس کے اندر ایک نرماہٹ اتر آئی تھیں پچھلے چودہ سالوں میں اس کے اندر عجیب سی کرختگی اور تختی بھر گئی تھی لیکن اس وقت ایک دل پگھلا دینے والی کیفیت تھی جو اس کے اندر کی کرختگی کو نرمی میں بدل رہی تھی اسے لگا جیسے وہ پہلے والا ثمر حیات ہو ...... نرم اور گداز دل ......

اس نے آہستگی سے فرح کے ہاتھ چھوڑ دیے تھے۔

''اللہ کا شکر ہے فرحی کہ اس نے ہمیں اولاد کی نعمت سے نوازا اس نے ہمیں تھاما اور بچالیا۔''

اس نے کچھ دیر پہلے کہی گئی اس کی بات کا جواب دیا تھا۔ اور فرحی کے لبوں پر ہی صرف مسکراہٹ نہیں آئی تھی بلکہ اس کی آنکھیں بھی جگمگا اٹھی تھیں۔

اور اس روز وہ بہت دیر تک جاگتا رہا تھا۔ فرحی کے سونے کے بعد بھی ...... اس نے گزرے چودہ سالوں اور

اس سے پہلے کے بیتے گئے سالوں کے ایک، ایک لمحے کو یاد کیا تھا۔ اس زندگی کا اس زندگی سے موازنہ کیا تھا...... اور سوچا تھا کہ انتخاب کا حق تو میرے پاس تھا۔ فرح صحیح کہتی ہے اور میں نے اپنے لیے خود اس راستے کو چنا تھا...... اور اب اس نے سوچا تھا صبح ہوتے ہی وہ جلیل خان کو فون کر کے پوچھے گا کہ وہ بنکاک سے کب آ رہا ہے...... اگر اسے دیر سے آنا ہے تو وہ خود ہی کارخانے کا سودا پکا کر کے بیانہ دے دے کہیں کوئی اور ہی نہ خرید لے۔ اب اگر بزنس اسٹارٹ کرنے کا ذہن بن گیا تھا تو پھر دیر نہیں کرنی چاہیے۔

وہ یونہی منصوبے بناتے، بناتے سویا ہی تھا کہ فون کی بیل سے آنکھ کھل گئی۔ اس نے مندی، مندی آنکھوں سے سامنے کلاک کی طرف دیکھا تھا۔ تین بجنے والے تھے۔ فرحی نے کروٹ بدلی تھی۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا اور فوراً ہی بیڈ سائڈ ٹیبل پر پڑے فون کا ریسیور اٹھالیا۔ دوسری طرف شیر خان تھا۔

''خیریت شیر خان اس وقت؟'' وہ پریشان ہو گیا تھا۔

''باس نے آج دو بجے کی فلائٹ سے آنا تھا بنکاک سے......''

''تو کیا ہوا......؟'' اس نے سوئی ہوئی فرحی پر نظر ڈالی تھی۔

''باس کو ائر پورٹ سے ہی پولیس پکڑ کر لے گئی ہے۔''

''کیوں......؟'' اس نے پوچھا تھا۔

''پتا نہیں استاد...... ابھی تو کچھ پتا ہی نہیں چل رہا کہ وہ باس کو لے کر کہاں گئے ہیں...... صبح ہی وکیل سے بات کروں گا۔''

''او کے...... تم پریشان مت ہو شیر خان، میں کچھ دیر تک نکلتا ہوں لاہور کے لیے......''

فرحی اس کی باتوں کی آواز سے اٹھ بیٹھی تھی اور اب متوحش نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

''کیا ہوا ثمر......؟''

اور جب اس نے جلیل خان کی گرفتاری کا بتایا تو وہ رونے لگی تھی۔

''میں اسی دن سے ڈرتی تھی ثمر......''

گو وہ خود بھی پریشان تھا لیکن منہ اندھیرے ہی لاہور کے لیے روانہ ہو گیا تھا...... اور پھر دو تین روز بعد ہی اس کی جلیل خان سے ملاقات ہو سکی تھی۔ جلیل خان بہت مطمئن تھا۔ اسے پریشان دیکھ کر مسکرایا تھا۔

''پریشان کیوں ہوتا ہے حیاتے...... یہ تو چلتا ہی رہتا ہے۔ بس ہڈی ڈالنے میں کوتاہی ہو گئی تھی۔ چھ، سات روز میں باہر آ جاؤں گا۔ بس تو اتنی مہربانی کر کہ یہ چند دن یہاں لاہور میں گھر پر ہی رک جا...... جو لوگ آئیں ان سے ملنا اور...... کئی لوگوں کو ٹائم دے رکھا تھا اور جانتا ہے ناں تو اس طرح ساکھ خراب ہوتی ہے...... اور باقی کے کاموں کا تو سارا تجھے پتا ہی ہے ناں......''

اس نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔

''اور فکر نہ کر باہر نکلتے ہی پہلا کام کارخانہ لینے کا کروں گا...... فرحی بیٹی کیسی ہے، اسے سمجھا دینا۔''

اور وہ ایک ماہ پہلے جس گھر سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گیا تھا اس میں پھر آ گیا تھا۔ وہ جلیل خان کو انکار نہیں کر سکتا تھا...... جلیل خان کے اس پر بہت احسان تھے۔ اس کے احسانوں کے بوجھ سے اس کی گردن جھکی ہوئی تھی۔

''صرف چند دن کی بات ہے فرحی۔'' گھر آ کر اس نے فرحی کو تسلی دی تھی...... لیکن اس وقت وہ خود بھی نہیں جانتا تھا کہ یہ چند دن کتنے سالوں پر محیط ہو جائیں گے۔

''تم اپنا بہت خیال رکھنا اور دو دن بعد تمہیں ڈاکٹر کے پاس جانا ہے...... یاد ہے ناں...... اور جو ڈاکٹر نے

ڈیٹ بتائی تھی میں اس سے دو دن پہلے ہی آجاؤں گا بلکہ اگر جلیل خان آگئے تو میں اس سے بھی پہلے آجاؤں گا تم دعا کرنا..... یوں تو جلیل خان کے کافی تعلقات ہیں لوگوں سے پھر بھی وکیل کہہ رہا تھا کہ شاید کچھ دن لگ جائیں۔"

"وہ رہا تو ہو جائیں گے ناں ثمر..... انہیں سزا تو نہیں ہوگی ناں.....؟" فرحی بہت پریشان ہوگئی تھی۔

"ہاں..... جلیل خان کہہ تو رہے ہیں کہ بس چند دن میں باہر ہوں گے..... وکیل فی الحال ضمانت کی کوشش کر رہا ہے۔" اس نے پھر اسے تسلی دی تھی۔

لیکن جلیل خان چند دن تو کیا اگلے کئی مہینے تک باہر نہیں آسکا تھا..... اس دوران وہ دو پیارے، پیارے بچوں کا باپ بھی بن گیا تھا۔ ریحان اور روحان.....

"ہم نے کیا سوچا تھا ثمر کہ ہمارے بچے.....؟"

"اب بھی ایسا ہی ہوگا فرحی، ہم ایک نئی زندگی شروع کریں گے۔ ہمارے بچے ایک مختلف ماحول میں پرورش پائیں گے..... میرا وعدہ ہے تم سے فرحی کہ جلیل خان آگئے تو میں پیچھے مڑ کر بھی نہیں دیکھوں گا۔" اس روز وہ خانیوال آیا تھا اور چاہتا تھا کہ فرحی اور بچوں کو اپنے ساتھ لاہور ہی لے جائے لیکن فرحی..... بہت مایوس اور دلگرفتہ تھی۔

"اتنے دن گزر گئے خان بابا ابھی تک باہر نہیں آسکے۔ ضمانت بھی نہیں ہوئی۔ ایسا کیا، کیا ہے انہوں نے؟"

"وکیل کوشش کر رہا ہے فرحی....." اس نے اس کے باقی سوال کو نظر انداز کر دیا تھا۔

"پتا نہیں خان بابا کب آئیں گے اور اگر انہیں سزا ہوگئی اور اگر تمہیں بہت سارے دن وہاں رہنا پڑا تو.....؟" خدشے اور خوف اس کے لفظوں سے ہی نہیں اس کی آنکھوں سے بھی جھلک رہے تھے۔ وہ بے حد مضطرب اور بے چین تھی۔

"ہم نے اپنے بچوں کے لیے جو خواب دیکھے تھے ثمر....." ایک بار پھر اس نے کہا تھا اور ایک بار پھر اس نے اسے یقین دلایا تھا کہ ان کے خواب ضرور پورے ہوں گے۔ ان کے بچے وہی زندگی جئیں گے جن کے خواب فرحی دیکھتی ہے..... ایک نارمل اور عام لوگوں جیسی زندگی.....

"پہلے اور بات تھی، میں اور خالہ اکیلے تھے، اب یہ بچے ہیں تین دن پہلے ریحان کی طبیعت آدھی رات کو خراب ہوگئی تھی..... ہم دو عورتیں آدھی رات کو کیا کرتیں..... پتا نہیں کیسے رات گزاری..... اور صبح خالہ اسے ڈاکٹر کے پاس لے کر گئیں۔"

"اسی لیے تو میں نے سوچا ہے کہ تمہیں اپنے ساتھ لاہور ہی لے جاؤں گا۔ ہم اکٹھے وہاں ہی رہیں گے۔ میں بھی ان دونوں کے بغیر نہیں رہ سکتا..... بہت یاد آتے ہیں۔" اس نے فرحی کی گود میں لیٹے ریحان کے رخسار کو ہولے سے چھوا تھا۔

"لیکن میں لاہور نہیں جاؤں گی۔ مجھے اپنے بچوں کے ساتھ خان بابا کے گھر میں نہیں رہنا ثمر....." اس نے صاف انکار کر دیا تھا۔

"وہ دنیا والوں کی نظر میں ایک بدمعاش کا گھر ہے..... اور میں نہیں چاہتی کہ میرے بچے اس گھر میں رہیں۔"

"تھوڑے سے دنوں کی بات ہے فرحی....." اس نے سمجھایا تھا۔

"میں بچوں کے ساتھ تمہیں یہاں اکیلا نہیں چھوڑنا چاہتا....."

"تھوڑے دنوں کے لیے بھی نہیں۔" فرحی کا انداز حتمی تھا۔ اس نے نفی میں سر ہلا دیا تھا۔

"ہم الگ گھر کرائے پر لے لیں گے۔" وہ فرحی کو اکیلا نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔

''میں لاہور جانا ہی نہیں چاہتی ثمر.....'' فرحی کی آنکھیں چھلک پڑی تھیں۔

''وہاں میں کیسے خود کو روک پاؤں گی ثمر..... میرا جی چاہے گا میں اس گھر کو دیکھوں جہاں میں نے زندگی کے اتنے سال گزارے..... میں اپنے، ممی، ڈیڈی کی قبروں کی مٹی آنکھوں سے لگاؤں.....'' اور وہ بلک، بلک کر رونے لگی تھی۔

لوگ کہتے ہیں وقت ہر زخم پر مرہم رکھ دیتا ہے لیکن اس کے زخم تو روزِ اوّل کی طرح تھے اور ان سے خون رستا تھا۔

''ٹھیک ہے.....'' اس نے فرحی کو گلے لگایا تھا..... تسلی دی تھی۔

''جلیل خان باہر آجائیں تو ہم لاہور نہیں جائیں گے۔ کسی اور شہر میں جا بسیں گے۔'' وہ مرد تھا پھر بھی کئی بار اس کا دل ان گلیوں میں جانے کو مچلتا تھا جہاں کھیل کود کر وہ بڑا ہوا تھا۔ اس گھر کو دیکھنے کے لیے مچلتا جہاں اس کا بچپن، لڑکپن اور جوانی کا بہت سا حصہ گزرا تھا۔ کیسے، کیسے اس نے اپنے دل پر پتھر رکھے تھے۔ اور فرحی تو.....

اور وہ اسے بہت ساری تسلیاں اور دلاسے دے کر آگیا تھا..... اور یہ تسلیاں اور دلاسے اسے بھی اگلے کئی سال تک دینے تھے۔ وہ ہفتے میں دو چکر خانیوال کے لگاتا تھا۔

جلیل خان نے بہت سارے بکھیڑے پال رکھے تھے اور وہ مستقل خانیوال نہیں رہ سکتا تھا۔

یہ صرف ہڈی ڈالنے کی بات نہیں تھی۔ معاملہ کچھ اور بھی تھا۔ جلیل خان کے خلاف بہت مضبوط کیس بنایا گیا تھا۔ ڈوریاں کہیں اوپر سے ہلی تھیں اور جلیل خان کو پانچ سال کی سزا ہوگئی تھی..... قتل کے کیس میں بھی ہوشیار وکیل ضمانت کروا لیتے ہیں یہاں تو محض اسمگلنگ کا جرم تھا۔ اور بھلا اتنی جلدی فیصلے کب ہوتے ہیں۔ مہینوں عدالتوں میں کیس چلتا ہے..... پیشیاں ہوتی ہیں اور یہاں تو چھ ماہ کے اندر، اندر سزا بھی ہوگئی تھی۔ وہ بے حد دلگرفتہ اور دل شکستہ سا خانیوال آیا تھا۔ اسے فرحی کا سامنا کرتے ہوئے شرمندگی ہورہی تھی کیونکہ وہ فیصلہ کر چکا تھا کہ اسے جلیل خان کے باہر آنے تک اس کی نمائندگی کرنی ہے..... جلیل خان برا تھا، اسمگلر تھا، غنڈا تھا لیکن بہت سارے لوگوں کے لیے اچھا بھی تھا۔ محلے میں کئی گھر ایسے تھے جو صرف جلیل خان کی وجہ سے خود کو محفوظ سمجھتے تھے۔ جلیل خان کے گھر تالا لگنے کا مطلب تھا کہ وہ غیر محفوظ ہوگئے۔

''پچھلی گلی میں ایک بیوہ عورت اپنی تین جوان بچیوں کے ساتھ رہتی ہے..... تمہیں ان کا خاص خیال رکھنا ہے ثمر..... لڑکیاں جوان ہوں، خوب صورت ہوں اور سر پر کوئی سائبان نہ ہو تو بہت سوں کی رال ٹپک پڑتی ہے۔ میں نے بیگم عبدالغفور سے وعدہ کیا تھا کہ میرے ہوتے ہوئے کوئی ان کے گھر کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکے گا اور ثمر تمہیں میرے وعدے کی لاج رکھنی ہے۔ اگر کسی کو میری گرفتاری اور سزا کی بھنک پڑ گئی تو.....'' جلیل خان نے گرفتار ہونے کے بعد اس سے پہلی ملاقات میں کہا تھا اور اب تو اسے سزا ہوگئی تھی اور اس نے جلیل خان کی جگہ سنبھالنی تھی۔ جلیل خان بھی یہی چاہتا تھا گو اس نے زبان سے نہیں کہا تھا اور اسے زبان سے کہنے کی ضرورت بھی نہیں تھی، وہ جانتا تھا کہ ثمر حیات بہت خوش اسلوبی سے اس کے حصے کا کام سنبھالے ہوئے ہے اور آئندہ بھی سنبھال لے گا..... لیکن فرحی وہ اسے قبول کرے گی بھی یا نہیں..... وہ تو گن، گن کر دن گزار رہی تھی کہ جلیل خان کے آتے ہی وہ جلیل خان کی زندگی سے نکل جائیں گے۔ دور کہیں کسی اور شہر میں..... ہوزری کا کارخانہ بک گیا تھا اور نہ بھی.....بکتا تب بھی فرحی فیصلہ کر چکی تھی کہ ایک بار وہ جلیل خان کی زندگی سے نکل گئے تو وہ پھر بھی مڑ کر نہیں دیکھیں گے۔ بھلے جلیل خان انہیں احسان فراموش کہیں، وہ اپنے بچوں کے لیے سب کچھ سننے کو تیار تھی۔ یہ ٹھیک تھا کہ جلیل خان کے لیے اس کے دل میں احترام تھا..... وہ ایک بیٹی کی طرح ہی اس سے محبت کرنے لگی تھی اور جلیل خان نے

بھی ایک باپ کی شفقت دی تھی اسے لیکن وہ کیا کرتی، وہ اپنے بچوں کے لیے ایک صاف ستھرا پاکیزہ ماحول چاہتی تھی وہ ان کے ساتھ کوئی ایسا حوالہ نہیں چاہتی تھی جن پر انہیں کبھی شرمندگی ہو اور اپنے ان خیالات کا اظہار وہ وقتاً فوقتاً ثمر حیات کے سامنے بھی کرتی رہتی تھی سو ثمر حیات سر جھکائے اس کے سامنے بیٹھا لفظوں کی تلاش میں اپنے اندر بھٹک رہا تھا جب اس نے ریحان کے کپڑے تبدیل کرتے، کرتے اس کی طرف دیکھا تھا۔

''کیا بات ہے ثمر تم کچھ پریشان ہو؟''

''ہاں...... '' وہ چونکا تھا۔

''جلیل خان کو سزا ہوگئی ہے پانچ سال کی......'' اس کے ہاتھ لمحہ بھر کو رکے تھے اور وہ پھر مصروف ہوگئی تھی...... اس نے کچھ کہا نہیں تھا لیکن اس کی آنکھیں اسے منجمد سمندروں کی طرح لگی تھیں۔

اور پھر ریحان کو تیار کر کے بیڈ پر لٹا کر تھپک، تھپک کر سلانے لگی تھی۔ اسے لگا تھا جیسے اس نے سنا نہیں۔

''جلیل خان کو سزا ہوگئی ہے فرحی......''

اس نے دُہرایا تھا...... ریحان کو تھپکتے، تھپکتے اس نے بس ایک نظر ثمر حیات کی طرف دیکھا تھا۔

''تم کچھ کہو گی نہیں پوچھو گی نہیں......'' اس کی خاموشی سے وہ الجھ رہا تھا۔

''کیا کہوں اور کیا پوچھوں......؟''

برفیلی سطح کے نیچے جیسے پانی زور مارنے لگا تھا اور برف کی تہ جگہ، جگہ سے تڑخ رہی تھی۔

''چند دن، مہینوں اور اب سالوں پر محیط ہوگئے ہیں ثمر...... جانتی ہوں تم نے خود کو جلیل خان کا قائم مقام بنا لیا ہے۔''

''فرحی بہت مجبور ہوں، کتنی بھی کوشش کروں خود غرض نہیں ہو سکتا...... اس شخص کا ہاتھ نہیں چھوڑ سکتا جس نے بے حد مشکل لمحوں میں میرا ہاتھ تھاما تھا۔ فرح بس چند سال کی بات ہے...... پانچ سال کا مطلب پانچ سال نہیں ہے...... دن رات شمار ہوں گے اور پھر سزا میں تخفیف بھی ہوتی رہتی ہے۔''

پتا نہیں وہ خود کو تسلی دے رہا تھا یا اسے۔ فرحی نے کچھ نہیں کہا تھا بس بیڈ پر پڑا چھوٹا کمبل اٹھا کر ریحان پر ڈالا تھا جو سو گیا تھا۔

''تم یہاں رہو گی خانیوال اور میں جو زندگی گزار رہا ہوں اس کا سایہ تک بچوں پر نہیں پڑے گا فرح...... میرا یقین کرو......''

''مجھے تم پر یقین ہے ثمر لیکن......'' بات ادھوری چھوڑ کر فرحی دروازے کی طرف بڑھی تھی اور زیتون خالہ کو آواز دینے لگی تھی۔

''خالہ روحان سو گیا ہے تو اسے اِدھر لٹا جائیں۔''

''لیکن کیا فرحی......'' اس نے تڑپ کر اسے دیکھا تھا۔

''لیکن...... تقدیر سے ڈر لگتا ہے، میں نے تمہارے ساتھ زندگی گزارنے کی چاہ کی...... میں تمہارے سنگ زندگی گزار رہی ہوں لیکن کس قیمت پر...... میں نے چاہا کہ میرے بچے وہ زندگی نہ گزاریں جس زندگی میں ان کا باپ حادثاتی طور پر آ گیا ہے تو پتا نہیں اس چاہت کا کیا انجام ہوگا...... میں اپنی تقدیر بدلنے کی قدرت نہیں رکھتی ثمر اور نہ ہی اپنے بچوں کی...... میں نے خود کو تقدیر کے دھارے پر چھوڑ دیا ہے جو ہو سو ہو......''

''اتنی مایوسی فرحی......؟'' اس نے بہت دل شکستگی سے فرح کو دیکھا تھا۔

''پتا نہیں یہ مایوسی ہے یا صبر...... شکر ہے یا قناعت، یقین ہے یا بے یقینی......'' فرحی نے ایک گہری سانس لے

کرزیتون خالہ سے روحان کو لے کر بیڈ پر لٹا دیا تھا۔ وہ ساکت بیٹھا تھا۔ اور گاہے گاہے نظر اٹھا کر فری کو دیکھ لیتا تھا جو بیڈ پر بچوں کے پاس ہی نیم دراز ہوگئی تھی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں لیکن پلکوں میں کبھی کبھی لرزش ہوتی تھی اس کا ایک ہاتھ بچوں پر تھا اور دوسرا بازو سر کے نیچے تھا۔ وقت نے اس کے چہرے کی شوخی اور آنکھوں کی شریر چمک چھین لی تھی...... اب وہاں سنجیدگی تھی، ایسی سنجیدگی جس میں بلا کا سوز تھا۔ ایک پگھلا دینے والی کیفیت تھی۔ اور یہ سوز یہ کیفیت پچھلے چودہ سال سے وہ اس کے چہرے پر محسوس کر رہا تھا۔ اس کے اپنے چہرے کی سنجیدگی میں ایک پتھریلا پن تھا۔ پتھروں جیسی سخت بے مہری تھی۔ وقت نے اس کے چہرے کو پتھر کر دیا تھا لیکن اس کا دل تو ویسا ہی تھا۔ گداز، نرم وہ زیادہ دیر تک فری کے چہرے کی طرف نہیں دیکھ سکا تھا۔ وہ جب بھی اس کے چہرے کی طرف دیکھتا تھا تو اس کا دل پگھل کر پانی ہونے لگتا تھا۔ اس نے فری کے چہرے سے نظریں ہٹالی تھیں اور اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے ساتھ بیڈ کراؤن سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا تھا۔ اور اپنا دایاں بازو اس کے گرد حمائل کرتے ہوئے اسے اپنے ساتھ لگا لیا تھا۔

''آئی ایم سوری...... فری......'' فری نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا تھا اس کی آنکھوں کے زیریں کنارے سرخ ہو رہے تھے، لمحے بھر بعد اس نے آنکھیں بند کرلی تھیں اور اپنا سر اس کے سینے پر ٹکا دیا تھا۔

''میں دو تین دن تک لاہور جاؤں گا۔ وکیل نے کہا تھا کہ وہ جلیل خان سے ملاقات کا بندوبست کردے گا۔ پھر پتا نہیں وہ اسے لاہور میں رکھیں گے یا کہیں اور بھیج دیں گے۔ میں جلیل خان کو بتا دوں گا کہ میں......'' بات ادھوری چھوڑ کر اس نے فری کی بند آنکھوں سے بہتے آنسوؤں کو بائیں ہاتھ سے پونچھا۔

''اور تم جہاں کہوگی فری ہم وہاں چلے جائیں گے۔'' وہ ایک بار پھر اس سے وعدہ کر رہا تھا اور نہیں جانتا تھا کہ وہ اپنا وعدہ پورا بھی کر سکے گا یا نہیں...... فری کے آنسو اور زیادہ تیزی سے بہنے لگے تھے اور اس کے دل پر جیسے کوئی بوجھ آ گرا تھا۔ پتا نہیں یہ بوجھ کیسا تھا، کیوں تھا...... وہ جلیل خان سے کیا کہے گا نہیں جانتا تھا۔ جلیل خان کا ردعمل کیا ہوگا...... وہ یہ بھی نہیں جانتا تھا۔

کیا وہ جلیل خان کو کچھ بھی بتائے بغیر خاموشی سے فری کے ساتھ کہیں چلا جائے...... اور اس صورت میں یہ بوجھ جو اس کے دل پر اچانک آ گرا تھا یونہی دھرا رہے گا۔

اگلے دو دن فری کے اور اس کے درمیان اس موضوع پر کوئی بات نہیں ہوئی تھی...... نہ فری نے کچھ کہا تھا نہ اس نے کوئی بات کی تھی...... حالانکہ وہ فری سے بات کرنا چاہتا تھا، پوچھنا چاہتا تھا کہ وہ کہاں جا کر سیٹل ہوں گے...... لیکن ان کے درمیان گفتگو کا موضوع زیادہ تر بچوں کی بیماری رہی تھی خصوصاً ریحان کی...... گو وہ دونوں صحت مند تھے لیکن روحان سرخ و سپید تھا جبکہ ریحان کا رنگ زرد تھا اور وہ اکثر بیمار ہو جاتا تھا۔

''میرا خیال ہے اس بار میں لاہور جاؤں گا تو کسی چائلڈ اسپیشلسٹ سے ٹائم لے لوں گا۔'' اس نے فری سے کہا تھا۔

''ٹھیک ہے......'' فری نے اعتراض نہیں کیا تھا۔ ''ویسے تو یہاں میں نے ڈاکٹر سے چیک کروالیا ہے لیکن پھر بھی اپنی تسلی کے لیے لاہور سے چیک کروالیتے ہیں کسی اسپیشلسٹ سے......''

''میں جلیل خان سے مل کر اسے لاہور لے جاؤں گا۔'' اس نے فری سے کہا تو فری نے پوچھا تھا کہ اسے کب ملنے جانا ہے۔

''پتا نہیں، مجھے وکیل کے فون کا انتظار ہے۔ اس نے کہا تھا وہ دو تین روز میں ملاقات کا بندوبست کردے گا۔'' اس نے فری کو بتایا تھا اور اگلے روز ہی وکیل کا فون آ گیا تھا کہ اس نے ملاقات کا بندوبست کر دیا ہے۔ جلیل خان کو جیل میں کافی سہولتیں حاصل تھیں۔ جیلر سے اس کی پرانی یاری تھی جب بھی وہ جلیل خان سے ملاقات کرنے

جاتا ایک الگ کمرے میں بہت آرام وسکون سے وہ جب تک چاہتے بات کرتے تھے۔
''مجھے صبح جلیل خان سے ملنے لاہور جانا ہے۔'' اس نے رات سونے سے پہلے فرحی کو بتایا تھا۔ روحان کو تھپکتے ہوئے اس کے ہاتھ لحظہ بھر کو تھمے تھے۔
''یہ گھر جلیل خان کا ہے اور میں نہیں سمجھتا کہ جلیل خان کو اپنا فیصلہ سنانے کے بعد ہمیں مزید یہاں رہنا چاہیے۔ ہوسکتا ہے مجھے لاہور میں تین، چار دن لگ جائیں، تم اپنے استعمال کی ضروری چیزیں پیک کر لینا...... لاہور سے آتے ہی ہم یہاں سے چلے جائیں گے...... عارضی طور پر پہلے ہم فیصل آباد جائیں گے، وہاں ہوزری کی فیکٹری کے سلسلے میں تین چار بار جانا ہوا تو کچھ لوگوں سے اچھی دعا سلام ہوگئی تھی۔ ان کے ذریعے کوئی گھر کرائے پر لے لیں گے۔ پھر وہاں بیٹھ کر سکون سے آئندہ کا لائحہ عمل طے کریں گے۔ تم خالہ سے پوچھ لینا اگر وہ ہمارے ساتھ جانا چاہیں تو......''
فرحی نے اس کی پوری بات سنی تھی لیکن نہ اس کی تائید کی تھی نہ تبصرہ کیا تھا بلکہ ذرا سا رخ موڑے روحان کو تھپکتی رہی تھی جس کا سونے کا قطعی موڈ نہیں لگ رہا تھا۔
''ہم ہمیشہ فیصل آباد نہیں رہیں گے۔'' ذرا سے توقف کے بعد اس نے پھر کہا تھا۔
''بلکہ تم جہاں کہو گی ہم وہاں ہی سیٹل ہوں گے یہ تو بس عارضی طور پر ہوگا...... ہم ایک چھوٹا سا اسٹور کھول کر بھی کام کا آغاز کر سکتے ہیں۔'' اس نے جیسے فیصلہ کر لیا تھا کہ اسے مزید جلیل خان کے ساتھ نہیں رہنا...... بات مکمل کر کے اس نے فرحی کی طرف دیکھا تھا لیکن اس نے اب بھی کچھ نہیں کہا تھا۔ وہ اٹھ کر صحن میں چلا آیا تھا۔ اوپر آسمان تاروں سے بھرا تھا۔ خانیوال کے اس گھر سے آسمان نظر آتا تھا وہ اکثر صحن میں چارپائی پر لیٹ کر آسمان کو تکتا رہتا تھا۔ لاہور والے گھر کے صحن سے بھی تو آسمان یوں ہی نظر آتا تھا۔ وہ چارپائی پر لیٹ کر اکثر تاروں کو تکتے، تکتے وہاں صحن میں ہی سو جاتا تھا آج بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ کچھ دیر ٹہلنے کے بعد وہ صحن میں پڑی چارپائی پر لیٹ گیا تھا اور اوپر جگمگاتے تاروں کو دیکھتے، لاہور والے گھر اور اماں، ابا کو یاد کرتے ہوئے جانے کب سو گیا تھا۔ صبح اذان کی آواز پر اس کی آنکھ کھلی تھی اس کا دل اب بھی بہت بوجھل تھا۔ وہ خاموشی سے چارپائی پر لیٹے فرحی کو کچن میں جاتے اور بچوں کے لیے فیڈر تیار کرتے کمرے میں لے جاتے اور پھر برآمدے میں نماز پڑھتے دیکھتا رہا۔ نماز کے بعد فرحی نے صحن میں آکر پوچھا تھا۔
''کب لاہور جانا ہے؟''
''نو بجے تک نکل جاؤں گا۔'' فرحی کو جواب دے کر اس نے پھر آنکھیں موند لی تھیں۔ اور دل ہی دل میں وہ لفظ ترتیب دینے لگا تھا جو اسے جلیل خان کو کہنے تھے۔ وہ احسان فراموش نہیں کہلوانا چاہتا تھا لیکن وہ فرحی کی آنکھوں میں آنسو بھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اس کی خاموشی جیسے اب بھی اس کے دل پر ضربیں لگا رہی تھی۔ وہ یونہی آنکھیں موندے جھلے سوچتا اور رد کرتا رہا اور جب دھوپ صحن میں اتر کر آنکھوں میں چبھنے لگی تو وہ اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ اور جب تیار ہو کر اپنے کمرے سے نکلا تو ناشتا برآمدے میں بچھی گول ٹیبل پر لگا ہوا تھا۔ وہ جب خانیوال والے اس گھر میں ہوتا تو وہ تینوں فرحی، خالہ زیتون اور وہ ناشتا کھانا سب اکٹھا یہاں ہی برآمدے میں اسی ٹیبل کے گرد بیٹھ کر کرتے تھے لیکن آج وہ اکیلا تھا اس نے فرحی کو آواز دی تو اس نے کمرے سے ہی جواب دیا تھا کہ وہ اور خالہ ناشتا کر چکے ہیں۔ ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ انہوں نے اس سے پہلے ہی ناشتا کر لیا وہ تھوڑا سا حیران ہوا۔ شاید فرحی کو اس کی بات کا یقین نہیں ہے اور شاید وہ اس سے کچھ ناراض ہے لیکن اسے ابھی لاہور کے لیے نکلنا تھا اس لیے وہ ناشتا کرنے لگا تھا اور جب وہ تھرماس میں سے اپنے لیے چائے نکال رہا تھا تو فرحی بھی چادر اوڑھے کمرے سے نکل آئی تھی وہ کہیں

جانے کے لیے تیار کھڑی تھی۔

''تم کہیں جا رہی ہو فرحی؟'' اس نے بے حد حیرت سے پوچھا تھا۔

''مجھے بھی تمہارے ساتھ جانا ہے ثمر......''

''کیوں......؟'' اس کے لبوں سے بے اختیار نکلا تھا۔

''خان بابا سے ملنے......''

''لیکن تم نے تو رات کو ذکر نہیں کیا تھا۔''

''تم باہر آ کر سو گئے تھے تو میں نے جگایا نہیں......'' اس نے فرحی سے مزید سوال نہیں کیے تھے اور چائے پینے لگا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ فرحی، جلیل خان سے ایک بیٹی کی طرح ہی محبت کرتی ہے اور اس کی سزا کا سن کر اس کا جذباتی ہو کر اس سے ملنے کے لیے جانا فطری تھا۔ اس کا اپنا ذہن الجھا ہوا تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ جب وہ جلیل خان کو اپنے فیصلے سے آگاہ کرے گا تو اس کا کیا ردِعمل ہوگا...... اسے اپنے دل پر ایک نامعلوم سا بوجھ دھرا محسوس ہو رہا تھا تاہم وہ فیصلہ کر چکا تھا۔

ناشتے کے بعد وہ لاہور کے لیے روانہ ہو گئے تھے۔ دورانِ سفر بھی ان کے درمیان کوئی خاص بات نہیں ہوئی تھی۔ ہاں بچوں کے متعلق چند باتیں ہوئی تھیں۔ لاہور پہنچ کر انہیں گھر چھوڑ کر وہ وکیل سے ملنے چلا گیا تھا۔ ملاقات کا وقت اگلے روز دس بجے تھا، واپسی پر وہ ڈاکٹر سے ٹائم لیتا آیا تھا اور پھر رات وہ فرحی اور ریحان کے ساتھ ڈاکٹر کے پاس گیا تھا۔ خانیوال والے ڈاکٹر کی طرح اس نے بھی یقین دلایا تھا کہ پریشانی والی کوئی بات نہیں...... ریحان کی طرف سے اطمینان ہو جانے کے باوجود اس کی رات بہت بے چین اور مضطرب گزری تھی۔ اس نے فرحی کو بھی کروٹیں بدلتے ہوئے دیکھا تھا۔ یقیناً وہ بھی بے چین تھی کہ یہ وہی بیڈروم تھا جس میں جلیل خان نے پہلی بار انہیں ٹھہرایا تھا۔

صبح جب وہ سو کر اٹھا تو نہ صرف فرحی تیار تھی بلکہ اس نے بچوں کو بھی تیار کر رکھا تھا۔ وہ ناشتا کر کے اٹھا تو خالہ زیتون بچوں کو لے آئی۔ فرحی نے روحان کو اس کی طرف بڑھا دیا۔

''کیا مطلب تم بچوں کو بھی ساتھ لے کر جاؤ گی۔'' اس نے روحان کو گود میں لیتے ہوئے حیرت سے پوچھا تھا۔

''ہاں، میں چاہتی ہوں خان بابا ایک بار اپنے نواسوں سے مل لیں۔ فرحی کے چہرے پر وہی سوز بھری سنجیدگی تھی جو اسے پگھلا کر پانی کر دیتی تھی۔ وہ خاموش ہو گیا تھا۔ مختلف مراحل سے گزر کر وہ اسی مخصوص کمرے میں آئے تھے۔ آج جلیل خان پہلے سے ہی کمرے میں موجود اِدھر اُدھر ٹہل رہا تھا۔

''خان بابا......'' فرحی نے پہلے اندر قدم رکھا تھا۔

''ارے تم فرحی بیٹی......'' جلیل خان حیران رہ گیا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر فرحی کے سر پر ہاتھ رکھا تھا۔

''خان بابا آپ کو سزا ہو گئی ہے۔'' فرحی کی آنکھیں چھلک پڑی تھیں۔

''اوئے، اوئے پاگل نہ ہو تو، رو کیوں رہی ہے۔ یوں گزر جائیں گے یہ سال......''
اس نے چٹکی بجائی تھی لیکن فرحی کے آنسوؤں میں روانی آ گئی تھی۔

''جھلی دھی......'' (بیٹی) جلیل خان اس کے سر پر ہاتھ پھیر رہا تھا۔

''میں کوئی پہلی بار اِدھر تھوڑا ہی آیا ہوں، پہلے بھی دو بار آ چکا ہوں۔ اِدھر سب اپنے ہیں، بہت خیال رکھتے ہیں، کچھ نہیں ہوگا بس اب چپ کر جا نہ رو......''

''ایسا تو ہونا ہی تھا خان بابا...... ایسے کاموں کا ایسا ہی انجام ہوتا ہے۔''

''اوئے کیسے کام چھلیے...... (پاگل) یہ تو اس (گالی دے کر) کی شرارت ہے۔ اس بڑے سیاست دان سے پنگا لے بیٹھا تھا۔ خیر باہر نکل کر میں بھی دیکھ لوں گا اسے۔''

''نہیں خان بابا رہا ہو کر آپ کچھ نہیں کریں گے، یہ سب چھوڑ دیں گے۔ ہمارے ساتھ چلیں گے۔ ہمارے پاس رہیں گے ثمر کوئی چھوٹا موٹا کام کرلیں گے۔''

''اوئے...... ہاں تیری اس ہوزری فیکٹری کا کیا بنا حیاتے......'' جلیل خان نے فرحی کی بات سنی ان سنی کرتے ہوئے پہلی بار دروازے کے قریب بچوں کا stroller تھامے کھڑے ثمر حیات کی طرف دیکھا تھا اور پھر اس کی نظر بچوں پر پڑی تھی وہ تیزی سے ان کی طرف بڑھا تھا۔

''یہ......''

''آپ کے نواسے ہیں خان بابا......'' فرحی نے آگے بڑھ کر بیلٹ کھولی تھی۔ اور باری، باری اٹھا کر اس کی طرف بڑھایا تھا۔

''آپ سے ملوانے لائی ہوں۔''

''یہ تم نے اچھا کیا......''

جلیل خان نے دونوں بچوں کو دبوچ لیا تھا۔

''لو بچوں کا نانا چار، پانچ ماہ بعد بچوں کو دیکھ رہا ہے۔'' وہ انہیں چوم رہا تھا۔ اس کی بڑھی ہوئی شیو کے بال بچوں کو چبھے تو وہ کسمسائے اور پھر رونے لگے۔

فرحی نے انہیں جلیل خان سے لے کر پھر stroller میں لٹا دیا تھا۔ وہ تھوڑا سا بسور کر پھر سو گئے تھے۔ فرحی نے وہاں سے ہی بات شروع کردی تھی جہاں سے ختم کی تھی۔

''خان بابا میں نے سوچا ہم ایبٹ آباد میں رہیں گے...... بہت خوب صورت جگہ ہے۔ میں دو تین بار وہاں گئی تھی۔ میری ایک دوست کا گھر وہاں ہی تھا۔ آپ کو ایبٹ آباد پسند آئے گا...... ثمر کا ارادہ اسٹور کھولنے کا ہے اور......''

''میں...... میں کیسے......'' جلیل خان ٹپٹایا تھا۔

''میرے ادھر سب بکھیڑے ہیں، تم اور ثمر چلے جانا...... میں کبھی کبھار ملنے آجایا کروں گا۔ یہاں جیل کے اندر سے بھی میں تمہاری مدد کرسکتا ہوں بہت سورسز ہیں میرے...... میں اپنے وعدے پر قائم ہوں، میں تمہیں روکوں گا نہیں...... میرا خیال تھا چند دن کی بات ہے اس لیے ثمر حیات کو روکا تھا لیکن اب......'' اس نے ثمر حیات کی طرف دیکھا تھا۔

''دو تین روز تک کراچی سے ممتاز خان کو بلوا لوں گا۔ نیا لڑکا ہے لیکن مخلص اور وفادار ہے...... تم اسے سمجھا دینا اور......''

''لیکن خان بابا...... ہم آپ کے بغیر کہیں نہیں جائیں گے۔'' فرحی نے اسے بات مکمل نہیں کرنے دی تھی۔

''میرے بچوں کے پاس کوئی رشتہ نہیں ہے، بس آپ ہیں...... میں چاہتی ہوں جب میرے بچے بڑے ہوں تو ان کا نانا ان کے پاس ہو...... کوئی ایک رشتہ تو ہو...... وہ اپنے نانا کی گود کی گرمی محسوس کریں...... ان کی انگلی پکڑ کر پہلی بار اسکول اور مسجد جائیں۔'' اب وہ پھر رو رہی تھی اور روتے، روتے اپنے سارے خواب جلیل خان سے شیئر کررہی تھی جو بچوں کی پیدائش سے پہلے سے لے کر جلیل خان کی گرفتاری تک اس سے شیئر کرتی رہی تھی۔

''آپ نے مجھے بیٹی کہا لیکن سمجھا نہیں خان بابا......'' اس کے لہجے میں ہی شکوہ نہیں تھا بلکہ اس کا پورا وجود شکوہ بنا ہوا تھا۔

''کیسے نہیں سمجھا......'' جلیل خان جھلایا ہوا کبھی اسے اور کبھی ثمر حیات کو دیکھ رہا تھا۔

''کہہ تو رہا ہوں تم لوگ اپنی مرضی سے اپنی زندگی گزارو، اپنے وعدے سے تھوڑی مکرا ہوں میں، وہ تو یہ پھڈا پڑ گیا ورنہ اب تک ثمر حیات اپنا کام شروع کر چکا ہوتا۔''

''نہیں سمجھا ناں خان بابا...... اگر یہ سگے ہوتے تو آپ کبھی نہ چاہتے کہ یہ بڑے ہو کر اسمگلر یا غنڈے بنیں۔ لیکن یہ سگے نہیں ہیں ناں تو اب یہ اسمگلر اور غنڈے ہی بنیں گے۔''

''اوئے ہوئے حیاتے، دیکھ میں نے کچھ ایسا کہا، کہہ تو رہا ہوں...... کہ تم لوگ......''

''لیکن ہم آپ کے بغیر نئی زندگی شروع نہیں کریں گے۔'' فرحی نے اس کی بات کاٹی تھی۔

''بھلے ثمر حیات سرحد پر گولی کا نشانہ بن جائے...... عمر بھر کے لیے جیل میں چلا جائے...... ریحان اور روحان اسمگلر، ڈاکو کچھ بھی بن جائیں۔''

وہ اٹھ کھڑی ہوئی تھی...... آنسو ایک بار پھر اس کی آنکھوں میں مچلے تھے۔

''اچھا خان بابا خدا حافظ......''

جلیل خان ساکت کھڑا تھا۔ اور وہ اب...... زارو قطار رو رہی تھی۔

''نہ رو...... بس کر واب، ٹھیک ہے رہا ہو کر وہی کروں گا جو تم کہوگی، باہر تو آجاؤں......'' جلیل خان جیسے بے بس ہو کر بولا تھا۔

''لیکن یہ سب اتنی جلدی نہیں ہو سکے گا ہمارے ہاں زبان کی بڑی اہمیت ہوتی ہے کڑیے......'' (لڑکی)

''تو ثمر آپ کے رہا ہونے تک آپ کے گھر پر ہی رکیں گے؟'' فرحی آنسو پونچھ کر اب پھر آئندہ کے پروگرام بنانے لگی تھی، وہ خاموش کھڑا تھا۔ جلیل خان اور فرحی کے درمیان وعدے ہو رہے تھے، پیمان کیے جا رہے تھے...... پھر وہ اس کی طرف دیکھ کر ہنسا تھا۔

''سیانے صحیح کہتے ہیں حیاتے، عورت کے آنسوؤں میں بڑی طاقت ہوتی ہے...... سلطنتیں الٹ دیتے ہیں یہ آنسو......'' وہ ہولے سے ہنسا تھا اور جھپٹ کر بچوں کو اٹھایا تھا، چوما تھا، گدگدایا تھا اور اس کی شیو کے بالوں نے انہیں پھر رلا دیا تھا اور اسے اپنے سینے سے بوجھ سرکتا ہوا سا محسوس ہوا تھا۔ اس نے ممنون نظروں سے فرحی کو دیکھا تھا...... وہ احسان فراموش نہیں کہلوانا چاہتا تھا اور فرحی نے ناممکن کو ممکن کر دیا تھا۔

''دو چار روز تک ایک ملاقات کا پھر بندوبست کرنا ثمر حیات بہت سے معاملات سمجھانے اور سمجھنے والے ہیں۔ اور ہاں ایبٹ آباد میں ایک اچھا سا گھر ضرور دیکھ لینا۔'' رخصت ہوتے ہوئے جلیل خان ہنسا تھا۔

''آپ رہا ہو کر آجائیں تو ہم گھر بھی دیکھ لیں گے خان بابا......'' فرحی کی آنکھیں جگمگا رہی تھیں اور لبوں پر مسکراہٹ تھی۔ اس روز اس پر فرحی کی اصلیت کا پہلی بار ادراک ہوا تھا کہ وہ اپنی بات منوانے کی طاقت رکھتی ہے۔ شاید ہر عورت میں یہ طاقت ہوتی ہے یہ الگ بات ہے کہ ہر عورت اپنی بات نہیں منواتی۔

اس روز وہ فرحی کو چھوڑ کر واپس لاہور آیا تو بہت مطمئن تھا جلیل خان جب سے جیل گیا تھا یہ پہلی رات تھی کہ وہ بہت پُرسکون اور گہری نیند سویا تھا۔

اسے جلیل خان کے رہا ہونے تک سب کام سنبھالنے تھے اور پھر جلیل خان کے رہا ہوتے ہی انہیں یہاں سے چلے جانا تھا۔ فرحی نے آتے ہوئے کہا تھا۔

''خان بابا کے رہا ہونے سے کچھ پہلے ہی تم ایبٹ آباد میں گھر خرید لینا اور باقی سب بھی طے کر لینا۔'' فرحی کی ہدایت پر وہ مسکرایا تھا اور سر خم کیا تھا۔

''او کے میم......''

ابھی تاریکی تھی لیکن دور روشنی کی ایک کرن چمک رہی تھی...... ایک گھر، بچے، فرحی اور ہر ٹینشن سے پاک پُرسکون زندگی...... ساری رات وہ خواب دیکھتا رہا تھا صبح اس کی آنکھ دروازے پر ہونے والی دستک سے ہی کھلی تھی۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا تھا سامنے کلاک پر نظر پڑی تو دس بج رہے تھے۔

وہ تیزی سے بیڈ سے اترا تھا...... دروازے پر شیر خان تھا۔

''ایک خاتون آئی ہے، داداسے ملنے کو کہتی ہے میں نے اسے ڈرائنگ روم میں بٹھایا ہے۔''

اس کا ذہن فوراً بیگم عبدالغفور کی طرف گیا تھا اگرچہ اس نے دلدار کی ڈیوٹی لگادی تھی کہ ان کی خیر خبر لیتا رہے اور کوئی پرابلم ہو تو اسے بتائے...... وہ جلدی سے تیار ہو کر ڈرائنگ روم میں آیا تھا۔ سیاہ ریشمی برقع کا نقاب پیچھے کیے وہ بالکل سامنے ہی بیٹھی تھی اس کا رنگ بہت گورا تھا۔ گول چہرہ موٹے، موٹے ہونٹ، بڑی، بڑی آنکھیں عمر اندازاً چالیس، پینتالیس سال کے لگ بھگ ہوگی وہ بیگم عبدالغفور نہیں تھی پھر کون تھی۔ سوچتے ہوئے اس نے سلام کیا تھا۔

''مجھے خان دادا سے ملنا ہے۔'' سلام کا جواب دے کر اس نے کہا تھا۔

''دادا تو ملک سے باہر ہیں۔'' خاتون کے چہرے پر مایوسی نظر آنے لگی تھی۔

''آپ کو جو بھی مسئلہ ہے مجھے بتائیں، میں یہاں دادا کی جگہ پر اسی لیے بیٹھا ہوں کہ ان کے حصے کے کام نبٹاؤں......'' خاتون نے پہلی بار غور سے اسے دیکھا تھا۔

''ہم ایک بڑی مصیبت میں پڑ گئے ہیں اور صرف خان دادا ہی ہمیں اس مصیبت سے نکال سکتے ہیں۔''

''آپ بتائیں تو خاتون کیا مسئلہ ہے؟'' وہ اس کے سامنے ہی بیٹھ گیا تھا۔ ''پھر مسئلے کا حل بھی نکال لیں گے۔''

''میں...... شاہجہان ہوں، شاہجہان بیگم...... شاہی محلے میں میرا چوبارہ سب سے بڑا ہے۔''

ٹرن ٹرن فون کی بیل مسلسل ہو رہی تھی۔ اس نے یک دم چونک کر پاس پڑا اپنا سیل اٹھایا۔ اسکرین پر ممتاز خان کا نام چمک رہا تھا۔

''ہاں ممتاز...... کیا بات ہے کہو......'' اس نے سر جھٹک کر فون آن کیا...... ذہن ابھی تک ماضی کی بھول بھلیوں میں الجھا ہوا تھا۔

''عظام صاحب آئے تھے کل......''

''کیوں، کیا کہہ رہا تھا؟'' وہ یک دم الرٹ ہوا تھا۔

''آپ کا پوچھ رہے تھے کہ کہاں ہیں...... کب آئیں گے؟''

''اداس ہو گیا ہوگا۔'' وہ ہولے سے ہنسا۔

''کچھ پریشان سے بھی لگتے تھے۔''

''اوہ......'' وہ مضطرب سا ہو گیا تھا۔

''کیا...... کچھ کہا تھا، تمہیں کیسے لگا کہ وہ پریشان ہے؟''

''کہہ رہے تھے کہ اگر آپ کا فون آئے تو پیغام دے دوں کہ آپ انہیں فون کرلیں...... بہت ضروری بات کرنی ہے انہیں۔''

''اچھا ایسا کہا اس نے؟'' اس کے اضطراب میں اضافہ ہوا تھا۔

''آج رات تک بابر سے بات کر کے میں کل صبح کسی وقت گھر آ جاؤں گا۔'' فون بند کر کے اس نے پھر بیڈ کراؤن سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر لی تھیں لیکن اب وہ عظام کے متعلق سوچ رہا تھا۔

☆☆☆

ایمل دونوں ہاتھ گود میں رکھے کسی گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی بیٹھی تھی۔

''نہیں، یہ بھلا کیسے ہوسکتا ہے۔'' وہ بڑبڑائی۔

''ضرور ہمدانی صاحب کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔'' ہمدانی صاحب اپنے کسی کام کے سلسلے میں کراچی آئے ہوئے تھے اور انہیں کچھ کاغذات پر ایمل کے دستخط بھی کروانے تھے۔ ایمل کو فون کرنے کے بعد وہ گھر آئے تھے۔ بابر آفس جا چکا تھا جس پر ہمدانی صاحب نے اطمینان کا اظہار کیا تھا۔

''یہ اچھی بات ہے کہ بابر صاحب اس وقت گھر پر نہیں ہیں، ہم اطمینان اور سکون سے بات کر سکیں گے۔'' وہ ہمدانی صاحب کی بات پر حیران تو ہوئی تھی لیکن اس نے اس کا اظہار نہیں کیا تھا...... اور ان کاغذات کے متعلق دریافت کرنے لگی تھی جس پر اس نے دستخط کرنے تھے۔

''ہم بہت جلد لاہور شفٹ ہو جائیں گے اور میرا خیال ہے کہ میں بابر کو اتھارٹی لیٹر دے دوں...... وہ میرے مقابلے میں بزنس کے معاملات کو زیادہ بہتر سمجھتے ہیں۔''

''ایسا غضب مت کرنا بیٹی......'' ہمدانی صاحب کے لبوں سے بے اختیار نکلا تھا۔

''کیوں......؟''

''دراصل کرنل صاحب کو بابر پر ٹرسٹ نہیں تھا اس لیے انہوں نے میجر طاہر کو تمام معاملات کا نگراں بنا دیا تھا۔ بابر نے آپ کو بتایا ہوگا بیٹی......''

''نہیں تو انہوں نے اس سلسلے میں مجھ سے کوئی بات نہیں کی۔'' اس نے نفی میں سر ہلایا۔

''اور پھر تو آپ کو کرنل صاحب کی وصیت کے متعلق بھی کچھ علم نہیں ہوگا؟''

''جی...... لیکن ممی سے کل بھی بات ہوئی تھی انہوں نے بتایا تھا کہ وکیل صاحب ابھی واپس نہیں آئے۔''

''وہ تو ابھی نہیں آئے لیکن بابر صاحب کے اصرار پر میں نے انہیں بتایا تھا لیکن شاید انہوں نے آپ سے ذکر نہیں کیا۔''

اس نے صرف اثبات میں سر ہلایا تھا۔

''کرنل صاحب کی تمام پراپرٹی وغیرہ کا آپ اور بیگم صاحبہ کے سوا اور کوئی وارث نہیں...... تاہم کچھ پراپرٹی کرنل صاحب نے ایک ٹرسٹ کے نام کی ہے اور کچھ ارتقاع بیٹی کے نام......''

''ارتی کے نام؟'' اسے حیرت ہوئی تھی۔

''آپ کے بعد ظاہر ہے آپ کی جائداد کے وارث آپ کے بچے اور شوہر ہی ہوں گے لیکن شاید کرنل صاحب کو ارتقاع کے معاملے میں بابر پر بھروسا نہیں تھا۔''

''ارے نہیں ہمدانی صاحب، ڈیڈی کو اس سلسلے میں ضرور کوئی غلط فہمی ہوئی ہوگی۔ بابر تو مجھ سے زیادہ ارتقاع کو چاہتے ہیں۔'' اس کے لبوں سے بے اختیار نکلا تھا۔

''ہوسکتا ہے۔'' ہمدانی صاحب اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

''اور بابر......؟'' اسے یک دم خیال آیا تھا۔

''بابر کو بھی تو ممی، ڈیڈی نے بیٹا بنایا ہوا تھا۔ وہ بھی تو وارث......''

''نہیں ایمل بیٹی، وراثت میں اس کا کوئی حق نہیں ہے۔''

''کیا ممی کو پتا ہے کہ بابر......؟''

''یقیناً علم ہوگا اور نہیں بھی ہوگا تو ایک ہفتے تک وکیل صاحب انشاء اللہ واپس آجائیں گے۔ مکمل تفصیل کا علم تو انہیں ہی ہے۔'' وہ ہمدانی صاحب کو گیٹ تک چھوڑ کر واپس آئی تو لاؤنج میں ہی بیٹھ گئی تھی۔ آخر ڈیڈی کو بابر پر ٹرسٹ کیوں نہیں تھا...... حالانکہ ڈیڈی تو پہلے یہی چاہتے تھے کہ بابر ان کا سارا بزنس سنبھال لیں۔ یہ تو بابر نے خود ہی منع کر دیا تھا۔ ہمدانی صاحب یقیناً مخلص آدمی ہیں لیکن بابر کے متعلق ان کی رائے صحیح نہیں تھی۔ بابر کے ساتھ گزری زندگی کا ہر لمحہ اس کے سامنے تھا۔

''مجھے ممی سے بات کرنی چاہیے۔'' اس نے اٹھ کر لاہور کا نمبر ملایا۔

فون ملازمہ نے اٹینڈ کیا تھا اور بتایا تھا کہ ان کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی اور کچھ دیر پہلے ہی وہ میجر طاہر اور ان کی بیگم کے ساتھ ڈاکٹر کی طرف گئی ہیں۔

''کیا ممی کی طبیعت زیادہ خراب ہے؟'' وہ پریشان ہوگئی تھی۔

''پتا نہیں...... شاید بی پی ہائی ہوگیا تھا۔''

''ٹھیک ہے جیسے ہی ممی آئیں تم ان سے میری بات کروا دینا۔'' تب ہی باہر بابر کی گاڑی کا ہارن سنائی دیا اور پھر گیٹ کھلنے کی آواز آئی......

''یہ بابر آج جلدی کیوں واپس آگئے ہیں۔'' اس نے سوچا اور ریسیور رکھ کر مڑی ہی تھی کہ بیل ہونے لگی تھی...... اس نے مڑ کر ریسیور اٹھا لیا۔

''ہیلو جی کون......؟''

''مجھے مسز بابر سے بات کرنی ہے۔'' دوسری طرف کوئی خاتون تھیں۔

''جی میں مسز بابر ہی بات کر رہی ہوں...... آپ کون......؟''

''میں...... میں عنبرین ہوں......''

''کون عنبرین......'' اس نے پوچھا اور اندر آتے بابر نے عنبرین کا نام سنا تو تیزی سے آگے بڑھا اور اس کے ہاتھ سے ریسیور لے لیا۔ اس نے مڑ کر دیکھا...... بابر اس کے پیچھے ریسیور کان سے لگائے کھڑا تھا۔ دوسری طرف عنبرین کہہ رہی تھی۔

''مسز بابر مجھے آپ سے ضروری بات کرنی ہے۔''

''میں بابر نوید بات کر رہا ہوں میڈم، آپ کو جو بات مسز بابر سے کرنی ہے مجھ سے کرلیں۔'' بابر نے عنبرین کی آواز پہچان لی تھی اور دل ہی دل میں پیچ وتاب کھا رہا تھا۔ عنبرین نے اس کی آواز سنتے ہی فون بند کر دیا تھا۔ وہ حیران تھا کہ عنبرین نے ایمل سے کیا بات کرنے کے لیے فون کیا...... اور پھر اس کو یہاں گھر کا نمبر کہاں سے ملا...... اس نے دو تین بار ہیلو ہیلو کہا اور پھر ریسیور کریڈل پر ڈال کر ایمل کی طرف مڑا اور انجان بنتے ہوئے پوچھا۔

''یہ عنبرین کون ہے، تمہاری کوئی دوست؟''

ایمل نے جو بابر کے اس طرح پیچھے سے آکر ریسیور پکڑنے پر حیران سی کھڑی تھی چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

''مجھے نہیں معلوم کون ہے...... ابھی تو اس نے صرف نام ہی بتایا تھا، تعارف نہیں کروایا تھا اور اس نام کی کسی لڑکی کو میں نہیں جانتی۔''



''دیکھو...... ایمل ......'' اندر ہی اندر عنبرین کی اس جرأت پر کھولتے ہوئے اس نے ایمل کو سمجھایا۔'' آئندہ کسی اجنبی سے بات کرنے کی ضرورت نہیں، چاہے وہ کوئی مرد ہو یا کوئی عورت، آج کل لوگ بہت فراڈی ہو گئے ہیں۔ ڈائریکٹری سے نمبر دیکھ کر کسی گھر میں فون کرتے ہیں اور گھریلو عورتوں کو خاص کر اپنی چکنی چپڑی باتوں سے پھنسا لیتے ہیں۔ کبھی کسی انعامی اسکیم کا لالچ دے کر اور کبھی کچھ کہہ کر گھروں تک رسائی حاصل کر لیتے ہیں۔ مال و دولت تو جاتی ہے عزت جانے کا بھی...... خطرہ ہوتا ہے۔''

وہ نہیں چاہتا تھا کہ عنبرین اگر پھر فون کرلے تو اس کی ایمل سے بات ہو، اب نہ جانے اس نے اتنے سالوں بعد کس مقصد سے فون کیا تھا۔

''ایسے کئی کیسز ہو چکے ہیں کہ پہلے ایک خاتون گھر کے اندر آئی اور پھر اس نے دوسرے ساتھیوں کو بھی بلا لیا اور لوٹ کر چلتے بنے...... بعض اوقات جان بھی چلی جاتی ہے اور عزت بھی......'' اس نے اپنی بات کو پُراثر بنانے کے لیے مزید کہا۔ اس میں کسی حد تک حقیقت بھی تھی۔ ایسی باتیں سننے میں آرہی تھیں۔

ایمل نے اثبات میں سر ہلا دیا، وہ اس وقت اس اجنبی لڑکی کی کال کے متعلق نہیں سوچ رہی تھی۔ اس نے بابر کی بات سن تو لی تھی لیکن اس کا ذہن ممی کی بیماری میں الجھا ہوا تھا۔ ضرور ممی کی طبیعت زیادہ خراب ہوگی تب ہی تو میجر طاہر اور ان کی بیگم ممی کو لے کر اسپتال گئے ہیں۔ ورنہ چھوٹی موٹی تکلیف میں تو ممی خود ہی ڈاکٹر زیاد سے فون پر ڈسکس کر لیتی تھیں۔ ضروری ہوتا تو ڈاکٹر زیاد گھر بھی آجاتے تھے۔ اس کے بچپن سے ہی ڈاکٹر زیاد گھر آرہے تھے۔ ممی بھی اب ڈیڈی کی طرح اس سے اپنی تکلیف چھپانے لگی تھیں۔

''کیا بات ہے، تم کچھ پریشان ہو؟'' بابر بغور دیکھ رہا تھا۔

''ہاں......'' اس نے چونک کر بابر کی طرف دیکھا۔ ''ممی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔''

''کیا لاہور بات ہوئی؟''

''ہاں، میں نے ابھی لاہور ہی فون کیا تھا۔ ممی سے بات نہیں ہو سکی۔ میجر طاہر اور ان کی مسز انہیں ڈاکٹر کے پاس لے کر گئے ہوئے تھے۔ رات ممی سے اتنی دیر بات ہوئی لیکن انہوں نے ذکر تک نہیں کیا کہ ان کی طبیعت خراب ہے۔'' وہ پریشان سی وہاں ہی صوفے پر بیٹھ گئی۔

''یہ میجر طاہر...... who is he'' بابر نے بہ مشکل اپنے غصے پر قابو پایا تھا۔ ''مجھے سمجھ نہیں آتی کہ آخر ہمارے گھریلو معاملات میں اس کا اتنا عمل دخل کیوں ہے۔ اگر ممی کی طبیعت اتنی خراب تھی تو انہیں یہاں فون کرنا چاہیے تھا ہمیں...... نہ کہ میجر طاہر کو لیکن بھلا وہ ہمیں کیوں فون کریں گی۔ ہم ان کے کیا لگتے ہیں۔'' اس کے لہجے میں ہلکا سا طنز در آیا تھا۔

''بابر......'' ایمل کو اس کا یہ طنزیہ انداز اچھا نہیں لگا۔

''ہم یہاں ہیں کراچی میں اور کیا وہ ہمیں فون کرتیں کہ ہم انہیں اسپتال لے جائیں؟''

''تو......'' بابر نے بھویں اچکائیں۔ ''کون سا ہمیں پیدل چل کر جانا تھا پہنچ جاتے دو تین گھنٹے تک۔'' بابر پتا نہیں کیوں اتنا چڑچڑا ہو رہا تھا۔

''انکل مجیب ڈیڈی کے بہت اچھے دوست ہیں۔ آپ خود بھی جانتے ہیں کہ ہمیشہ سے ہی ان کے خاندان سے ہمارے فیملی ٹرمز بہت اچھے رہے ہیں۔ میجر طاہر پر ڈیڈی کو بہت ٹرسٹ تھا۔ میرے بچپن میں اکثر ڈیڈی طاہر بھائی کو گھر لے آتے تھے پھر ڈیڈی نے تو آرمی کی جاب چھوڑ دی تھی لیکن انکل آرمی میں ہی تھے اور ان کی پوسٹنگ مختلف علاقوں میں ہوتی رہی۔ یہ اتفاق ہی تھا کہ آپ کے آنے کے بعد بہت کم طاہر بھائی ہمارے گھر آئے۔

انہیں کمیشن مل گیا تھا پھر ان کی بھی مختلف جگہوں پر پوسٹنگ ہوتی رہی لیکن انکل مجیب کو تو آپ اچھی طرح جانتے ہیں...... ریٹائرمنٹ کے بعد انہوں نے لاہور میں ہی رہائش اختیار کرلی تھی...... ہم جن دنوں کراچی شفٹ ہوئے تھے طاہر بھائی کو بھی آرمی چھوڑنا پڑی...... ایک حادثے میں وہ زخمی ہوگئے تھے۔ ایک سال بیڈ پر رہے انہیں چلنے میں پرابلم بھی رہا اس لیے مجبوراً آرمی چھوڑ دی۔'' ایمل نے اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے نرمی سے ساری تفصیل بتاتی۔



''جانتا ہوں سب۔'' بابر کے لہجے میں بیزاری تھی۔

''ڈیڈی کی بیماری کے دنوں میں انکل اور طاہر بھائی نے بہت خیال رکھا...... ہر وقت ان کے ساتھ رہے اور بہت محبت کرتے تھے ڈیڈی ان سے۔''

''تمہارے ڈیڈی......'' بابر اپنے غصے پر قابو نہ رکھ سکا۔ ''انہیں خدا جانے ان کرنل مجیب اور میجر طاہر میں ایسی کیا خوبی نظر آگئی تھی کہ انہوں نے آخری وقت تک نہ تو ہمیں اپنی بیماری سے آگاہ کیا اور نہ ہی دوسرے معاملات کے متعلق کچھ بتایا۔''

''کیا مطلب ہے تمہارے ڈیڈی......؟'' ایمل نے اس کی باقی بات پر غور نہیں کیا تھا۔ ''کیا وہ آپ کے ڈیڈی نہیں تھے؟''

''میں تو ایسا ہی سمجھتا تھا لیکن......'' اس نے یک دم اپنا لہجہ نرم کیا۔ ''وہ صرف تمہارے ڈیڈی تھے، تمہیں جلد ہی پتا چل جائے گا۔ خیر چھوڑو اس بات کو۔'' وہ جو ابھی تک کھڑا تھا ایمل کے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گیا۔

''مجھے یہ میجر طاہر صحیح بندہ نہیں لگتا، مجھے ڈر ہے کہ یہ کہیں تم لوگوں کو کوئی بڑا دھوکا نہ دے جائے۔''

''لیکن میجر طاہر بھلا ہمیں کیا دھوکا دیں گے؟'' ایمل نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

''اب یہ تو مجھے معلوم نہیں کہ تمہارے ڈیڈی نے اسے کہاں تک اختیار دیے ہیں۔ یہ تو ہمدانی صاحب کو پتا ہوگا یا ممی کو...... لیکن جس طرح وہ تمہارے ڈیڈی کے آفس میں بیٹھا ہوتا ہے اس سے تو لگتا ہے کہ اس کے پاس ضرورت سے زیادہ ہی اختیار ہیں۔''

''کیا آپ کی ملاقات ہوئی طاہر بھائی سے...... آپ گئے تھے آفس؟'' اس نے پوچھا۔

''نہیں...... میں نے سنا ہے۔''

''آپ کو یقیناً طاہر بھائی کے متعلق کچھ غلط فہمی ہوئی ہے...... انکل مجیب اور طاہر بھائی سب ہمارے ساتھ بہت مخلص ہیں۔ وہ کبھی ہمیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے۔''

اس کے لہجے میں یقین تھا۔

''یہ تو وقت آنے پر ہی پتا چلے گا کہ کون کتنا مخلص ہے۔'' بابر کے چہرے پر ایک طنزیہ سی مسکراہٹ نمودار ہو کر معدوم ہوگئی۔

''یہاں ہر دوسرے شخص نے چہرے پر نقاب لگا رکھا ہے۔ جس کے پیچھے اصل چہرہ چھپ جاتا ہے اور تمہارے ڈیڈی کو معاف کرنا آدمیوں کی پہچان ہرگز نہیں تھی...... اگر انہیں پہچان ہوتی تو وہ تمہارے لیے مدثر حسن جیسے شخص کا انتخاب ہرگز نہیں کرتے۔ وہ تو خیر خود ہی بے نقاب ہو گیا اتفاقاً ورنہ پتا نہیں کیا ہوتا۔'' وہ پھر کھڑا ہو گیا تھا۔

''تم اپنے وکیل سے بات کر کے اس میجر طاہر اور انکل مجیب سے جان چھڑاؤ فوراً اور سارا کام کسی بھروسے والے شخص کے سپرد کرو۔'' وہ بات کر کے رکا نہیں تھا اور سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا تھا۔ ایمل ہاتھ گود میں دھرے ساکت بیٹھی تھی۔ مدثر کے متعلق بابر نے کچھ غلط تو نہیں کہا تھا۔ اس کے معاملے میں ڈیڈی ضرور دھوکا کھا گئے تھے لیکن نہیں...... اس میں بھلا ڈیڈی کا کیا قصور تھا۔ مدثر ان کا انتخاب کب تھا۔ مدثر کے لیے تو وہ خود پاگل ہوئی تھی اور ڈیڈی اس کے آنسو برداشت نہیں کر سکتے تھے کیونکہ وہ اس سے بے حد محبت کرتے تھے اور مدثر...... اس نے کیا، کیا تھا اس کے ساتھ...... ''ہم لڑکیاں بھی کتنی پاگل ہوتی ہیں کوئی محبت کے محض دو لفظ بول دے تو دل و جان سے اس پر ایمان لے آتی ہیں اور سمجھتی ہیں کہ دنیا میں اس سے بڑھ کر کوئی نہیں...... سب رشتے سارے تعلق اس ایک نئے رشتے کے سامنے بے معنی لگنے لگتے ہیں......'' وہ بھی تو مدثر کی محبت کے سحر میں گم سمجھتی تھی کہ اس کے لیے مدثر سے بڑھ کر کوئی نہیں...... اور اگر مدثر کا ساتھ نہ ملا تو وہ جی نہیں پائے گی۔ کتنا یقین تھا اسے مدثر پر اس کی محبت پر اور کس بری طرح ٹوٹا تھا اس کا یقین...... وہ مدثر کو دوبارہ دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔ اس سے بات نہیں کرنا چاہتی تھی۔ ممی، ڈیڈی، مدثر کے بابا جان سب نے ہی اسے سمجھایا تھا لیکن اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اب وہ مدثر کے ساتھ زندگی نہیں گزار سکتی۔ اسے صرف طلاق چاہیے تھی اور اگر مدثر نے طلاق نہ دی تو وہ خلع لے لے گی لیکن اس روز جب بابا جان نے اسے آنے والے بچوں کا واسطہ دیا، سمجھوتا کرنے کی درخواست کی...... ان بچوں کی خاطر جو ابھی دنیا میں نہیں آئے تھے تو وہ ہارنے لگی تھی۔ اسے مدثر کے بابا جان سے کبھی کوئی گلہ نہیں رہا تھا۔ وہ بہت محبت کرنے والے بہت نفیس انسان تھے۔ جتنا وقت اس نے مدثر کے گھر گزارا تھا انہوں نے اس کا بہت خیال رکھا تھا۔ تھکے ہارے نڈھال سے بابا جان اس کی منت کر رہے تھے، ہاتھ جوڑ رہے تھے۔ اس کے دل کو جیسے کسی نے مٹھی میں لے لیا تھا۔

''ایک بار صرف ایک بار ان بچوں کے متعلق سوچ لو جو ابھی اس دنیا میں نہیں آئے۔ کیا انہیں باپ کی کمی محسوس نہیں ہوگی۔ کیا بڑے ہو کر وہ تم سے باپ کے متعلق سوال نہیں کریں گے اور اگر وہ باپ کے پاس رہے تو کیا وہ ماں کے لیے نہیں ترسیں گے؟''

''نہیں، میں اپنے بچوں کو مدثر کے حوالے نہیں کروں گی۔'' وہ تڑپ اٹھی تھی۔

''مدثر اتنا ظالم نہیں ہے بیٹا کہ وہ ایک ماں سے اس کے بچے جدا کر دے اور پھر ماں بھی وہ جسے اس نے اپنی زندگی کی سب سے قیمتی متاع جانا...... وہ تمہارے دل کو تکلیف نہیں پہنچا سکتا بھلے اس کا اپنا دل خاک ہو جائے۔ بیٹی تم نے مدثر کو سمجھا ہی نہیں۔'' وہ دکھی تھے۔

''بابا جان......!'' اس نے بے حد شاکی نظروں سے انہیں دیکھا تھا۔

''آپ پلیز مدثر کے متعلق کوئی بات نہیں کریں۔ آپ باپ ہیں، آپ بھی مدثر کو غلط نہیں سمجھیں گے۔''

''سوری...... بیٹا! میں یہاں مدثر کی صفائی پیش کرنے نہیں آیا کیونکہ میں جانتا ہوں اس سے کوئی فائدہ نہیں ہے۔ بعض اوقات بدگمانی کے نقش اتنے گہرے ہوتے ہیں کہ کوئی بھی دلیل، کوئی بھی کوشش اس نقش کو مٹا نہیں سکتی۔ وقت شاید کبھی خود ہی فیصلہ کر دے۔'' انہوں نے ایک گہری سانس لی تھی اور قدرے توقف کے بعد پھر کہا تھا۔

''میں ان باپوں میں سے نہیں ہوں بیٹا جو اولاد کی غلطیوں پر پردہ ڈالتے ہیں۔ مجھے اگر یقین ہوتا کہ مدثر غلط ہے اور وہ سب کچھ صحیح ہے جو تم نے کہا ہے تو میں اس کے بجائے تمہارے ساتھ کھڑا ہوتا لیکن اس وقت مجھے مدثر کے لیے کچھ نہیں کہنا...... اور نہ میں اس کے لیے یہاں آیا ہوں۔ میں صرف تمہارے اور اس کے بچوں کے لیے آیا ہوں، جن کے لیے ہم سب نے مل کر خواب دیکھے ہیں۔ ایک بار صرف ایک بار تم ان کے متعلق سوچ لو۔ میں جانتا ہوں تم انہیں زندگی کی ہر نعمت دے سکتی ہو لیکن کیا تم انہیں ان کا باپ اور اس کی محبت و شفقت بھی دے سکتی ہو؟ ان کو باپ کی محبت سے محروم مت کرو بیٹی۔''

اور تب کتنے کرب اور اذیت سے گزر کر اس نے بچوں کی خاطر سمجھوتا کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ مدثر کے ساتھ ...... اب وہ کیسے رہے گی...... لیکن اسے رہنا تھا۔ بچوں کی خاطر...... بابا جان کی باتوں نے اس کے اندر بے چینی اور اضطراب پیدا کر دیا تھا وہ صحیح ہی تو کہہ رہے تھے کہ وہ دنیا کی ہر نعمت ان کے سامنے ڈھیر کر دے لیکن انہیں ان کا باپ نہیں دے سکتی تھی۔ اس نے بابا جان سے وعدہ کر لیا تھا کہ وہ بچوں کی خاطر یہ زہر پینے کے لیے تیار ہے۔ وہ اب زندگی بھر مدثر کی محبت پر اعتبار نہیں کر سکتی لیکن وہ گھر واپس آ جائے گی صرف بچوں کے لیے لیکن اسے خود کو ذہنی طور پر تیار کرنے کے لیے کچھ وقت چاہیے۔ بابا جان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔

''شکریہ بیٹے!'' اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے ان کا ہاتھ لرز رہا تھا۔

ان کی آنکھوں کے آنسو...... ان کا وہ نڈھال سا شکستہ وجود اسے بے چین کر گیا تھا...... انہوں نے آج مدثر کی صفائی میں کچھ نہیں کہا تھا نہ ہی اس کی وکالت کی تھی۔ ان کے جانے کے بعد وہ ممی کے پاس آ کر بیٹھ گئی تھی۔ ممی نے اس کے فیصلے کو سراہا تھا۔

''تم نے صحیح فیصلہ کیا ہے، مرد کا کیا ہے وہ سو غلطیاں بھی کر لے تو عورت کو اپنی اولاد کی خاطر اپنا گھر بچانے کے لیے معاف کرنا ہی پڑتا ہے۔ مدثر تو بہت اچھا لڑکا ہے۔ وہ ایسا تو نہیں تھا۔''

''ہاں، وہ ایسا تو نہیں تھا۔'' اس روز بہت دنوں بعد اس نے سوچا تھا، پھر اس نے ایسا کیوں کیا...... کیا وہ لڑکی مجھ سے بہتر تھی یا ہو سکتا ہے وہ مجھ سے پہلے ہی اس لڑکی سے محبت کرتا ہو...... اور اس نے مجھ سے محبت کی ہی نہیں تھی۔ بابر سچ ہی کہتا ہے کہ اس نے صرف دولت کی خاطر مجھ سے شادی کی تھی...... اس کی محبت جھوٹی تھی۔ اس نے محبت کا ڈراما رچایا تھا لیکن کیا جھوٹ میں بھی اتنا اثر ہوتا ہے۔'' وہ تو مدثر کے محبت بھرے لفظوں کی اسیر تھی۔ اس کی وہ محبت لٹاتی نظریں...... وہ شدتیں...... وارفتگیاں اسے کبھی نہیں لگا تھا کہ وہ سب ایک جھوٹ ہے...... ڈراما ہے، وہ کتنی وارفتگی سے اسے تکتا تھا۔ کیسے اس کی ذرا، ذرا سی بات کا خیال رکھتا تھا۔

اور کیا خبر مدثر نے سچ ہی کہا ہو کہ وہ لڑکی اس کے لیے انجان ہی ہو...... اور اس سے مدد حاصل کرنے کے لیے

ہی ملی ہو...... اس روز پہلی بار اس نے سوچا لیکن پھر خود ہی اپنی سوچ رد کر دی تھی۔

''نہیں، یہ صرف ایک روز کی بات تو نہیں تھی۔ بابر نے پہلے بھی کتنی ہی بار اسے اس لڑکی کے ساتھ دیکھا تھا لیکن وہ تو بالکل ہی مکر گیا اور اگر نہ مکرتا تو شاید میں خود کو تسلی دے لیتی کہ اس کے ساتھ کوئی کولیگ کوئی دوست ہوگی لیکن......'' سوچتے، سوچتے وہ گھبرا کر کمرے سے لاؤنج میں آ گئی تھی۔ بابر لاؤنج میں اکیلا بیٹھا ٹی وی دیکھ رہا تھا۔

''پتا نہیں، میں نے صحیح کیا ہے یا غلط......'' اپنے فیصلے کے متعلق بتاتے ہوئے اس نے بابر سے پوچھا تھا۔ وہ بابر سے کبھی بے تکلف نہیں رہی تھی۔ کبھی ان کے درمیان فالتو بات نہیں ہوئی تھی شادی سے پہلے بہت رسمی سی بات ہوتی تھی لیکن آج کل ان میں مختلف موضوعات پر بات چیت ہوتی رہتی تھی۔ جب سے بابر نے مدثر کے حوالے سے بات کرنا شروع کی تھی، ان کے درمیان سے تکلف کی دیوار گر گئی تھی۔ بابر اکثر اس کے پاس آ کر اس کی دلجوئی کرتا رہتا تھا۔ اس وقت بھی اس نے بابر سے پوچھا تھا اور وہ بے حد حیران ہو کر اسے دیکھ رہا تھا۔

''تم نے مدثر کے گھر واپس جانے کا فیصلہ کر لیا؟''

''ہوں......'' اس نے سر ہلایا تھا۔

''ڈیڈی اور ممی کا بھی یہی خیال ہے کہ مجھے بچوں کی خاطر واپس چلے جانا چاہیے۔''

''لیکن وہ شخص ہرگز بھی تمہارے جیسی شفاف، پاکیزہ دل رکھنے والی لڑکی کے قابل نہیں ہے۔'' بابر بے حد مضطرب لگ رہا تھا۔

''ممی کہتی ہیں طلاق یافتہ عورت کو معاشرے میں اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا۔ بھلے وہ بے قصور ہی کیوں نہ ہو۔ طلاق یافتہ عورت کے بچوں کو بہت سفر کرنا پڑتا ہے۔ اور پھر بڑے ہو کر وہ کیا سوچیں گے کہ ان کی ماں نے ان کے باپ سے طلاق لے لی تھی۔ ہو سکتا ہے وہ مجھے ہی قصوروار سمجھیں۔'' وہ بے حد افسردہ تھی۔

''کیا ضرورت ہے ایمل کہ بچوں کو بتایا جائے کہ ان کی ماں نے طلاق لے لی تھی۔ یہ بات ان سے چھپائی بھی تو جا سکتی ہے۔''

''کب تک؟ جب وہ بڑے ہوں گے تو انہیں پتا چل ہی جائے گا۔ ایسی باتیں بھلا کہاں اور کب تک چھپ سکتی ہیں۔''

''کوئی دوسرا شخص بچوں کو یہ احساس دلائے بغیر کہ وہ اس کے بچے نہیں ہیں انہیں باپ کا پیار دے سکتا ہے۔ تم اگر کسی ایسے انسان سے شادی کر لو تو......'' بابر کی نظریں اسی پر تھیں۔

''ایسا شخص...... کون ہوگا بھلا......؟'' وہ بے حد دلگرفتہ تھی۔ ''کوئی بھی شخص دوسروں کی اولاد کو اپنا نہیں سمجھ سکتا...... اور پھر اگر میں مدثر سے طلاق لے بھی لیتی تو میرا ارادہ دوبارہ شادی کرنے کا نہیں تھا۔''

''زندگی تنہا نہیں گزر سکتی ایمل......'' بابر کا انداز سمجھانے والا تھا۔ ''دنیا اچھے لوگوں سے خالی نہیں ہے...... ہر شخص مدثر نہیں ہوتا...... تم اپنے اردگرد نظر ڈالو تو شاید تمہیں محسوس ہو جائے کہ کوئی ہے جو تمہارے بچوں کو باپ کی کمی محسوس نہیں ہونے دے گا۔''

لیکن اس نے بابر کی بات پر دھیان نہیں دیا تھا اور اسے ڈیڈی کے متعلق بتانے لگی تھی۔

''ڈیڈی کہتے ہیں ہو سکتا ہے وہ سب سچ ہو جو مدثر نے کہا ہے۔ ہمیں کوئی غلط فہمی بھی تو ہو سکتی ہے اور مجھے ضرور اسے ایک چانس دینا چاہیے۔''

''غلط فہمی......؟'' بابر کا رنگ سرخ ہوا تھا۔

''تم نے خود اسے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا ایمل، پھر بھی تم اسے غلط فہمی کہہ رہی ہو؟'' پتا نہیں کیوں بابر کو غصہ

آ گیا تھا۔ ''اگر وہ اتنا ہی سچا ہے تو اب تک اپنا سچ ثابت کرنے کے لیے اس لڑکی کو لے کر کیوں نہیں آیا یہاں......'' بابر نے کہا تھا۔

''یہ تو ہے لیکن کبھی، کبھی بصارتیں دھوکا بھی تو کھا جاتی ہیں۔ انسان جو کچھ دیکھتا ہے وہ اصل حقیقت نہیں ہوتی۔'' بالکل غیر ارادی طور پر اس کے لبوں سے مدثر کے کہے الفاظ نکلے تھے۔

''تم احمق ہو ایمل...... بھلا اس طرح آنکھوں دیکھی مکھی کون نگل سکتا ہے۔'' بابر جھنجلایا تھا۔

''آپ ٹھیک کہتے ہیں بابر بھائی لیکن کبھی، کبھی انسان مجبور ہو جاتا ہے، میں بھی اپنے بچوں کی خاطر یہ مکھی نگلنے پر مجبور ہوں، میں نے بابا جان سے کہہ دیا تھا کہ میں چند دنوں تک گھر آ جاؤں گی لیکن مدثر......''

''لیکن تم یہ کیسے کر سکتی ہو ایمل۔'' بابر نے اس کی بات کاٹ دی تھی۔ ''تم ایک سچی اور کھری لڑکی ہو، تم کیسے ایک دغا باز جھوٹے اور فریبی مرد کے ساتھ رہ سکتی ہو۔''

''ہاں، یہ آسان نہیں ہوگا۔'' اس نے بے بسی سے بابر کی طرف دیکھا تھا۔

''لیکن میں نے اسے اپنے بچوں کی خاطر معاف کر دیا ہے۔ عورت کو اولاد کی خاطر سب کچھ برداشت کرنا پڑتا ہے بابر بھائی اور میری بھی مجبوری ہے کہ وہ میرے ہونے والے بچوں کا باپ ہے۔''

''تمہاری کوئی مجبوری نہیں ہے ایمل......'' بابر نے اسے سمجھایا تھا۔ ''عورت وہاں مجبور ہوتی ہے جہاں اسے معاشی پرابلمز کا سامنا ہو...... تمہیں اور تمہارے بچوں کو ایسا کوئی پرابلم نہیں ہے۔''

''بابر بھائی بات صرف مالی آسودگی کی ہی تو نہیں ہوتی۔ بڑی سے بڑی دولت بھی باپ کی شفقت و محبت کا نعم البدل نہیں ہو سکتی۔'' بابا جان کی بات دہراتے ہوئے اس نے دل ہی دل میں اس کا اعتراف بھی کیا تھا۔ بھلے وہ بچوں کے سامنے دولت کے ڈھیر لگا دے ان کے لیے دنیا کی ہر آسائش مہیا کر دے لیکن کسی روز اگر انہوں نے پوچھ لیا...... ہمارا باپ کہاں ہے تو وہ پھر کیسے انہیں مطمئن کرے گی۔

''او کے، اگر تم فیصلہ کر چکی ہو تو میں کہہ کیا سکتا ہوں، سوائے اس کے کہ تمہیں اپنے فیصلے پر پچھتانا نہ پڑے۔''

''آمین......'' اس نے دل ہی دل میں کہا تھا۔

بابر نے اس کے بعد اس سے کوئی بات نہیں کی تھی اور پھر ٹی وی کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔ وہ کچھ دیر وہاں ہی بیٹھی رہی اور پھر اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گئی تھی اتنے دنوں میں پہلی بار وہ مدثر کے لیے اپنے دل میں ایک نرم گوشہ محسوس کر رہی تھی۔ وہ بستر پر سونے کی غرض سے لیٹی تھی مگر وہ مدثر کو ہی سوچے جا رہی تھی۔

کہیں کوئی ایک لمحہ بھی ایسا نہیں تھا کہ اسے احساس ہوتا کہ مدثر اس کے ساتھ مخلص نہیں ہے۔ اس کی وارفتگیاں اس کی محبتیں...... اس کے جذبوں کی حدت میں لپٹے الفاظ اس کا کہا ایک، ایک لفظ اسے یاد آیا جو اسے ہمیشہ معتبر کر دیتا تھا۔ وہ عجب طرح سے نازاں ہوتی اور اس کی محبت اسے مغرور کرتی تھی۔ اسے فخر تھا کہ مدثر اس کا شریک زندگی ہے اور وہ دنیا کی سب سے خاص بلکہ خوش قسمت ترین لڑکی ہے اور پھر اس کا یہ غرور خاک میں مل گیا تھا۔ وہ خاص نہیں رہی تھی ایک عام عورت ہو گئی تھی، ایک ایسی عام عورت جس کا شوہر صرف اس کا شوہر نہ تھا۔

وہ بیتے دنوں کو یاد کرتی رہی تھی اور اس کا تکیہ اس کے آنسوؤں سے بھیگتا رہا تھا۔ پتا نہیں وہ کب سوئی لیکن صبح اٹھی تو وہ پچھلے دنوں کے مقابلے میں زیادہ فریش تھی اور اپنے فیصلے پر بے حد مطمئن...... مدثر نے ان بیتے دو سالوں میں اسے بے حد اور بے حساب چاہا تھا وہ کوئی ایک لمحہ بھی ایسا یاد نہ کر سکی تھی جب اسے مدثر کی محبت میں کمی محسوس ہوئی ہو تو اسے ایک چانس دیا جا سکتا تھا۔

''ممی میں سوچ رہی ہوں کہ آج شام واپس گھر چلی جاؤں آپ مدثر کو فون کر دیں کہ وہ کالج سے واپسی پر

مجھے لے جائیں۔'' ناشتا کرتے ہوئے اس نے بہت اطمینان سے ممی سے کہا تھا۔
پتا نہیں کیوں اس کا جی چاہا تھا کہ وہ مدثر کے سنگ ہی گھر واپس جائے۔
ناشتا کرتے ہوئے بابر نے بے حد چونک کر اسے دیکھا تھا اتنے سارے دنوں سے اس کے چہرے پر جو تناؤ تھا اور جو بیزاری کی کیفیت ہر وقت اس پر طاری رہتی تھی اب نہیں تھی۔
''وہ ممی آج مجھے اماں، ابا سے ملنے جانا ہے۔ ابا کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے، وہ کئی دنوں سے فون کر کے بلا رہے ہیں۔'' وہ ایک دم کھڑا ہو گیا تھا۔
''ٹھیک ہے بیٹا چلے جاؤ، میری طرف سے بھی بھائی صاحب کی مزاج پرسی کرنا لیکن بیٹا ڈھنگ سے ناشتا تو کر لو۔''
''میں نے ناشتا کر لیا ہے، ممی آپ لوگ کب اسلام آباد کے لیے نکلیں گے۔''
''کچھ دیر تک، جنازہ تو رات آٹھ بجے ہے۔'' بابر سے بات کر کے وہ ایمل کی طرف متوجہ ہوئی تھیں جو سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھ رہی تھی۔
''میں اور تمہارے ڈیڈی ایک گھنٹے میں اسلام آباد کے لیے نکل رہے ہیں۔ دراصل تمہارے ڈیڈی کے دوست کرنل شفیق کے والد کا انتقال ہو گیا ہے۔ انشاء اللہ کل شام تک واپس آجائیں گے تو تم ہمارے واپس آنے کے بعد ہی اپنے گھر چلی جانا لیکن اپنے سسر یا مدثر کو فون ضرور کرنا وہ بیچارے بہت پریشان تھے...... اکلوتے بیٹے کے حوالے سے تم بھی انہیں بہت عزیز ہو گئی ہو...... بہت محبت کرتے ہیں تم سے۔''
''مجھے خوشی ہے کہ تم نے گھر جانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔'' کرنل حامد نے ڈائننگ روم میں داخل ہوتے ہوئے کہا تھا۔ وہ ناشتا اپنی اسٹڈی میں ہی کیا کرتے تھے اور آج بھی انہوں نے وہاں ہی ناشتا کیا تھا اور اب تیار ہو کر باہر آئے تھے۔
''گھر بنتے مشکل سے ہیں مگر بہت آسانی سے ٹوٹ بھی جاتے ہیں...... اور ٹوٹے ہوئے گھر دوبارہ نہیں بنتے اور اگر بن بھی جائیں تو ویسے نہیں بنتے کہیں نہ کہیں کوئی نہ کوئی ڈیفیکٹ رہ جاتا ہے۔'' وہ اس کے برابر والی کرسی پر بیٹھ گئے تھے۔
''جی ڈیڈی......'' ایمل نے سر اٹھا کر ان کی طرف دیکھا تھا۔ ''ہو سکتا ہے مدثر کے لیے میرے دل میں وہ مقام کبھی پیدا نہ ہو سکے جو پہلے تھا لیکن مجھے اپنے بچوں کی خاطر سمجھوتا کرنا پڑا۔ میں نہیں چاہتی ڈیڈی کہ میرے بچے جب بڑے ہوں تو ان کی شخصیت میں کہیں کوئی کمی یا خلا رہ جائے۔''
''میری بیٹی بہت عقلمند ہے اور اس نے بالکل صحیح فیصلہ کیا ہے۔'' انہوں نے اس کا بازو تھپتھپاتے ہوئے بابر کی طرف دیکھا تھا جو اپنی کرسی کی پشت پر ہاتھ رکھے کھڑا تھا۔
''میاں تم کیوں کھڑے ہو؟ بیٹھ کر ناشتا کرو۔''
''میں نے ناشتا کر لیا ہے ڈیڈی...... مجھے ابا، اماں سے ملنے جانا ہے اور بس جا ہی رہا ہوں۔ یونہی آپ لوگوں کی بات سننے کے لیے رک گیا تھا۔''
''اپنے اماں، ابا کو میرا بھی سلام کہنا۔''
''جی......'' اس نے آہستگی سے کہا اور پھر کچھ جھجکتے ہوئے بولا تھا۔
''وہ ڈیڈی......'' ممی سے تو وہ ہمیشہ سے ہی بے تکلف تھا اور ہر بات بلا جھجک کہہ دیتا تھا لیکن ڈیڈی سے بات کرتے ہوئے آج بھی ہچکچاتا تھا اسے جھجکتے دیکھ کر ایمل کے لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ بکھر گئی تھی۔

''ہاں، ہاں کہو.....'' ہمیشہ کی طرح کرنل حامد کا لہجہ نرم اور حوصلہ دیتا ہوا سا تھا۔

''وہ دراصل میں یہ کہنا چاہ رہا تھا کہ ایمل کچھ غلط نہیں کر رہی..... مدثر قابلِ اعتبار نہیں ہے، کیا ایسے شخص پر بھروسا کیا جا سکتا ہے جو ایک بار آپ کو دھوکا دے چکا ہو؟''

''شاید نہیں۔'' کرنل حامد کے لبوں پر بڑی دلفریب سی مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی۔ ''لیکن میاں، بیوی کا معاملہ بالکل الگ ہوتا ہے بیٹا! ازدواجی زندگی کے معاملات کچھ مختلف اصولوں پر چلتے ہیں، کبھی بیوی کو سمجھوتا کرنا پڑتا ہے کبھی شوہر کو..... ایک دوسرے کی غلطیوں، خامیوں اور کمزوریوں کو نظر انداز کیے بنا یہ گاڑی نہیں چلتی۔ اپنے ابا، اماں کو ہی دیکھ لو..... تمہارے ابا سال میں کتنی بار تمہاری اماں کا اعتبار توڑتے ہیں اور ہر بار وہ پھر ان پر یقین کر لیتی ہیں۔'' ان کی مسکراہٹ گہری ہوئی تھی اور بابر کا سر جھک گیا تھا..... اس کے پاس دینے کے لیے کوئی دلیل نہیں رہی تھی..... ایمل کو تب لگا تھا کہ ڈیڈی کو خالہ، خالو کی مثال نہیں دینی چاہیے تھی تاہم وہ خاموش رہی تھی اور بابر خدا حافظ کہہ کر چلا گیا تھا اور ڈیڈی، ممی کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔

''بیگم صاحبہ دس بجنے والے ہیں اور آپ ابھی تک تیار نہیں ہوئیں۔ بارہ بجے کی فلائٹ ہے اور گھنٹا تو... ائرپورٹ پہنچنے میں لگ جائے گا۔''

''میں بس تیار ہی ہوں، بیگ میں ایک جوڑا کپڑوں کا رکھنا ہے بس.....'' ممی نے اپنے لیے چائے بناتے ہوئے جواب دیا تھا۔

''آپ کے لیے چائے بناؤں ڈیڈی.....؟'' ایمل نے پوچھا تو وہ اسی نرم لہجے میں بولے تھے۔

''ویسے تو پی چکا ہوں لیکن میری بیٹی بنائے گی تو ضرور پیوں گا۔''

وہ اس کے لیے اتنے ہی شفیق اور مہربان تھے۔ وہ ان کے لیے چائے بنانے لگی تھی اور ممی چائے پی کر تیار ہونے چلی گئی تھیں۔

ممی، ڈیڈی کے جانے کے بعد اس نے باتھ (غسل) لیا تھا، فریش ہونے کے بعد کچھ دیر اخبار پڑھتی رہی تھی اور پھر بہت ریلیکس ہو کر ٹی وی لاؤنج میں آ کر ٹی وی دیکھنے لگی تھی۔ ان دنوں اس کے پاؤں ذرا سا لٹکانے سے بہت سوج جاتے تھے سو وہ پاؤں کے نیچے کشن رکھے ٹانگیں تھوڑی سی پھیلائے صوفے کی پشت سے ٹیک لگائے بہت آرام سے ٹی وی دیکھ رہی تھی۔ جب ملازمہ نے آ کر بتایا تھا کہ کوئی لڑکی اس سے ملنے آئی ہے۔

''اوہ، ضرور مونی ہو گی۔'' وہ یک دم سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔

''ارے بھئی اسے اندر لے آؤ باہر کیوں روک رکھا ہے۔'' ملازمہ نئی تھی اور مونی کو پہچانتی نہیں تھی۔

کتنے سارے دن ہو گئے تھے مونا سے اس کی ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ جب سے مونی کی شادی ہوئی تھی صرف دو تین بار ہی اس کی بات ہو سکی تھی۔ ایک تو اس کے سسرال میں اتنے بچے تھے کہ جب بھی فون کرو کوئی بچہ اٹھا لیتا تھا۔

''اچھا مامی سے بات کرنی ہے۔ ہولڈ کریں بلاتا ہوں۔'' اور پھر ریسیور اٹھائے، اٹھائے ہاتھ تھک جاتے اور ٹوں، ٹوں کی آواز آنے لگتی۔ بچہ شاید مامی کو بتانا بھول جاتا..... یا پھر کوئی بچہ کہتا۔

''اچھا چاچی سے بات کرنی ہے لیکن چاچی تو کچن میں ہیں.....'' یا پھر یہ کہ ''کمرے میں ہیں باہر آئیں گی تو بتا دوں گا۔''

''ارے بھئی کمرے میں جا کر بتا دو۔''

''توبہ، توبہ..... '' بچہ توبہ کرنے لگتا۔

''ہمیں چاچو سے ڈانٹ کھانے کا کوئی شوق نہیں ہے، آپ اپنا نام بتا دیں جب چاچی نظر آئیں گی تو پیغام

دے دوں گا۔'' از راہ کرم ارشاد ہوتا۔
اور پھر پیغام دینے والا وعدہ کر کے شاید بھول جاتا تھا۔ تنگ آ کر اس نے اس کی سسرال فون کرنا چھوڑ دیا تھا اور آنٹی سے کہہ دیا تھا کہ جب وہ لاہور آئے تو اس کی بات کروا دیں اور اس کا تو ایسا دل لگا تھا اپنی سسرال میں کہ وہ شادی کے بعد دو تین بار ہی آئی تھی اور اسے ان دنوں اس کی کتنی ضرورت تھی ایک وہ ہی تو تھی اس کی اکلوتی دوست...... اس کی ہمراز جس سے وہ دل کی ہر بات کہہ سکتی تھی...... اور جس نے ہمیشہ اسے مدثر کی محبتوں کا یقین دلایا تھا اور جو اس کی قسمت پر رشک کرتی تھی کہ مدثر جیسا شخص اس کا دیوانہ ہے۔ دل جیسے آبلہ بنا ہوا تھا۔ وہ بہت اشتیاق سے اس کے استقبال کے لیے کھڑی ہوئی تھی لیکن اندر لاؤنج میں قدم رکھنے والی مونی نہیں تھی۔ کندھوں تک کٹے بال، جدید تراش خراش کا لباس پہنے وہ لڑکی اسے جانی پہچانی سی لگی تھی لیکن اسے یاد نہیں آیا تھا کہ اس نے اسے پہلے کہاں دیکھا ہے۔

''مجھے مسز مدثر حسن سے ملنا ہے۔'' لڑکی سوالیہ نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

''جی، میں ہی مسز مدثر ہوں۔'' اس کا دل جیسے ایک لمحہ کو ڈوب کر ابھرا تھا۔

''تشریف رکھیں پلیز......'' اس نے سامنے والے صوفے کی طرف اشارہ کیا تھا۔ وہ بیٹھ گئی تھی لیکن بہت مضطرب اور بے چین لگ رہی تھی۔ کچھ دیر تو وہ یونہی بیٹھی انگلیاں چٹخاتی رہی تھی اور پھر پہلو بدلتے ہوئے اس نے یونہی انگلیاں چٹخاتے ہوئے اس کی طرف دیکھا تھا۔

''میں بہت مجبور ہو کر آپ کے پاس آئی ہوں مسز مدثر، میں کبھی یہاں نہ آتی اگر......'' اس نے بات ادھوری چھوڑ دی تھی یوں جیسے اسے اپنی بات کی وضاحت کے لیے لفظ نہ مل رہے ہوں...... پھر اس کی آنکھیں نم ہوئیں۔ وہ اپنے ہونٹ بے دردی سے دانتوں تلے کچل رہی تھی اور ایمل کو لگا تھا جیسے وہ ابھی رو دے گی اور ایسا ہی ہوا تھا۔ وہ دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر رونے لگی تھی اس کا وجود ہولے، ہولے ہل رہا تھا۔

''پلیز مت روئیں، بتائیں تو سہی کیا ہوا ہے۔'' ایمل گھٹنوں پر کہنی کا دباؤ ڈال کر تھوڑا سا آگے جھکی تھی۔ کسی انہونی کا خوف اس کے دل کو جیسے اپنے پنجوں میں جکڑے ہوا تھا کسی خوفناک عفریت کی طرح......

''آپ...... صرف آپ ہیں جو میری مدد کر سکتی ہیں۔'' کچھ دیر بعد اس نے اپنے چہرے سے ہاتھ ہٹائے تھے اور دوپٹے کے پلو سے رگڑ کر چہرہ صاف کیا تھا۔

''میں آپ کی کیا مدد کر سکتی ہوں آپ بتائیں تو اگر میرے اختیار میں ہوا تو ضرور آپ کی مدد کروں گی۔'' ایمل کا دل اس کے لیے گداز ہوا تھا۔

''آپ کے اختیار میں ہی تو ہے سب کچھ۔'' وہ ایک دم اپنی جگہ سے اٹھی تھی اور ایمل کے پاس نیچے بیٹھتے ہوئے اپنے ہاتھ ایمل کے پاؤں پر رکھ دیے تھے۔

''نہیں...... نہیں یہ کیا کر رہی ہیں آپ......'' اس نے یک دم اپنے پاؤں کھینچ کر صوفے پر رکھ لیے تھے اور اضطراری کیفیت میں ہولے، ہولے دبانے لگی تھی۔

''میں آپ کی کنیز بن کر رہ لوں گی، ساری زندگی آپ کی نوکرانی بن کر گزار دوں گی بس آپ مدثر سے کہیں مجھ سے شادی کر لے۔''

اور اسے لگا تھا جیسے خوف کے اس عفریت نے اپنے نوکیلے ناخن اس کے دل میں چبھو دیے ہوں اور وہ بھرائی آواز میں کہہ رہی تھی۔

''آپ اسے شادی کی اجازت دے دیں، بس ایک بار وہ مجھ سے شادی کر لے پھر چاہے ساری زندگی آپ

مجھے گھر کے ایک کونے میں ڈال دیجیے گا۔ پڑی رہوں گی، آپ جو کہیں گی، کروں گی لیکن خدا کے لیے مجھے بچالیں۔ میرا باپ بہت سخت ہے، وہ مجھے مار ڈالے گا، اگر اسے پتا چل گیا تو...... وہ مجھے ہی نہیں میری چھوٹی بہنوں کو بھی مار ڈالے گا اور ہم سب کو مار کر خود بھی مر جائے گا...... میں مدثر کے بچے کی ماں بننے والی ہوں...... میں خودکشی نہیں کر سکتی، مجھے مرنے سے بہت ڈر لگتا ہے۔ ورنہ اپنی زندگی ختم کر لیتی۔'' اور ظالم عفریت نے اس کا دل مٹھی میں دبا کر مسل ڈالا تھا۔

وہ ہاتھ جوڑ رہی تھی اور منتیں کر رہی تھی لیکن وہ ساکت بیٹھی تھی جیسے پتھر کی ہو، اس کے اندر جو وہ ایک نرم گوشہ پیدا ہوا تھا مدثر کے لیے وہاں کی زمین جیسے یک دم سخت، پتھریلی چٹانوں میں بدل گئی تھی۔ وہ جو رات کو اس نے اس نرم گوشے سے ننھی ننھی کونپلیں پھوٹتی محسوس کی تھیں معافی کی، امید کی، درگزر کی، نرمی کی، وہاں اب کسی کونپل کا نشان تک نہیں تھا۔ بس سخت پتھریلی زمین تھی، جہاں نہ پھول کھلتے ہیں نہ سبزہ...... اس نے خالی، خالی نظروں سے اس اجنبی لڑکی کو دیکھا تھا وہ بلاشبہ وہی تھی جسے اس نے اس رات مدثر کے ساتھ دیکھا تھا۔ اس کے جڑے ہوئے ہاتھوں کو اضطراری کیفیت میں پرے کرتے ہوئے وہ اٹھی اور اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی تھی اور پھر پتا نہیں کتنی دیر گزر گئی تھی اسے خبر نہیں تھی۔ وہ یونہی اپنے بیڈ پر ساکت بیٹھی تھی۔

وہ لڑکی کب گئی تھی اسے یہ بھی خبر نہیں تھی۔ بہت دیر بعد اس کے ساکت وجود میں جنبش ہوئی تھی۔ اور اس کی کھنچی ہوئی آنکھوں کی سطح پر نمی پھیلی تھی۔

مدثر نے اس کا اعتبار توڑا تھا۔ وہ کسی اور لڑکی کے ساتھ وقت گزار رہا تھا۔ اس نے اپنے ہونے والے بچوں کی خاطر اسے معاف کر دیا تھا لیکن وہ اتنا گھٹیا ہو سکتا ہے؟ اتنا گرا ہوا اسے یقین نہیں آرہا تھا لیکن یقین نہ کرنے کی کوئی وجہ بھی نہیں تھی۔ اس لڑکی کو بھلا کیا ضرورت تھی جھوٹ بولنے کی اور مدثر پر اتنا بڑا الزام لگانے کی جبکہ اس الزام کی زد میں اس کی اپنی ذات بھی آرہی تھی۔

اسے لگا تھا جیسے اس کی زندگی ختم ہو رہی ہو۔ کتنا بڑا دھوکا کھایا تھا اس نے مدثر کی محبت پر اعتبار کر کے...... اسے اپنی ناقدری پر رونا آیا اور اس کی نم آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے تھے اور پھر پتا نہیں کتنی ہی دیر تک وہ روتی رہی تھی گھر پر کوئی نہیں تھا۔ ملازمہ نے ایک دو بار دستک دی تھی لیکن اس نے ڈانٹ کر بھگا دیا تھا۔ بڑی دیر بعد جب وہ روتے، روتے تھک گئی تو اٹھی تھی۔

''میں اپنے بچوں کو کسی بدکردار شخص کے سائے تلے نہیں پلنے دوں گی...... بھلے ان کی زندگی میں کوئی خلا ہو یا کوئی کمی......'' اس کے دل میں اب مدثر کے لیے کوئی نرم گوشہ نہیں تھا...... دل کی زمین پر نفرت کے کیکٹس تھے جن کے کانٹے خود اس کے اپنے دل کو بھی زخمی کرتے تھے لیکن نفرتوں کے پودوں پر اب محبتوں کے پھول کبھی نہیں کھلنے تھے اس نے منہ ہاتھ دھو کر مدثر کا نمبر ملایا تھا۔

''ہیلو......'' مدثر کی آواز سن کر ایک لمحے کے لیے اسے اپنا دل ڈوبتا ہوا محسوس ہوا تھا۔ اسے لگا تھا وہ اس فریبی شخص سے کبھی بات نہیں کر سکے گی اس کی ہیلو اس کی سماعت پر جیسے کسی ہتھوڑے کی طرح پڑی تھی۔

''ہیلو......'' مدثر نے پھر کہا تھا۔

''یہ تم ہو نا، میں تمہاری خوشبو سے بھی پہچان لیتا ہوں۔''

''اور کس، کس کو اس کی خوشبو سے پہچانتے ہو؟'' وہ بولی تو اس کی آواز بے حد سرد اور ٹھنڈی تھی۔ لیکن اس نے شاید محسوس نہیں کیا تھا کیونکہ اس کی آواز میں ایک چہکار اور ایک سرخوشی سی تھی۔

''بابا جان، ایما کا فون ہے۔'' اس نے بابا جان کو بتایا تھا وہ شاید قریب ہی بیٹھے تھے اور پھر اسی چہکتی آواز

میں اس نے اسے مخاطب کیا تھا۔

''تھینک یو ڈیر...... تم نے بچوں کی خاطر ہی سہی گھر آنے کا فیصلہ تو کیا...... مجھے یقین ہے میں بہت جلد تمہاری غلط فہمی دور کردوں گا...... کہیں نہ کہیں کبھی نہ کبھی تو وہ لڑکی مجھے دوبارہ نظر آئے گی۔''

''میری غلط فہمی دور ہو چکی مدثر حسن صاحب کیونکہ وہ لڑکی خود چل کر میرے پاس آگئی ہے۔'' اس کی آواز اب بھی اتنی ہی سرد اور بے مہر تھی۔

''رئیلی جانم......'' وہ چہکا تھا۔ ''مجھے یقین تھا۔''

''بس مسٹر مدثر حسن...... بس......'' اس کا پیمانۂ صبر لبریز ہو چکا تھا۔ ''وہ لڑکی میرے پاس آئی تھی لیکن تمہاری بے گناہی ثابت کرنے کے لیے نہیں بلکہ یہ بتانے کے لیے کہ تم اس کے بچے کے باپ بننے والے ہو، تم اتنے گھٹیا ہو میں تصور نہیں کرسکتی تھی۔ تم اتنا گرسکتے ہو میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔'' اس کی آواز میں پہلے سے زیادہ... سرد مہری تھی۔

سیڑھیوں سے اترتے بابر نے حیرت سے اسے دیکھا اور قریب آکر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

''تم ابھی تک یہاں بیٹھی ہو تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے ناں......''

''ہاں......'' اس نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ''میں ٹھیک ہوں۔'' اس کے لہجے میں ایسی تھکن تھی جیسے کہیں دور کا سفر طے کر کے آئی ہو۔ ہاں اس کے ماضی کا سفر تھکا دینے والا ہی تو تھا۔

''پھر کوئی فون آیا تھا کیا؟'' اس نے کھوجتی نظروں سے اسے دیکھا۔

''نہیں......'' ایمل نے نفی میں سر ہلایا۔ وہ سمجھ نہیں پایا تھا کہ عنبرین نے یہاں کیوں فون کیا تھا اور وہ کیوں ایمل سے بات کرنا چاہتی تھی...... اس نے اپنے بیڈروم میں جا کر کتنی ہی بار عنبرین کا نمبر ملایا تھا لیکن عنبرین فون ریسیو نہیں کر رہی تھی۔ کیا اس کے دل میں کوئی چور تھا...... اس نے اس کی آواز سن کر فون بند کر دیا تھا...... وہ الجھ گیا تھا سو اس نے اسی وقت لاہور جانے کا فیصلہ کیا تھا...... اس میں فوری فیصلے کرنے کی صلاحیت تھی اور زندگی میں جب، جب اس نے فوری فیصلے کیے تھے وہ پچھتایا نہیں تھا...... عنبرین اگر اب ایمل کو سب کچھ بتا بھی دیتی تو کچھ خاص فرق پڑنے والا نہیں تھا اور یہ بات عنبرین بھی جانتی تھی پھر یہاں فون کرنے کا مقصد......

''میں ایک دو روز کے لیے لاہور جا رہا ہوں۔'' اس نے ایمل کے چہرے سے نظریں ہٹالیں۔

ایمل نے پہلی بار اس کے ہاتھ میں موجود بریف کیس کی طرف دیکھا۔

''میں بھی آپ کے ساتھ چلتی...... آپ مجھے بتا دیتے تو...... ممی کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی...... ان سے مل لیتی، انہیں دیکھ لیتی تو......'' اس کے لہجے میں ہلکا سا شکوہ محسوس کر کے بابر مسکرایا۔

''بس اچانک ابھی چند منٹ پہلے ہی آفس سے فون آیا ہے۔ بہت ضروری کام ہے، پہلے سے پروگرام نہیں تھا...... ایمرجنسی میں جانا پڑ رہا ہے۔ تھینک گاڈ کہ ایک سیٹ مل گئی ہے۔ تمہیں پتا تو ہے ان دنوں بزنس کے معاملات کچھ گڑبڑ سے ہیں۔ جن کی وجہ سے اپ سیٹ ہوں...... ایک بندے سے ملنا ہے، اچھا بزنس ملنے کی امید ہے۔''

''آپ ممی سے ملیں گے ناں......'' ایمل نے پوچھا۔

''کیوں نہیں، کام سے فارغ ہو کر سیدھا ممی کی طرف ہی جاؤں گا۔ اگر ممی کی طبیعت ٹھیک ہوئی تو انہیں اپنے ساتھ ہی لے آؤں گا۔ انہوں نے وعدہ کیا تھا ناں کہ عدت کے بعد وہ کراچی آئیں گی لیکن پھر نہیں آئیں......''

''ہاں یہ اچھا ہے۔'' ایمل خوش ہو گئی۔ ''آپ ممی کو ساتھ ہی لے آئیے گا...... میں بھی ممی سے کہوں گی کہ وہ آپ کے ساتھ ہی آجائیں۔''

''ہاں ٹھیک ہے، تم فون کر دینا لیکن اگر مجھے لگا کہ ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے تو میں تمہیں فون کر دوں گا تم افنان کے ساتھ آ جانا بلکہ رتی کو بھی لے آنا..... تاہم میری پہلی کوشش تو یہی ہوگی کہ انہیں ساتھ ہی لے آؤں۔''

ایمل دل ہی دل میں اس کی ممنون ہوئی تھی۔

''ڈونٹ وری ایما..... ممی انشاء اللہ ٹھیک ہوں گی۔'' اس نے ایمل کا بازو تھپتھپایا اور لاؤنج سے باہر نکل گیا۔

☆☆☆

عنبرین صوفے پر خاموش بیٹھی سامنے ٹیبل پر پڑے فون کو خوف زدہ نظروں سے دیکھ رہی تھی جو مسلسل بج رہا تھا لیکن اس نے فون اٹھانے کے لیے ہاتھ آگے نہیں بڑھایا تھا۔ کچھ دیر بعد بیل آنا بند ہوگئی تو اس نے ایک گہری سانس لی۔ فون کی بیل وقفے، وقفے سے ہو رہی تھی اور فون اٹھائے بغیر بھی وہ جانتی تھی کہ یہ بابر کا فون ہے اور وہ یہ بھی جانتی تھی کہ بابر اسے فون کیوں کر رہا ہے اور وہ اس سے کیا پوچھنے والا ہے۔ اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ بابر کو کیسے مطمئن کرے گی اور اس سے کیا کہے گی کہ اس نے ایمل کو فون کیوں کیا..... سچ تو یہ تھا کہ وہ خود بھی نہیں جانتی تھی کہ اس نے ایمل کو فون کیوں کیا تھا وہ اپنے contacts چیک کر رہی تھی کہ اس کی نظر اس نمبر پر پڑی تھی جو اس نے R,home کے نام سے سیو کر رکھا تھا۔ یہ نمبر اس نے رتی کے فون سے لیا تھا اس روز جب ارتقاع اس کے گھر آئی تھی اور بابر لاؤنج سے باہر نکل کر کاریڈور میں کھڑا اپنے فون پر کسی سے بات کر رہا تھا کہ رتی اپنا فون ٹیبل پر رکھ کر واش روم گئی تھی تو اس نے یونہی بلا مقصد اس کا فون اٹھایا تھا اسے یہ اسمارٹ فون اچھا لگا تھا..... contacts میں sweet home کے نام سے موجود نمبر کو اس نے فوراً ہی اپنے فون میں محفوظ کر لیا تھا اور پھر بابر کے قدموں کی آہٹ پر اس نے فون فوراً ٹیبل پر رکھ دیا تھا جہاں ارتقاع چھوڑ کر گئی تھی۔ شاید اس کے ذہن میں کہیں ایمل کا نمبر جاننے کی خواہش تھی، یہ خواہش کیوں تھی وہ نہیں جانتی تھی۔ بابر اپنا فون بہت سنبھال کر رکھتا تھا۔ ایک بار اس نے اس کا فون اٹھایا تھا تو بابر نے اسے بہت بری طرح ڈانٹا تھا اور کہا تھا کہ اگر آئندہ اس نے اس کا فون اٹھایا تو وہ اس کے ہاتھ توڑ دے گا۔ یہ الگ بات تھی کہ بابر نے اس کے بعد کبھی اسے فون اٹھانے کا موقع نہیں دیا تھا۔ وہ واش روم بھی جاتا تو فون ساتھ لے جاتا تھا، پتا نہیں بابر کو اس سے کیا خطرہ تھا۔ شاید اسے ڈر تھا کہ وہ اس کے فون سے ایمل کا نمبر لے کر اس سے کوئی بات نہ کر لے، کوئی ایسی بات جو ایمل کو بابر سے متنفر کر دے..... حالانکہ اگر وہ ایسا کرنا چاہتی تو اس کے لیے ایمل کا نمبر حاصل کرنا ناممکن نہیں تھا..... اسے ''حامد ولا'' کا پتا تھا وہ وہاں جا کر اس کی ممی سے ایمل کا نمبر معلوم کر سکتی تھی لیکن اس نے کبھی ایمل سے بات کرنے یا اسے کچھ بتانے کے متعلق نہیں سوچا تھا اور اب بھی اس نے ارتقاع کے فون سے غیر ارادی طور پر یہ نمبر لیا تھا اور جب وہ نمبر ملا رہی تھی تب بھی اس کے ذہن میں ایسا کچھ نہیں تھا کہ اسے ایمل سے کوئی خاص بات کرنی ہے لیکن جب ایمل نے ہیلو کہہ کر جواب دیا تھا کہ وہی مسز بابر ہے تو اس کے ذہن میں ایک کشمکش جاری ہوگئی تھی۔ بہت سارے دنوں سے اس کے دل پر ایک بوجھ سا دھرا تھا۔ جی چاہ رہا تھا کہ وہ دل کو اس بوجھ سے آزاد کر لے، وہ اس عورت سے بات کرنا چاہتی تھی جس کا گھر برباد کرنے میں اس نے ایک اہم کردار ادا کیا تھا..... لیکن بابر کی آواز سنتے ہی خوف زدہ ہو کر اس نے ریسیور رکھ دیا تھا۔ کبھی، کبھی وہ یونہی بابر سے خوف زدہ ہو جاتی تھی اسے لگتا تھا جیسے اگر کبھی اس نے بابر کی مرضی کے خلاف کچھ کیا تو بابر کے لیے یہ مشکل نہیں ہوگا کہ اس کی زندگی ختم کر دے اور اسے زندگی سے بہت پیار تھا اس نے کبھی کچھ ایسا نہیں کیا تھا جو بابر کو ناراض یا خفا کر دے وہ اب بھی بابر کو ناراض نہیں کرنا چاہتی تھی لیکن وہ بابر کو ناراض کر چکی تھی اس نے بابر کی کال اٹینڈ نہیں کی تھی اور مسلسل اگنور کر رہی تھی۔ فوری طور پر اسے سمجھ نہیں آیا تھا کہ بابر سے کیا کہے..... بابر کا کیا ردعمل ہوگا وہ اس کے متعلق اندازہ نہیں کر سکتی تھی۔ اتنے سالوں کے بعد بھی وہ بابر کو پوری

طرح سمجھ نہیں پائی تھی کبھی تو وہ بہت مہربان ہوتا اتنا کہ وہ اس کی ہر بات مان لیتا اور کبھی اتنا سخت کہ معمولی سی بات پر آپے سے باہر ہو جاتا...... وہ بڑی عجیب سی زندگی گزار رہی تھی لیکن یہ زندگی اس نے خود چنی تھی۔ پیسے کے معاملے میں بابر نے کبھی کنجوسی نہیں کی تھی۔ وہ ہر ماہ باقاعدگی سے اسے خرچ کے لیے ضرورت سے زیادہ ہی دے دیتا تھا لیکن خود وہ مہینے میں کبھی ایک بار کبھی دو بار چکر لگاتا تھا۔ شروع شروع میں تو دو، دو، تین، تین مہینے بعد آتا تھا۔ اس کی کسی سے دوستی نہ تھی۔ وہ شاپنگ کے علاوہ بہت کم گھر سے باہر نکلتی تھی۔ اور اب تو بلاوجہ شاپنگ کا شوق بھی ختم ہو چکا تھا۔ میکے سے یوں بھی اس کا تعلق ٹوٹ چکا تھا اور میکے میں تھا ہی کون سوائے اماں کے اور ان کے بعد تو وہ در بھی بند ہو گیا تھا۔

بہت سارا وقت خواب دیکھتے گزر چکا تھا لیکن اب اس کا دل گھبراتا تھا اب اس کا جی چاہتا تھا کہ اس کی بہنیں، بھانجیاں، بھانجے اس کے گھر آیا کریں تاکہ کچھ دیر کے لیے ہی سہی اس فلیٹ کی جان لیوا خاموشی ٹوٹے اور سب سے بڑھ کر اسے اپنی بنی یاد آتی تھی، اپنے خوابوں کے پیچھے بھاگتے، بھاگتے اس نے کیا کچھ گنوا دیا تھا کبھی اپنا احتساب کرنے بیٹھتی تو اسے لگتا جیسے سود و زیاں کے اس سفر میں اس نے صرف کھویا ہی کھویا ہے...... جب بھی وہ سوچتی صرف بابر سے شادی کرنے کے لیے اس نے کیا کچھ نہیں کیا تھا۔ اس کے دل پر بوجھ سا آ گرتا تھا۔ بھاری بوجھ جس سے دل پھٹنے لگتا تھا وہ بابر سے شادی کرنا چاہتی تھی کیونکہ اس کے پاس وہ سب کچھ تھا جس کی اسے چاہ تھی لیکن بابر بھی اس سے شادی کرنا چاہتا ہے یا نہیں اس کا وہ اندازہ نہیں کر پا رہی تھی۔ وہ اس سے شادی نہیں کرنا چاہتا اس کا یقین اسے بہت بعد میں ہوا تھا اور تب وہ شاید بابر سے محبت بھی کرنے لگی تھی یا شاید اسے لگا تھا کہ وہ بابر سے محبت کرنے لگی ہے۔ یا اس محبت کے پیچھے یہ احساس بھی چھپا تھا کہ اگر بابر نے اس سے شادی نہ کی تو شاید اسے کوئی اور چانس نہ ملے...... ایک اچھی زندگی گزارنے کا اس کا خواب پورا نہ ہو کیونکہ اماں نے بھی وارننگ دے دی تھی کہ اگر وہ لڑکا اس کا رشتہ لے کر نہیں آتا تو وہ شبر دکاندار کو ہاں کر دیں گی...... سو اسے ہر قیمت پر بابر سے شادی کرنا تھی لیکن بابر...... وہ اسے باہر لے کر جاتا تھا...... کتنی ہی بار انہوں نے اکٹھا لنچ کیا تھا وہ وقتاً فوقتاً اسے تحائف دیتا رہتا تھا اور تحائف دینے کے لیے اسے کسی موقع کی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔

''بازار گیا تو یہ واچ اچھی لگی، تمہارے لیے لے لی۔''

''آپا کے لیے ہینڈ بیگ لینے گیا تو تمہارے لیے بھی لے لیا۔'' وہ بابر کے تحائف پا کر بہت خوش ہوتی تھی اور اماں کو بھی ضرور دکھاتی تھی۔ اماں نے کبھی تبصرہ نہیں کیا تھا لیکن ان کی نظریں اسے ہمیشہ شرمندہ کر دیتی تھیں۔

''صرف تحفوں سے زندگی کا سفر طے نہیں ہوتا...... یہ امیر زادے تم ایسی لڑکیوں سے شادی نہیں کرتے۔'' بس ایک بار انہوں نے کہا تھا۔

''بابر ایسا نہیں ہے اماں......'' اس نے اس کا دفاع کیا تھا۔

''تو اس سے کہو کہ اپنے اماں، ابا کو بھیجے رشتے کے لیے۔''

لیکن وہ یہ بات بابر سے کیسے کہتی، کہہ ہی نہیں سکتی تھی۔ وہ ہر طرح اس کا خیال رکھتا تھا...... اسے اپنی بیسٹ فرینڈ کہتا تھا۔ لیکن اس نے کبھی یہ نہیں کہا تھا کہ وہ اس سے شادی کرنا چاہتا ہے یا یہ کہ وہ اس سے محبت کرتا ہے......

اس روز وہ بڑے دل سے تیار ہوئی تھی اور بابر نے بھی بے اختیار سراہا تھا۔

''آج بہت پیاری لگ رہی ہو۔'' اس کی ٹیبل کے پاس سے گزرتے ہوئے وہ ذرا کا رکا تھا۔

''صرف آج...... کیا پہلے کبھی پیاری نہیں لگی؟'' اس نے بے حد ادا سے اسے دیکھا تھا۔

''ہمیشہ ہی لگتی ہو سوئٹی لیکن، آج تو قیامت ڈھا رہی ہو۔'' دونوں ہاتھ اس کی ٹیبل پر رکھتے ہوئے تھوڑا سا جھکتے

ہوئے وہ مسکرایا تھا اور وہ پورے دل سے مسکرائی تھی۔
''سنو آج لنچ کے لیے باہر چلتے ہیں۔'' ہمیشہ بابر ہی اسے دعوت دیتا تھا لیکن آج اس نے اسے دعوت دی تھی۔
''غلام حاضر ہے لیکن جناب یہ لنچ کس خوشی میں۔''
''بس یونہی...... آج آپ سے باتیں کرنے کو بہت دل چاہ رہا ہے۔''
وہ گھر سے فیصلہ کرکے آئی تھی کہ اگر اظہار میں بابر پہل نہیں کر رہا تو وہ خود پہل کر دے گی۔
''گڈ...... یوں بھی بہت دن ہو گئے تھے ہمیں اکٹھا لنچ کیے ہوئے...... اگر تم نہ کہتیں تو میں تمہیں لنچ کی آفر کرنے ہی والا تھا۔''
بابر اپنے روم کی طرف چلا گیا تھا اور اس روز کھانے کے وقفے میں اپنے مخصوص ریسٹورنٹ میں جو اُن کے آفس سے نزدیک ہی تھا کھانا کھاتے ہوئے اس نے اعتراف کیا تھا۔
''بابر میں آپ سے محبت کرنے لگی ہوں۔''
''جانتا ہوں۔'' وہ مسکرایا تھا۔ ''آئی...... لو یو ٹو......''
اور یہ ایک جملہ سننے کے لیے اس نے دو سال انتظار کیا تھا۔ اسے لگا تھا جیسے اس کے اردگرد ہر چیز رقصاں ہو' وہ جو دل میں سوچ کر آئی تھی کہ آج وہ بابر سے شادی کے متعلق بھی بات کرے گی اس کے اعترافِ محبت کے بعد سب کچھ بھول گئی تھی۔ وہ اس سے محبت کرتا تھا تو ظاہر ہے شادی بھی کر لیتا...... وہ دن اس کی زندگی کا سب سے خوب صورت دن تھا۔ اس روز بابر کے سامنے بیٹھے وہ اس سے چھوٹی چھوٹی باتیں کرتی رہی تھی۔ اپنے خواب، اپنی خواہشیں اور بابر دھیمے دھیمے مسکراتا رہا تھا۔ اس روز پہلی بار بابر نے کچھ وعدے اس کی مٹھی میں تھمائے تھے اور اس نے بھی کچھ عہد و پیمان کیے تھے۔ عمر بھر ساتھ نبھانے کے اور واپس آفس آتے ہوئے بابر نے اسے یاددہانی کروائی تھی کہ وہ اس پر سب سے زیادہ بھروسا کرتا ہے' اپنے دوستوں سے بھی زیادہ اور وہ واحد ہستی ہے جس کے ساتھ وہ اپنے سیکرٹ شیئر کرتا ہے۔
ایک بار پہلے بھی وہ یہی بات کر چکا تھا اور اس نے اسے یقین دلایا تھا کہ وہ کبھی اس کا بھروسا نہیں توڑے گی اور یہ اس سے صرف تین دن بعد کی بات تھی جب بابر نے اسے مدثر سے ملنے اور وہ سارا ڈراما کرنے کو کہا تھا۔
''یہ سب کیا ہے بابر......؟'' وہ حیران ہوئی تھی۔
''صرف ایک چھوٹی سی شرارت یا مذاق......'' اس نے اپنے سامنے اسے مدثر حسن کو فون کروایا تھا۔
''یہ مذاق کچھ عجیب سا نہیں......؟''
''یار یہ مذاق ہے بس شرارت...... عجیب کیا ہے اس میں، میں دیکھنا چاہتا ہوں اس کا باپ کتنا ایماندار ہے اور وہ خود کتنے پانی میں ہے۔'' لیکن چند دنوں بعد ہی اس نے جان لیا تھا کہ یہ نہ تو شرارت تھی نہ مذاق یہ تو کچھ اور ہی تھا کوئی بڑی بات، کوئی دشمنی، کوئی انتقام، کوئی سازش...... اور نہ چاہتے ہوئے بھی اسے اس سازش کا حصہ بننا پڑا تھا کیونکہ بابر ایسا چاہتا تھا اور بابر نوید وہ شخص تھا جو اسے وہ زندگی دینے والا تھا جس کے خواب وہ بچپن سے دیکھتی چلی آئی تھی اس روز وہ آفس آیا تو کچھ اپ سیٹ لگ رہا تھا۔
''سنو کچھ دیر بعد چھٹی لے کر باہر آجاؤ۔'' اس کی ٹیبل کے پاس سے گزرتے ہوئے اس نے کہا تھا۔ خود وہ فوراً ہی غالباً چھٹی لے کر چلا گیا تھا۔ اس کا دل خوشگوار انداز میں دھڑکا تھا۔
''کیا وہ اسے پرپوز کرنے والا ہے؟'' کل ہی تو اس نے بابر سے کہا تھا کہ ''اماں شادی جلد کرنا چاہتی ہیں۔ دو تین بہت اچھے رشتے ہیں، اگر تم اپنے والدین کو بھیج دو تو...... اماں مزید انتظار نہیں کریں گی۔''

''ہاں..... ہاں تم پریشان مت ہو، بہت جلد میں انہیں بھیجوں گا بس ابھی تم انہیں کسی طرح ٹال دو۔''
''لیکن بابر میں اماں کو بہت دیر تک روک نہیں پاؤں گی۔ انہیں ایک رشتہ بہت پسند ہے۔'' وہ چاہتی تھی کہ یہ معاملہ جلد از جلد نبٹ جائے ورنہ دو تین تو کیا ایک رشتہ بھی نہیں تھا۔ شبر دکاندار کو جواب دینے کے بعد اماں نے خاموشی اختیار کرلی تھی.....

''او کے یار..... آج بات کرتا ہوں گھر والوں سے۔'' اس نے وعدہ کیا تھا اور اب وہ اسے باہر بلا رہا تھا تو..... پتا نہیں کیا کہنے والا تھا..... وہ کچھ ڈسٹرب لگ رہا تھا کہیں اس کے والدین نے منع تو نہیں کردیا لرزتے ہاتھوں سے اس نے درخواست لکھی تھی اور کچھ ہی دیر بعد وہ باس کے سامنے کھڑی تھی۔

''سر وہ میری اماں کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے انہیں لے کر اسپتال جانا ہے اگر اسپتال سے جلدی فارغ ہوگئی تو واپس آجاؤں گی۔''

''او کے.....'' یہ ادھیڑ عمر باس اچھا آدمی تھا اور سب ورکر کے ساتھ اس کا رویہ بہت اچھا تھا۔ بابر پارکنگ میں ہی گاڑی کے ساتھ ٹیک لگائے کھڑا تھا..... اسے دیکھتے ہی اس نے گاڑی کا دروازہ کھول دیا تھا، وہ خاموشی سے بیٹھ گئی تھی۔ آج پہلی بار وہ اس کے ساتھ نہیں جا رہی تھی بلکہ کئی بار وہ نزدیکی ریسٹورنٹ میں جانے کے بجائے کہیں اور چلے جاتے تھے لیکن آج اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ پتا نہیں بابر اس سے کیا کہنے والا تھا۔ لیکن جب اپنے پسندیدہ کیفے میں چائے پیتے ہوئے بابر نے اپنا مدعا بیان کیا تو وہ لمحے بھر کو حیران سی اسے دیکھتی رہی تھی۔

''لیکن بابر یہ سب تو جھوٹ ہے ناں.....''

''ہاں تو پہلے بھی تو تم نے جھوٹ بولا تھا ناں.....''

''لیکن وہ ایک بے ضرر سا جھوٹ تھا بابر اور یہ..... یہ تو کسی شخص پر الزام ہے..... ایسا الزام جس کے نتیجے میں اس شخص کی گھریلو زندگی متاثر ہوسکتی ہے۔''

''لیکن جب میں ان دونوں کو بتا دوں گا کہ یہ سب ڈراما تھا تو سب کچھ ٹھیک ہوجائے گا۔'' بابر مسکرایا تھا۔

''لیکن یہ بہت سنگین مذاق ہے بابر اور میں.....''

''او کے ایز یو وش.....'' بابر کے لہجے کی ناراضی نے اور اس کے چہرے کے تاثرات نے اسے پریشان کردیا تھا۔ بابر کی ناراضی کا مطلب تھا.....

''بابر..... وہ..... میں.....'' اس نے تھوک نگلتے ہوئے اس کے بازو پر ہاتھ رکھا تھا جسے اس نے سختی سے پیچھے ہٹا دیا تھا۔

''لیو اٹ عنبرین..... ناؤ کلوز دس ٹاپک۔''

''بابر پلیز.....''

''میں تم پر سب سے زیادہ بھروسا کرتا تھا اور سمجھتا تھا کہ اگر میں تمہیں کنویں میں بھی چھلانگ لگانے کو کہوں گا تو تم بلاجھجک چھلانگ لگا دو گی بغیر کوئی سوال کیے..... لیکن تم نے اتنی سی بات پر آرگیو کیا، میں سمجھتا تھا کہ تم مجھ سے بہت محبت کرتی ہو..... اور محبت میں تو سوال جواب نہیں ہوتے..... کیوں.....؟ کہاں نہیں ہوتا عشق و محبت تو بے دھڑک کود جانے کا نام ہے۔'' اور وہ ہار گئی تھی۔

''او کے، بتاؤ کیا کرنا ہے۔'' اور لڑکیاں جس سے محبت کرتی ہیں یونہی اسی طرح اس کے سامنے ہتھیار ڈال دیتی ہیں اور اس سے اس نے سوچا تھا کہ وہ واقعی بابر سے محبت کرنے لگی ہے۔ ورنہ اس کے ڈرامے کا حصہ نہ بنتی اور

پھر اسکرپٹ تو بابر کا تھا ایکٹ اس نے کیا تھا۔
''حیران کُن......'' بابر نے جب اس روز اسے حامد ولا کے نزدیک اسٹاپ سے پک کیا تھا تو کہا تھا۔
''یار تم تو غضب کی اداکارہ ہو۔''
بابر کو خود اس نے اپنی کارکردگی بتائی تھی لیکن سب کچھ بتانے کے بعد اس کا دل بجھ گیا تھا۔ پھر بابر کی تعریف بھی اسے خوش نہیں کرسکی تھی۔ اس کے دل پر ایک ان دیکھا بوجھ سا آپڑا تھا۔ ایمل کے سوجے ہوئے پاؤں، اس کی جسمانی کیفیت بتا رہی تھی کہ وہ ماں بننے والی ہے۔ وہ سب سن کر ساکت رہ گئی تھی اس کی خاموشی بے حد سنگین تھی۔ اگر اس لڑکی کو کچھ ہو گیا تو...... اس حالت میں یہ صدمہ...... کچھ بھی ہوسکتا تھا۔ اسے یقین ہو گیا تھا کہ یہ محض شرارت نہیں تھی، یہ تو بابر نے کوئی دشمنی نبھائی تھی اور کوئی انتقام لیا تھا...... وہ لڑکی بات کیے بغیر لاؤنج سے چلی گئی تھی اور وہ مردہ قدموں سے لاؤنج سے نکلی تھی اور ٹرالی دھکیلتی ملازمہ نے اسے بے حد حیرت سے دیکھا تھا۔
''آپ...... چائے......''
لیکن وہ رکے بغیر تیزی سے اندرونی گیٹ کھولتی تیز، تیز قدموں سے چلتی ہوئی گیٹ سے نکل گئی تھی۔ شاید اس نے غلط کیا تھا بلکہ یقیناً غلط کیا تھا لیکن وہ بابر کو ناراض بھی نہیں کرسکتی تھی۔ سو غلط تھا یا صحیح اس نے اپنے دل کو مطمئن کرلیا تھا یہ سوچ کر کہ ہوسکتا ہے بابر نے صحیح کہا ہو، ہوسکتا ہے یہ محض مذاق ہو...... اور اگر کچھ غلط فہمی ہے تو اس میں بھلا میرا کیا قصور...... میں نے تو سب کچھ بابر کے کہنے پر کیا ہے...... اور پھر بہت سارے دن گزر گئے بابر بہت کم آفس آیا تھا اور اس کی دو تین بار بابر سے سرسری سی ملاقات ہوئی تھی...... اور بابر نے بتایا تھا کہ اس کی کوئی کزن اسپتال میں ایڈمیٹ ہے اس لیے وہ چھٹیاں کررہا تھا۔ پھر وہ آفس بھی آنے لگا لیکن عنبرین سے کم ہی بات ہوتی تھی اس نے گلہ کیا تو تسلی دی۔
''کچھ فیملی پرابلمز ہیں عنبرین...... سو ان دنوں تمہیں وقت نہیں دے پا رہا لیکن بہت جلد سب ٹھیک ہوجائے گا۔'' مزید ایک ماہ گزر گیا وہ منتظر ہی رہی کہ بابر اپنے والدین کو بھیجنے کی بات کرے گا پھر اس نے سنا اس نے ون منتھ نوٹس دے دیا ہے اور وہ جاب چھوڑنے والا ہے۔
''کیا واقعی تم جاب چھوڑ رہے ہو بابر......'' اس روز وہ اس کے کیبن میں چلی گئی تھی۔
''ہاں......'' بابر نے ایک سرسری نظر اس پر ڈالی تھی۔ ''تم جانتی ہو میں نے جاب صرف تجربہ حاصل کرنے کے لیے کی تھی اور اب میں اپنا بزنس سیٹ کروں گا۔''
وہ اندر ہی اندر پریشان ہوئی تھی...... اگر بابر چلا گیا تو کیا پھر کبھی اس کی بابر سے ملاقات ہوسکے گی...... اور کیا بابر اب اس سے شادی نہیں کرے گا۔ اور بابر اس کے چہرے کی بدلتی کیفیت دیکھ کر مسکرایا تھا۔
''پریشان کیوں ہوتی ہو...... میں جاب چھوڑ رہا ہوں...... دنیا تو نہیں چھوڑ رہا...... انشاء اللہ ملاقات ہوتی رہے گی...... ہم ہمیشہ اچھے دوست رہیں گے۔''
''دوست......؟'' اس نے متوحش نظروں سے اسے دیکھا تھا۔
''اور شادی......''
''ہاں شادی...... ظاہر ہے وہ بھی کرنی ہے لیکن اس موضوع پر ہم پھر بات کریں گے۔ اس وقت میں بزی ہوں...... جو رپورٹ میں تیار کررہا تھا باس نے کہا ہے کہ جانے سے پہلے وہ مکمل کر کے دوں...... ایک دو روز تک باہر کہیں کھانا کھاتے ہیں۔ سکون سے بات کرلیں گے۔''
''ٹھیک ہے لیکن تم نے اپنے والدین سے بات کی بابر...... تمہیں پتا ہے ناں اماں بہت جلد میرے فرض سے

سبکدوش ہونا چاہتی ہے۔'' جاتے، جاتے اس نے پوچھا تھا۔
''ہاں کی ہے بات...... یار پریشان مت ہو۔'' وہ مسکرایا تھا۔
اور اس کے بے چین اور مضطرب دل کو قرار سا آ گیا تھا اور اس نے اماں کو بھی بتا دیا تھا کہ بابر نے اپنے والدین سے بات کرلی ہے اور وہ جلد آئیں گے۔
لیکن یہ ایک دو روز پورے پچیس دن پر محیط ہو گئے تھے۔ اس روز آفس میں اس کا آخری دن تھا جب وہ اس کے ساتھ اس کے پسندیدہ ریسٹورنٹ میں آئی تھی۔ بابر کا موڈ بے حد اچھا تھا اور اتنے دنوں بعد بابر کے ساتھ لنچ کرتے ہوئے وہ بھی بے حد خوش تھی لیکن یہ خوشی بس چند لمحوں کی... ہی تھی۔ کھانا آرڈر کرنے کے بعد بابر نے کہا تھا۔
''ایک مسئلہ ہو گیا ہے عنبرین۔''
''کیسا مسئلہ......؟'' وہ متوحش سی ہو کر اسے دیکھنے لگی تھی۔
''دراصل جب میں نے اماں سے بات کی تمہارے متعلق تو انہوں نے مجھے مجبور کیا کہ میں اپنی کزن سے شادی کرلوں۔'' بابر نے نظریں جھکا لی تھیں۔
''اور تم مجبور ہو گئے بابر......''
اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئی تھیں اور وہ جو اتنے دنوں سے اماں سے کہہ رہی تھی کہ بابر بہت جلد اپنا رشتہ بھجوانے والا ہے اور بابر وہ شخص ہے جو واقعی اسے ڈیزرو کرتا ہے، اب......
اس کے تصور میں اماں کی تاسف بھری اور اپنی بہنوں کی تمسخر اڑاتی نظریں آ گئیں۔
''ہاں...... میں مجبور ہو گیا عنبرین کیونکہ میری کزن...... نے اپنے شوہر سے طلاق لے لی تھی اور یہ طلاق میری ایک معمولی سی غلطی کی وجہ سے ہوئی سو مجھے ہی اپنی غلطی کی تلافی کرنا ہے۔''
''تمہاری وجہ سے طلاق......؟''
''اوہ...... ہاں...... میرے خیال میں جبکہ حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔''
اسے لگا تھا جیسے روانی میں اپنی کہی جانے والی بات پر وہ پچھتا رہا ہے اور اب بات بدلنے کی کوشش کر رہا ہے۔
لمحے کے ہزارویں حصے میں اس کے اندر کچھ کلک ہوا تھا۔
''ایمل سے...... تم ایمل سے شادی کر رہے ہو بابر......؟''
''نہیں...... ہاں......'' وہ گھبرا سا گیا تھا۔
''وہ دراصل اس نے مدثر سے طلاق لے لی ہے، مجھے اندازہ نہیں تھا کہ وہ اس طرح ری ایکٹ کرے گی۔ میں نے تو بس ایک چھوٹا سا مذاق کیا تھا...... تو...... اس کی عدت کے بعد......''
''نہیں...... وہ مذاق نہیں تھا بابر......'' وہ کھڑی ہو گئی تھی۔ ''تم نے باقاعدہ پلاننگ سے اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے مجھے استعمال کیا تھا...... تم ایمل سے شادی کرنا چاہتے تھے...... اور کسی وجہ سے تمہاری شادی اس سے نہیں ہو سکی اور تم نے ایک شخص پر جھوٹا الزام لگا کر سازش سے......''
''بس عنبرین...... بس کرو اندازے لگانا......'' اس نے ہاتھ اٹھا کر اسے روکا تھا۔
''میں نے واقعی کسی بری نیت سے ایسا نہیں کیا تھا، وہ تو ایمل کہتی تھی کہ اسے مدثر پر بہت بھروسا ہے اور یہ کہ کچھ بھی ہو جائے اس کا بھروسا نہیں ٹوٹ سکتا...... تو میں اسے......'' وہ سوچ سوچ کر بول رہا تھا اور عنبرین گہری نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ جانتی تھی وہ جو کہہ رہا ہے وہ سچ نہیں ہے۔ سچ کیا تھا وہ اسے کھوجنے کی ضرورت نہیں تھی۔ سب کچھ روز روشن کی طرح عیاں تھا پھر بھی شاید اپنے دل کی تسلی کے لیے اس نے بابر کی بات کاٹی تھی۔

''تو کیا تم نے ایمل اور مدثر کو سب سچ بتا کر اُن سے معافی مانگ لی اور انہوں نے تمہیں معاف بھی کر دیا۔''
''ہاں......''اس نے فوراً ہی اثبات میں سر ہلایا تھا۔
''اور انہوں نے تمہیں معاف کر دیا کتنا بڑا ظرف ہے ان کا اور نہ صرف معاف کر دیا بلکہ ایمل تم سے شادی کرنے کے لیے بھی تیار ہوگئی۔ پھر تو مجھے بھی ایمل سے معافی مانگ لینی چاہیے اور مدثر سے بھی...... آخر میں بھی تو اس ڈرامے کا ایک کردار ہوں۔''
''نہیں، نہیں اس کی ضرورت نہیں۔''بابر نے بے ساختہ کہا تھا۔
''کیوں...... کیا وہ مجھے معاف نہیں کرے گی؟''اب وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔ ''اگر وہ تمہیں معاف کر کے تم سے شادی کرنے کے لیے تیار ہو سکتی ہے تو مجھے کیوں معاف نہیں کرے گی جبکہ میں تو اس ڈرامے کا صرف ایک کردار تھی رائٹر تو تم تھے ناں...... میں نے تو جو کچھ کیا تمہارے کہنے پر کیا...... جب میں اسے سب کچھ بتاؤں گی تو وہ ضرور مجھے بھی معاف کر دے گی...... میں اسے بتا دوں گی کہ چونکہ میں تم سے محبت کرتی تھی اس لیے تمہاری کسی بات سے انکار نہیں کر سکی اور ہر محبت کرنے والے کی طرح مجھے تمہاری ہر بات سچ لگتی تھی کہ تم صرف مذاق......''
''میں کہہ رہا ہوں ناں...... اس کی ضرورت نہیں ہے، تم ایمل کے گھر نہیں جاؤ گی۔''بابر نے سختی سے اس کی بات کاٹی تھی۔ لیکن وہ اس کے لہجے کی سختی سے متاثر ہوئے بغیر بولی تھی۔
''کیوں نہیں جاؤں گی؟ تم چاہتے ہو کہ ساری زندگی اس بوجھ کے ساتھ جیوں کہ میں نے وہ کام کیا جو شیطان کا شیوہ ہے، میاں، بیوی کے درمیان جدائی ڈالنے کا کام...... میں نے ایک ہنستے بستے جوڑے کا گھر برباد کیا...... میں ضرور جاؤں گی بابر بلکہ ابھی جاؤں گی اور ایمل کو سب لفظ، لفظ بتا کر معافی مانگوں گی...... میں اپنے ضمیر پر یہ بوجھ لے کر نہیں جی سکتی۔''وہ تیزی سے ریسٹورنٹ کے دروازے کی طرف بڑھی تھی اور بابر نے جھلا کر ویٹر کو آواز دے کر بل لانے کو کہا تھا اور پھر پلیٹ میں بل کی رقم رکھتا تیزی سے اس کے پیچھے لپکا تھا۔ وہ اپنا آخری پتا کھیل کر تیزی سے باہر جا رہی تھی...... اس وقت حقیقتاً وہ دُہرے عذاب میں تھی۔ بابر نے اس سے شادی نہیں کرنا تھی اس نے اسے استعمال کیا تھا اور وہ اپنی خواہشوں کی طلب میں استعمال ہوگئی تھی اور اس نے ایک گھر اجاڑ دیا تھا صرف بابر کے ساتھ اپنا گھر بنانے کی چاہ میں اور اس کا گھر پھر بھی نہیں بن سکا تھا۔
آنسو اس کے حلق میں گر رہے تھے۔ اس نے اپنی چال چل لی تھی...... نہیں جانتی تھی کہ نتیجہ کیا نکلے گا لیکن اس نے فیصلہ کر لیا تھا وہ بابر کو بھی اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہونے دے گی۔
''سنو تو عنبرین پلیز رکو تو......''بابر نے قریب آتے ہوئے کہا تھا۔
وہ ذرا کی ذرا رکی تھی۔
''کیا سنوں......؟''اور پھر تیز، تیز چلنے لگی تھی۔

"I love you Ambreen I am really love you"

اب وہ اس کے ساتھ، ساتھ چل رہا تھا۔
''میں نے بھی تم سے بہت محبت کی ہے، بہت چاہتی ہوں میں تمہیں، میں تمہارے ساتھ زندگی گزارنے کے خواب دیکھنے لگی تھی۔ لیکن خیر اب اس ذکر کا کیا فائدہ......''اس نے لمحے بھر کے توقف کے بعد پھر کہا تھا۔
''ایمل اور مدثر مجھے معاف کر دیں گے تو کم از کم دل پر دہرا یہ بوجھ تو کم ہو جائے گا۔ تم ایمل کے ساتھ خوش رہو بابر میں......''

''میں تمہارے بغیر کیسے خوش رہ سکتا ہوں۔'' بابر نے اس کی بات کاٹی تھی۔

''اگر تم مجھ سے محبت کرتی ہو تو میں بھی تم سے زیادہ تم سے محبت کرتا ہوں بغیر کسی غرض اور لالچ کے...... میں بھی تمہاری ہی رفاقت میں زندگی گزارنا چاہتا ہوں لیکن تم نے میری پوری بات سنی ہی نہیں اور اٹھ کر چل دیں۔ میں کہہ رہا تھا کہ میں ایمل کے ساتھ شادی کرنے پر مجبور ہو گیا ہوں۔ کیونکہ وہ میری ماں کی سگی بھانجی ہے اور پھر میری ہی غلطی سے اس کا گھر ٹوٹا...... لیکن میں تم سے بھی شادی کروں گا۔ عنبرین بس تمہارے ساتھ شادی کے لیے میرے والدین رضامند نہیں، اس شادی میں ان کی مرضی شامل نہیں ہوگی...... میں اکیلا آؤں گا تمہاری اماں سے تمہارا ہاتھ مانگنے...... تم جانتی ہو میں دو بیویوں کو افورڈ کر سکتا ہوں...... مجھے تم سے ہی پوچھنا تھا کہ اس صورتِ حال میں کیا تم مجھے قبول کر لوگی...... تمہاری اماں کوئی اعتراض تو نہیں کریں گی؟''

''میں اماں کو منا لوں گی۔''

''تو ٹھیک ہے، میں کل ہی تمہاری اماں سے ملوں گا۔''

''کل کا مطلب کل ہی ہے نا، میں زیادہ......'' اس نے بات ادھوری چھوڑ دی تھی اور اسے بات مکمل کرنے کی ضرورت نہیں تھی وہ جو بات بابر کو سمجھانا چاہتی تھی وہ جانتی تھی کہ بابر نے وہ بات سمجھ لی ہے...... اماں کو راضی کرنا مشکل نہ تھا...... انہوں نے بہت پہلے ہی اس کے معاملات سے ہاتھ اٹھا لیا تھا...... تاہم اس نے اماں کو اس بات پر راضی کر لیا تھا کہ بابر جب اس کا رشتہ مانگنے آئے تو وہ اسے دو تین دن کے اندر، اندر نکاح کرنے پر مجبور کریں...... کیونکہ ایمل سے شادی کرنے کے بعد ممکن تھا کہ بابر اس سے شادی نہ کرتا...... ابھی ایمل کی عدت پوری ہونے میں کافی دن تھے اور وہ بابر کو مجبور کر سکتی تھی...... وہ بڑی ہوشیاری سے اپنے پتے کھیل رہی تھی اور اسے پچاس فی صد تو کامیابی کی امید تھی ہی لیکن بابر نے اماں کی بات مان لی کہ وہ اسی ہفتے اس سے نکاح کر لے گا تو لمحے بھر کے لیے اس کا جی چاہا تھا کہ وہ بابر کو منع کر دے اور ایمل کو جا کر سب کچھ سچ، سچ بتا دے کہ وہ جس سے شادی کرنے والی ہے وہ کس قدر سازشی اور دھوکے باز ہے لیکن پھر ہر جذبے پر خود غرضی کا جذبہ غالب آ گیا تھا...... ایک شاندار زندگی اس تنگ گلیوں والے محلے سے دور کسی پوش علاقے میں...... بابر جیسے امیر ہم سفر کے ساتھ...... یہی خواب تو دیکھا تھا اس نے اور اب جب اس کا خواب اس کی دسترس میں تھا وہ کیا بے وقوفی کرنے والی تھی۔ غلطی ایمل کی بھی تو تھی نا...... اس نے کیوں اپنے شوہر پر بھروسا نہیں کیا اور آنکھیں بند کر کے دوسروں کی بات پر بھروسا کر لیا۔

اس نے اپنے ضمیر کو سلانے کی کوشش کی تھی اور اس میں کامیاب بھی ہو گئی تھی۔

ٹن، ٹن، ٹن وکلاک کی آواز پر چونک کر اس نے سہمی، سہمی نظروں سے اپنے سیل فون کی طرف دیکھا لیکن اس کا فون خاموش تھا اور اس کی اسکرین تاریک...... اس کی نظر سامنے دیوار پر لگے کلاک پر پڑی جو آخری بار ٹن کر کے خاموش ہو گیا۔ وہ پھر سہمی، سہمی نظروں سے فون کو دیکھنے لگی۔

اور فون کی طرف دیکھتے، دیکھتے اسے احساس ہوا کہ گھنٹے بھر سے اوپر ہو چکا ہے اور فون کی بیل نہیں ہوئی...... اب بابر اسے فون نہیں کر رہا تھا جبکہ پہلے تو دو، دو منٹ بعد بیل ہو رہی تھی...... بابر اسے فون کیوں نہیں کر رہا تھا...... یک دم اس کے اندر کچھ کلک ہوا تھا اتنے سالوں میں وہ بابر کو اتنا تو جان ہی گئی تھی۔

وہ یک دم اٹھی...... اپنا ہینڈ بیگ اٹھایا...... اس میں موجود رقم کو چیک کیا۔ جوتے تبدیل کیے اور ہینڈ بیگ اٹھا کر اپنے فلیٹ سے باہر نکل آئی...... فون اس نے گھر میں ہی چھوڑ دیا تھا...... فلیٹ لاک کر کے وہ تیز، تیز چلتی ہوئی روڈ تک آئی تھی...... اور ایک رکشا روک کر اس میں بیٹھ گئی۔

(جاری ہے)

# وہ طلب گار تھا

عتیقہ محمد بیگ

وہ پھوٹ، پھوٹ کر رو پڑی...... اپنے اس عمل پر وہ پریشان بھی تھی۔ ہر تکلیف سہنے کے بعد پھر اچانک کیسے اس کا دل بے چین سا ہو گیا...... کاش محبت کا ٹھکانا دل کے بجائے آنکھوں پر ہوتا...... جب دل کرتا جی بھر کر رو، رو کر محبت کو دھکے دے کر نکال دیا جاتا...... اور پھر زندگی کا سفر پُرسکون سا ہو جاتا...... مگر زندگی میں سکون ہی سکون ہو...... تو شاید وہ زندگی، زندگی نہیں ہوتی۔

اس نے بھی تو ایک پُرسکون زندگی کا خواب دیکھا...... ''وہ'' اور صرف وہ ہو...... مگر شاید وہ اس کی قسمت میں تو تھا...... مگر صرف اس کا...... صرف اس کا نہ بن سکا۔ وہ کتنی چاہت سے اس دن تیار ہو کر بیٹھی تھی...... جب اچانک اس خبر نے اس کے پاؤں تلے سے زمین کھینچ لی۔

''مریم...... مریم...... میرا امریکا جانے کا بندوبست ہو گیا......'' وہ خوشی سے کمرے میں داخل ہو کر اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔

اس کے ہاتھ پاؤں یخ ٹھنڈے ہو گئے...... ابھی شادی کو دوسرا مہینہ تھا اور ابھی سے جدائی...... وہ ڈر سی گئی۔

''مریم آج میں بہت خوش ہوں...... اب میں تمہیں دنیا کی ہر خوشی دے سکوں گا...... مہنگے، مہنگے کپڑے...... قیمتی جیولری...... میک اپ...... گھر جو تم لینا چاہو گی بس حکم کرنا...... سب کچھ تمہارے سامنے آ جائے گا۔'' قاسم پُرجوش ہو کر اس کے بازوؤں کو تھام کر گول، گول گھومنے لگا۔ اس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

''سب کچھ سامنے آ جائے گا مگر آپ...... آپ تو نظروں سے دور ہو جائیں گے......'' اس نے قاسم کے ہاتھوں کو مضبوطی سے تھام لیا۔

''اوہو...... مریم...... تم پریشان کیوں ہو رہی ہو...... میں تمہیں بھی بہت جلد وہاں بلا لوں گا...... ہم امریکا میں ایک بہترین گھر لیں گے۔'' قاسم نے پیار سے اسے تسلی دی...... اور اس کے ٹھنڈے برف ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے کر مسلنے لگا...... جو جانتا تھا کہ مریم اس سے جدا ہونے کے تصور سے ڈر رہی ہے۔

''قاسم...... مجھے کچھ نہیں چاہیے...... بس آپ مجھے چھوڑ کر مت جائیں۔'' آخر کار اس نے روتے، روتے وہ بات کر ڈالی...... جس کا اسے ڈر تھا۔

''مریم...... تم پریشان کیوں ہو رہی ہو...... میری جان...... میں تمہارے لیے بلکہ ہم دونوں کی زندگی کی تمام خواہشات پوری ہوں...... صرف اس لیے امریکا جانا چاہتا ہوں اور امریکا جانے کا خواب تو میں کب سے دیکھ رہا تھا تمہیں ڈرنے کے بجائے خوش ہونا چاہیے کہ میرا خواب پورا ہو گا۔'' قاسم نے اس کے گالوں کو چھوا...... جس پر موٹے موٹے آنسو آ گرے تھے۔

وہ پھر چپ سی رہ گئی...... اور اسے چپ ہی رہنا پڑا۔ دونوں فیملیز اس کے امریکا جانے پر بہت خوش ہوئیں۔ بس صرف اس کا تنہا دل ہی تھا...... جو چیخ، چیخ کر رو رہا تھا...... دل کا درد اتنا بڑھ گیا...... کہ آخر اس

نے اپنی ماں سے بات کر ڈالی..... مگر الٹا فرخندہ اس پر برس پڑیں۔

''مریم..... تم پاگل ہو، شکر کرو اللہ کا..... جس نے تمہیں بے شمار مصیبتوں سے بچالیا۔ قاسم امریکا جائے گا تو ضرورت کی ہر چیز تمہیں آسانی سے مل جائے گی۔ اپنی دوسری بہنوں کا حال دیکھو..... پیسے، پیسے کو ترستی ہیں، مہینے کے شروع میں ہی ان کے چہرے بجھ جاتے ہیں کہ کس طرح گزارہ ہوگا اور تم اس فائدے پر آنسو بہار ہی ہو۔'' ماں کی جلتی باتیں اسے مزید پگھلا سی گئیں..... اور وہ پھٹ پڑی۔

''آپ کے نزدیک تو صرف چیزیں ہی ہمیشہ اہم رہی ہیں..... اور رہیں گی بھی.....'' اس کے آنسو آٹپکے جب اس نے اپنی ماں کا ماضی یاد کیا۔

''ہاں، ہاں میرے لیے چیزیں ہی ہمیشہ اہم رہی ہیں۔ جب تمہاری جیٹھانی، دیورانی تم سے اچھا لباس، اچھا کھانا، اچھی چیزیں استعمال کریں گی تو اہمیت چیزوں کی خود بخود آ جائے گی۔'' فرخندہ نے بھی لفظ چبا، چبا کر اپنے برے وقت کو یاد کر کے جواب دیا۔

جب سگی ماں اس کی بات پر متفق نہ تھی تو ساس کہاں سے ہوتی۔ فاطمہ حیات تو پھولے نہ سما رہی تھیں..... وہ تو اس محبت کی شادی پر پہلے ہی خوش نہ تھیں..... کیسے انہوں نے اپنے بیٹے کی خوشی کو قبول کیا تھا، یہ اللہ ہی جانتا ہے..... مریم کو یوں لگ رہا تھا انہیں پیسوں کی اصل ضرورت نہیں..... بلکہ وہ دونوں کے درمیان ہونے والی جدائی سے خوش ہیں..... آخر کار پھر جدائی کا موسم آ گیا..... اور پھر یہ جدائی کا موسم اس کا نصیب بن کر رہ گیا..... قاسم نہ اسے امریکا بلوا پایا..... اور نہ خود آ سکا..... اب وہی لوگ طرح، طرح کی باتیں اڑانے لگے..... کسی بھی خاندانی تقریب میں وہ سب کی نظروں میں رہتی..... کوئی کہتا۔

''قاسم نے وہاں شاید..... دوسری شادی کر لی ہے۔'' تو کوئی اسے چالاک سمجھتا..... کہ ''پیسوں کی خاطر میاں کو پردیس بھیج دیا'' وہ کوئی اچھا لباس پہن



لیتی تو کھسر پھسر چل پڑتی۔ ''نہ جانے کس کے لیے بجتی سنورتی ہے۔'' ''کہیں باہر گھومنے پھرنے اپنے بھائیوں کے ساتھ چلی جاتی تو بھابیوں کی سرگوشیاں شروع ہو جاتیں۔'' ''کتنی سخت دل لڑکی ہے، میاں بیچارہ پردیس کاٹ رہا ہے اور یہ سیر و تفریح اور شاپنگ کرنے میں مگن ہے۔'' ہر ایک کو اب اس کی ذات پر انگلیاں اٹھانے کی عادت ہوگئی تھی...... سسرال میں دیورانی، جیٹھانی اسے خاطر میں نہ لاتیں، اس کی وجہ کہ اس کا شوہر اس کے پاس نہیں ہے اور نہ اس کے بچے ہیں...... گھر بھر کا سارا کام اس کے سر پر سونپ دیا جاتا اور کسی کو بھی احساس نہ ہوتا کہ وہ اکیلی کام کر رہی ہے بلکہ اسے کاموں میں مشغول رکھنے کی بات اس لیے ہوتی...... کہ اس کا دل گھر سے اچاٹ نہ ہو جائے...... اپنی جان سے زیادہ کام کرنے کی عادت نے آخر کار اسے بیمار کر دیا...... کاموں سے جان تو چھوٹ گئی مگر جیٹھانی اور دیورانی کے منہ سوج گئے۔ وہ سسرال کی پریشانیوں سے دور میکے آ بیٹھی تو بھابیوں کے طعنے...... بھائیوں کے رویے بدل گئے۔ کافی وقت ان مسائل کا وہ خاموشی سے مقابلہ کرتی رہی...... مگر پھر پانی اس کے سر سے گزر گیا۔ اس کے اپنے دیور سے بے تکلفی کو الٹا رنگ دیا جانے لگا...... وہ اس بات پر اپنے شوہر کے فون آنے پر لڑ پڑی کہ اب وہ مزید تنہا نہیں رہ سکتی...... اس جھگڑے کی وجہ سے گھر میں الگ مسئلہ آ کھڑا ہوا...... جس پر سارا قصور مریم پر ڈال دیا گیا...... اور یوں سسرال والوں کے ساتھ اس کی ناراضی چل پڑی۔ آخر کار مجبور ہو کر وہ میکے آ بیٹھی۔ ماں نے مجبوراً اس کا ساتھ دیا...... باقی بھائیوں، بہنوں اور بھابیوں نے طرح، طرح کی باتیں شروع کیں...... اگر تھوڑا لحاظ بھائیوں نے رکھا تو اس کی وجہ اس کا پیسہ تھا...... مگر بدقسمتی سے اس کا خرچ بند ہو گیا...... قاسم کے گھر والوں نے نہ جانے ایسی کیا، کیا باتیں اس کے دماغ میں بھر دیں کہ قاسم نے فون کرنا چھوڑ دیا۔ خرچ بند ہوا...... تو ہر کسی اصلیت کھلنے لگی۔ وہ بے قصور ہو کر مجرم ثابت ہونے لگی...... کہ اس نے ہنستا بستا گھر اپنا تباہ کیا ہے گھر تو شوہر کے ساتھ ہوتا ہے...... جب شوہر ہی اس کے پاس نہیں...... تو گھر کیسا؟

مگر اس کے احساسات کو کوئی نہیں سمجھ پایا...... اور سب سے پہلا طعنہ اس کی اپنی سگی ماں نے دیا...... تو وہ کانپ کر رہ گئی۔ اس دن نہ جانے اس سے کیسے ہنڈیا میں نمک تیز رہ گیا...... تو فرخندہ پھٹ پڑیں۔

''اپنے میاں کی کمائی ہوتی تو تمہیں پیسوں کی قدر ہوتی...... سالن کا ستیاناس کر دیا......'' فرخندہ نے غصیلی نظروں سے اسے گھورا۔ وہ بھی چپ نہ بیٹھی...... اور غصے سے چیخ اٹھی۔

''ہاں آپ ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہیں...... پیسوں کی قدر مجھے کیسے ہوگی...... میرے سارے پیسے تو آپ نے اکرم بھائی کے کاروبار میں جو لگوا دیے...... مجھے پیسوں کی قدر ہوتی تو اپنے سگے بھائی کی مدد کبھی نہ کرتی۔'' اس نے بھی غصے سے اپنا احسان یاد کروا دیا۔

''ہاں، ہاں میں تمہارا مطلب سمجھ گئی ہوں...... اکرم تمہارے پیسے جلد لوٹا دے گا......'' فرخندہ بیٹے کے نام پر نظریں چرانے لگیں۔ اب وہ بیچاری بھی کیا کرتیں...... انہیں اپنی بہوؤں کا ڈر تھا کہ کہیں اس سالن کی بات پر جھگڑا نہ ہو جائے...... وہ بیٹی کو اس بات کا احساس دلانا چاہتی تھیں مگر ان کا رویہ درست نہیں تھا۔ بہوؤں نے بھی اس مسئلے پر فتنہ اٹھا دیا...... وہ فتنہ کیوں نہ اٹھاتیں فرخندہ بیگم بھی تو ان کی چھوٹی، چھوٹی غلطیوں پر گھر سر پر اٹھا لیتی تھیں۔ بہوؤں نے بہت شور مچایا...... تو انہیں بیٹی کا ساتھ دینا پڑا اور آخر کار بیٹوں نے یہ فیصلہ دیا...... کہ گھر میں دو ہنڈیاں بنائی جائیں۔ جس پر فرخندہ مزید پریشان سی ہو گئیں۔ وہ ہنڈیا والی بات تو وہ کسی بھی طرح ہضم نہیں کر پائیں...... اور انہوں نے بیٹی کو ہی باورچی خانے میں جانے سے روک دیا۔

''اماں...... یہ میرا بھی گھر ہے۔'' اس کی آنکھوں میں نمی بھر آئی۔ جب اسے باورچی خانے

میں جانے سے روک دیا گیا...... تو وہ اپنا حق جتلانے لگی۔

''شادی کے بعد لڑکی کا گھر اس کے شوہر کا گھر ہوتا ہے اور تمہارے نصیب میں وہ گھر نہیں لکھا...... اس لیے جیسا میں بول رہی ہوں بس وہی کرو...... وہ تمہارے حق میں بہتر ہے۔'' فرخندہ نے بیٹی کے دل کا لحاظ نہ کیا...... اور دو ٹوک بات کر ڈالی۔

اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے...... ماں جیسا انمول... رشتہ بھی اس کے لیے پرایا ہو جائے گا...... ایسا تو کبھی اس نے سوچا ہی نہیں تھا۔ اس کے آنسوؤں سے وہ پگھل سی گئیں...... اور پھر روتے، روتے بولیں۔

''میں یہ سب کچھ تمہارے لیے ہی کر رہی ہوں...... دو ہنڈیا بن جائیں گی تو تمہاری بھابیوں کے سر سے میری ذمے داری اتر جائے گی...... اور جب ذمے داریاں ان کے سر سے اٹھالی جائیں گی...... تو وہ ہمیں کسی خاطر میں نہیں لائیں گی...... اور ایک دن ایسا آئے گا...... کہ وہ مجھے اور تمہیں اس گھر سے باہر نکال پھینکیں گی......'' فرخندہ نے اپنے دل کا ڈر آخر کار بیٹی کو سنا دیا...... جس پر اس کے آنسو تو تھم گئے...... مگر دل سہم کر رہ گیا...... کہ اس نے یہاں آکر زندگی کی سب سے بڑی غلطی کر دی ہے۔

ایک مہینہ گزر گیا...... مگر قاسم کا فون نہ آیا...... تو وہ بہت پریشان سی ہوگئی...... اپنا دکھ...... اپنے آنسوؤں کو چھپا، چھپا کر وہ مرجھا سی گئی۔ آخر کار اس کی بچپن کی سہیلی ایمان نے اسے سمجھایا...... کہ اگر قاسم نے فون کرنا بند کر دیا ہے تو وہ قاسم کو خود فون کرلے...... ایمان کی باتوں کو سوچ کر آخر کار اس نے فون کر ڈالا...... مگر دوسری طرف فون پک نہ ہوا...... وہ مزید پریشان سی ہوگئی...... اور اس بات پر رونے لگی...... وہ رو رہی تھی۔ جب اچانک اس کے بھتیجے بھتیجیاں کھیلتے، کھیلتے اس کے کمرے میں آگئے...... بچوں نے اسے روتے دیکھ لیا...... تو اس کی حالت کا گھر والوں کو علم ہو گیا...... بھابیوں کی...

## فیل

وہ مجھ سے حساب کتاب چاہتی ہے
جس نے خود
میٹرک میں میتھ کی سپلی دی ہے......!

از: فردوس شاہی، لاڑکانہ

## ساحل پہ گھر

الجھی ہوئی ذات کو پانے کی ضد نہ کرو
جو نہ ہو اپنا اسے اپنانے کی ضد نہ کرو
اس سمندر میں طوفان بہت آتے ہیں فراز
اس کے ساحل پہ گھر بنانے کی ضد نہ کرو

مرسلہ: سیدہ غزالہ عالم، لانڈھی، کراچی

سرگوشیاں چل پڑیں۔

''بہت شوق سے سسرال چھوڑ کر آئی تھی...... اب میاں کی قدر آرہی ہے۔ ہم بھی تو اپنی، اپنی سسرال میں بیٹھی ہوئی ہیں...... ہر طرح کی مصیبتیں آتی ہیں...... مگر کبھی میکے جا کر بیٹھنے کا نہیں سوچا......'' یہ وہ بھابی تھیں جس کی ہر پریشانی میں اس نے ان کا ساتھ دیا تھا۔

''ہمیشہ ہمیں جلانے کے لیے مہنگے سے مہنگے کپڑے پہنتی تھی...... اب کہاں سے کپڑے خرید سکے گی......'' دوسری نے بھی تیکھے لہجے میں اس کا مذاق اڑایا...... یہ وہ بھابی تھیں...... جنہیں اس نے کتنے کپڑوں کے تحائف سے نوازا تھا...... اس کی آنکھوں سے آنسو برسنے لگے...... وہ جو دھلے ہوئے کپڑے تار سے اتار کر سیڑھیاں اتر رہی تھی...... پر بھابیوں کی... سرگوشیاں سے وہاں بت بنی کھڑی رہ گئی۔

''اُف خدایا...... میرے سامنے تو وہ بار، بار اپنا پرس کھولتی تھی...... اور نیلے، نیلے لال، لال نوٹوں سے میری غربت کا مذاق اڑاتی تھی...... اب نہ رہا پرس...... اور نہ رہے وہ کرارے نوٹ......'' سب سے چھوٹی والی

بھابی نے تیکھے لہجے سے اس کی گم گشتہ امیری کا پرچار کیا...... اس نے کبھی ایسا نہیں کیا تھا...... کہ وہ اپنی دولت کو دکھائے...... اس کے نزدیک اس کی چھوٹی بھابی...... اس کی بہن جیسی تھی...... بھابیوں کی ان باتوں سے اسے اندازہ ہوا...... اس کی زندگی کو بہت بری نظر لگی ہے...... مگر وہ کر کیا سکتی تھی...... رونے کے سوا اس کے پاس کچھ نہیں تھا۔

☆☆☆

پانچ سال کیسے گزر گئے...... کوئی نہیں جان پایا...... صرف وہ تنہا اس سفر کی تکلیف کو سمجھ پائی...... پانچ سالوں میں قاسم کی کوئی کال نہ آئی...... اور نہ ہی اس نے کبھی اس کا فون اٹھایا...... اس کی سسرال والوں سے اسے جب یہ خبر ملی...... کہ قاسم نے امریکا میں دوسری شادی کرلی ہے...... تو اس نے اپنا فون بند کردیا...... اور پھر کبھی اس نے وہ فون آن نہیں کیا...... ان پانچ سالوں میں کتنی دفعہ اس کی ماں نے اس کی ساس فاطمہ سے طلاق کا مطالبہ کیا تھا...... مگر دوسری طرف سے کوئی جواب نہ مل سکا...... اور جب بھائیوں تک طلاق کی بات پہنچی...... تو وہ اس کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے...... کہ خاندان میں بدنامی ہوجائے گی...... اور ان کی بچیوں پر بھی انگلیاں اٹھنے لگیں گی...... ان کے نزدیک اسے صرف قاسم کے آنے کا انتظار کرنا چاہیے...... انتظار ایسا...... جس کی کوئی مدت نہیں...... بس اسے اس ظالم شخص کا انتظار کرنا ہوگا۔ جس نے کبھی اس کو ٹوٹ کر چاہا تھا...... چھٹے سال اس کی دعا اللہ نے سن لی...... جب اس کی ماں نے اسے خبر دی...... کہ قاسم پاکستان لوٹ کر آگیا ہے...... اور اس کی ساس کا فون آیا ہے...... کہ وہ لوگ اسے لینے کے لیے آرہے ہیں۔

''چھ سال کے بعد...... وہ کیسے لینے آسکتے ہیں...... کس حق سے...... '' اس کا دل چیخ، چیخ کر اس سے پوچھنے لگا...... مگر اس کے دل نے یہ جرأت نہ کی...... کہ وہ اپنی ماں سے پوچھے...... کہ گزشتہ چھ سال جس اذیت میں وہ رہی ہے...... اس کا حساب اسے کون دے گا...... کسی نے اس سے پوچھا تک نہیں...... کہ کیا وہ جانا بھی چاہتی ہے یا نہیں......؟ اس کی ماں کی تیاریوں سے اسے اندازہ ہوگیا کہ وہ اسے جلد رخصت کردینا چاہتی ہیں۔ اگر کوئی خوش نہیں تھا تو وہ اس کی بھابیاں تھیں...... جنہوں نے ایسا کبھی سوچا ہی نہیں تھا...... کہ قاسم اسے لینے بھی آسکتا ہے...... اور آخر کار وہ وقت آگیا...... جب وہ ظالم شخص اس کے سامنے تھا...... اس کے کمرے میں......

''مریم میں آخر کار سب کچھ چھوڑ کر آگیا ہوں...... جیسا تم چاہتی تھیں۔'' اس کے لہجے میں شرمندگی تھی...... جیسے زندگی کی تمام عیاشی کرلینے کے بعد وہ لوٹا تھا۔

''آپ میرے لیے امریکا چھوڑ کر نہیں آئے......'' اس نے غصے سے کہا۔ وہ یک دم آکر اس پر کیسے اپنا حق جتلا سکتا تھا۔ جس نے کبھی اس کا فون پک کرنا بھی گوارا نہیں کیا تھا۔

''میں تمہاری ناراضی سمجھتا ہوں...... مگر اب میں آگیا ہوں ناں تو سب کچھ ٹھیک کردوں گا......'' قاسم نے اس کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لینا چاہا۔

''نہیں، نہیں...... آپ پلیز مجھ سے دور رہیں۔'' وہ ایک دم پیچھے کو ہٹی...... اب اس کی آنکھوں میں نمی بھر آئی۔

''تم میری بیوی ہو...... اور میرا تم پر پورا حق ہے......'' اب کہ اس نے خفگی ظاہر کی...... اس کے یوں پیچھے ہٹ جانے پر قاسم نے اپنی بے عزتی محسوس کی۔

''ہاں، میں آپ کی بیوی ہوں...... مگر صرف نام کی۔'' اس کی آنکھوں سے آنسو آ ٹپکے۔

''نام کی...... ہاں...... نام کی تو ہو......'' اس نے بھی دُہرایا۔

''اماں سچ ہی کہتی تھیں۔ تمہارے تیور بدل گئے...... میرے جانے کے بعد یہاں تک کہ تم نے میرے چھوٹے بھائی......'' اس نے جملہ ادھورا چھوڑ [illegible] بات کی وجہ سے اس نے سسرال سے ناتا

توڑ دیا تھا۔

”خبردار...... جو آپ نے بھی مجھ پر اتنا گھٹیا الزام لگانے کی کوشش کی...... اور اگر آپ کو یہ بات سچ لگتی ہے تو کیوں مجھے آزاد نہیں کیا...... اور آخر وہ بات آپ کی زبان پر آٹھہری...... آپ ابھی اسی وقت مجھے طلاق دے دیں۔“ اس کے چھ سال کا صبر ٹوٹ کر کرچی کرچی ہوگیا۔ اور وہ غصے سے اسے گھورنے لگی۔

”سنو مریم......“ وہ اس کے رونے پر پریشان سا ہوا...... اور اس کی طرف بڑھا۔

”آپ مجھے آزاد کردیں...... بس آزاد کردیں۔“ وہ چیخی۔

”اچھا ٹھیک ہے...... بہت جلد آزاد کردوں گا۔“ وہ غصے سے کہہ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔

جتنے قدم اس نے کمرے سے باہر نکالنے میں اٹھائے تھے...... اتنی دفعہ اس کا دل زور، زور سے کانپا تھا۔

اس کا دل اس کے بس میں نہیں تھا۔ جس نے اس کے آنے سے پہلے یہ فیصلہ لیا تھا...... کہ وہ اس کے ساتھ نہیں جائے گی...... مگر اب اس کے صرف ان لفظوں سے اس کا دل موم بن کر رہ گیا...... کہ وہ اسے آزاد کردے گا۔

اس کی آنکھیں پھر اس کی منتظر ہونے لگیں۔ وہ منہ میں بڑبڑائی۔

”مجھے آپ سے محبت نہیں...... آپ دنیا کے سب سے ظالم شخص ہیں قاسم...... میں کبھی آپ کے ساتھ نہیں جاؤں گی۔“ اس نے روتے، روتے اپنے دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپالیا تھا۔

پھر اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا...... چھ سال جس اندھیری زندگی میں وہ رہی تھی...... وہ اندھیرا پھر آجائے گا...... اس کے دل سے آواز ابھری...... اور اس نے جھٹ سے اپنے ہاتھ ہٹالیے...... اسے روشنی میں جینا تھا...... اور یہ روشنی اسے صرف اسی کے نام سے مل سکتی تھی...... ہزار انگلیاں جو اس کے وجود پر اٹھتی تھیں اب ان کے جھکنے کا وقت آگیا تھا۔

اس نے اپنے آنسوؤں کو پونچھا...... اور کمرے سے باہر آگئی...... وہ سب لوگ اس کی ماں کے کمرے میں بیٹھے تھے...... قاسم نے شاید انہیں اس کا فیصلہ نہیں سنایا تھا...... جس کی وجہ سے وہ خوش دکھائی دے رہے تھے...... اچانک اس کی ماں نے اسے کمرے سے باہر دیکھا تو وہ اٹھ کر اس کے پاس آئیں۔

”آؤ بیٹی آؤ...... آجاؤ...... دیکھو تو سب لوگ تمہیں تمہارے گھر لے جانے کے لیے آئے ہیں۔“

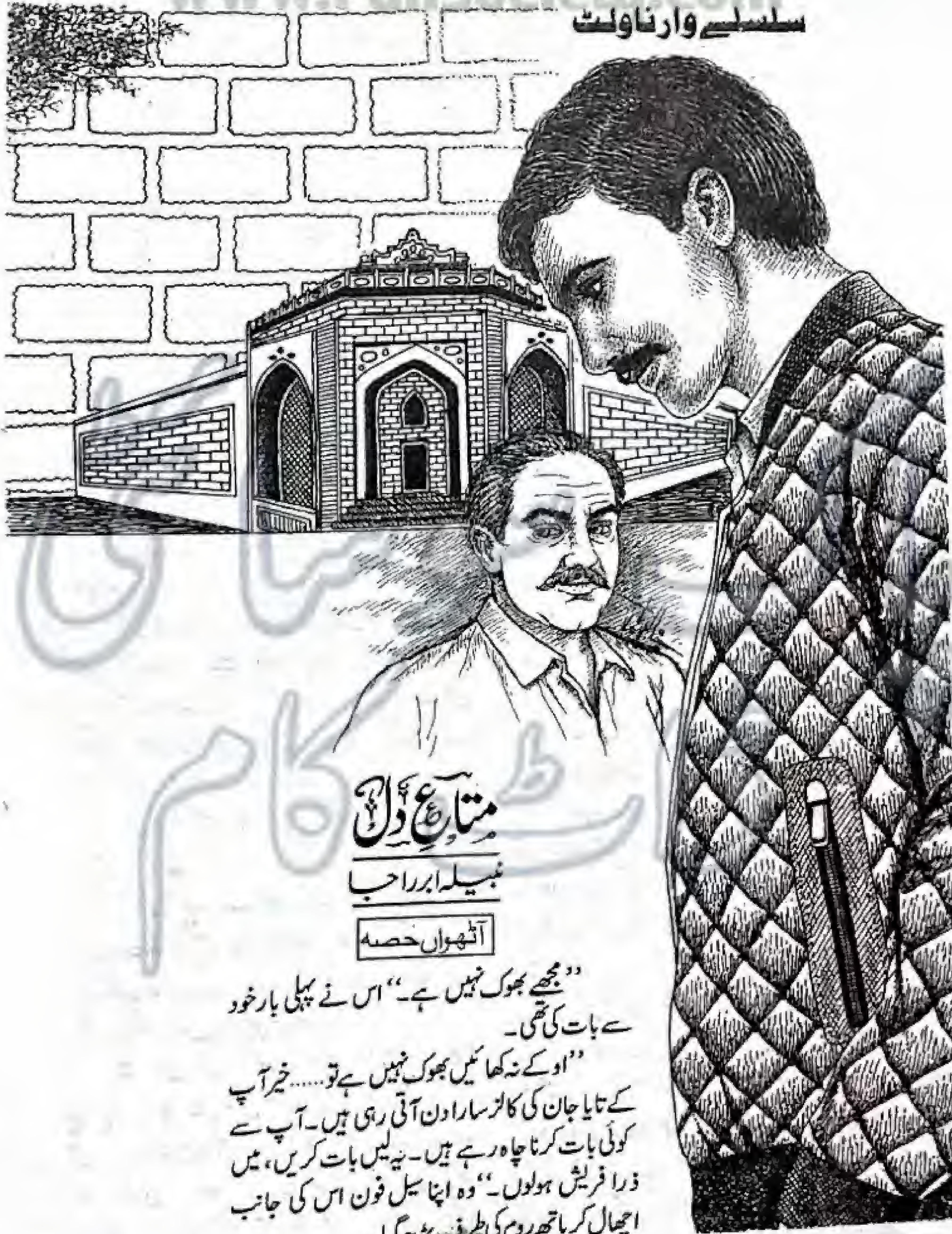
اس نے اپنی ساس کو سلام کیا...... جنہوں نے پیار سے اسے گلے سے لگایا...... اور شائستگی سے بولیں۔

”میں اپنی بہو کو نہیں...... بلکہ اپنی بیٹی کو واپس لینے آئی ہوں۔“

اس کا دل چیخنے لگا...... سب جھوٹ ہے...... اس ظالم شخص کی وجہ سے سب رشتے تمہارے بن رہے ہیں۔ تمہارا اپنا وجود کچھ نہیں۔ وہ خاموشی سے اس کے پاس جا بیٹھی۔ جو سر جھکائے بیٹھا تھا اور فکر مند دکھائی دے رہا تھا...... قاسم کی کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا...... کمرے میں تو مریم نے اسے چھوڑنے کی بات کی تھی پھر اب یہاں...... اس کے ساتھ......

”آپ یہاں سے اکیلے نہیں جائیں گے۔ میں آپ کے ساتھ جاؤں گی۔“ اس نے نہ چاہ کر بھی اس کے کان میں سرگوشی کی...... مریم کے ان لفظوں سے اس کا بجھا چہرہ روشن ہوگیا...... اور وہ پیار سے مریم کو دیکھنے لگا۔

وہ بھی اسے دیکھ کر مسکرائی...... کیونکہ چور نظروں سے اس کی بھابیاں اس کی جیٹھانیاں، دیورانیاں اسے دیکھ رہی تھیں...... جو ہمیشہ کی طرح جل بھن کر رہ گئیں کیونکہ اس کی زندگی سے اندھیرے کے بادل اس ظالم شخص نے پل میں ہی مٹا دیے تھے...... پھر وہ ظالم شخص معافی کا طلب گار ہی تو تھا...... تو اسے معافی دینی ہی پڑی۔




# متاعِ دل

نبیلہ ابر راجا

آٹھواں حصہ

''مجھے بھوک نہیں ہے۔'' اس نے پہلی بار خود سے بات کی تھی۔

''او کے نہ کھائیں بھوک نہیں ہے تو...... خیر آپ کے تایا جان کی کالز سارا دن آتی رہی ہیں۔ آپ سے کوئی بات کرنا چاہ رہے ہیں۔ یہ لیں بات کریں، میں ذرا فریش ہولوں۔'' وہ اپنا سیل فون اس کی جانب اچھال کر باتھ روم کی طرف بڑھ گیا۔

دُرِ یکتا کو نمبر معلوم تھا ... اورنگزیب کا...... اس نے


READING
Section

نمبر ڈائل کیا۔ پہلی بیل پر ہی کال ریسیو کرلی گئی۔ تایا اورنگزیب خود ہی تھے۔ دُرِ یکتا بات کرتے ہوئے رو پڑی۔

''طیب کی حالت بہت خراب ہے۔ آج بھی ڈاکٹر کے پاس لے گئے تھے۔ تم اشعر سے کہو، اسے بتاؤ طیب کی حالت کا...... کسی طرح اسے راضی کرلو...... طیب کسی سے بھی چپ نہیں ہورہا ہے۔'' تایا اورنگزیب بتارہے تھے۔ وہ اسے کچھ ہدایات دے رہے تھے۔ وہ چپ ہو کے سن رہی تھی۔

اتنے میں اشعر نہا کے آ گیا تھا سیل فون اس کے ہاتھ سے لے لیا اور کان سے لگالیا۔ ''اس کی منت کرو، بتاؤ طیب کا۔'' انہیں نہیں پتا تھا کہ اب فون اشعر کے پاس ہے۔ وہ بولا تو انہیں پتا چلا۔

''دُرِ یکتا کو واپس چھوڑ جاؤ۔ سارے خاندان میں بدنامی ہورہی ہے ہماری۔ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے ہم۔ میں تم سے درخواست کرتا ہوں، اسے چھوڑ دو۔ ہمارے گھر میں مسائل بڑھ رہے ہیں۔ دُرِ یکتا، عمر کی دیکھ بھال کرتی تھی، وہ اس سے مانوس تھا اب کسی کے قابو میں نہیں آتا۔ تمہیں ہم سب پر رحم نہیں آتا؟'' وہ جذباتی بلیک میلنگ پر اتر آئے تھے۔

''آپ کی بدنامی کیوں ہورہی ہے؟ کیوں آپ منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے؟ دُرِ یکتا میری بیوی ہے، میں اس کا جائز، شرعی شوہر ہوں، میرے پاس ہے وہ...... کسی غیر کے پاس نہیں جو آپ کی بدنامی ہورہی ہے۔ باقی اب آپ کی ذمے داری ہے۔ آپ کے مسائل ہیں جس طرح بھی ان کو حل کریں...... مجھے ڈسٹرب نہ کریں۔'' اشعر نے جھنجلاتے ہوئے فون بند کردیا اور اپنے گیلے بالوں میں ہاتھ پھیرنے لگا۔ دُرِ یکتا نے اچانک ایک ایسی حرکت کی جس کی توقع اشعر نہیں کرپارہا تھا۔

اس نے گھٹنوں کے بل جھکتے ہوئے اشعر کے پاؤں پکڑلیے۔

''پلیز مجھے گھر چھوڑ آئیں...... طیب بہت سخت بیمار ہے، وہ میرے بغیر نہیں رہ سکتا۔ مائرہ بھابی بھی شادی کرکے اپنی دنیا میں مگن ہوگئی ہیں۔ کوئی اس کی دیکھ بھال کرنے والا نہیں ہے...... پپا وہاں اکیلے پڑے ہیں، وہ میری ذمے داری ہیں۔ پلیز آپ کو خدا کا واسطہ مجھے جانے دیں۔ مجھے یہاں اس طرح بند کرکے آپ کو کیا ملے گا۔ طیب کو کچھ ہوگیا تو......'' اس کے بعد دُرِ یکتا کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ اس سے کوئی اور بات کی ہی نہیں جارہی تھی۔

اشعر نے اس کے ہاتھوں سے اپنے پاؤں چھڑوائے۔

''اوپر بیٹھ کے بات کریں۔ میں یہ سب پسند نہیں کرتا جس طرح ابھی آپ نے کیا ہے۔'' اشعر کا اشارہ پاؤں پکڑنے کی جانب تھا۔

''میں خلع کا کیس واپس لے لوں گی۔ رخصت ہو کے آپ کے پاس آجاؤں گی۔ بس ایک بار مجھے یہاں سے جانے دیں۔'' اس کی آنکھوں سے اشک باری ختم ہوگئی تھی۔ اب وہ امید بھری نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی جیسے اسے یقین ہو اس بار وہ انکار نہیں کرے گا۔

''آپ کو میں یہاں سے جانے دوں تاکہ آپ پھر میرے خلاف عدالت میں کھڑی ہوجائیں، اپنے تایا کے ساتھ۔ میری مردانگی کا مذاق اڑائیں...... سرِعام...... نہیں، میں یہ نہیں ہونے دوں گا۔''

''آپ پلیز میرا یقین کریں، میں ایسا کچھ بھی نہیں کروں گی۔ میں خلع کا کیس واپس لے لوں گی اور رخصت ہو کے آپ کے پاس آجاؤں گی۔'' وہ التجائیہ انداز میں بولی۔

''مجھے آپ کا، آپ کے تایا کا اعتبار نہیں ہے، ہاں آپ اگر اسٹامپ پیپر پر مجھے یہ لکھ کر دیں تو میں سوچ سکتا ہوں آپ کی واپسی کا...... ورنہ نہیں...... آپ میرے پاس ہی رہیں گی۔''

''میں لکھ کر دینے کے لیے تیار ہوں جو آپ کہہ رہے ہیں بس مجھے چھوڑ آئیں۔'' لجاجت کوٹ کوٹ

کر بھری تھی اس سے اس کے لہجے میں۔ ''خیر کل اسٹامپ پیپر مل جائے گا۔ سائن کر دیجیے گا اپنے..مزید اضافے کے ساتھ کہ اگر آپ کے تایا یا خاندان کا کوئی فرد آپ کے نکاح اور رخصتی کی راہ میں حائل ہوا تو آپ کسی رکاوٹ کو خاطر میں نہیں لائیں گی اور میرا یعنی اپنے شوہر کا ساتھ دیں گی۔''

''مجھے منظور ہے ہر بات۔'' وہ جلدی سے یوں بولی جیسے نہ بولی تو اشعر اپنا ارادہ بدل دے گا۔

''آہم، آہم خاصی فرمانبردار قسم کی بیوی ہیں آپ......کل بتاؤں گا اتنی جلدی نہ کریں۔ سوچ لیں۔ میں کچھ بھی منظوری کے لیے دے سکتا ہوں۔'' اشعر کے لبوں پر معنی خیز مسکراہٹ سجی ہوئی تھی۔

دُرِ یکتا اس مسکراہٹ کو کوئی نام نہیں دے پائی۔

''اب آپ مطمئن ہیں تو کھانا کھالیں۔ کل واپس چھوڑ آؤں گا آپ کو۔''

''سچ......؟'' اسے یقین نہیں آرہا تھا۔ کیا واقعی وہ اسے کل چھوڑ آئے گا۔ یعنی وہ پھر سے اپنوں کے پاس ہوگی۔ یہ تصور ہی کتنا سرور آگیں تھا۔ اس کی بھوک مارے خوشی کے اڑ گئی پھر بھی اس نے اشعر کی وجہ سے کھانا کھایا۔ عجیب سا آدمی تھا کہیں اپنا ارادہ بدل ہی نہ دیتا اگر وہ اس کے کہنے پر کھانا نہ کھاتی تو...... اس نے جلدی، جلدی کھانا کھایا۔

اشعر غور سے دیکھ رہا تھا۔ وہ اپنی خوشی میں اتنی مگن تھی کہ محسوس ہی نہیں کر پائی۔ اشعر اسی بیڈ پر سو گیا۔ دُرِ یکتا بہت دیر بعد سوئی۔ کل کا دن اس کے لیے خوشی لے کر آنے والا تھا۔

☆☆☆

دُرِ یکتا کے ہاتھ میں اسٹامپ پیپر تھا۔ اس پر لکھی تحریر اسے حرف بہ حرف ازبر ہوگئی تھی۔ اس نے کتنی بار پڑھا تھا۔

''اچھی طرح سوچ کے سائن کیجیے گا...... بعد میں سوچنے کی گنجائش نہیں ہوگی آپ کے پاس۔'' وہ پیچھے سے جھک کے بولا۔ دُرِ یکتا کرسی پر بیٹھی تھی۔ اشعر عین اس کے پیچھے کھڑا تھا۔

''میں نے سوچ لیا ہے، پین دیں میں سائن کر دوں۔'' وہ دانستہ طور پر اور بھی آگے کی طرف ہوگئی۔ اشعر نے اسی پوزیشن میں پین جیب سے نکال کر اس کے ہاتھ میں دیا۔ دُرِ یکتا نے لرزتے ہاتھوں سے پین کو اچھی طرح دبا کے سائن کر دیے۔ اشعر اس کے کندھوں پر جھکا ہوا اس کے ہاتھوں کی حرکت کو بغور دیکھ رہا تھا۔ دُرِ یکتا نے دونوں کاغذوں پر سائن کر دیے۔ اشعر پیچھے سے اس کے سامنے آگیا۔ ایک اسٹامپ پیپر اس نے اپنے پاس جیب میں ڈال لیا اور نقل دُرِ یکتا کی طرف بڑھائی۔

''یہ آپ رکھ لیں، اپنے تایا جان کو دکھا دیجیے گا۔ اصل میرے پاس رہے گی۔'' اس نے لے کے رکھ لیا اور کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اشعر اس کے سامنے کھڑا تھا اسے بغور تکتا۔ اس نے اچانک دُرِ یکتا کو بانہوں میں بھر لیا۔ وہ اس کے لیے تیار نہیں تھی۔ ایک ہلکی سی چیخ اس کے لبوں سے نکلی۔

''نہیں......'' اشعر نے اس کے ہونٹوں پر انگلی رکھ دی۔ ''میں نے سائن کرنے سے پہلے پوری طرح سوچنے کا موقع دیا تھا۔ آپ نے کہا تھا مجھے سب منظور ہے تو اب یہ احتجاج کیسا؟'' اس نے اپنے اور دُرِ یکتا کے درمیان موجودہ فاصلے کو کچھ اور بھی کم کر دیا۔

''نہیں، نہیں......'' دُرِ یکتا نے اسے خود سے دور کرنا چاہا۔

''یہ ضروری ہے تاکہ آپ کو اپنا وعدہ یاد رہے۔''

''مجھے یاد رہے گا سب کچھ۔'' دُرِ یکتا کے حلق سے پھنسی، پھنسی آواز برآمد ہوئی۔

''اوکے پھر ٹھیک ہے اگر یاد رہے تو......'' اشعر کے بازوؤں کی گرفت ڈھیلی ہوگئی۔ وہ تڑپ کے دور ہوئی اور اپنی اتھل پتھل ہوتی سانسوں کو ہموار کرنے کی کوشش کرنے لگی۔

اشعر نے پھر کوئی مزید بات نہیں کی اور گاڑی کی چابی اٹھائی۔ دُرِ یکتا بہت تیزی سے سائڈ پر ہوئی۔ اس

حد درجہ احتیاط پر اشعر مسکرا دیا تھا۔

''اتنا برا ہوں میں۔'' وہ مصنوعی تاسف سے خود کو دیکھتے ہوئے بولا۔ دُرِ یکتا نے جان کے دروازے کی طرف دیکھنا شروع کر دیا۔

''چلیں آئیں' میں گاڑی اسٹارٹ کرتا ہوں۔''

اس بار اس کے قدموں میں بجلی کی سی تیزی تھی، دُرِ یکتا ساتھ، ساتھ تھی اس کے۔ واپسی کا سفر شروع ہو گیا تھا۔ اشعر اس کے گاؤں کی طرف جا رہا تھا۔

☆☆☆

حویلی کے گیٹ پر متعین چوکیدار کو اجازت نہیں تھی کہ وہ کسی اجنبی شخص کے لیے گیٹ کھولے اور اسے گھر کے اندر آنے دے...... پر گاڑی میں دُرِ یکتا کے ساتھ بیٹھے اس نوجوان کی شخصیت ایسی تھی کہ چوکیدار کو بغیر کوئی سوال پوچھے گیٹ کھولنا پڑا۔

دُرِ یکتا جب تک رہائشی حصے تک پہنچی سب کو اس کی آمد کا پتا چل چکا تھا۔ فوزیہ، فرح، شیریں، مائرہ، سائرہ، اورنگزیب، نوید سب ہی تو موجود تھے۔ دُرِ یکتا گھبرا سی گئی۔

اشعر اس کے ساتھ ہی ڈرائنگ روم میں آیا۔ پہلی بار دُرِ یکتا کو اس کی موجودگی سے ڈھارس ملی۔ ورنہ سب کتنی عجیب نگاہوں سے دیکھ رہے تھے جیسے وہ گھر سے بھاگ کے اشعر کے ساتھ گئی ہو۔

''تمہیں تو میں دیکھ لوں گا۔'' اورنگزیب، اشعر کو کھا جانے والی نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ شیریں نے ہاتھ دبا کے اشارہ کیا کہ بات نہ بڑھائیں جب وہ دُرِ یکتا کو خود یہاں لے آیا ہے تو...... اشعر کچھ دیر ٹھہرنے کے بعد اٹھ کھڑا ہوا کیونکہ کسی کے رویے میں گرمجوشی نہیں تھی۔ وہ کسی گرمجوشی کی توقع کر بھی نہیں رہا تھا۔

''اوکے انکل...... انشاء اللہ بہت جلد ملاقات ہوگی۔ پپا آپ کے پاس آئیں گے۔ شادی کی تاریخ لینے...... تب تک میری بیوی، میری امانت کی صورت میں آپ کے پاس رہے گی۔'' اس نے اورنگزیب سے زبردستی ہاتھ ملایا۔

وہ ہکا بکا اس کے الفاظ پر غور کر رہے تھے۔ وہ کیا کہہ گیا تھا۔ اورنگزیب تو سمجھ رہے تھے کہ اس نے ہار مان لی ہے تب ہی دُرِ یکتا کو خود یہاں چھوڑ کے گیا ہے۔

☆☆☆

دُرِ یکتا کو سب گھیرے بیٹھے تھے۔ شیریں کو عجیب سی کھد بھد لگی ہوئی تھی۔ دُرِ یکتا کے جسم پر وہی کپڑے تھے جو اغوا والے دن اس نے پہنے ہوئے تھے۔ بال بکھرے ہوئے جنہیں ہاتھ سے ہی اس نے پیچھے کر کے سنوارنے کا فریضہ انجام دیا تھا۔ حالانکہ اشعر اس کے لیے کپڑے لے کر آیا تھا اس نے دُرِ یکتا سے کہا بھی تھا کہ ان میں سے کوئی بھی پہن لیں پر خوشی میں اسے اپنے ناگفتہ بہ حلیے کی فکر ہی نہیں رہی تھی۔ اشعر کے ساتھ آتے وقت اس نے پورے جسم اور سر کے گرد اچھی طرح چادر لپیٹ لی تھی جس نے اس کی ہیئت کذائی کو چھپا لیا تھا۔

مگر گھر کی عورتوں کی نظروں سے کچھ بھی چھپ نہیں سکتا تھا۔ وہ دو راتیں اور تین دن اس کے پاس گزار کے آئی تھی۔ اشعر ایک صحت مند، تنومند نوجوان دُرِ یکتا کے ساتھ اس کا نکاح ہو چکا تھا۔ ان دو راتوں اور تین دنوں میں کیا کچھ ہوا ہوگا۔ ان میں سے کسی کے لیے بھی یہ اندازہ لگانا چنداں مشکل نہیں تھا۔ شیریں تائی، سائرہ کو پرے کرتی اس کے قریب آ بیٹھیں۔

''دُرِ یکتا، اشعر نے تمہیں کچھ کہا تو نہیں۔'' شیریں نے اپنی طرف سے خاصی آہستہ آواز میں کہا تھا۔

پر وہاں موجود فوزیہ اور فرح نے بھی سن لیا۔

''جی تائی، دھمکیاں دی تھی۔'' وہ سادگی سے بولی۔

''ارے نہیں، میرا مطلب ہے اس نے کچھ ایسا ویسا تو نہیں کیا ناں......''

شیریں نے ''کچھ ایسا ویسا'' اس انداز میں کہا کہ شرم سے وہ کٹ کے رہ گئی۔ بچی تو وہ بھی نہیں تھی جو پس پردہ مفہوم کو نہ سمجھ پاتی۔

...ند دیکھ کر شیریں سر پکڑ کے بیٹھی تھیں۔

''اف اب کیا ہوگا؟'' انہیں سارا کھیل ہاتھ سے نکلتا نظر آرہا تھا۔

''تائی، اشعر نے اس کاغذ پر مجھ سے سائن کروائے تھے۔''

''اُف دُرِ یکتا تم نے کیا کر دیا...... یہ سب کرنے کی کیا ضرورت تھی۔'' شیریں نے اسے تاسف سے دیکھا۔

''تائی اس کے بغیر میرا وہاں سے آنا ناممکن تھا۔ تب میں نے سائن کیے۔''

''میں تمہارے تایا کو دکھاتی ہوں۔ اب تو کیس بھی واپس لینا پڑے گا۔ تمہاری بے وقوفی نے یہ دن دکھائے ہیں۔ ہم جیتی بازی ہار گئے ہیں۔'' شیریں کا چہرہ لٹکا ہوا تھا۔

''ویسے اشعر لغاری اور اس کی فیملی اس طرح کی لگتی تو نہیں ہے۔ جس طرح اورنگزیب بھائی بتاتے ہیں۔'' فوزیہ پُرخیال انداز میں شیریں کے وہاں سے جانے کے بعد بولی تو فرح نے بھی تائید کی۔

''میرا بھی یہی خیال ہے کہ اس میں کوئی سچائی نہیں ہے۔ عمر بھائی نے کچھ سوچ کر ہی وہاں بیٹی دی ہے۔ اب کس قدر بدنامی ہوئی ہے۔ پورے خاندان کی اس ایک غلط فیصلے کی وجہ سے۔ اشعر بے شک شوہر ہے دُرِ یکتا کا اگر اسے ساتھ لے گیا ہے تو...... پر یہ طریقہ تو قابلِ تعریف نہیں ہے۔ اب دُرِ یکتا کے بارے میں جو باتیں ہو رہی ہیں میری بیٹی کے بارے میں کوئی کرتا تو میں مارے شرم کے کسی کا سامنا تک نہ کر سکتی۔ ہارون بتا رہے تھے، اورنگزیب بھائی نے عدالت میں کیس دائر کرنے سے پہلے اشعر کو بڑی دھمکیاں دیں کہ تم دُرِ یکتا کو طلاق دے دو۔ ایسی دھمکیاں بھلا کوئی مرد سن سکتا ہے۔ تب ہی اشعر نے یہ سب کیا۔ اسے شک تھا کہ ہم لوگ پھر بھی مکر سکتے ہیں تب ہی اس نے اسٹامپ پیپر پر یہ سب کچھ لکھوایا۔ سوچو تو کتنے شرم کی بات ہے یہ ہمارے خاندان کے لیے۔''

فرح اور فوزیہ آہستہ آواز میں باتیں کر رہی تھیں۔ انہوں نے دُرِ یکتا سے شیریں تائی کی طرح پوچھ گچھ نہیں کی تھی۔

ان کی نوجوان نسل کے لیے یہ اپنی نوعیت کا اچھوتا واقعہ تھا سب دُرِ یکتا سے طرح، طرح کے سوال کر رہے تھے۔ ان میں سائرہ پیش، پیش تھی۔

''ویسے ایک بات ہے تمہارا ہزبینڈ ہے بہت بولڈ ورنہ روڈ سے تمہیں اس طرح اٹھا کے اپنے ساتھ نہ لے جاتا......'' وہ بہت مزے سے بولی تھی۔ دُرِ یکتا الجھن محسوس کر رہی تھی۔

''وہاں جا کے اس نے تمہیں کیا کہا......؟''

دریکتا کی ایک دوسری کزن بولی تو توہین کی شدت سے اس کی آنکھوں میں نمی آگئی۔

اشعر تو اسے چھوڑ کر چلا گیا تھا اور سوالوں کے نئے باب اس کے لیے کھل گئے تھے۔

''ویسے اغوا ہونے کا بھی اپنا ہی مزہ ہے۔ اگر اغوا کرنے والا اشعر لغاری کی طرح ہو تو میں سو بار اغوا ہونا پسند کروں...... تمہاری طرح منہ لٹکا کے نہ بیٹھوں......''

''شکر ہے اشعر لغاری، دُرِ یکتا کا شوہر ہے ورنہ تم ساری زندگی اغوا ہی ہوتی رہتیں۔'' سائرہ کی بات پر ان کی ایک اور کزن بولی تو زور کا قہقہہ پڑا۔

''کاش یار ایسا ہی ہوتا......'' سائرہ کے لہجے میں بڑی حسرت تھی۔

''یعنی کہ تم اغوا ہوتی رہتیں۔'' وہی کزن حیرت سے بولی۔

''ہاں کیونکہ اشعر لغاری بالکل میرے آئیڈیل کی طرح ہے۔'' وہ یہ بات کہتے ہوئے ذرا بھی نہیں شرمائی کہ دُرِ یکتا پاس بیٹھی ہے۔

''ہاں یہ تو ہے، دُرِ یکتا کا ہزبینڈ بہت زبردست ہے۔'' دوسری کزن نے بھی تائید کی۔ ان کی باتوں سے دُرِ یکتا کے سر میں درد ہونا شروع ہو گیا تھا۔

وہ پچھلے دو گھنٹے سے اشعر لغاری کو ہی موضوعِ گفتگو بنائے ہوئے تھیں۔ مزیدار اور چٹ پٹا قصہ ہاتھ جو آیا تھا خاص طور پر سائرہ اتنی آسانی سے چھوڑنے والی نہیں تھی۔

شیریں نے وہ اسٹامپ پیپر کی نقل اورنگزیب کو دکھادی تھی۔ ان کے خوابوں کا تاج محل پوری قوت سے زمین بوس ہوا تھا۔ سب کچھ چکنا چور ہو گیا تھا۔ اشعر لغاری نے انہیں شرم ناک شکست دی تھی۔ اب وہ نہ بھی نہیں کرسکتے تھے۔

☆☆☆

مُدرِیکا لیٹی ہوئی تھی۔ وہ ذہنی طور پر بری طرح تھک گئی تھی۔ سب کے سوالوں کا سامنا اتنا بھی آسان نہیں تھا۔ اشعر نے جو کرنا تھا کرلیا تھا انا اور مردانگی کی جنگ میں فتح یاب ہوا تھا۔ پر اسے جو شرمندگی اور توہین کا احساس ہو رہا تھا آنے والی جس بدنامی کا سامنا کرنا تھا وہ اس کے لیے بہت مشکل تھی۔

گھر میں جب اتنی باتیں ہو رہی تھیں تو کیا گھر سے باہر کے لوگوں نے نہیں کی ہوں گی۔ اورنگزیب تایا اپنی غلطی مان ہی نہیں رہے تھے۔ سارا قصور اشعر لغاری کے سر تھوپ رہے تھے۔

شیریں کو زیادہ فکر اس بات کی تھی کہ اشعر لغاری، دُرِیکا سے اپنا حق وصول چکا تھا۔ حالانکہ ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ نہ مارے شرم کے مُدرِیکا اس کی وضاحت کر پائی تھی۔ اب رخصتی کرنا ضروری تھی۔ ان کے پاس انکار کا کوئی جواز نہیں رہا تھا۔ ادھر سے عاشر نے بھی کہا تھا۔ مُدرِیکا اغوا کے بعد واپس آئے یا اشعر اسے طلاق دے دے وہ اب اس شادی نہیں کرے گا۔ اس کے ذہن میں بھی وہی مخصوص روایتی سوچ تھی کہ بیوی ان چھوئی اور کنواری ہو۔

اورنگزیب نے جب اپنا پورا منصوبہ اس کے سامنے رکھا تھا تو وہ خوشی خوشی راضی ہو گیا تھا کیونکہ مُدرِیکا خوب صورت ہونے کے ساتھ، ساتھ بے پناہ جائداد کی بھی مالک تھی پر اب اسے مُدرِیکا میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس کی خوب صورتی سے بالکل بھی نہیں...... کیونکہ اشعر لغاری اپنے سارے حق استعمال کر چکا تھا۔ شیریں کی طرح اس کی سوچ بھی یہی تھی۔

☆☆☆

زیبن، طیب کو اس کے پاس چھوڑ گئی تھی۔ اس نے سوئے ہوئے طیب کی طرف کروٹ لی۔ کتنا معصوم اور دنیا کے غموں سے ناآشنا تھا وہ...... کاش وہ بھی طیب جتنی ہی رہتی کبھی بڑی نہ ہوتی تو کتنا اچھا تھا۔ اس کی سوچ ناممکن سی تھی۔

سوچ، سوچ کر مُدرِیکا کا سر درد کر رہا تھا۔ شیریں تائی کی بات اسے پھر یاد آئی تو اکیلے میں بھی وہ شرما گئی۔

اشعر کے پاس وہ دو رات رہی تھی۔ وہ مزے سے سو گیا تھا۔ اس کے پاؤں میں چوٹ لگی تھی اس لیے وہ درد کی وجہ سے سوتی جاگتی رہی تھی کچھ اس کی طرف سے خوف بھی تھا مگر اس کا خوف بے بنیاد تھا۔ پر آج جب مُدرِیکا نے اسٹامپ پیپر پر سائن کیے...... اس کے بعد جو ہوا وہ اس کے لیے ناقابلِ فراموش تھا۔ اشعر کی جرأت اور بے باکی بھولنے والی تو نہیں تھی۔ اس کے حلق میں جیسے کانٹے پڑ گئے تھے۔ پانی کا گلاس لبوں سے لگایا اور ایک ہی سانس میں پی گئی۔ اس وقت تنہائی تھی وہ آرام سے ہر چیز پر غور کر سکتی تھی۔

صبح کے واقعے کی جزئیات تک اسے یاد تھیں۔ یاد کرتے ہی اس کے ماتھے پر پسینہ آگیا۔ ساتھ سائرہ کا تبصرہ بھی کہ مُدرِیکا کا ہزبینڈ بہت بولڈ ہے۔ اس کی نیند ہی آج پلکوں سے روٹھ گئی تھی۔

☆☆☆

طاہر لغاری تاسف سے اسے دیکھ رہے تھے۔ وہ سب کچھ بتا چکا تھا۔

"اشعر تم نے یہ سب کیوں کیا...... کم سے کم مجھے بتاتے تو...... میں تمہیں ایسا کبھی نہ کرنے دیتا۔"

"پپا اب جو ہونا تھا ہو چکا ہے۔ وہ لوگ اب رخصتی سے انکار نہیں کریں گے۔"

"اشعر میں پہلے ہی اپنے خاندان والوں کی باتوں سے ڈر رہا تھا کہ اشعر کی منکوحہ نے اسے عدالت میں گھسیٹ لیا ہے۔ میں ایسی بدنامی فیس نہیں کرسکتا۔"

"پپا کیسی بدنامی؟ میں کسی اور کو نہیں اپنی بیوی کو

لے گیا تھا۔ اس میں کوئی بات کرتا ہے تو کرے، میں پروا نہیں کرتا...... پپا وہ سب لوگ حتیٰ کہ خود دُرِ یکتا تک نامناسب رویے کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ مجھے دھمکیاں دی جا رہی تھیں، خلع کے لیے دباؤ ڈالا جا رہا تھا۔ جیسے میں کوئی زرخرید ملازم ہوں ان لوگوں کا...... تو بس دماغ گھوم گیا میرا......'' وہ اپنی ذہنی کیفیت باپ کو بتا رہا تھا۔

''پپا، میں اپنی عزتِ نفس اور انا پر چوٹ برداشت نہیں کرسکتا۔ کسی صورت بھی نہیں...... دُرِ یکتا کے تایا کی اکڑ فوں نکل گئی ہے اور دُرِ یکتا کی بھی۔'' آخری تین لفظ اس نے دل میں کہے...... ''اب میں نے پکا کام کردیا ہے۔ رخصتی سے انکار نہیں ہوگا۔'' دل ہی دل میں وہ مسکرا رہا تھا۔

''چلو یہ تو اچھی بات ہے، بہتری اسی میں ہے کہ میں دُرِ یکتا کو جلد سے جلد رخصت کروا کے لے آؤں۔'' طاہر لغاری پُرسوچ انداز میں بولے۔

''ہاں پپا ٹھیک ہے۔'' اشعر نے بھی تائید کی۔

دُرِ یکتا کو وہ چھوڑنے گیا تو اس کے تایا کے رویے میں پہلی جیسی کوئی بات نہیں تھی۔ وہ اکڑ وہ غرور کچھ بھی نہیں تھا۔

اشعر جیت چکا تھا جو چیز اس کی انا اور غیرت کے لیے چیلنج بنی ہوئی تھی۔ وہی اس کی فتح بن گئی تھی۔

دُرِ یکتا کا ڈرا ڈرا خوف زدہ انداز گریز یا رویہ یاد آتے ہی اشعر کے لبوں پر مسکراہٹ آگئی۔ کہاں تو شیر بنی ہوئی تھی اور کہاں اس کے سامنے آکر بھیگی بلی بن گئی تھی۔ فارم ہاؤس میں اس نے خود سے اشعر سے کم ہی بات کی تھی۔ اس کا سارا زور رونے کی طرف تھا یا پھر ڈرنے کی طرف...... اس کی آنکھوں اور رویے میں ڈر تھا۔ جیسے اشعر کوئی ڈریکولا یا پھر خوفناک انگریزی فلموں کا کوئی کردار ہو جو موقع ملتے ہی اسے چیر پھاڑ کے کھا جائے گا۔ پتا نہیں وہ اتنی خوفزدہ کیوں تھی اس سے۔ اشعر کو یہ بات پوچھنی یاد ہی نہیں رہی تھی۔ جب وہ یہاں آجاتی رخصت ہو کے تو تب اس نے پوچھنا تھا کہ محترمہ آپ مجھ سے اس قدر خوفزدہ کیوں ہیں۔ جب وہ اسے پہلی بار زبردستی ساتھ لے کے جا رہا تھا تب وہ گاڑی میں خوف کی وجہ سے بے ہوش ہوگئی تھی۔ پتا نہیں اس سے کیا کہا گیا تھا جو وہ اتنی کبیدہ خاطر تھی۔



☆☆☆

شیریں، مائرہ کو چھوڑنے جا رہی تھیں۔ دُرِ یکتا کی وجہ سے وہ اس مسئلے پر دھیان نہیں دے پائی تھیں۔ اب فرصت تھی۔ انہوں نے حمزہ احمد سے خود بات کرنی تھی۔ باسط ایک ذرا سی بات پر مائرہ سے اس طرح ناراض ہوگیا تھا۔ اس انتہا تک جانا اچھا نہیں تھا۔ شیریں کے دل میں تلخی آگئی تھی۔

بینا ان دونوں کو دیکھ کر بہت خوش ہوئی۔ مائرہ کافی دن بعد واپس آئی تھی۔ بینا بڑی محبت سے ملی۔ شیریں اکھڑی، اکھڑی تھیں بینا فوراً بھانپ گئی کہ کوئی

بات ہے، انہیں کھانا کھلا کے وہ اپنے بیڈ روم میں ہی لے آئی اور پھر بات کا آغاز کیا۔

''آپا کیا بات ہے، آپ کچھ ناراض، ناراض سی لگ رہی ہیں۔''

''ہاں، میں ناراض ہی ہوں، بات ہی ایسی ہے۔ میں حمزہ بھائی کے سامنے بات کروں گی تم سے۔'' شیریں اسی موڈ میں تھیں۔ بینا پریشان ہوگئی کہ یقیناً کوئی خاص بات ہے جو آپا، حمزہ کے سامنے بات کرنا چاہ رہی ہیں۔ اس نے پھر نہیں پوچھا۔ حمزہ گھر آئے تو شیریں نے پھر انہیں ساری بات بڑھا چڑھا کے بتائی۔

☆☆☆

جہاز لینڈ کرنے میں تھوڑا ہی ٹائم تھا۔ باسط فضا کی بلندی سے نیچے نظر آنے والی عمارتوں کو دیکھ رہا تھا۔ رفتہ، رفتہ چیزوں کا حجم بڑا ہوتا جا رہا تھا اور سب کچھ واضح ہو رہا تھا۔ درخت، عمارتیں، روڈ، سڑک پر بھاگتی دوڑتی گاڑیاں، قریب اور قریب سے نظر آ رہی تھیں۔ جہاز کا زمین سے فاصلہ کم ہوتا جا رہا تھا۔

باسط کو پاکستان میں ایک آدمی سے ملنا تھا۔ اس کا اچانک پروگرام بنا تھا۔ اس نے سرپرائز دینے کے چکر میں گھر میں کسی کو بھی اپنے آنے کا نہیں بتایا تھا۔

ائرپوٹ سے باہر آ کر اس نے ٹیکسی کو اشارے سے روکا اور بیٹھ گیا۔ گھر کے سامنے اترا تو چھوٹا گیٹ کھلا ہوا تھا۔

وہ لان سے گزر کر اندر آیا۔ کوئی ذی نفس بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ دوپہر کا وقت تھا اس نے سوچا سب آرام کر رہے ہوں گے۔ دبے پاؤں اپنے بیڈ روم کی طرف آیا تو لاؤنج میں بھی کوئی نہیں تھا۔ ڈرائنگ روم سے ہلکی، ہلکی باتوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔

''اچھا تو سب وہاں ہیں۔'' اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی یہ سوچتے ہوئے کہ سب اسے دیکھ کر کتنا خوش ہوں گے وہ آرام، آرام سے آہستگی سے چلتا ہوا ڈرائنگ روم کی طرف آنے لگا۔ دروازہ ہلکا سا نیم وا تھا۔ اب آنے والی آوازیں واضح تھیں اور قابلِ شناخت تھیں۔

''حمزہ بھائی کبھی بینا نے آپ کو شکایت کا موقع دیا۔ اس نے ساری زندگی بھی آپ کو یا باسط کو احساس دلایا کہ وہ باسط کی سگی ماں نہیں ہے۔ میری بہن کا دل اور ظرف بہت بڑا ہے۔ اور باسط نے صرف اس بات پر کہ مائرہ، طیب کو ڈاکٹر کے پاس کیوں لے گئی ناراض ہو گیا۔ اس حد تک کہ کوئی لحاظ بھی نہیں کیا صاف کہہ دیا کہ اب اپنی ماں کے گھر ہی رہو۔ یہ اتنی بڑی بات تو نہیں تھی۔ کاش بینا کا ظرف اور حوصلہ باسط میں بھی آ جاتا۔ آخر کو اس کی گود میں پلا بڑا ہے۔ کچھ تو اثر ہوتا ناں کہ بینا نے اس کی پرورش کی ہے۔''

شیریں خالہ کی آواز ایک، ایک لفظ، سماعتوں میں زہر بن کے اتر رہا تھا۔ پر خود کو سنبھالنا ضروری تھا جو کچھ وہ سن چکا تھا اس سے زیادہ سننا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ اس نے فوری طور پر کچھ سوچا اور قدم موڑ لیے۔ وہ کسی کی نظر میں آئے بغیر یہاں سے لوٹنا چاہتا تھا۔

جونہی وہ گیٹ سے باہر نکلا...... اس کی نظر دائیں طرف سے آتی میرون کلر کی کرولا پر پڑی۔ یہ ایاز تھا۔ اس کی نظر ابھی تک باسط پر نہیں پڑی تھی۔ پر گاڑی قریب آ گئی تھی۔ باسط گیٹ کی طرف منہ کر کے کھڑا ہو گیا جیسے ابھی بھی پہنچا ہو۔

وہ یہ تاثر دینے میں پوری طرح کامیاب رہا تھا۔ ایاز چھلانگ مار کے نیچے اترا اور اس کے گلے لگ گیا۔

''بھائی آپ کب آئے اور اس طرح...... بتایا بھی نہیں۔''

''بس سوچا تم سب کو سرپرائز دوں اس وجہ سے نہیں بتایا۔'' اس نے تیزی سے خود کو سنبھالا۔ پر نہ جانے کیوں آج ایاز سے ملتے ہوئے اس کے رویے میں سرد مہری سی تھی۔ ایاز نے اپنی خوشی میں اس بات کو محسوس ہی نہیں کیا۔ ایاز گاڑی سے اتر کر تیزی سے اندر بھاگا۔ باسط دوبارہ جب گھر میں داخل ہوا تو سب

## حسن والے

طبیب ملتے ہیں پر دوا نہیں ملتی
دوا اگر ملتی ہے تو شفا نہیں ملتی
میں ساری دنیا ڈھونڈ آیا فراز
حسن والے تو ملتے ہیں پر وفا نہیں ملتی

مرسلہ: نگینہ ضیا بخش، کراچی

## ضرورت

کسی انسان کا پہلا پیار بننا کوئی بڑی بات نہیں بننا ہے تو کسی کا آخری پیار بنو اس لیے یہ کبھی مت سوچو کہ تم سے پہلے وہ کسی اور سے پیار کرتا تھا کوشش یہ کرو کہ تمہارے بعد اسے کسی اور کے پیار کی ضرورت ہی نہ رہے۔

مرسلہ: ایس انمول، بھابڑا شریف

اس کے استقبال کے لیے تیار کھڑے تھے۔ شیریں خالہ، مائرہ، حمزہ احمد، بینا اس کے چھوٹے بہن بھائی۔ سب ہی تو تھے۔ اسے چمکتی محبت بھری نگاہوں سے تکتے...... بینا حسبِ معمول اس کا ماتھا چوم کے سینے سے لگا کر ملی۔ پر آج باسط بجھا، بجھا سا تھا۔ شیریں جو کچھ دیر پہلے حمزہ اور بینا کے سامنے گرج برس رہی تھیں اس وقت صدقے واری ہوئی جا رہی تھیں۔ کتنا تضاد تھا ان کے رویے اور سوچ میں۔

مائرہ البتہ کچھ ڈری، ڈری سی لگ رہی تھی کہ جانے باسط اسے کیا کہے...... تنہائی ملتے ہی وہ اس کے قریب آگئی۔ باسط کے بازو اس کی سمت نہیں بڑھے وہ خود اس کی بانہوں میں سما گئی۔

''باسط آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔ بس آخری غلطی تھی معاف کردو۔ اب میں طیب کی طرف پلٹ کر دیکھوں گی بھی نہیں۔'' وہ اس کے کانوں میں سرگوشیاں کر رہی تھی۔ جواب میں باسط نے اسے عجیب سی نگاہوں سے دیکھا۔ شیریں خالہ کی کہی باتیں کانوں میں گونجنے لگیں۔ ایک دم اندر کوئی آگ سی بھڑکنے لگی تھی۔ اس نے مائرہ کو بازوؤں کی گرفت سے آزاد کردیا اور خود سگریٹ سلگا لیا۔ خوب گہرے، گہرے کش لیے کہ شاید سکون مل جائے۔ پر کہاں اس کے من میں دور تک بے چینی اور بے سکونی پھیلی ہوئی تھی۔ کتنے کڑوے سچ کا سامنا کرنا پڑا تھا آج...... سچ کڑوا اور جان لیوا تھا۔ بینا اس کی سگی ماں نہیں تھیں...... پر آج تک کبھی ان کے رویے سے یہ بات ظاہر یا محسوس نہیں ہوئی تھی۔ وہ ایاز سے بھی زیادہ اس کا خیال رکھتی تھیں۔ آج تک اس سے یہ بات چھپائی گئی تھی جانے کیا مصلحت تھی اس میں...... کاش یہ بات چھپی ہی رہتی یا پھر اسے بہت پہلے بتا دی جاتی۔ وہ ریزہ، ریزہ ہو کے ایسے بکھرتا تو نہیں...... وہ اندر ہی اندر ٹوٹ رہا تھا، بکھر رہا تھا۔ کوئی سمیٹنے والا تک نہیں تھا۔ اسے خود کو خود ہی جوڑنا تھا۔

کاش وہ گھر نہ آتا یا اپنے آنے کی اطلاع دے دیتا۔ کاش وہ شیریں خالہ کے منہ سے اتنے کڑوے اور زہریلے انداز میں اس سچ کو نہ سنتا...... کاش ابو اسے خود بتاتے یا پھر امی اسے پاس بٹھا کر آرام سے بتا دیتیں کہ میں تمہاری اصلی ماں نہیں ہوں۔ پھر شاید اسے اتنا دکھ نہیں ہوتا...... اسے اس کرب سے نہ گزرنا پڑتا۔ کاش، کاش یہ سب نہ ہوتا۔ کاش اسے پتا نہ چلتا۔

☆☆☆

سورج کی کرنیں کمرے میں جھانک رہی تھیں۔ مائرہ کی آنکھ کھل گئی اور سب سے پہلے اس نے اپنی دائیں سائڈ پر دیکھا۔ باسط کی جگہ خالی تھی۔ اس کے جوتے، رسٹ واچ اور موبائل فون بھی سامنے ٹیبل پر موجود نہیں تھا۔ وہ واش روم میں بھی نہیں تھا۔ مائرہ باہر آئی کہ شاید وہ بینا خالہ کے پاس ہو، وہ وہاں بھی نہیں تھا۔ وہ الٹا اس سے پوچھنے لگیں کہ باسط ابھی تک سو رہا ہے۔ مائرہ اسے ڈھونڈنے باہر آئی تھی اور وہ اسی سے پوچھ رہی تھیں۔ وہ پورے گھر میں نہیں تھا۔ چوکیدار سے معلوم ہوا کہ چھوٹے صاحب رات تین بجے گھر سے نکلے تھے... بغیر گاڑی کے۔

''وہ کہہ رہے تھے کہ میں ائرپورٹ تک ٹیکسی لے لوں گا۔'' چوکیدار بتا رہا تھا۔

بینا کو ڈر لگ رہا تھا۔ اس کے ذہن میں خود ہی یہ بات آئی تھی کہ باسط کو پتا چل گیا ہے وہ اس کی ماں نہیں ہے۔ اس نے سن لیا ہے۔ تب ہی یہاں سے بغیر بتائے اس طرح گیا ہے۔ باسط نے وہاں جا کے کال کی تو اس کی جان میں جان آئی۔

''امی ایک ضروری کام تھا اس لیے جلدی میں آنا پڑا مجھے... سب سو رہے تھے۔ میں نے سوچا کیا جگاؤں اس لیے اکیلا ہی آیا ائرپورٹ تک۔'' وہ نارمل طریقے سے بول رہا تھا۔ بینا نے رکی، رکی سی سانس خارج کی، اب دل کو کہیں سکون ملا تھا اور ایک بوجھ اترا تھا۔ پر مائرہ، باسط سے ناراض تھی۔

☆☆☆

باسط کبھی زندگی بھر نہیں رویا تھا پر ائرپورٹ سے اپنے اپارٹمنٹ تک پہنچتے ہی وہ اپنے بستر پر ایسے گرا جیسے میلوں دور سے پیدل چل کے آیا ہو۔ جن آنکھوں میں مائرہ کے نام سے دیے جلتے تھے وہ آنکھیں اب بھیگ رہی تھیں۔ دبئی آ کے کالے دھندے سے وابستہ ہونے کے بعد اس کا دل سخت ہو گیا تھا پر آج احساس ہوا کہ ایک گوشت پوست کا بنا دل سینے میں ہے اور قطرہ، قطرہ پگھل رہا ہے، موم کی طرح...... اسے بے پناہ گھٹن کا احساس ہو رہا تھا کوئی چیز نس، نس کو کاٹ رہی تھی، چھید رہی تھی۔ باسط نے شرٹ اور اس کے نیچے پہنی ہوئی بنیان بھی اتار کر پھینک دی پھر شاور کھول کر کھڑا ہو گیا۔ پر اندر آگ ہی آگ بھڑک رہی تھی۔ اس نے اپنی آنکھوں کو دھیرے سے چھوا۔ وہ بھیگ رہی تھیں۔ اس نے سر کے بال دونوں مٹھیوں میں جکڑ لیے۔

''نہیں، نہیں۔'' وہ زور، زور سے چیخنے لگا اور اپنا سر پوری قوت سے بیڈ کی پٹی سے ٹکرایا۔ شاید اس جنون کو سکون مل جائے۔ سکون ہوتا تو ملتا وہ تو نہ ملا پر اس کا سر پھٹ گیا تھا۔ وہ پوری قوت سے چیخ رہا تھا۔

☆☆☆

نوید نے اورنگزیب کو کسی نہ کسی طرح آمادہ کر لیا تھا کہ عمر کو چیک اپ کے لیے کسی ڈاکٹر کے پاس لے جایا جائے۔

خلافِ توقع وہ مان گئے تھے۔ نوید کو اپنے دماغ سے ایک بوجھ اترتا محسوس ہوا۔ وہ عمر کو دیکھ کر احساس جرم کا شکار ہو جاتا۔ ان تینوں بھائیوں میں سے کسی نے سنجیدگی سے اس کے علاج پر توجہ نہیں دی تھی۔

شاہ زیب کی حادثاتی موت نے عمر زیب کا دماغ ماؤف کر دیا تھا۔ اورنگزیب کا کہنا تھا کہ عمر اس طرح رہے تو ٹھیک ہے۔ جب وہ تندرست ہوگا تو شاہ زیب کا صدمہ اسے مار ڈالے گا۔ اورنگزیب نے نوید اور ہارون کو بھی قائل کر لیا تھا۔ اس کے بعد عمر کی ذہنی حالت خراب سے خراب تر ہوتی چلی گئی۔ ہر کسی کی اپنی دنیا تھی کسی کو احساس نہیں تھا۔ اورنگزیب ماحول کی تبدیلی کے بہانے عمر کو گاؤں لے آئے تھے۔ تب سے وہ اور دُرِ یکتا ادھر ہی تھے۔ دُرِ یکتا بیٹی ہونے کے ناتے باپ کے لیے کڑھتی، پریشان ہوتی عمر اب جارحیت پر اتر آئے تھے جس کو دیکھتے مارنے کے لیے دوڑتے..... نوید کے دل میں قدرت کی طرف سے ہی یہ خیال آیا تھا کہ اسے عمر کا بھائی ہونے کے ناتے اپنا فرض ادا کرنا چاہیے۔

امجد بھی گاؤں آیا ہوا تھا۔ نوید اسی کے ساتھ عمر کو لے کر شہر آئے۔ ڈاکٹر سے انہوں نے پہلے ہی ٹائم لے لیا تھا۔ اس لیے انتظار کی زحمت سے بچ گئے۔

یہ ذہنی اور نفسیاتی امراض کا مشہور اسپتال تھا۔ نوید کو پوری امید تھی کہ عمر یہاں سے ٹھیک ہو جائیں گے۔ عمر کے مختلف قسم کے ٹیسٹ ہوئے۔ ڈاکٹرز کی ٹیم نے آپس میں مشورے کے بعد عمر کو ایڈمٹ کرنے کا مشورہ دیا۔ انہیں عمر کا کیس کافی دلچسپ اور قابلِ توجہ نظر آیا تھا۔ نوید نے اسپتال میں ہی دُرِ یکتا کو کال کر کے بتایا۔ وہ بھی پپا کے مکمل علاج کروانے کے حق میں تھی۔ جب نوید آج عمر کو ساتھ لے کر آ رہے تھے تو دُرِ یکتا نے

انہیں بھیگی، بھیگی متشکرانہ نگاہوں سے دیکھا تھا۔ ان نگاہوں میں چمکتی نمی نے نوید کے ملال کو کچھ اور بھی بڑھا دیا تھا۔

انہوں نے عمر زیب کو اسپتال، ایڈمٹ کروا دیا تھا۔ ان کا علاج، طویل، محنت طلب اور صبر آزما تھا۔ انہیں لمبا عرصہ اسی اسپتال میں گزارنا تھا۔

بہر حال ایک امید کی کرن نظر آئی تھی جسے نوید نے اپنی مٹھی میں جکڑ لیا تھا۔ عمر ایڈمٹ ہو چکے تھے اور ڈاکٹرز نے علاج شروع کر دیا تھا۔ دُرِ یکتا کو امید تھی کہ پپا ٹھیک ہو جائیں گے۔ نوید نے اورنگزیب بھائی کو عمر کے علاج کی بابت بتایا وہ غائب دماغی سے سر ہلا رہے تھے۔ انہوں نے کسی خاص دلچسپی کا اظہار نہیں کیا تھا۔ وہ اپنی پریشانیوں میں ڈوبے ہوئے تھے۔ اشعر والے مسئلے نے انہیں زچ کر کے رکھا ہوا تھا۔ انہیں کسی وقت بھی دُرِ یکتا کی رخصتی کے لیے تیاری مکمل رکھنی تھی۔ یعنی انہوں نے سارے فوائد سے ہاتھ دھو لیا تھا۔ دُرِ یکتا کی جائداد پہ قبضے اور اختیار کا خواب ادھورا رہ گیا تھا۔ جو کچھ شاہ زیب نے مائرہ اور اپنے پیدا ہونے والے بچے کے لیے چھوڑا تھا اس میں سے کچھ نہیں بچا تھا۔ مائرہ اسی گمان میں تھی کہ وہ شاہ زیب کے کاروبار کی مالک ہے۔ بے شک سب کچھ خسارے میں تھا پر مالک ہونے کا بھی تو اپنا نشہ ہوتا ہے، اگر وہ ان سے کاروبار کے بارے میں پوچھ لیتی تو وہ کیا جواب دیتے۔ عاشر نے اور انہوں نے جو فائدہ اٹھانا تھا اٹھا لیا تھا باقی کچھ بھی نہیں تھا۔ دُرِ یکتا کے اکاؤنٹ میں سے بھی انہوں نے تقریباً سب پیسے نکلوا لیے تھے۔ اس نے تو شاہ زیب کے نام اور ان کے بزنس کی خاطر ان پر اندھا اعتبار کیا تھا۔ وہ سب پیسہ ان کی جیب میں گیا تھا۔ تھوڑا بہت تھوڑا ہارون اور نوید کو دیا تھا لیکن زیادہ ان کے پاس تھا۔ عمر زیب کے کاروبار کا انہوں نے بیڑا غرق کر کے رکھ دیا تھا۔ حالات تباہی کی طرف اشارہ کر رہے تھے اب ہارون بھی ان سے الگ ہو گیا تھا۔ اسے آنے والی مشکلات کا اندازہ ہو گیا تھا۔ نوید عمر کو اسپتال ایڈمٹ کروا آیا تھا۔ دوسری بار ہارون ان کے ساتھ اسپتال گیا اور عمر کے جگری دوست طاہر لغاری کو بھی بتا دیا۔ عمر کا علاج سست رفتاری سے ہو رہا تھا مگر ہو رہا تھا۔ ڈاکٹرز، عمر زیب کی حالت اور رویے کو تسلی بخش قرار دے رہے تھے۔ نوید نے دُرِ یکتا سے وعدہ کیا تھا کہ اگلی بار جب میں عمر کا پتا کرنے جاؤں گا تو تمہیں بھی ساتھ لے کے جاؤں گا۔ یہاں سے وہ خود بھی تین چار دن بعد اسپتال کا چکر لگا لیتے اس کے علاوہ انہوں نے عمر کی دیکھ بھال کے لیے اپنے ایک ملازم کو اسپتال میں چھوڑا ہوا تھا حالانکہ اس کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ عمر کی بہترین دیکھ بھال ہو رہی تھی۔

☆☆☆

طاہر لغاری عمر کے پاس بیٹھے تھے۔ عمر آنکھیں موندے لیٹے تھے۔ اشعر بھی باپ کے ساتھ تھا۔ طاہر نے سب سے پہلے ڈاکٹرز سے مل کر عمر کے علاج کے بارے میں پوچھا تو انہیں کچھ تسلی ہوئی۔ انہیں ایک بات کا دکھ پھر بھی تھا کہ عمر کے بھائی انہیں بہت دیر کے بعد اسپتال لائے پھر بھی عمر کے علاج کی کامیابی کی پوری امید تھی۔

''میرے دوست میں گاؤں جا رہا ہوں، تمہارے بھائی اورنگزیب سے دُرِ یکتا کی رخصتی کی تاریخ لینے، کاش تم خود ٹھیک ہوتے اور اپنے ہاتھوں سے اپنی بیٹی کو رخصت کرتے۔'' طاہر، عمر کے پاس بیٹھے اسے یوں بتا رہے تھے جیسے وہ سن رہے ہوں اور سمجھ رہے ہوں۔ وہ تو سابقہ پوزیشن میں لیٹے ہوئے تھے۔ طاہر کا بتانا نہ بتانا ایک برابر تھا۔

☆☆☆

طاہر، اورنگزیب سے شادی کی تاریخ لینے آئے ہوئے تھے۔ انہوں نے کوئی چون و چرا کیے بغیر دس دن بعد کی تاریخ دے دی۔

دل میں پریشان بھی تھے کہ دُرِ یکتا کی شادی اپنے رتبے، خاندان اور عزت کے شایانِ شان کیسے ہوگی۔ طاہر لغاری نے تو کہا تھا کہ مجھے کسی چیز کی بھی ضرورت

نہیں ہے۔ اشعر نے بھی سختی سے منع کیا تھا..... پر وہ دُرِ یکتا کو ایسے ہی تو رخصت نہیں کر سکتے تھے۔ خاندان کی عزت اور آن بان کا بھی خیال تھا۔ ان کے کس بل نکل گئے تھے اس لیے کہ اب دُرِ یکتا کی موجودگی کا انہیں کوئی فائدہ نہیں تھا سوائے اس کے کہ وہ بھتیجے کو سنبھال رہی تھی۔

دُرِ یکتا تو یہی چاہتی تھی کہ شادی انتہائی سادگی سے ہو، بے شک کسی کو بھی نہ بلایا جائے، اسے سب کے سوالوں سے الجھن ہوتی اور وہ ڈرتی بھی تھی۔ پپا اسپتال میں تھے، وہ کسی قسم کی دھوم دھام کے حق میں بھی نہیں تھی۔

شیریں نے بھی اورنگزیب کو یہی صلاح دی تھی کہ شادی سادگی سے ہو۔ چار دن وہ اشعر کے ساتھ گزار آئی تھی۔ ایک کیسی رخصتی اور کہاں کی دھوم دھام۔ وہ دُرِ یکتا کے بارے میں بڑے تنفر اور غلط انداز سے سوچ رہی تھیں۔

وہ تو رخصت ہو کے چلی جاتی طیب کو کون سنبھالتا۔ مائرہ اپنے گھر تھی۔ باقی کوئی بھی طیب کی ذمے داری لینے کے لیے تیار نہیں تھا۔

☆☆☆

طاہر، اورنگزیب کے پاس سے اٹھ کر دُرِ یکتا کے پاس آئے۔ وہ اداس اور متفکر سی بیٹھی تھی۔ اس نے سلام کیا تو طاہر نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا، دعائیں دیں۔ وہ اپنے گزشتہ رویے پر شرمندہ تھی۔ ان سے نگاہ ہی نہیں ملا پا رہی تھی۔ نہ اتنی ہمت ہو رہی تھی کہ طاہر انکل سے وہ بہت کچھ کہنا چاہ رہی تھی پر ہچکچا رہی تھی۔

وہ بھانپ گئے تھے کہ دُرِ یکتا ان سے کچھ کہنا چاہ رہی ہے پر ڈر رہی ہے۔ انہوں نے اسے حوصلہ دیا۔

''بیٹی تم مجھ سے کچھ کہنا چاہ رہی ہو، میں محسوس کر رہا ہوں پر تم بول نہیں پا رہی ہو۔ ایسی کون سی الجھن ہے، کیا مجھے نہیں بتاؤ گی، میں عمر کی جگہ ہوں۔'' وہ بے بسی سے انہیں تکنے لگی۔

''بولو بیٹا جو بات ہے..... جو تمہارے دل میں ہے۔'' وہ اسے بولنے پر آمادہ کرنے کی کوشش کرنے لگے۔

دُرِ یکتا کو ان کی نرمی نے کچھ حوصلہ دیا۔

''انکل، طیب کسی کے پاس بھی نہیں رہتا۔ مائرہ بھابی کا تو آپ کو پتا ہی ہے، وہ اپنی سسرال میں ہیں۔ طیب کو ساتھ لے کر نہیں گئیں۔ باقی وہ کسی کے پاس نہیں رہتا۔ میرے ساتھ وہ بہت مانوس ہے، کیسے رہ پائے گا۔ کون دیکھ بھال کرے گا اس کی۔ ہر ایک کی اپنی زندگی ہے، کوئی بھی طیب کی ذمے داری نہیں لے گا۔'' آخر میں وہ تھوڑا تلخ سی ہو گئی تو طاہر اس سادہ اور بے غرض سی لڑکی کو دیکھنے لگے جسے اپنی زیادہ فکر نہیں تھی بلکہ اس چھوٹے سے بچے کی فکر تھی جو ابھی ایک سال کا بھی نہیں تھا۔ وہ اس کی باتوں سے مطلب کی بات تک پہنچ گئے تھے۔

''تم طیب کو یہاں چھوڑنا نہیں چاہتیں؟ میرا مطلب ہے کوئی یہاں اسے رکھنے والا نہیں ہے؟''

''نہیں طاہر انکل، زینب ہے تو..... پر وہ تنخواہ دار نوکرانی ہے، میں اعتبار نہیں کر سکتی۔''

''تو پھر تم شادی کے بعد طیب کو ساتھ لے جاؤ۔'' انہوں نے اس کے دل کی بات کہہ دی۔ دُرِ یکتا کا چہرہ دیکھنے والا تھا۔ اس پر خوشیوں کے ہزاروں رنگ بکھر گئے تھے اور ہر رنگ اپنی جگہ مکمل اور خوب صورت تھا۔

''انکل کیا آپ سچ کہہ رہے ہیں؟'' بے یقینی سے اس کی آواز لرز رہی تھی۔

''بالکل سچ ..... کیونکہ میں جھوٹ نہیں بولتا۔ میرے گھر میں بہت جگہ ہے۔ طیب، عمر کا پوتا ہے۔ آخری نشانی ہے شاہ زیب کی۔ عمر سے وابستہ ہر چیز اور ہر رشتہ مجھے عزیز ہے۔'' وہ مضبوط لہجے میں بولتے ہوئے دُرِ یکتا کے چہرے پر چھائے بے یقینی کے بادلوں کو ہٹتا دیکھنے لگے۔

''کسی اور کو تو کوئی اعتراض نہیں ہوگا جب میں طیب کو ساتھ لاؤں گی؟'' وہ دانستہ طور پہ اشعر کا نام

نہیں لینا چاہ رہی تھی۔

''ارے میرے گھر میں نوکروں کے علاوہ میں اور اشعر ہوتے ہیں۔ جب مجھے اعتراض نہیں ہے تو پھر اشعر کو بھی نہیں ہوگا۔ وہ غصے کا تیز ہے، انا پسند ہے پر انسانیت اور انسانیت سے وابستہ رشتوں کو جانتا ہے، باشعور ہے۔ اس کی فکر مت کرو میں اسے سمجھا دوں گا۔'' طاہر بھی اس کی ہچکچاہٹ بھانپ گئے تھے اس لیے آرام اور تسلی سے بات کی۔

''انکل میری ایک بہت بڑی فکر ختم ہوگئی ہے۔ میں طیب کی وجہ سے بہت پریشان تھی کہ اس کا کیا ہوگا۔'' وہ انہیں یہ نہیں بتا سکتی تھی کہ وہ کیا، کیا سوچتی رہی تھی۔ وہ پچھتاتی تھی کہ اس اسٹامپ پیپر پہ اپنے دستخط کیوں کیے۔ اسی وجہ سے تو پورا گھر پریشان اور مایوسی کا شکار تھا۔ اس نے یقیناً بہت بڑی غلطی کر دی تھی تبھی تو اورنگزیب تایا خاموش رہنے لگے تھے ورنہ اس سے پہلے اس نے انہیں اس طرح اداس، خاموش اور پریشان نہیں دیکھا تھا۔ دُرِیکتا نے اسٹامپ پیپر پر سائن کر کے اور وہ تحریر اشعر کے حوالے کر کے بہت بڑی غلطی کی تھی اپنے پاؤں پر کلہاڑی ماری تھی۔ ورنہ وہ کبھی اس طرح رخصتی پر مجبور نہ ہوتی۔ دُرِیکتا کی سوچ طاہر انکل سے بات کرنے کے باوجود بھی ایسی ہی تھی۔

☆☆☆

طاہر لغاری نے شادی کے کارڈ چھپنے کے لیے دے دیے تھے۔ ان کی دونوں بیٹیاں، داماد اور بچے پاکستان آگئے تھے۔ اشعر کی بہنیں دونوں بڑی تھیں۔ نکاح پر نہیں آپائی تھیں۔ یہاں آ کے روبرو پہلی بار اپنی بھائی کو دیکھا تھا۔ بہت خوش تھیں دونوں بہنیں...... ان کا اکلوتا بھائی تھا۔ بہت ارمان تھے ان کے دل میں اپنے اپنے انداز سے خوشی کا اظہار کر رہی تھیں۔ مہمانوں کی لسٹ بن رہی تھی۔ وقت کم تھا لائبہ اور ثمرہ شادی کی شاپنگ کر رہی تھیں۔ ساتھ، ساتھ اشعر سے چھیڑ چھاڑ کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ طاہر لغاری نے لائبہ، ثمرہ اور اشعر تینوں کو دُرِیکتا کے بھتیجے طیب کے بارے میں آگاہ کر دیا تھا کہ وہ شادی کے بعد دُرِیکتا کے ساتھ اسی گھر میں رہے گا۔ اشعر کچھ نہیں بولا تھا۔ پر لائبہ اس کی سب سے بڑی بہن نے چھیڑ، چھیڑ کر ناک میں دم کر دیا تھا۔

''اشعر تمہیں تو جہیز میں ایک چھوٹا سا رقیب بھی مل رہا ہے۔'' وہ اسے شرارتی نگاہوں سے دیکھ رہی تھیں۔

''تو پھر کیا ہے...... میں چھوٹے بڑے سب رقیبوں سے نمٹ لوں گا۔'' اشعر نے بات مذاق میں اڑا دی تھی۔

ثمرہ، اشعر سے بڑی اور لائبہ سے چھوٹی تھی۔ وہ سنجیدہ مزاج تھی پر اشعر کو تنگ کرنے سے باز وہ بھی نہیں آرہی تھی۔ طاہر بہت خوش تھے۔ بہن، بھائی کے ہنسی مذاق نوک جھوک سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ برسوں بعد اس گھر میں خوشیوں کی بارات اتری تھی۔ ان میں جوانوں کی سی پھرتی اور تیزی آگئی تھی۔ بڑھ چڑھ کر سب کاموں میں حصہ لے رہے تھے۔ مشورے دے رہے تھے۔ آخر ان کے اکلوتے بیٹے کی شادی تھی۔

☆☆☆

دُرِیکتا پہلی بار اسپتال آئی تھی پیا کو دیکھنے......

پرسوں اس کی رخصتی تھی۔ فوزیہ چچی نے خود کہا تھا کہ شادی سے پہلے جا کے پیا کو دیکھ لو۔ دُرِیکتا خود بھی یہی چاہ رہی تھی۔ اس کے ساتھ فرح اور فوزیہ چچی دونوں آئی تھیں۔

عمر زیب الگ روم میں تھے۔ نرس نے انہیں ابھی ان کے سامنے دوائی کھلائی اور انجکشن لگایا تھا۔

''پیا آپ ٹھیک ہیں؟'' دُرِیکتا سامنے کھڑی تھی، انہوں نے ایک ثانیے کے لیے نگاہیں اٹھا کے اسے دیکھا اور پھر خود میں گم ہوگئے تھے۔ جیسے ان کے سامنے کوئی بھی نہیں ہو۔ آج ان کے رویے میں کوئی جارحیت نہیں تھی۔ یہ ایک اچھا اشارہ تھا۔

جانے کیوں دُرِیکتا کا دل چاہا ان کے سینے سے لپٹ جائے پہلے کی طرح...... پر دل مسوس کے رہ گئی۔

ڈاکٹر نے کسی بھی قسم کے جذباتی رویے کے مظاہرے سے روکا تھا۔

جاتے، جاتے وہ ان کے سامنے رکی انہیں جی بھر کر دیکھا تو ٹوٹ کر رونا آیا۔ پر آنسوؤں کو آنکھوں میں مقید کرنا پڑا۔ کیسا عجیب رشتہ تھا باپ، بیٹی کا...... وہ خود کو بہت اکیلا محسوس کر رہی تھی۔ کوئی اپنا نہیں تھا، راز دار نہیں تھا۔ کوئی ایسا نہیں تھا جو اس کی جدائی پہ روتا، نہ ماں نہ بہن نہ بھائی۔ عمر خود اسپتال میں تھے۔ کون اس کے لیے دعا کرتا کہ تمہارے نصیب اچھے ہوں۔ کون سینے سے لگاتا۔ دُرِیکتا کو اپنا اکیلا پن بہت زیادہ کھل رہا تھا۔

یہاں اس کی شادی کی کوئی خاص خوشی نہیں تھی۔ ہاں فوزیہ اور فرح چچی اور اس کی کزنز کچھ سرگرمی دکھا رہی تھیں ورنہ شیریں یا سائرہ خاموش ہی تھیں۔ مائرہ رخصتی سے ایک دن پہلے آئی اس کے ساتھ صرف بینا تھی۔ مائرہ مارے باندھے آئی تھی۔ اس کا دل نہیں چاہ رہا تھا۔ جب سے باسط اس طرح گیا تھا اس کو کسی کام میں بھی خوشی یا سکون نہیں مل رہا تھا۔ بینا زبردستی ساتھ لے کر آئی تھی کہ چلو دل بہل جائے گا مگر یہاں آ کے بھی اس کی اداسی ختم نہیں ہوئی۔

☆☆☆

دُرِیکتا پہ کل کی فکر سوار تھی کہ آیا طیب کل اس کے ساتھ جائے گا کہ نہیں یا دو چار دن بعد اسے یہاں سے لے جانا پڑے گا۔ یہ بات اسے طاہر انکل سے پوچھتے ہوئے شرم آ رہی تھی۔ اشعر کی دونوں بہنیں یہاں گاؤں آ کے اس سے ملی تھیں مگر ان سے بھی وہ یہ بات نہیں کر سکتی تھی۔

لے دے کے صرف ایک اشعر ہی بچتا تھا کیونکہ شادی اسی کے ساتھ ہو رہی تھی۔ اسٹامپ پیپر پہ سائن دُرِیکتا نے اسی کے کہنے پر کیے تھے۔ اس کو یہ بات اشعر سے ہی کرنی چاہیے۔ آخر اس نے بھی تو (اپنے تئیں سائن کر کے) اس کا ساتھ دیا تھا۔ دُرِیکتا کے سر سے بوجھ اترا۔ اشعر سے وہ کیسے بات کرتی اس کے پاس نمبر نہیں تھا اشعر کا...... اور نہ کبھی اسے عام حالات میں بات کرنے کا اتفاق ہوا تھا۔ اشعر کا نمبر پتا چل سکتا تھا یہ کوئی ایسا مشکل کام نہیں تھا۔ اورنگزیب کے پاس اشعر کا نمبر تھا لیکن تایا سے نمبر معلوم کرتے ہوئے اسے شرم آ رہی تھی۔ اس کے ذہن میں طاہر انکل کا نام آیا۔ جب وہ شادی کی ڈیٹ لینے آئے تھے تو انہوں نے تب دُرِیکتا سے اس کا سیل نمبر لیا تھا اور اپنا بھی اسے دیا تھا کہ کبھی، کبھی ضرورت پڑ جاتی ہے تو انسان بات تو کر سکتا ہے۔

وہ طاہر انکل سے اشعر کا نمبر پوچھ سکتی تھی۔ اسے شرم تو آ رہی تھی پر ساری شرم بالائے طاق رکھتے ہوئے خود کو اس دلیل سے مطمئن کرتے ہوئے آخر میرا نکاح ہوا ہے اشعر لغاری کے ساتھ میں بات کر سکتی ہوں۔ اس میں حرج نہیں ہے۔ اس نے طاہر انکل کو کال کر دی۔

دریکتا نے انہیں خود سے کبھی کال نہیں کی تھی۔ اب کل اشعر کی بارات جانی تھی۔ اس تناظر میں دُرِیکتا کی کال انہیں پریشانی سے دور چار کر گئی کہ جانے کیا بات ہے، کہیں اس نے رخصتی سے انکار کرنے کے لیے تو فون نہیں کیا...... ان کے ذہن میں پہلی بات ہی یہی آئی تبھی دُرِیکتا سے بات کرتے ہوئے ان کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔

''بیٹا خیریت تو ہے ناں سب ٹھیک ہے ناں......؟'' انہوں نے لہجے کی لرزش چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا۔ دُرِیکتا اپنی پریشانی میں تھی اس نے محسوس ہی نہیں کیا تھا۔

''جی انکل سب ٹھیک ہے۔'' وہ اتنا کہہ کر خاموش ہو گئی۔ طاہر بے تابی سے اس کے مزید بولنے کا انتظار کر رہے تھے۔

''مجھے اشعر کا نمبر چاہیے یا میری ان سے بات کروا دیں۔'' اس نے خود میں جرأت پیدا کرتے ہوئے کہہ ہی دیا۔ ایک ثانیے کے لیے وہ خاموش سے ہو گئے اور پھر فوراً اس کا نمبر نوٹ کروا دیا۔

''بیٹا کوئی پریشانی والی بات تو نہیں ہے؟'' وہ ابھی تک الجھن کا شکار تھے۔

''نہیں انکل بس مجھے ایک کام ہے۔'' دُرِیکتا نے کام کی نوعیت انہیں نہیں بتائی۔

رات کو سونے کے لیے لیٹنے سے پہلے دُرِیکتا نے اشعر کو فون کرنا ضروری سمجھا۔

''السلام علیکم......'' اشعر بولا تو دُرِیکتا پہ خاموشی طاری ہوگئی۔

''وعلیکم اسلام......'' بہ مشکل منہ سے نکلا۔

''معاف کیجیے گا' میں نے پہچانا نہیں۔'' رات کے اس پہر اس اجنبی لڑکی کو وہ واقعی نہیں پہچان پایا تھا۔

''میں دُرِیکتا بات کر رہی ہوں۔''

''اوہو......'' اشعر ایک ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔

''آج ہی کا دن ہے، کیا آپ کل تک انتظار نہیں کرسکتیں؟'' اشعر کو بے اختیار شرارت سوجھی تو دوسری طرف موجود دُرِیکتا اس لطیف سی جرأت پر تھوڑا سا نروس سی ہوگئی۔

''میں، میں دراصل طیب کو کل اپنے ساتھ لانا چاہتی ہوں مگر مجھے سمجھ نہیں آرہا کہ یہ کیسے ہوگا۔ ہوسکتا ہے آپ کی فیملی کو اعتراض ہو، طیب کو بارات والے دن ساتھ لانے پر...... اگر آپ میرا ساتھ دیں تو ایسا ہوسکتا ہے۔ اگر آپ کل خود کہہ دیں کہ طیب ہمارے ساتھ جائے گا تو......'' وہ امید وبیم کی کیفیت بھی اس کے جواب کا انتظار کر رہی تھی۔ شروع میں بات کرتے ہوئے وہ نروس تھی پر اب اضطراب کا شکار تھی۔

اشعر اس کی بات سمجھ گیا تھا۔

''ٹھیک ہے کل طیب ساتھ ہی ہوگا آپ کے...... باقی میں سنبھال لوں گا۔'' دُرِیکتا بے طرح خوش ہوگئی۔

''آپ کا بہت، بہت شکریہ میں اس بات کی وجہ سے بہت پریشان تھی۔ آپ نے میری مشکل آسان کردی ہے۔'' اشعر تو اس سے مختلف ثابت ہو رہا تھا جیسا اس نے اورنگزیب تایا اور شیریں تائی سے سنا تھا۔

## آدابِ مسجد

مسجد شعائرِ اسلام میں سے ہے اس لیے ہر مومن پر اس کا ادب واحترام لازمی ہے۔ اس سلسلے میں چند آداب تحریر کیے جاتے ہیں۔ جس کا خیال ہر مومن کو رکھنا چاہیے۔

1۔ مسجد میں داخل ہوتے وقت پہلے سیدھا پاؤں اندر رکھے پھر **بسم اللہ والصلاۃ والسلام علی رسول اللہ ﷺ** اور **اللھم افتح لی ابواب رحمتک** پڑھے۔

2۔ مسجد میں داخل ہوتے وقت اگر کچھ لوگوں کو بیٹھا دیکھے تو ان کو سلام کرے...... لیکن یہ اس صورت میں ہے یعنی سلام کرنا جبکہ حاضرین نماز یا تسبیح وتلاوت وغیرہ میں مشغول نہ ہوں۔

3۔ پھر تحیۃ المسجد پڑھے جو دو رکعت نفل ہے یہ بڑا اجر وثواب کا کام ہے۔ نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ہے تم میں سے جب کوئی مسجد میں جائے جب تک وہ دو رکعت نماز نہ پڑھے نہ بیٹھے لیکن اس میں اوقات مکروہا کا خیال رکھے۔ (بخاری ومسلم)

4۔ مسجد میں دنیا کی باتیں نہ کرے۔

5۔ مسجد میں بیٹھنے کی جگہ پر کسی سے لڑائی جھگڑا نہ کرے۔

6۔ مسجد میں بے جا آواز بلند نہ کرے۔

7۔ مسجد کے عظمت واحترام کا تقاضا یہ ہے کہ آدمی ڈرتا لرزتا اس میں داخل ہو اور نہایت سکون اور عاجزی سے جہاں جگہ ملے وہاں بیٹھ جائے یہ بات بالکل خلافِ ادب ہے کہ دوسروں کو ہٹاتا اور پھلانگتا ہوا آگے بڑھ جائے یا زبردستی گھس کر دوسروں کے درمیان بیٹھ جائے۔

مرسلہ: عرشیہ جنید، کراچی

اس کے گھر پر فائرنگ کروانے والا شخص اس قدر ہمدرد بھی ثابت ہوسکتا ہے اسے یقین نہیں آرہا تھا۔

''کل ملاقات ہوگی آپ سے فیس ٹو فیس...... پھر شکریہ بھی ادا کردیجیے گا۔'' اشعر کے یہ کہنے کی دیر تھی اس نے فون بند کردیا۔

دُرِ یکتا بہت خوش اور مطمئن تھی۔ کل طیب اس کے ساتھ ہوگا۔ اسے حویلی میں کسی کے بھی رحم و کرم پر نہیں چھوڑنا پڑے گا۔

اسے مارے خوشی کے نیند ہی نہیں آرہی تھی۔

☆☆☆

پپا اور شاہ زیب بھائی کے بغیر اسے اپنی رخصتی کا تصور ... کل تک بہت کربناک لگتا تھا مگر وہ ان کے بغیر ہی رخصت ہوکر اشعر لغاری کے گھر آگئی تھی۔ طیب اور زیبن اس کے ساتھ تھے۔ اشعر نے نہ جانے اورنگزیب اور شیریں سے کیا کہا تھا کس طرح بات کی تھی جو زیبن، طیب کے کپڑے اور دیگر ضروری سامان پیک کرکے واپسی پر بارات کے ساتھ ہی آئی تھی۔

اشعر نے ثمرہ، لائبہ اور پپا کو خود ہی قائل کیا تھا۔ کسی کو اگر تھوڑا بہت اعتراض بھی تھا تو اس نے ختم کردیا تھا۔

اس کے باوجود دُرِ یکتا یہاں آکر بھی رو، رو کر بے حال ہوئی جارہی تھی۔ ثمرہ، لائبہ دونوں نے مشکل سے اسے چپ کروایا۔ اتنا تو انہیں بھی پتا کہ دریکتا کے جوان بھائی کی ڈیتھ ہوگئی ہے اور عمر انکل ذہنی امراض کے اسپتال میں ایڈمٹ ہیں۔ انہیں دُرِ یکتا کے نازک احساسات کا اچھی طرح اندازہ تھا کہ یہ لڑکی جو ابھی اپنے گھر سے باپ اور بھائی کے بغیر وداع ہو کے آئی ہے اس کے دل پر کیا گزر رہی ہوگی۔ رو، رو کے دُرِ یکتا کا سر درد کررہا تھا۔

اشعر دوستوں کی طرف تھا۔ جب سے بارات لوٹی تھی وہ تب سے دوبارہ خواتین کے گھیرے میں نہیں آیا تھا جو عجیب، عجیب سی رسمیں کررہی تھیں۔

☆☆☆

ثمرہ نے زیبن کے لیے کمرا خالی کروا کے سیٹ کروا دیا تھا۔ طیب اسی کے پاس تھا۔ طیب کو سلانے سے پہلے وہ اسے دُرِ یکتا کے پاس لے گئی۔ نیند سے اس کی آنکھیں بوجھل تھیں پر وہ سو نہیں رہا تھا۔ بے چین سا تھا اتنے بہت سارے لوگوں کو دیکھ کر...... اور آج اس نے تنگ بھی بہت زیادہ کیا تھا۔

دُرِ یکتا نے طیب کو اس سے لے لیا۔ زیبن کے ہاتھ سے اسے لینے کی دیر تھی اس نے رونا شروع کردیا۔ دُرِ یکتا کا بھاری لہنگا اور اس پر کیا گیا کام طیب کے نازک جسم کو گراں گزرا تھا۔ اس نے رو کر ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ زیبن نے اسے اپنی گود میں اٹھالیا۔ اب وہ پُرسکون تھا۔ اتنے میں ثمرہ بھی اِدھر آگئی۔

''ہاں جی سونے سے پہلے طیب سے مل لو، اشعر آرہا ہے۔'' اس کے لہجے میں شرارت ہی شرارت تھی۔ وہ سٹ سی گئی۔ ثمرہ کے بعد لائبہ اور ان کی کچھ اور کزنز بھی دُرِ یکتا کے پاس بیٹھ گئیں۔ زیبن بھی وہیں تھی۔ طیب کے منہ میں فیڈر دبی ہوئی تھی اور نیند کی وادیوں میں آہستہ، آہستہ اتر رہا تھا۔ زیبن دلچسپی سے ان سب کی باتیں سن رہی تھی اور لطف اندوز ہورہی تھی۔

اشعر دوستوں سے فارغ ہوکر آیا تو لائبہ کو دُرِ یکتا پر رحم آگیا۔ بھاری جوڑے اور زیورات کی وجہ سے وہ بہت بے آرام سی تھی۔ لائبہ نے سب کو اٹھنے کا اشارہ کیا۔

''دُرِ یکتا، میں نے تمہارے کپڑے نکال کر رکھ دیے ہیں بدل لینا...... اور پریشان مت ہونا طیب سو گیا ہے۔ یہ دیکھو زیبن کی گود میں ہے۔'' وہ جاتے، جاتے پھر شرارت سے بولی تھی۔ کمرا خالی ہوچکا تھا۔ اب صرف اشعر ہی تھا جو صوفے پر بیٹھا اسی کو دیکھ رہا تھا۔

''میرا خیال ہے آپ کافی تھک گئی ہیں، ذہنی اور جسمانی طور پر...... آپ ان کپڑوں سے جان چھڑائیں اور ریسٹ کریں۔'' اشعر شوز اتارنے لگا۔ دُرِ یکتا نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ باتھ روم میں جاچکا تھا۔ پانی گرنے کی آواز آرہی تھی۔ چند منٹ بعد وہ

نائٹ ڈریس میں ملبوس باہر نکلا۔

''جائیں آپ بھی چینج کرلیں۔'' وہ نرمی سے بولا تو دُرّیکتا بھی بھاری لہنگا سمیٹتی آرام سے اٹھی اور ڈریسنگ روم کی طرف بڑھی۔ دوپٹا اتار کے اس نے ہینگ کیا، زیورات سنبھال کر رکھے اور باتھ روم میں چلی گئی۔ شاور لے کر نائٹ ڈریس پہن کر جب وہ کمرے میں آئی تو دل دھک، دھک کررہا تھا دل اور دماغ میں کش مکش ہورہی تھی۔ کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا۔ اشعر سے ڈر بھی لگ رہا تھا۔ بڑی مشکل سے خود کو سمجھا کر وہ باہر آئی تھی۔

بیڈ روم کی تمام لائٹس بند تھیں۔ صرف زیرو پاور کی ایک لائٹ جل رہی تھی۔ اس کے قدم من، من بھر کے ہوگئے تھے۔ اشعر کی نگاہ اسی کی طرف تھی۔ وہ شاید اس کی اندرونی کش مکش سے واقف تھا۔ اس لیے لائٹس دوبارہ آن کردیں۔ وہ پُراسرار اور معنی خیز ماحول یکسر بدل گیا۔

''آئیں، سوجائیں، مجھے خود بہت شدید نیند آرہی ہے.....'' اس نے سگریٹ لائٹر دونوں چیزیں تپائی سے اٹھالیں۔ وہ چھوٹے، چھوٹے قدم اٹھاتی آگے آگئی۔ اشعر اٹھ گیا تھا۔ دُرّیکتا کا دل دھک، دھک کرتے لگا وہ اسی کی طرف آرہا تھا۔ وہ سائڈ پہ ہوگئی جیسے بچنا چاہ رہی ہو۔ اشعر نے اس کی طرف نہیں دیکھا وہ ٹیرس کا دروازہ کھول کر باہر چلا گیا۔

دُرّیکتا بیڈ پر آکر لیٹ گئی اسے بہت دیر بعد نیند آئی۔

اشعر جانے کس وقت دوبارہ آیا اور کب سویا اسے کچھ خبر نہیں...... صبح جب اس کی آنکھ کھلی تو وہ جہازی سائز بیڈ کے دوسرے سرے پر سر کے نیچے دو تکیے رکھے محوِ خواب تھا۔

اسے کچھ پتا نہیں تھا کہ وہ کب آکے سویا...... یہ تو طے تھا کہ وہ اس کے سونے کے بعد ہی آیا ہوگا۔ کچھ عجیب سا رویہ تھا اس کا...... جیسے دُرّیکتا کا کوئی وجود ہی نہیں ہو...... وہ سوچنا چاہ رہی تھی پر ٹائم نہیں تھا۔ اسے ناشتے کے بعد پارلر جانا تھا۔ جانے کتنی دیر تختۂ مشق بننا تھا اور پھر ایک ہی پوز میں مسلسل بیٹھنا تھا۔ بہت مشکل تھا۔

اشعر دیر تک سویا رہا تھا۔

دُرّیکتا سب کے ساتھ ناشتا کرچکی تھی اور اب گاؤں سے آئے ہوئے رشتے داروں کے ساتھ بیٹھی تھی۔ اشعر بھی بیدار ہونے کے بعد اُدھر ہی آگیا۔ سائرہ نے بڑے غور سے اسے دیکھا۔ اشعر نے سب کو سلام کیا۔ دُرّیکتا کی دونوں چچیاں، تائی، کزنز وغیرہ سب ہی تھے۔ صرف اورنگزیب اور ہارون نہیں تھے۔ انہوں نے شام کو آنا تھا۔ اورنگزیب یہاں آنے میں بے عزتی محسوس کررہے تھے پر شیریں کے سمجھانے بجھانے پر آمادہ ہوگئے تھے۔ نوید چچا تھوڑی دیر بیٹھنے کے بعد چلے گئے تھے۔

☆☆☆

اشعر کا ناشتا لائبہ ڈرائنگ روم میں ہی لے آئی جہاں دُرّیکتا کے رشتے دار بیٹھے تھے۔ اشعر ہنس، ہنس کر باتیں کررہا تھا۔ اس وقت وہ کہیں سے بھی ایک سخت گیر پولیس آفیسر نہیں لگ رہا تھا جس طرح سائرہ نے اس کے بارے میں سنا تھا۔ اشعر نے ڈٹ کر ناشتا کیا اور آخر میں چائے پی۔ ہلکے رنگ کی ٹی شرٹ اور ٹراؤزر میں ملبوس سائرہ کو وہ بہت زوردار لگا۔ ٹی شرٹ میں سے جھانکتے بازوؤں کے مضبوط مسلز اور کلائی پر بندھی قیمتی رسٹ واچ سے لے کر اسے ہیر اسٹائل تک سب کچھ ہی قابلِ توجہ تھا۔

سائرہ کو اچانک دُرّیکتا سے وہی پرانا حسد محسوس ہونے لگا۔ یہ شاندار مرد اس کا شوہر تھا، اس کے تمام تر اختیارات اور جملہ حقوق کا مالک...... اشعر لغاری اسے تروتازہ زندگی سے بھرپور لگ رہا تھا جبکہ یہاں اس کے مقابلے میں دُرّیکتا بجھی، بجھی اور تھکی، تھکی سی نظر آرہی تھی۔

اس کی تھکن کی وجہ نظر انداز کرنے والی نہیں تھی۔ سائرہ سلگ اٹھی۔ اتنا کچھ ہونے کے باوجود بھی اشعر نے آخر کار دُرّیکتا کو جیت ہی لیا تھا۔ ابو نے کتنا زور لگایا تھا وہ دُرّیکتا کو چھوڑ دے...... پر وہ ضدی تھا۔

غیرت کا پکا...... تب ہی تو کل اسے رخصت کروا کے اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ اور آج وہ حقیقت بنی اس کے گھر میں بیٹھی تھی۔ کتنا مکمل منظر تھا۔ اس نے رشک سے دیکھا۔

نوکرانی ناشتے کے برتن اٹھا کے لے گئی تو زیبنؔ طیب کو لیے چلی آئی۔ دُرِ یکتا نے بے تابی سے اسے گود میں لے لیا...... اور اس کے گال چومے......

شیریں نے معنی خیز نگاہوں سے اسے دیکھا۔ طیب کی ذمے داری کا بوجھ مکمل طور پر ان کے سر سے اتر گیا تھا۔ دُرِ یکتا اسے ساتھ لے آئی تھی اسے اپنے دلہنا پے کی بھی پروا نہیں تھی کہ اس طرح شادی کے اولین دنوں میں طیب پہ اتنی توجہ دینے سے کہیں اشعر ناراض نہ ہو جائے پر وہ تو مسکرا رہا تھا، اسے طیب کے ساتھ لاڈ کرتے دیکھ کر جیسے اس کی اپنی اولاد ہو۔ یہ سوچتے ہی شیریں شرمندہ سی ہو گئیں ایک مائرہ تھی اس کی ماں اور دوسری شیریں تھیں طیب کی نانی، سائرہ بھی طیب کی خالہ وہ بھی تو دُرِ یکتا کی ہم عمر ہی تھی۔ کسی کو بھی طیب کی پروا نہیں تھی۔ ان اجنبی لوگوں نے جو طیب کے سگے نہیں تھے اسے قبول کر لیا تھا۔ شیریں نے اشعر کی فیملی کے ہر چہرے کو غور سے دیکھا کہ کہیں انہیں کوئی خفگی نظر آئے۔ پر نہیں...... دُرِ یکتا پہلے دن ہی طیب کو ساتھ لے آئی تھی۔ شیریں نے زیبن سے کرید، کرید کر سب کے رویے کے بارے میں پوچھا...... پر انہیں جواب سن کے مایوسی ہوئی۔ ثمرہ، لائبہ نے تو طیب کو گود میں لٹا کے لاڈ بھی کیا تھا۔ ثمرہ کی دو بیٹیاں ہی تھیں انہیں ایک کھلونا مل گیا تھا وہ طیب کو اٹھا کے گھوم رہی تھیں۔ وہ بھی ہنس رہا تھا کھلکھلا رہا تھا جیسے اپنی خوشی کا اظہار کر رہا ہو۔

وہ یہاں آ کے خوش تھا۔ اس گھر کے مکینوں میں اپنائیت کی خوشبو تھی بچے شاید اس چیز کو پہچانتے ہیں اس لیے طیب، ثمرہ کی گود میں آ کے رو نہیں رہا تھا۔

☆☆☆

ولیمے کی تقریب رات گئے اختتام پزیر ہوئی تو سب تھکن سے چور تھے۔ دُرِ یکتا کو تو سخت قسم کی نیند آ رہی تھی۔ کل رات بھی وہ ٹھیک طرح سے سو نہیں پائی تھی۔ اجنبی جگہ تھی، اجنبی بستر تھا، اجنبی کمرا تھا کچھ پریشانیاں بھی اپنی جگہ موجود تھیں جنہوں نے اسے سکون کی نیند سونے نہیں دیا تھا۔ صبح آنکھ بھی جلدی کھل گئی تھی۔

زیبن کل کی طرح آج بھی طیب کو سلانے لے گئی۔

دُرِ یکتا نے ولیمے کے بھاری کامدار جوڑے سے جان چھڑائی تو سکون ملا۔ کپڑے بدل کے باہر آئی تو اشعر موجود تھا۔ حالانکہ جب وہ کمرے میں آئی تو وہ وہاں نہیں تھا۔ وہ جیسے ہی بیڈ کے قریب آئی اشعر نے سب لائٹس آف کر دیں۔ سوائے زیرو پاور لائٹ کے...... وہ خود صوفے پر بیٹھا تھا۔ شاید اسی کے انتظار میں تھا۔ دُرِ یکتا کا دل دھڑکنے لگا۔ کل تو وہ سو گیا تھا، اسے بھی ریسٹ کرنے کا کہا تھا پر آج جانے کیا ہوگا۔ وہ گرنے کے انداز میں بیٹھی تھی۔ اشعر کو ہنسی تو بہت آئی پر ہونٹوں میں دبا لی۔

اشعر نے دو تکیے اٹھائے سر کے نیچے رکھے۔

”پلیز زیرو پاور کی لائٹ بھی آف کر دیں یہ تیسرا بٹن ہے۔“ کروٹ بدل کر اس نے یہ جملہ سو فی صد دُرِ یکتا سے کہا تھا۔ اس نے لائٹ آف کر دی۔

☆☆☆

پندرہ، بیس دن پر لگا کر اڑ گئے۔ ثمرہ، لائبہ واپس جا رہی تھیں۔ انہوں نے دُرِ یکتا کو بہت محبت اور اپنائیت دی تھی۔ بہت جلد ہی وہ اس گھر کے ماحول سے مانوس ہو گئی تھی۔ اس میں سارا کمال۔۔ اشعر کی دونوں بہنوں کے محبت بھرے رویے کا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ دُرِ یکتا ان کے واپس جانے پر بہت اداس تھی۔ دو دن بولائی بولائی پھرتی رہی۔ زیبن، طاہر انکل اور طیب نہ ہوتے تو وہ تنہائی کے احساس سے پاگل ہی ہو جاتی۔ اشعر کی شکل گھر میں کم ہی نظر آتی۔ وہ بہت مصروف ہو گیا تھا یا جان کے خود کو مصروف ظاہر کر رہا تھا۔

(جاری ہے)

وہ میرے جہیز کا ڈنر سیٹ تھا جو میرے والد نے میری شادی کے موقع پر دیا تھا۔ اس سیٹ کو کم و بیش پچاس سال تو ہو چکے تھے۔ اس قسم کے برتن آج کل ناپید تھے۔ ماسین چائنا کے برتن جرمن کے شہر ورستو بن کے قریب بنتے تھے اور پوری دنیا میں مشہور تھے۔ عام طور سے ایسے برتن امیر لوگ رکھتے تھے سو میں ان برتنوں کی حفاظت جی جان سے کرتی تھی اور اہم سے اہم موقع پر بھی ان برتنوں کو نہیں نکالتی تھی کہ مبادا اس میں سے کچھ ٹوٹ جائے۔ یہ تو بس ڈرائنگ روم کی بڑی سی کیبنٹ میں سجے رہتے تھے اور جب بھی میرے ہاں کوئی خاص مہمان آتے، میں انہیں ان برتنوں کا دیدار ضرور کراتی اور ان کے "واہ، وا کیا خوب صورت برتن ہیں...... کس قدر نازک شیشہ ہے......" قسم کے جملوں سے دل تسکین حاصل کرتی...... کبھی میاں کے خاص دوست آتے تو وہ مجھ سے درخواست کرتے کہ یہ سیٹ نکال دو لیکن میں نے کبھی ان کی یہ خواہش پوری نہیں کی...... ہوں، ہاں کر

# کرچیاں دل کی

شمیم فضلِ خالق



کے انہیں ٹال دیتی بعد میں وہ بھی بھول بھال جاتے۔
بیلا میری بہت پیاری اور لاڈلی بیٹی تھی۔ تین بیٹوں کے بعد خدا نے اسے ہمارے آنگن میں اتارا تھا وہ بھی ہزاروں منتوں، مرادوں اور بے انتہا دعاؤں کے بعد...... بیلا میرے اور میرے میاں کے دل کا ٹکڑا تھی، ہم نے کبھی اس کی کسی خواہش کو رد نہیں کیا تھا...... وہ تھی بھی بہت پیاری...... لیکن فرمائشیں وہ ضرور کرتی تھی اور ہم تو تھے ہی پورا کرنے کے لیے...... جب وہ ایف اے میں اچھے نمبر لے کر کامیاب ہوئی تو اس نے اپنے دوستوں کو پارٹی دینے کا پروگرام بنایا۔ میں نے اور اس کے پاپا نے اس کے اس آئیڈیے کی بہت تعریف کی...... اس کے پاپا نے تو شہر کے بڑے، بڑے ہوٹلوں کے نام لیے کہ ہم یہ پارٹی وہاں دیں گے لیکن بیلا نے ہوٹل میں پارٹی دینے کو رد۔ یجیکٹ کیا اور کہہ دیا کہ وہ یہ پارٹی اپنے گھر میں دے گی اور اس میں زیادہ تر ڈشز اس کی مما یعنی میں بناؤں گی۔ کوکنگ کا شوق تو مجھے بہت تھا اور اکثر کوئی نہ کوئی نئی ڈش ٹرائی کرتی رہتی تھی...... ظاہر ہے بیلا کی خواہش تو ہمارے لیے حکم کا درجہ رکھتی تھی سو میں فوراً راضی ہوگئی اور تب ہم تینوں یعنی میں، بیلا اور اس کے پاپا مل کر دعوت کا مینیو ڈسکس کرنے لگے۔
دعوت والے دن میں خالہ زرینہ کے ساتھ مل کر الماری سے برتن نکالنے لگی...... صبح سے کچن میں کام کر، کرکے میں تھک چکی تھی...... یہ بھی اچھا تھا کہ خالہ زرینہ آج منہ اندھیرے میری مدد کے لیے آ گئی تھی...... خالہ زرینہ میری جز وقتی ملازمہ تھی جسے آج میں نے پورے دن کے لیے بلایا تھا...... میں برتن نکال، نکال کر خالہ زرینہ کو دے رہی تھی کہ بیلا اپنے کمرے سے باہر آ گئی اور ناک سے سوں سوں کرتی ہوئی ہنس کر بولی۔
''مما...... آج تو آپ نے اتنی خوشبوئیں پھیلائی ہیں کہ مجھے اپنے کمرے میں بھی چین نہیں آ رہا۔''
''یہ تو تمہاری دوستوں سے ہی پتا چلے گا کہ کون سی ڈش اچھی بنی ہے۔'' میں مصروف انداز میں اسے دیکھتے ہوئے بولی۔
''مما...... میری دوستوں کے لیے آج آپ اپنے جہیز کا سیٹ نکال دیں تو دعوت کا لطف دوبالا ہو جائے گا۔''
بیلا میرے پاس آ کر کھڑی ہوگئی اور اچانک اس نے بڑی عجیب بات کرتے ہوئے کہا۔ میری تو اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی نیچے رہ گئی...... گھر میں بہت ساری دعوتیں ہوئی تھیں...... بچوں کی سالگراہیں بھی ہم مناتے رہتے تھے لیکن کسی بچے نے ایسی فرمائش نہیں کی تھی...... خود بیلا وقت بے وقت اپنی بے تکلف دوستوں کی دعوتیں کرتی تھی لیکن کھانا کن برتنوں میں سرو ہوتا ہے اس سے اسے کوئی سروکار نہیں تھا...... وہ میرے قریب کھڑی آس بھری نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں نے کھنکھار کر اپنا گلا صاف کیا اور بہ مشکل بولی۔
''بیلا جانی...... ہمارے گھر میں سارے برتن اعلیٰ ہی کوالٹی کے ہیں...... تمہیں تو معلوم ہے کہ تمہارے پاپا اور نہ ہی میں لو کوالٹی کے برتن پسند کرتے ہیں، میں نے دعوت کے لیے وہ سیٹ نکالا ہے جو ابھی چند ماہ قبل تمہارے پاپا پشاور سے لائے تھے...... ابھی اسے کسی اور نے یوز نہیں کیا...... پہلی بار......''
''پلیز مما...... میں چاہتی ہوں کہ میری دوستیں ان یونیک برتنوں کا دیدار کریں...... اور اگر ان کو معلوم ہو گیا کہ یہ برتن آپ کے جہیز کے ہیں تو وہ کتنا امپریس ہوں گی...... کہ اس زمانے میں نانا مرحوم نے آپ کو اتنے قیمتی برتن جہیز میں دیے تھے۔'' بیلا میری بات کاٹتے ہوئے بولی۔
''لل...... لیکن میری جان......'' میں کچھ بے بسی سے اسے دیکھ کر رہ گئی، مجھ سے کوئی بات نہیں بن رہی تھی۔
''لیکن ویکن کچھ نہیں......'' وہ حتمی لہجے میں بولی۔
''بس فیصلہ ہو گیا...... آج کی دعوت کے لیے آپ کے جہیز کے برتن ہی استعمال ہوں گے......'' وہ ہمیشہ کی طرح یک طرفی فیصلہ دے کر خالہ زرینہ سے کہنے لگی۔
''خالہ...... وہ والے برتن لا کر واپس رکھ دیجیے۔ اور مما کے جہیز والے برتن لے جا کر دھو لیجیے...... لیکن خیال رکھیے بہت احتیاط سے دھونے ہوں گے۔ مما کی ان برتنوں میں جان ہے۔'' وہ حکم دے کر ہنستی ہوئی اپنے کمرے کی طرف مڑ گئی جبکہ میری تو بچ مچ جان پر بن



# باتیں بہار و خزاں کی

زندگی رات دن کی گردش ہے
کچھ خزاں کی ہے کچھ بہار کی بات

اس گردشِ لیل و نہار میں ہمارے شب و روز سیلِ رواں کی طرح گزرتے چلے جا رہے ہیں۔ انہی گزرتے پل میں بے شمار کہانیاں، ڈھیروں قصے اور ان گنت واقعات جنم لیتے چلے جا رہے ہیں اور ہم ان کے کردار بنے تماشائے اہلِ کرم بھی دیکھتے اور کبھی دکھاتے چلے جاتے ہیں۔ آپ سب لوگ جو مصنفین اور بالخصوص قارئین کی حیثیت سے ہمارے ساتھ برسوں سے وابستہ ہیں اور کسی نہ کسی انداز میں پاکیزہ صفحات کو رونق بخشتے چلے آئے ہیں اور یہی پاکیزہ کی کامیابی کا راز بھی ہے کہ مخلص اور محنتی مصنفات اپنی پُر تنوع تخلیقات کے ذریعے اور تبصرہ نگار بہنیں اپنے دقیق تبصروں اور قیمتی آرا سمیت ہمارے ساتھ رہی ہیں اور انشاءاللہ رہیں گی۔

ہم ہمیشہ ہی سے کچھ نہ کچھ نیا اور دلچسپ کرتے چلے آئے ہیں سو آج بھی ایک مختصر مگر جامع سوالنامہ حاضرِ خدمت ہے تاکہ آپ کی اپنی شخصیت کے بھی کچھ نہاں پہلو سب کے سامنے آئیں اور آپ کے ذاتی افکار، خیالات اور تجربات سے ہم سب بھی آگاہ ہوں اور لطف بھی اٹھائیں۔ امید ہے آپ کو یہ اچھوتا سلسلہ بہت پسند آئے گا۔

سوالات حاضرِ خدمت ہیں۔

1۔ روز و شب کے اس گزرتے گورکھ دھندے میں خواتین اپنی شخصیت کو کیسے پُراثر بنا سکتی ہیں، آپ کا مشورہ اپنے تجربے کے حوالے سے......

2۔ آپ کی زندگی کا کوئی دلچسپ قصہ، واقعہ یا لمحہ جس نے آپ کے فکر و خیال کا رخ موڑ دیا۔

3۔ پاکیزہ کے مختلف سلسلے کیوں پسند ہیں؟ اور آپ کون سا ایسا سلسلہ شروع کرنا چاہیں گی جو سب کو پسند بھی آئے؟

4۔ پاکیزہ مصنفات سے آپ کیا کہنا چاہتی ہیں...... کوئی دل کی بات؟

5۔ اپنے تعارف کو دو جملوں یا دو اشعار میں بیان کیجیے۔

آپ کے قیمتی خیالات کا انتظار رہے گا۔ آپ چاہیں تو اپنی تصویر بھی ارسال کر سکتی ہیں۔

گئی...... اگر بیلا کی بات نہ مانتی تو بیلا کا موڈ آف ہو جاتا اور ساری پارٹی کا مزہ کرکرا ہو جاتا۔ میں یہ بھی نہیں چاہتی تھی کہ وہ پارٹی کے لیے بہت پُرجوش ہو رہی تھی اور کب سے تیاریوں میں لگی تھی...... اور اگر اس کی بات مانتی تو...... برتنوں کے ٹوٹنے کا خدشہ تھا کہ برتنوں کا شیشہ انتہائی نازک تھا...... کروں تو کیا کروں...... سمجھ میں نہیں آ رہا تھا لیکن آخر کار بیٹی کی محبت جیت گئی......

میں نے سارے برتن خود اپنے ہاتھ سے نکالے...... اور ان برتنوں کے دھونے اور خشک کرنے کا سارا کام میں نے اپنے ہاتھوں سے کیا...... اس سلسلے میں، میں خالہ زرینہ پر اعتبار نہیں کر سکتی تھی...... حالانکہ میری کمر میں درد شروع ہو گیا تھا کہ میں فجر کی نماز کے بعد سے کچن میں کھڑی تھی...... پکانے کا کام ہی بہت زیادہ تھا کجا کہ میں نے برتنوں کی صفائی کا کام بھی اپنے ذمے لے لیا تھا...... لیکن سارا وقت مجھے یہی تشویش ستاتی رہی کہ کہیں برتنوں میں سے کوئی برتن ٹوٹ نہ جائے...... مجھے شک تھا کہ اگر ان برتنوں میں سے کوئی برتن ٹوٹ گیا تو یقیناً میرا دل اسی وقت بند ہو جائے گا۔ اتنی ہی جذباتی تھی میں ان برتنوں کے لیے...... خیر...... میں نے سوچ لیا کہ میں ان برتنوں کو اپنے ہاتھ سے دھو کر الماری میں واپس رکھوں گی اور خالہ زرینہ کو ہاتھ تک لگانے نہیں دوں گی۔

مقررہ وقت پر بیلا کی دوستیں آنی شروع ہو گئیں...... لان کا ایک کونہ میں نے ان کے لیے سیٹ کیا ہوا تھا...... دوسری طرف ڈنر کے لیے میزیں سجا رکھی تھیں...... بوفے سسٹم تھا، ڈیک پر بیلا نے اپنی پسند کا میوزک لگایا تھا۔ گھر کے سب افراد کے لیے بیلا کی وارننگ تھی کہ ہم ان کے دوستوں سے مل کر انہیں ویل کم تو کہیں گے لیکن ان کے ساتھ بیٹھ کر ان کی گپ شپ میں مخل نہیں ہوں گے۔ سو بیلا کے پاپا اور دونوں بھائی بیلا کی دوستوں سے مل مل کر اِدھر اُدھر ہو گئے...... بیلا کے پاپا تو اپنے دوستوں میں چلے گئے اور دونوں بھائی اپنے کمرے تک محدود ہو گئے...... میں کچن میں مصروف ہو گئی...... لیکن سارا وقت برتنوں کے ٹوٹنے کا خدشہ مجھے ستاتا رہا۔

لڑکیوں کے ہنسنے بولنے کی آوازیں کچن تک آ رہی تھیں وہ خوب انجوائے کر رہی تھیں...... پھر وہیں سے بیلا نے مجھے آواز دی۔

''مما...... کھانا لگوا دیجیے...... ! میری دوستوں کو اب بھوک برداشت کرنا مشکل ہو گیا ہے۔''

''خوشبوئیں جو زبردست آ رہی ہیں تو بھوک بھلا کیسے برداشت ہو گی۔'' اس کی کسی سہیلی نے ہنس کر کہا...... اور میرے کام کرتے ہاتھوں میں تیزی آ گئی...... خالہ زرینہ کے پیروں کو بھی پہیے لگ گئے۔ تھوڑی دیر میں لمبی چوڑی میز یہاں سے وہاں تک کھانوں سے سج گئی...... پھر چمچوں کا شور، ہنسی، مذاق اور میوزک کا دھیما پن...... سب کچھ بہت دل لبھا دینے والا تھا۔ میں بچیوں سے معذرت کر کے کچن میں دوبارہ آ گئی جہاں میرے دونوں بیٹے مظلومیت کی تصویر بنے کھڑے تھے۔

''مما...... کھانا دیں ناں...... کتنی دیر ہو گئی ہے۔''

چھوٹا رضوان اپنے پیٹ کو تھام کر کہہ رہا تھا...... وہ بھوک کا بہت کچا تھا اور آج تو دیر بھی ہو گئی تھی کہ میرا بہر حال اصول یہ ہے کہ مہمانوں سے پہلے میزبانوں کو کھانا نہیں کھانا چاہیے۔

''ہاں...... ہاں...... ابھی دیتی ہوں کھانا...... بس تم دونوں بھائی اندر اپنے کمرے میں جاؤ...... میں لاتی ہوں وہیں پر آپ دونوں کا کھانا......'' میں نے انہیں پچکارتے ہوئے کہا...... وہ دونوں کچن سے چلے گئے تو میں لڑکوں کے لیے کھانا نکالنے لگی۔ خالہ زرینہ توے پر گرم چپاتیاں بنانے میں لگی تھی...... اور ایک، ایک کر کے چپاتی میز پر پہنچا رہی تھی...... یہ بھی بیلا کا حکم تھا کہ روٹی ہر گز بازار سے نہیں آئے گی۔ گھر میں پکے گی اور گرما گرم چپاتی میز پر سرو ہو گی...... ابھی میں بچوں کے لیے کھانا نکالنے لگی تھی کہ اچانک ہی کچن کے دروازے پر بیلا نمودار ہوئی...... مجھے حیرت ہوئی وہ کس ضرورت کے لیے کچن میں اس وقت آ گئی ہے میں ابھی اس سے کچھ پوچھنے بھی نہیں پائی تھی کہ اچانک میری نظر اس کے ہاتھ پر پڑ گئی جس سے بھل،

بھل کرتا خون بہہ رہا تھا..... میرا دل دھک سے رہ گیا۔ میں حواس باختہ ہوگئی..... بیلا کا گلابی رنگ پیلا پڑ گیا تھا..... مارے پریشانی کے خون میری رگوں میں جمنے لگا۔

''یہ..... یہ کیا ہوا؟'' میں نے ہکلا کر اس سے پوچھا۔

''مما..... وہ.....'' وہ اپنا ہاتھ نلکے کے آگے کرتے ہوئے کچھ ہچکچاتے ہوئے بولی..... پانی خون کے ساتھ مل کر سرخ ہو رہا تھا۔

''بتاتی کیوں نہیں..... کیسے ہوا یہ سب.....؟'' میں اس کا ہاتھ پکڑ کر..... گھبرا کر تیز آواز میں بولی۔

''ماہ رخ سے..... آپ کا وہ سیٹ..... میرا مطلب ہے..... اس کی پلیٹ ٹوٹ گئی..... میں اس کی کرچیاں اکٹھی کرنے لگی تو..... شیشے کا ٹکڑا ہاتھ میں..... چبھ گیا۔''

''ارے خالہ..... اندر سے وہ فرسٹ ایڈ باکس تو لے آنا..... جلدی کرو..... دیکھو تو..... خون بند نہیں ہو رہا.....'' گھبراہٹ اور پریشانی سے میرا برا حال تھا۔

''مما..... آپ کو اپنے سیٹ کی پلیٹ ٹوٹنے کا دکھ ہوا ہے ناں.....؟'' بیلا اپنے بہتے ہوئے خون سے..... بے پروا میرے چہرے کو کھوج رہی تھی۔

''ارے بھاڑ میں جائے وہ سیٹ اور اس کی پلیٹ..... بس کسی طرح تمہارا خون بند ہو جائے.....'' میں اس کے ہاتھ کو ہاتھ میں تھامے فکر سے ادھ موئی ہوئی جا رہی تھی۔ بیٹی کی محبت ساری محبتوں پر حاوی ہوگئی تھی۔ یہ اولاد ہوتی ہی ایسی ہے کہ اس کے آگے اور کچھ نظر نہیں آتا..... مجھے بھی آج اپنی بیٹی کا زخمی ہاتھ نظر آ رہا تھا..... اور کچھ نہیں.....

☆☆☆

رات کچھ سوتے جاگتے گزری معلوم نہیں لیکن اتنی شدید تھکن کے باوجود مجھے بہت کم نیند آئی..... بیلا تو اسی وقت ٹھیک ہوگئی تھی اور دوستوں کے ساتھ مگن ہوگئی تھی..... رات گئے تک ان کا ہنگامہ جاری رہا..... جانے سے قبل بیلا کی دوستوں نے کھانے کی لذت کی بہت تعریف کی تھی اور میرا بہت شکریہ ادا کیا تھا..... ان کے جانے کے بعد بھی وہ سرشار رہی اور پارٹی کی باتیں کرتی رہی..... وہ بار، بار میرے گال پر پیار کر کے میرا شکریہ ادا کرتی رہی کہ اس کے کہنے کے مطابق ہر ڈش ہی لذیذ تھی۔ میں اور اس کے پاپا اس کو خوش دیکھ کر خوش ہو رہے تھے۔

☆☆☆

سحر خیزی میری عادت تھی..... میں صبح منہ اندھیرے اٹھی اور لان کے اس حصے کی طرف گئی جہاں رات کی دعوت گزری تھی..... وہاں تو صورتِ حال اس مصرعے کی تفسیر تھی کہ...

تیری صبح کہہ رہی ہے تیری رات کا فسانہ

لان کا وہ حصہ ٹشو پیپرز اور باقی بیکار چیزوں سے بھرا پڑا تھا۔ حتیٰ کہ چکن کی ہڈیاں بھی بکھری پڑی تھیں..... یہ کارستانی تو خالہ زرینہ کی تھی..... برتن خالی کر کے سارا گند اس نے یہیں گرا دیا تھا کہ صبح سوئیپر صاف کرے گا..... مجھے جی بھر کر اس پر غصہ آیا..... میں وہاں سے واپس پلٹ گئی لیکن اچانک میری نظر اپنے جہیز کی ٹوٹی پلیٹ پر پڑی۔ میں گھٹنوں کے بل بیٹھ کر کانچ کے ٹوٹے ٹکڑے اکٹھے کرنے لگی..... تھوڑی دیر میں، میں نے سارے ٹکڑے اکٹھے کر لیے تھے۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے میرے دل میں یہ کرچیاں چبھ رہی ہوں۔ جانے کیا ہوا لیکن میں خود پر قابو نہ رکھ سکی اور پھوٹ، پھوٹ کر رونے لگی۔ میں ان کرچیوں کو دوسرے ہاتھ سے ایسے سہلانے لگی جیسے میں کل بیلا کا خون آلود ہاتھ سہلا رہی تھی۔ میرے محسوسات بالکل کل کی طرح ہو رہے تھے۔ بیلا تو میری اولاد تھی..... لیکن بعض اوقات کچھ چیزیں بھی اولاد کی طرح عزیز ہوتی ہیں۔ خاص کر جہیز کی چیزیں جنہیں مرحوم والدین نے اپنی بیٹی کے لیے بہت پیار سے جمع کیا ہوتا ہے..... آنسو میرے گالوں پر بڑی شدت سے بہنے لگے تھے۔

# اے عشق ترے ہیں کھیل عجب

ڈرِ ثمن بلال

وہ کمالِ ہنر یوں بھی کرتا گیا
زخم دیتا گیا زخم بھرتا گیا
دور اُس کی نگاہوں سے منزل ہوئی
جادۂ عشق میں جو بھی ڈرتا گیا
رات پھولوں پہ شبنم برستی رہی
رنگ پھولوں کے رخ کا نکھرتا گیا

عشق، محبت، چاہت، پیار ایک جذبے کے کتنے اظہار ...یہ جذبہ ہر کسی کے دل میں پنپ سکتا ہے بشرطیکہ دل کا ظرف وسیع اور خلوص کے موتیوں سے مرصع ہو، زیرِ نظر کہانی اسی جذبے کے اتار چڑھاؤ کو بے حد متاثر کن انداز میں قاری کو ایک نئی سوچ سے روشناس کراتے ہوئے بڑھتی ہے۔

**عشق کے آفاقی جذبے کو ایک نئے انداز میں بیان کرتی دلکش تحریر**

قسط 2





''سارہ ویسے آپ بہت ضدی ہیں۔ دو مہینے سے آپ کے پیچھے خوار ہو رہا ہوں، آخر کس طرح میں آپ کو اپنی محبت کا یقین دلاؤں؟'' اس کے لہجے میں بیچارگی تھی۔ وہ تقریباً اس کے ساتھ، ساتھ ہی چل رہا تھا۔

''مجھے آپ کی محبت پر یقین کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے اور میں بھی آپ کو کئی بار کہہ چکی ہوں کہ آپ کسی اور لڑکی پر لائن ماریں۔ میں کوئی ایسی ویسی لڑکی نہیں ہوں۔ بلاوجہ مجھ پر ٹائم ویسٹ کر رہے ہیں آپ۔'' ہمیشہ کی طرح اس بار بھی سارہ کا لہجہ دوٹوک تھا۔

''یقین کیجیے سارہ، میں بھی کوئی سڑک چھاپ عاشق نہیں ہوں۔ بخدا جب سے آپ کو دیکھا ہے کسی کام میں دل نہیں لگتا میرا......''

''تو میں نے آپ کے دل کا ٹھیکا نہیں لے رکھا۔ سنبھال کر رکھیں اپنے دل کو۔'' سارہ کو غصہ آنے لگا۔

اسجد بہت کم رفتار سے بائیک چلاتا ہوا اس کے بالکل پیچھے، پیچھے ہی آرہا تھا۔ سارہ کی بات پر وہ مسکرا پڑا۔

''سارہ جی میں تو کئی بار اپنے دل کو سمجھا چکا ہوں مگر یہ کم بخت اب میری سنتا ہی کب ہے...... میرے دل پر تو اب صرف آپ کی حکمرانی ہے، مجھ سے تو اب میرا دل مکمل طور پر بغاوت کر چکا ہے۔''

سارہ اب چلتے، چلتے رک گئی تھی۔ وہ پچھلے دو مہینے سے اس شخص کی ایسی باتیں سن رہی تھی اور وہ اس کو ایسے ہی جواب دے رہی تھی مگر آج وہ بہت پریشان ہوگئی تھی۔

''خدا کے لیے میرا پیچھا چھوڑ دیں۔ میرا باپ ایک شریف انسان ہے اگر کسی نے آپ کو میرے پیچھے آتے ہوئے دیکھ لیا تو میرے ساتھ، ساتھ وہ بھی کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں گے۔'' سارہ کے لہجے میں التجا تھی۔ وہ سڑک پر جس جگہ تھی وہاں سے اس کا گھر محض ایک گلی کے فاصلے پر تھا۔ وہ گھر جو بالکل خستہ حال تھا جس میں ایک غریب اور بیمار باپ کے پاس اپنی ایمانداری، نیک نامی اور اس کی بیٹیوں کی شرافت کے علاوہ کوئی قیمتی چیز نہ تھی۔

''میں جانتا ہوں سارہ! مجھے بھی آپ کی عزت، اپنی محبت سے بڑھ کر عزیز ہے صرف ایک بار کہیں بیٹھ کر میری بات سن لیں، میں خدا کو حاضر و ناظر جان کر کہتا ہوں کہ میں آپ سے سچی محبت کرتا ہوں اور آپ سے شادی کا خواہش مند ہوں۔''

''جو لڑکی جہیز میں سوائے شرافت کے اور کوئی چیز نہ لا سکے کیا آپ کے گھر والے ایسی لڑکی کو قبول کر لیں گے؟''

''سارہ مجھے اور میرے گھر والوں کو ان چیزوں سے کوئی فرق نہیں پڑتا، میرے پاس اللہ کا دیا سب کچھ ہے، میں اپنے والدین کا اکلوتا بیٹا ہوں۔ ان کے لیے وہ لڑکی سب سے خاص ہوگی جس سے میں محبت کرتا ہوں۔'' اسجد کے لہجے کی سچائی اس کی باتوں میں بولتی محبت...... سارہ کو اندر ہی اندر سرشار کرنے لگی...... مگر اس کے لب خاموش تھے۔ ذہن کچھ سوچنے لگا تھا۔ اسجد بائیک سے اتر کر اب اس کے سامنے کھڑا ہوگیا تھا۔ وہ بھی ٹھٹک کر رک گئی تھی۔

''سارہ کچھ تو بولیں۔''

سارہ بغیر اس کی طرف دیکھے ہی اس کے چہرے کے تاثرات کا اندازہ لگا رہی تھی۔ اسے اسجد کی باتیں جھوٹ نہیں لگیں۔ اسجد کی وارفتگی نے اسے اپنا رخ موڑنے پر مجبور کر دیا تھا۔

''اچھا یہی بتا دیں کہ میں اپنی امی کو آپ کے گھر کب بھیجوں؟''

''ابھی اس کی ضرورت نہیں۔'' سارہ نے فتح [illegible] کی جانب قدم بڑھائے۔

مہینے کے آخری دن چل رہے تھے۔ گھر میں مہینے کے آخری دنوں میں نوبت فاقوں تک آجاتی تھی۔ وہ اسجد کو کیا بتاتی... کیسے بتاتی؟

''آپ کو نہیں مگر مجھے تو ہے ضرورت...... آپ کے بغیر میرا ایک، ایک پل عذاب میں گزرتا ہے۔'' اس کی اس بات پر سارہ کو بے اختیار ہنسی آگئی مگر وہ ضبط کر گئی۔

''پلیز ابھی آپ جائیں یہاں سے...... مجھے دیر ہو رہی ہے۔ ویسے بھی آتے جاتے کوئی دیکھ لے گا تو کیا سوچے گا۔'' سارہ اسے ٹالتے ہوئے آگے بڑھ گئی تھی اور اسجد دیر تک کھڑا اسے جاتا ہوا دیکھتا رہا تھا۔

سارہ جب گھر میں داخل ہوئی تو خلاف توقع...... زویا کو گھر میں دیکھ کر حیران ہوئی۔

''السلام علیکم! ارے زویا آپی آج آپ اسکول نہیں گئیں؟'' سارہ کمرے میں آکر اپنی چادر اتارتے ہوئے بیڈ پر لیٹی زویا سے پوچھنے لگی۔

''وعلیکم السلام...... گئی تھی یار...... بس ہاف لیو لے کر واپس آگئی، سر میں اتنا شدید درد ہوا کہ کیا بتاؤں...... ساتھ میں بخار بھی لگ رہا تھا۔''

''اب کیسی طبیعت ہے آپ کی؟'' سارہ نے بیگ اور فائل اپنے پلنگ سے اٹھا کر الماری میں رکھے۔

''اب کچھ بہتر ہوں...... گھر آکر پین کلر لی تھی پھر اماں نے چائے بنادی۔ اب بہتر محسوس کر رہی ہوں۔''

''ابا کہاں ہیں نظر نہیں آرہے۔'' سارہ بہن کے پاس ہی پلنگ پر بیٹھ گئی تھی۔ ''اور اماں بھی نظر نہیں آرہیں۔''

''ابا صفدر صاحب کی دکان تک گئے ہیں۔ گھر بیٹھ، بیٹھ کر بور ہو رہے تھے اور اماں نہا رہی ہیں۔''

''گلو گھر آیا کہ نہیں؟'' سارہ کے سوال پر زویا نے سرد آہ بھری۔

''اس کے لیے یہ گھر...... گھر تھوڑی ہے وہ تو یہاں صرف سونے آتا ہے یا اماں سے پیسے مانگنے...... اسے بگاڑنے میں سارا قصور سراسر اماں کا ہے۔'' زویا نے اپنی رائے دی۔

''ہاں...... مگر اب تو اماں بھی اس کی ناجائز فرمائش پر اسے ڈانٹتی ہیں، رات کو جب وہ دوستوں کے ساتھ سیر و تفریح کے لیے مری جانے کے لیے اماں سے پیسے مانگ رہا تھا تو اماں اسے ڈانٹ رہی تھیں۔''

''سارہ، جب اسے سمجھانے اور ڈانٹنے کا وقت تھا تو اس وقت اماں گلو کو میرا اکلوتا بیٹا کہہ، کہہ کر اسے بدتمیز اور خود سر بناتی رہیں۔ اب بھلا یہ ڈانٹ گلو کے لیے کیا معنی رکھتی ہے؟ اب تو وہ ڈھیٹ ہو چکا ہے۔'' زویا کے لہجے میں تکلیف کم، دکھ تھا۔

''کہہ تو آپ ٹھیک رہی ہیں آپی! یہ گھر کیسے چل رہا ہے؟ ابا کی معمولی پنشن اور پورا مہینہ، آپ اور میں کتنی محنت سے ایک، ایک پائی جوڑتے ہیں...... اور پھر مہینے کے آخر میں ہمارے ہاتھ کیسے خالی رہ جاتے ہیں...... اس گھر کا کرایہ...... دودھ کا بل، بجلی کا بل، گھر کا راشن، ابا کی شوگر اور بلڈ پریشر کی دوائیاں...... کیسے اور کہاں سے آتی ہیں...... گلو کو ان چیزوں سے کبھی سروکار نہیں رہا...... بھائی تو اپنی بہنوں کو گھر کی چار دیواری کا تحفظ دے کر خود محنت مزدوری کرتے ہیں...... ان کی ضرورتیں پوری کرتے ہیں...... قرض اٹھا کر بہنوں کی شادیاں تک کرتے ہیں...... اور ایک ہمارا بھائی ہے دنیا کا انوکھا اور نرالا بھائی...... جو ہمارا بوجھ اٹھانے کے بجائے الٹا ہم پر بوجھ بنا ہوا ہے......'' وہ شدید دل گرفتہ تھی۔

''ابا کی نظر کے چشمے کا نمبر بدلنے والا ہے...... ہر وقت ان کے سر میں درد رہتا ہے، اس مہینے ہم انہیں ڈاکٹر کے پاس بھی نہیں لے جاسکے، ان کی نئی عینک نہیں بنی...... اماں نے آدھی گرمیاں پچھلے سال کے دولان کے

سستے جوڑوں میں گزار دیں...... ہم انہیں نئے سوٹ نہیں دلا سکے...... کیا کریں مہنگائی نے ہم جیسوں کو دال روٹی کے چکر میں ڈال رکھا ہے...... مہینے میں ایک بار ہمارے گھر فروٹ آتا ہے وہ بھی جس دن ابا کو پنشن ملتی ہے...... ہفتے بعد کہیں گوشت کی شکل دیکھنا نصیب ہوتی ہے ہمیں...... ہمارے دکھ سکھ بانٹنے والا کوئی نہیں ہے زویا آپی......''
سارہ حد سے زیادہ جذباتی ہوگئی تھی...... اس کا لہجہ بھیگ گیا تھا۔
پلنگ پر لیٹی زویا کی آنکھوں سے دو آنسو ٹوٹ کر گرے تھے اور تکیے میں جذب ہو گئے تھے۔

☆☆☆

مناب نے ایک بڑے برتن میں آٹھ کپ پانی میں چکن بریسٹ کے تین، چار قدرے بڑے پیس ڈال کر انہیں ابلنے کے لیے چولھے پر چڑھایا اور کچن کے کیبنٹ کھول کر دیکھنے لگی...... ان میں کچن سے متعلق ہر چیز رکھی ہوئی دیکھ کر مناب مسکرا پڑی۔

''لگتا ہے چھوٹو بڑا اسٹھڑ ہو گیا ہے......'' اس نے کارن فلاور کا ڈبا نکال کر شیلف پر رکھا اور فریج سے دو انڈے اور سویٹ کارن کا ڈبا نکال کر شیلف پر رکھنے کے بعد خود cooking gloves چڑھا کر پانی میں ابلتے چکن کو کانٹے کی مدد سے چیک کرنے لگی...... گوشت ابھی ٹھیک سے نہیں گلا تھا...... مناب نے برتن کے اوپر دوبارہ ڈھکن رکھ دیا اور گلوز اتارنے کے بعد وہ پیالی میں انڈے توڑ کر پھینٹنے لگی۔ تقریباً آدھے گھنٹے میں وہ چکن کارن سوپ تیار کر چکی تھی، اس دوران اس نے سنک میں رکھے برتن بھی دھو ڈالے تھے...... اب وہ ڈسٹر کی مدد سے کچن کی شیلف صاف کر رہی تھی جب اسے اقصم کے روم سے ہلکے سے کھٹکے کی آواز سنائی دی تھی۔

مناب نے جلدی سے ڈسٹر مقررہ جگہ پر رکھا اور ہاتھ دھو کر اقصم کے روم میں آ گئی۔
اقصم کروٹ بدل کر سائیڈ ٹیبل پر پڑی پانی کی بوتل اٹھانے کی کوشش کر رہا تھا جو اس کے پکڑنے کی کوشش میں نیچے کارپٹ پر گر گئی تھی۔ مناب تقریباً دوڑ کر اقصم کے قریب آئی تھی۔
''چھوٹو پانی چاہیے تمہیں......؟''
مناب کو اپنے سامنے اور اتنے قریب کھڑے فکرمند ہوتا دیکھ کر اقصم کئی لمحے بے یقینی سے اسے دیکھتا رہا۔
''کیا میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں؟'' وہ مناب کو دیکھتے ہوئے جیسے خود سے بڑبڑاتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔
''یہ خواب نہیں ہے چھوٹو...... میں تمہارے پاس ہوں۔'' مناب اس کے قریب بیٹھتے ہوئے بولی۔
''اب کیسی طبیعت ہے تمہاری؟'' اس نے اقصم کا ماتھا چیک کیا...... ''تھینکس گاڈ تمہارا بخار پہلے سے کم ہو گیا ہے۔'' مناب نے اسے تسلی دی۔
''آپ آ گئی ہیں اب میں یقیناً ٹھیک ہو جاؤں گا۔'' اقصم نے مسکرانے کی کوشش کی تھی۔
''جب میں آئی تھی تو تمہیں بہت تیز بخار تھا۔''
''آپ کو کس نے بتایا کہ میں بیمار ہوں؟''
''مجھے ممانی نے بتایا تھا، وہ بہت پریشان ہو رہی تھیں تمہارے لیے۔'' اقصم کا جی چاہا کہ وہ اس سے پوچھے۔
''کیا آپ میرے لیے پریشان ہوئی تھیں؟'' مگر وہ صرف سوچ کر رہ گیا تھا...... پوچھ نہیں پایا تھا۔
مناب اس سے عمر میں چار سال بڑی تھی۔ وہ تیئس سال کا ایک نوجوان لڑکا تھا جبکہ وہ ستائیس سال کی ایک میچور لڑکی تھی۔ لڑکیاں تو ویسے بھی اٹھارہ بیس سال میں ہی میچور ہو جاتی ہیں۔ مناب نے اسے ہمیشہ ایک چھوٹے بھائی کی طرح ہی ڈیل کیا تھا...... اور وہ بھی اپنے دل کی ہر بات صرف مناب سے ہی شیئر کیا کرتا تھا

اگر اسے گھر میں کسی شرارت پر ڈانٹ پڑ جایا کرتی تو وہ ناراض ہو کر ساجدہ پھپھو کے گھر ڈیرے جمالیتا..... وجہ وہاں جانے کی صرف مناب ہی ہوا کرتی تھی..... ایشال کی اس سے لڑائی ہوتی تو وہ شکایتوں کے انبار لے کر مناب کے پاس ہی آیا کرتا تھا وہ اپنے دل کی تمام باتیں حتیٰ کہ اپنے اسکول، کالج کے دور میں گرل فرینڈز کی باتیں تک مناب سے شیئر کیا کرتا تھا..... بس ایک بات ایسی تھی جو وہ مناب سے کہنا چاہتا تھا مگر کہہ نہیں پاتا تھا۔

''بھوک لگی ہے چھوٹو.....؟'' مناب کے سوال پر وہ صرف اثبات میں سر ہلا کر رہ گیا..... مناب اٹھ کر کچن میں آگئی تھی..... اس نے ایک باؤل میں سوپ نکالا..... سوپ کا چمچ، نیپکن..... پانی کا گلاس..... اور سوس وغیرہ سب چیزیں اس نے ٹرے میں رکھیں اور اقصم کے روم میں چلی آئی۔ اس نے ٹرے ٹیبل پر رکھی اور خود اقصم کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔

''چھوٹو چلو شاباش..... اچھے بچوں کی طرح ہمت کرو اور تھوڑی دیر کے لیے بیٹھ جاؤ۔'' مناب نے اسے کندھوں سے پکڑ کر اٹھنے میں مدد دی۔ تین دن کے اس شدید بخار نے اقصم کو شدید نقاہت میں مبتلا کر دیا تھا۔

مناب نے دوسرے ہاتھ سے اس کے پیچھے تکیے سیٹ کیے..... اقصم کو اس کے کپڑوں سے اٹھنے والی burberry weekend perfume کی دلفریب مہک نے ایک بار پھر اس کی طرف دیکھنے پر مجبور کر دیا۔

اس کے سیاہ سلکی بال دونوں کندھوں پر بکھرے ہوئے تھے..... بڑی، بڑی سیاہ آنکھوں پر لمبی اور خمیدہ پلکوں نے اس کی آنکھوں کو مزید خوب صورتی بخش رکھی تھی۔ گلابی مائل سفیدی نے چہرے کو تازگی بخشی ہوئی تھی۔ گلابی ہونٹ اور نچلے ہونٹ کی دائیں جانب تھوڑی کے اوپر ایک چھوٹا سا سیاہ تل اس کے مسکراتے ہونٹوں کے ساتھ اسے مزید خوب صورت بنا دیتا تھا۔ وہ اسے دیکھتے، دیکھتے مبہوت ہو جاتا..... ولی کو اگر اس سے پہلی نظر میں محبت ہوئی تھی تو اسے ہونی بھی چاہیے تھی۔ اس میں کشش ہی کچھ ایسی تھی..... اور پھر وہ فطرتاً اتنی اچھی تھی کہ ہر کسی کو اپنا گرویدہ بنالیتی تھی۔

اقصم بیڈ کی پشت سے ٹیک لگا کر بیٹھ چکا تھا..... مناب بھی ٹرے اٹھا کر اس کے سامنے بیٹھ گئی تھی اس نے نیپکن اقصم کے آگے پھیلایا۔

''میرا حلق خشک ہو رہا ہے پہلے تھوڑا سا پانی پلا دیں۔''

مناب نے پانی کا گلاس اس کے لبوں سے لگایا، چند گھونٹ پینے کے بعد اس نے گلاس ہٹا دیا..... اب مناب سوپ کا باؤل لے کر اس کے سامنے بیٹھی..... کسی بچے کی طرح اسے سوپ پلانے لگی۔

''میرا فیورٹ سوپ اور وہ بھی اتنے مزے کا صرف آپ ہی بنا سکتی ہیں۔'' اقصم تعریف کیے بغیر نہ رہ سکا۔

''تمہاری پسندیدہ چیزوں کی لسٹ ہمیشہ مجھے یاد رہتی ہے چھوٹو، میں نے تمہارے لیے ویسے بھی اتنی محنت اور پیار سے بنایا ہے مزے کا کیوں نہ بنتا۔''

''پلیز..... آپ مجھے چھوٹو نہ کہا کریں..... مجھے بہت عجیب سا لگتا ہے کیونکہ اب آپ کا چھوٹو، چھ فٹ دو انچ لمبا ہو چکا ہے۔'' اس کی آواز دھیمی تھی اور وہ دھیرے سے دل کی بات کہہ گیا تھا۔

مناب اس کی بات پر مسکرائی۔

''جس دن تم مجھے آپی کہنا شروع کرو گے، میں تمہیں چھوٹو کہنا چھوڑ دوں گی۔'' مناب مسکرائی۔

''آپ کہیں سے میری آپی نہیں دکھتیں تو میں آپ کو بھلا کیسے آپی کہوں؟'' وہ قدرے جھنجلایا۔

''بس بات تو پھر وہیں آ گئی ناں...... دیکھنے میں چاہے تمہاری آپی نہ بھی لگوں... رہوں گی تو تمہاری آپی ہی ناں...... ؟ قد میں تم چاہے جتنے بھی لمبے ہو جاؤ...... مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا...... میرے لیے تو تم چھوٹے بھائیوں جیسے ہو اور ہمیشہ میرے لیے چھوٹو ہی رہو گے۔'' اب اس کی بات پر اقصم کچھ نہیں بولا تھا...... بولنے کے لیے کچھ تھا بھی نہیں۔ اس کی بھوک یک دم ختم ہو گئی تھی...... دل جیسے بجھ گیا تھا۔

مناب نے سوپ سے بھرا چمچ اس کے لبوں سے لگایا تو اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

''بس اور نہیں......''

''ارے، تھوڑا سا تو پیو ناں...... تمہارا فیورٹ سوپ ہے یہ...... اور ویسے بھی تمہیں ضرورت ہے اس کی۔'' مناب نے اصرار کیا۔

''میری فیورٹ تو آپ بھی ہیں، میری ضرورت تو آپ بھی ہیں......'' اقصم نے دل ہی دل میں سوچا۔

کبھی کبھی وقت انسان کی پسند اور ضرورت کو یک دم بدل کے رکھ دیتا ہے...... وہ پچھلے کئی مہینوں سے بہت سی باتوں کو دل ہی دل میں سوچتا رہتا تھا مگر ان کو اظہار کا پیراہن نہ دے پاتا۔ بس دل کی باتیں صرف دل ہی میں کر لیا کرتا تھا۔

''پلیز اور نہیں اس وقت بس اتنا ہی۔'' اقصم کے انکار کرنے پر مناب باؤل ٹرے میں رکھ کر کچن میں آ گئی۔ سوپ فریج میں رکھنے کے بعد وہ دوبارہ کمرے میں آئی تو وہ لیٹا چھت کو گھور رہا تھا۔

''کیا سوچ رہے ہو چھوٹو......؟''

''آپ کے بارے میں سوچ رہا تھا۔''

''میرے بارے میں......؟'' مناب کو حیرت ہوئی۔

''یہی کہ آپ بہت اچھی ہیں...... میری بیماری کا سن کر فوراً میرے پاس چلی آئیں۔''

''ہاں، اچھی تو میں واقعی ہوں اور تمہیں پتا ہے تمہارے پاس یہاں آنے کے لیے میں نے اپنے خوب صورت ویک اینڈ کی قربانی دی ہے۔''

''کیسی قربانی......؟'' اقصم حیران ہوا۔

''کل ولی امریکا سے اپنی زری آپا کے ساتھ دو چار دن کے لیے انگلینڈ آ رہا تھا۔ وہ بہن، بھائی یہ ویک اینڈ میرے ساتھ گزارنا چاہتے تھے۔''

ولی کے ذکر پر اقصم کے دل میں ایک عجیب سا درد جاگ اٹھا تھا۔

''جب مجھے ممانی نے تمہاری طبیعت کا بتایا...... اور مجھے تمہارے پاس یہاں آنے کو کہا تو میں نے ولی کو یہاں آنے سے روک دیا...... اس سے ایکسکیوز کر لیا۔'' مناب کے لہجے میں افسوس تھا۔

''ولی بھائی کو غصہ تو آیا ہو گا اس بات پر؟''

''ہاں...... ایک دم سے اس کا موڈ آف ہو گیا تھا لیکن پھر میں نے اسے پیار سے سمجھایا اور وہ سمجھ گیا......'' مناب سائڈ ٹیبل سے میڈیسن اٹھا کر نکالنے لگی۔ "he is a wonderful man" مناب نے اس کی تعریف کی۔

''کاش...... کاش میں بھی سمجھ جاؤں کہ آپ میرے لیے نہیں بنی ہیں۔'' اقصم نے دکھ اور تاسف سے اسے دیکھتے ہوئے سوچا۔

''اٹھو اقصم...... شاباش یہ میڈیسن کھا لو......'' مناب نے اپنی ہتھیلی پر رکھی میڈیسن اس کی جانب بڑھائی

.... وہ اقصم کا نام بہت کم لیا کرتی تھی...... مگر جب بھی لیتی تھی اقصم کو بہت خوشی ہوتی...... اقصم نے لحظہ بھر اسے دیکھا۔

وہ اتنی دبلی پتلی سی تھی، اس کے چہرے پر اتنی معصومیت تھی، اس کے مزاج میں اتنی سادگی تھی...... کہ وہ اقصم کی ایج فیلو ہی لگتی تھی...... مگر ان سب چیزوں کے علاوہ وہ ایک منگنی شدہ لڑکی تھی اور اپنے منگیتر ولی سے بہت محبت کرتی تھی...... عنقریب ان دونوں کی شادی ہونے والی تھی...... اقصم نے آہستہ سے اٹھ کر دوائی اس کے ہاتھ سے لے لی...... میڈیسن کھانے کے بعد وہ دوبارہ لیٹ گیا تھا۔

''میں اب بہتر فیل کر رہا ہوں...... پلیز اب آپ بھی سو جائیں۔''

''چھوٹو تم میری فکر مت کرو...... میں سو جاؤں گی۔'' مناب نے مسکراتے ہوئے اس کے کندھے پر تھپکی دی۔

''ایکسٹرا کمبل الماری کے نچلے کیبنٹ میں پڑا ہے، آپ اپنے لیے نکال لیں۔'' اقصم نے اطلاع دی۔

''او کے، ڈونٹ وری میں لے لیتی ہوں......'' مناب نے اس کی الماری کے نچلے کیبنٹ سے کمبل نکال لیا۔

''او کے چھوٹو...... میں باہر لاؤنج میں سو رہی ہوں، تمہیں رات میں اگر کسی چیز کی ضرورت ہو تو میرے سیل فون پر کال کر لینا۔'' مناب کمبل اٹھا کر کمرے سے باہر نکلتے ہوئے بولی۔

''ویسے مجھے بہت افسوس ہے کہ میری وجہ سے آپ کا ویک اینڈ خراب ہوا۔''

''اچھا اب بکومت...... بچپن سے لے کر آج تک اپنی ہر بات تم مجھ سے دھونس جما کر منواتے رہے ہو، اب ان فارمیلٹیز میں پڑنے کی ضرورت نہیں ہے تمہیں۔'' مناب نے مصنوعی غصے سے اسے ڈپٹا۔

''آپ سچ کہہ رہی ہیں بچپن میں، میں آپ سے اپنی ہر بات منوالیا کرتا تھا بس ایک بات نہیں منوا سکا...... آپ کو خود سے محبت کرنے پر مجبور نہیں کر سکا......'' اقصم نے دل میں سوچا۔

''شاید آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں اپی وے...... آپ جا کر آرام کریں کافی ٹائم ہو گیا ہے...... او کے گڈ نائٹ...... !'' مناب نے اسے مسکرا کر دیکھا اور کمرے سے باہر نکل گئی۔

اس کے جانے کے بعد اقصم کو ایسے لگ رہا تھا جیسے اس کے کمرے کی تمام چیزیں کلرڈ سے بلیک اینڈ وائٹ ہو گئی ہوں۔

اقصم کی زندگی میں روز بروز لفظ ''کاش'' کے اضافے ہو رہے تھے وہ اکثر سوچا کرتا تھا کہ محبت کی گاڑی ہمیشہ ایک غلط راستے پر کیوں گامزن ہو جاتی ہے۔ یہ ہمیشہ غلط راستے کا ہی انتخاب کیوں کرتی ہے؟ جہاں بعض اوقات جگہ جگہ اس کو سگنل توڑنا پڑتے ہیں...... جہاں بھی اس گاڑی کے چالان ہوتے ہیں...... کبھی اس کی رفتار زیادہ ہوتی ہے کبھی کم اور کبھی اس کی بریکس فیل ہو جاتی ہیں اور پھر بالآخر یہ گاڑی علاقۂ ممنوعہ میں جا گھستی ہے اور کتنی تباہی مچاتی ہے۔ کتنے رولز توڑتی ہے یہ آنے والا وقت بتاتا ہے...... اقصم کی محبت کی گاڑی بھی شاید اسی ایریے میں داخل ہونے والی تھی۔

اقصم نے کروٹ بدلی، ہاتھ بڑھا کر پانی کا گلاس اٹھایا اور ایک ہی سانس میں اس نے گلاس خالی کر دیا۔

☆☆☆

صبح دس بجے کا وقت تھا جب نور منزل کے تمام افراد ڈائننگ ٹیبل پر ناشتا کرنے میں مصروف تھے بٹلر اور پپو سب کو ناشتا سرو کر رہے تھے۔

''پپو جا کر دیکھو زارون ابھی تک ڈائننگ روم میں کیوں نہیں آیا؟ ناشتا ٹھنڈا ہو جائے گا۔'' سمیرا بیگم نے براؤن بریڈ پہ ڈائٹ جام لگاتے ہوئے پپو کو مخاطب کیا...... جنو بیگم کو ایک باؤل میں کارن فلیکس ڈال کر دے

رہی تھی۔
''چھوٹی بیگم جی..... چھوٹے صاحب تو جی کافی دیر سے اس بھاگنے والی مشین پہ چڑھ کر تیز، تیز بھاگ رہے ہیں۔''
پینو کی اطلاع پہ ڈائننگ ٹیبل پر موجود تمام افراد مسکرا اٹھے۔
''پینو وہ بھاگنے والی مشین نہیں اسے ٹریڈ مل...... کہتے ہیں۔'' عنایہ نے اسے سمجھایا۔
''ہاں جی وہی......'' پینو نے گرم دودھ نور بیگم کے سامنے رکھا۔
''ہیلو ایوری باڈی......'' اسی دوران ٹریک سوٹ میں ملبوس زارون ڈائننگ روم میں داخل ہوا۔
اسے دیکھ کر عنایہ کی آنکھیں چمک اٹھیں اور لبوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی تھی...... زارون، عنایہ کے ساتھ خالی چیئر دیکھ کر اس کے ساتھ ہی بیٹھ گیا تھا۔
''زارون بھائی، میرے برابر بھی ایک چیئر خالی تھی اِدھر آجاتے۔'' ایشال کا انداز چھیڑنے والا تھا۔
''کیوں بھئی، میں کیوں اُدھر بیٹھوں؟ اپنے ساتھ تم اپنے اُن کو بٹھانا...... میں اِدھر اپنی اُن کے ساتھ ہی ٹھیک ہوں......'' زارون کی بات پر ایشال کے ساتھ، ساتھ سب ہی مسکرا دیے۔
''اللہ میرے ان دونوں بچوں کی جوڑی سلامت رکھے۔'' نور بیگم نے زارون اور عنایہ کو خوش دیکھ کر دعا دی۔
''آمین...... اماں آپ کی دعاؤں نے ہی نور منزل کو ایک مکمل گھر بنا رکھا ہے۔'' سمیرا بیگم نے احتراماً نور بیگم کو دیکھتے ہوئے اعتراف کیا۔
''جی اماں...... سمیرا بالکل ٹھیک کہہ رہی ہے، آج کل کے دور میں ایسا سکون، ایسی راحت گھروں میں کہاں دیکھنے کو ملتی ہے...... جو ہمارے گھر کو نصیب ہے۔'' برابر والی چیئر پر بیٹھے داؤد چوہدری نے عقیدت سے اپنی اماں کو دیکھا۔
''جیتے رہو میرے بچو...... میں اپنے پروردگار کا جتنا بھی شکر ادا کروں وہ کم ہے جس نے مجھے اتنی نیک، فرمانبردار اولاد...... اور پیار، عزت اور احترام کرنے والے پوتے، پوتیاں...... نواسے، نواسی عطا کیے۔'' تشکر سے نور بیگم کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں۔
''کم آن دادو...... آپ پلیز روئیں تو نہیں......'' زارون نے انرجی ڈرنک کی بوتل اٹھا کر لبوں سے لگائی۔
''میرے بچے، یہ تو خوشی کے آنسو ہیں......'' نور بیگم مسکرا دیں۔
''اسلم میرے لیے کافی بناؤ......'' داؤد چوہدری نے مؤدبانہ انداز میں قریب کھڑے بٹلر کو مخاطب کیا۔
''جی صاحب......!'' وہ حکم کی تعمیل کرنے لگا۔
''ایشو اب بس بھی کرو...... تم نان اسٹاپ کھا رہی ہو۔'' عنایہ نے اسے تیسرا اسلائس اٹھاتے ہوئے دیکھ کر ڈپٹا۔
''کیا ہے یار......؟ خود تو سارا سال تم ڈائٹ پر رہتی ہو...... کم از کم میرے کھانے پینے پر نظر تو نہ رکھا کرو......'' ایشال نے برا منایا۔
''بھئی کوئی میری ایشو کو کھانے پینے سے نہ روکے......'' داؤد چوہدری مسکرائے۔
''بڑے پاپا دیکھیں تو...... کتنی موٹی ہو رہی ہے یہ۔'' عنایہ نے دہائی دی۔
''کہاں موٹی ہو رہی ہوں...... میرا ویٹ جسٹ ففٹی تھری کے جی ہی تو ہے۔''
''تو ففٹی تھری کون سا کم ہے تمہارا ویٹ جسٹ ففٹی ہونا چاہیے۔'' عنایہ نے اسے گھورا...... کیونکہ وہ خود ایک weight conscious لڑکی تھی۔ چیز آملیٹ ایشال کا فیورٹ آملیٹ تھا۔ وہ جب بھی

بنا...... ایشال بڑی رغبت سے کھایا کرتی تھی...... ایشال ویسے بھی کھانے پینے کی شوقین تھی اسے بھوک بھی بہت لگتی تھی۔

''جس نے مجھے پسند کرنا ہوگا وہ مجھے ایسے ہی کر لے گا، اس لیے میں کیوں کسی مریض کی طرح اُبلی ہوئی سبزیاں کھاؤں۔'' ایشال نے بے پروائی سے شانے اچکائے۔

''ویسے ایشو تمہارے بارے میں عمر بھائی بالکل ٹھیک ہی کہتے ہیں...... تمہیں دیکھ کر یقین نہیں آتا کہ تم ایم بی بی ایس ہو...... بالکل اسٹوپڈ لگتی ہو شکل سے بھی عقل سے بھی۔''

''ایم بی بی ایس تو میں نے صرف مما اور بابا کی خواہش پوری کرنے کے لیے کیا ہے اگر میرے پاس چوائس ہوتی تو میں مر کر بھی کم از کم ڈاکٹر کبھی نہ بنتی۔'' ایشال کا موڈ ہنوز خراب تھا...... دونوں بہنوں کی نوک جھوک سے سب ہی محظوظ ہو رہے تھے۔

''ارے ہاں عمر کے ذکر سے یاد آیا...... ایشو بیٹا تمہارا ہاؤس جاب مکمل ہو گیا ہے۔ میں نے عمر سے تمہارے لیے بات کی تھی...... تم کچھ عرصہ عمر کے اسپتال میں اس کے ساتھ پریکٹس کرلو اور ویسے بھی تمہیں مستقبل میں child specialist ہی تو بننا ہے...... اس حساب سے تمہیں عمر سے بہت کچھ سیکھنے کو ملے گا۔'' داؤد چوہدری کی بات پر ایشال کی بھوک ختم ہو گئی تھی اور منہ پر بارہ بج گئے تھے۔

ایشال کے انداز پر زارون اور عنایہ نے ایک دوسرے کو مسکرا کر دیکھا۔

داؤد چوہدری نے تو جیسے ایشال کی دُکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔

''بڑے پاپا، آپ کے پاس مجھے اس سے بڑی سزا سنانے کے لیے نہیں تھی کہ میں عمر بھائی کے ساتھ رہ کر ان کے ساتھ پریکٹس کروں؟'' ایشال کا لہجہ روہانسا ہوا۔

زارون، اپنے ساتھ بیٹھی عنایہ کو آنکھ مار کر داؤد چوہدری سے مخاطب ہوا۔

''چچ، چچ، چچ...... پاپا آپ نے ویسے ایشو کے ساتھ بڑا ظلم کیا ہے...... چلو اسی بہانے عمر بھائی کے ساتھ رہ کر ان کی ڈانٹ سن، سن کر تمہارا وزن بھی کم ہو جائے گا۔''

''تم سلم بھی ہو جاؤ گی......'' زارون کی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے عنایہ نے بھی اسے زچ کیا۔

''بھئی میں نے ایسا کون سا ظلم کر دیا ہے میں نے تو ایشال کے برائٹ فیوچر کو مدِ نظر رکھتے ہوئے عمر سے بات کی تھی۔'' داؤد چوہدری کافی پیتے ہوئے مسکرائے۔

''بڑے پاپا عمر بھائی کے علاوہ بھی اس شہر میں بہت سے چائلڈ اسپیشلسٹ ڈاکٹرز موجود ہیں۔'' ایشال نے ہنوز افسردگی سے کہا۔

''مگر ایشو میری جان...... عمر کا اس وقت شہر کے قابل ترین اور فیمس (مشہور) consultant paediatrician میں شمار ہوتا ہے...... تم اس کے ساتھ ایز اے جونیئر کام کرو گی تو اس سے بہت کچھ سیکھنے کو ملے گا تمہیں۔'' سمیرا بیگم نے بھی اسے پیار سے سمجھایا۔

''ایشال میری بچی...... داؤد اور سمیرا ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ عمر تمہارا پھوپھو زاد بھائی ہے آخر کسی نہ کسی اسپتال میں کسی نہ کسی ڈاکٹر کے ساتھ تم نے کام تو کرنا ہی ہے ناں...... عمر تو پھر گھر کا بچہ ہے۔ بہت نیک اور فرمانبردار بھی۔'' نور بیگم نے بھی اسے پیار سے سمجھایا۔ ''اور اس میں فائدہ بھی صرف تمہارا ہی ہے۔''

''دادو عمر بھائی نیک ہوں...... فرمانبردار ہوں...... قابل ہوں یا فیمس...... اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا...... میرے لیے تو ہمیشہ وہ ہٹلر اور ہلاکو خان ثابت ہوئے۔'' ایشال کے لہجے اور انداز پر ڈائننگ ٹیبل پر موجود تمام

افراد ہنس دیے تھے۔



کمرے میں بیڈ کے دونوں اطراف رکھے لیمپ روشن تھے۔ وہ رات کا کوئی پچھلا پہر تھا جب ایک دم سے اسے اپنا حلق خشک ہوتا ہوا محسوس ہوا تھا۔ اقصم نے نیم وا آنکھوں سے وال کلاک کو دیکھا...... صبح کے چار بج رہے تھے...... اقصم نے خود پر لیا ہوا کمبل اتار کر ایک سائڈ پر پھینکا...... اسے پیاس کے ساتھ گرمی بھی لگ رہی تھی...... ایسا یقیناً اسے بخار اترنے کی وجہ سے محسوس ہوا تھا۔ اس نے سائڈ ٹیبل سے اپنا موبائل اٹھا کر مناب کو کال کرنی چاہی مگر پھر پُرسوچ انداز میں اس نے موبائل واپس تکیے کے نیچے رکھ دیا اور بیڈ پر چت لیٹا چھت کو گھورنے لگا...... پانچ، چھ گھنٹے پہلے مناب کے ساتھ گزرے لمحات، اس کی نظروں کے سامنے ری وائنڈ ہو رہے تھے...... جب پیاس کی شدت زیادہ بڑھی تو وہ ہمت کر کے بیڈ سے اٹھ گیا...... پہلے اقصم نے روم کی ہیٹنگ کم کی اور پھر کمرے سے باہر نکل گیا...... اب وہ خود کو پہلے سے بہتر محسوس کر رہا تھا...... مناب لاؤنج کے صوفے پر گردن تک کمبل تانے گہری نیند سو رہی تھی۔ وہ بے آواز چلتا ہوا کچن میں گیا...... صاف اور چمکتا ہوا کچن دیکھ کر وہ دھیرے سے مسکرا دیا۔ فریج سے پانی کی بوتل نکال کر وہ دوبارہ لاؤنج میں آ گیا...... اور احتیاط سے مناب کے قریب رکھے صوفے پر بیٹھ کر پانی پینے لگا۔ اس کی نظریں سوئی ہوئی مناب پر مرکوز تھیں...... بے اختیار اس کا جی چاہا کہ وہ اس کے سیاہ بکھرے سلکی بالوں میں دھیرے، دھیرے انگلیاں پھیرے، ہیٹر کی حدت سے اس کے پنک ہوتے رخسار کو اپنے ہاتھ کی انگلیوں سے چھوئے...... اس کی ٹھوڑی کے دائیں جانب بنے سیاہ تل کو...... اس کے پاس اس کے بے حد قریب بیٹھ کر فرصت سے دیکھتا رہے۔ اس کا ایک ہاتھ کمبل سے باہر نکلا ہوا تھا...... اس کا جی چاہا کہ وہ اس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے لے...... ایسی چھوٹی، چھوٹی بہت سی خواہشیں تھیں جو اس کے پاگل دل میں سر اٹھانے لگی تھیں۔

اچانک اس کی نظر اس کے ہاتھ کی اس انگلی پر پڑی جس میں ولی کے نام کی ڈائمنڈ رنگ جگمگا رہی تھی...... انگوٹھی دیکھ کر اس کا دل بجھ گیا...... اب مناب کے سامنے بیٹھنا اس کے لیے دشوار ہو گیا تھا۔ وہ شکست خوردہ سا اٹھ کر اپنے روم میں آ گیا...... اس کا دل درد سے بھر گیا۔

راہِ محبت میں عجب سا ہوا ہے حال اپنا
نہ زخم نظر آتا ہے نہ درد سہا جاتا ہے

دل اتنا بے چین اور بے بس ہو گیا کہ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے...... محبت ایک آسیب کی طرح اسے چمٹ گئی تھی...... وہ تھک گیا تھا محبت کے عذاب کو دل پر سہتے، سہتے...... اسے لگتا جیسے وہ کسی جنگل میں جا گھسا تھا...... جہاں اسے واپسی کا راستہ نہیں مل رہا تھا...... وہ بھٹک رہا تھا۔

وہ میرا سب کچھ ہے میرا مقدر نہیں
کاش وہ میرا کچھ نہ ہوتا میرا مقدر ہوتا

پتا نہیں یہ اقصم کے اندر کی بے بسی تھی، دکھ تھا یا غصہ...... اس نے پانی کی بوتل نیچے دے ماری...... کارپٹ پر بوتل گرنے سے شور ضرور اٹھا تھا لاؤنج میں سوئی مناب، اقصم کے روم سے آنے والی آواز سن کر اٹھ گئی تھی اس نے بے اختیار اپنا سیل فون اٹھا کر دیکھا اقصم کی کوئی بھی مسڈ کال نہیں تھی۔ مناب کمبل ہٹا کر اٹھ گئی۔ کھلے بالوں کو جوڑے کی شکل میں لپیٹا...... وہ جینز پر ریڈ شرٹ پہنے ہوئی تھی اس نے قریب رکھی اپنی گرم شال اپنے گرد لپیٹی اور اقصم کے روم میں چلی آئی۔

''چھوٹو آر یو او کے......؟'' وہ فکر مندی سے آگے بڑھی۔ وہ اقصم کے پاس آ کر بیڈ پر بیٹھ گئی۔
''چھوٹو...... تم ٹھیک تو ہو؟'' مناب نے فکر مندی سے اس کی سرخ ہوتی آنکھوں اور پریشان چہرے کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔
''میں ٹھیک ہوں...... آپ پلیز جائیں یہاں سے۔'' اقصم نے نظریں چرائیں۔
''نہیں، تم مجھے ٹھیک نہیں لگ رہے ہو...... کیا بات ہے چھوٹو......؟''
''کچھ بھی نہیں، آپ ایسے ہی پریشان ہو رہی ہیں۔'' مناب نے اس کا بخار چیک کیا۔
''شکر ہے تمہارا بخار اب اتر گیا ہے۔''
اقصم خاموش رہا۔
''کچھ چاہیے تمہیں......؟'' مناب کے سوال پر وہ چند لمحے اسے دیکھتا رہا۔
''اقصم بولو ناں...... میں تم سے پوچھ رہی ہوں...... کچھ کھانا ہے تو بتاؤ میں لا دیتی ہوں۔''
''نہیں، مجھے کچھ نہیں کھانا میں اب سوؤں گا۔''



''شیور؟''
''یس......''
''او کے ایز یو وش......'' مناب کمرے سے باہر نکل گئی۔
اور اقصم نے اپنا بوجھل سر تکیے پر گرا لیا تھا۔

☆☆☆

آج اتوار کا دن تھا جب سارہ سو کر اٹھی تو اچھا خاصا دن چڑھ آیا تھا...... سارہ بال سمیٹ کر چپل پہنے کمرے سے نکلی تو زویا نے صحن میں واشنگ مشین لگا رکھی تھی۔
سیما بیگم کچن میں ناشتا بنا رہی تھیں...... ان کے قریب ہی چوکی پر بیٹھے شاکر حسین ناشتا کرنے میں مصروف تھے...... اسی اثنا میں باتھ روم کا دروازہ کھلا تھا اور اٹھارہ انیس سال کا گلو بالوں میں تولیا رگڑتے ہوئے باہر نکلا۔
''اماں ناشتا بن گیا میرا......؟'' تولیا چارپائی پر پھینک کر وہ کچن کی جانب آیا۔
''بن گیا ہے آ کر کھالے......'' سیما بیگم کی کچن سے آواز آئی۔
''آپی آپ رہنے دیتیں، میں خود مشین لگا لیتی۔'' سارہ اس کے قریب آئی۔
''ارے کوئی بات نہیں، آج صبح میری جلدی آنکھ کھل گئی تھی۔ میں نے مشین لگا لی۔ دیکھو بس تھوڑے سے کپڑے رہ گئے ہیں۔'' زویا نے تار پر پھیلے کپڑوں کی طرف اشارہ کیا۔
''آپی میں نہا کر ابھی آئی پھر مل کر ناشتا کرتے ہیں......''
''ٹھیک ہے......'' کپڑے نتھارتی زویا نے بہن کو مسکرا کر دیکھا۔
سارہ باتھ روم میں گھس گئی تھی۔
آج پھر روٹی کے ساتھ اچار ہے؟ رات کا سالن نہیں بچا......؟ یا انڈا ہی بنا دو......'' گلو نے روٹی والی چنگیری اور اچار غصے میں پرے کھسکا دیا۔
''روٹی کھانی ہے تو اسی سے کھالے...... نہ سالن ہے نہ انڈا......'' سیما بیگم نے توے پر روٹی ڈالتے ہوئے اطلاع دی۔
''اس گھر میں آج تک ڈھنگ کی روٹی کھانا نصیب نہیں ہوئی...... مجھے نہیں کرنا ایسا بے سوادا ناشتا......''

''تو لے آحلوا پوریاں...... کیوں کھیلتا ہے سارا دن تاش...... کیوں کرتا ہے آوارہ گردی...... کماتا کیوں نہیں؟'' سیما بیگم کو غصہ آ گیا۔

''کما لوں گا اماں...... مجھے کمائی کے طعنے نہ دیا کر...... جس دن میں نے کمائی شروع کی ناں...... تیرا یہ رویہ نہیں رہے گا میرے ساتھ...... تو خود مجھ سے پوچھے گی...... بتا گلو میں آج تیرے لیے کیا بناؤں؟''

''ارے وہ دن تو آئے جس دن تو کمائی کر کے ہمیں کھلائے گا۔'' سیما بیگم کا غصہ ہنوز برقرار تھا۔

''ابا مجھے ایک ہزار چاہئیں...... ادھار ہی دے، دے واپس کر دوں گا تجھے۔''

''تمہیں پتا ہے گلو یہ مہینے کی آخری تاریخیں چل رہی ہیں...... ان دنوں گھر کی دال روٹی چلانا مشکل ہو جاتا ہے، میں تمہیں کہاں سے دوں ایک ہزار روپیہ......؟'' شاکر صاحب کے لہجے میں بے بسی تھی، مجبوریاں پنہاں تھیں۔

''بس ابا تجھ سے تو کچھ مانگنا ہی فضول ہے، بارہ مہینے تو کنگال ہی رہتا ہے۔'' گلو ناشتا چھوڑ کر اب زبان درازی پر اتر آیا تھا۔

زویا اس کا اندازِ بدتمیزی دیکھ کر پانی کا نل بند کر کے کچن کی طرف آ گئی۔

''گلو شرم کرو، یہ کس لہجے میں تم اماں اور ابا سے بات کر رہے ہو؟''

''تو اور کس لہجے میں بات کروں......؟ جب دیکھو پھوٹی کوڑی نہیں ہوتی تم لوگوں کے پاس......'' گلو کے لہجے میں نفرت تھی، بے پناہ غصہ تھا۔

''تو تمہارے جوئے کھیلنے کے لیے ہم کہاں سے لائیں اتنی بڑی، بڑی رقمیں......؟ کوئی ٹنکیاں نہیں لگا رکھی ہم نے پیسوں کی...... ابا کی پنشن اور ہم دونوں بہنوں کی کمائی سے جس طرح ہم خواہشوں کو مار، مار کر زندگی گزار رہے ہیں یہ صرف ہم ہی جانتے ہیں...... تم اتنے غیرت مند ہوتے تو اماں، ابا کو کما کر دیتے۔ ہم سب کی زندگی اتنی مشکل نہیں ہوتی جتنی آج ہم گزار رہے ہیں۔'' زویا نے اسے آڑے ہاتھوں لیا۔

''تو میں کہاں سے نوٹ کما کر لاؤں؟ یہاں ایم بی اے اور ماسٹرز کرنے والے نوکریوں کے لیے دھکے کھا رہے ہیں، مجھ میٹرک پاس کو کون نوکری دے گا۔''

''جن بیٹوں نے اپنے والدین کے لیے اور جن بھائیوں نے اپنی بہنوں کے لیے کمانا ہوتا ہے ناں تو وہ تمہاری طرح کام چور...... بہانے باز اور جوئے باز نہیں ہوتے...... تمہیں تو چلو بھر پانی میں ڈوب مرنا چاہیے...... جوان جہان ہٹا کٹا ہو کر ماں، باپ کو پیسے کما کر دینے کے بجائے ان سے ہتھیانے کی کوشش کرتا ہے۔ نالائق کہیں کا۔'' زویا نے گلو کو بری طرح سے ڈپٹا۔

''بس، بس آپی...... اپنی عزت اپنے ہاتھ میں...... تو اسکول میں بچوں کی استانی ہے انہی کو یہ سبق پڑھایا کر میری استانی بننے کی ضرورت نہیں ہے تجھے......''

''گلو میں کہہ رہا ہوں زبان سنبھال کر بات کر، یہ نہ ہو میرا ہاتھ اٹھ جائے تجھ پر......'' شاکر صاحب جو اتنی دیر سے اس کی بکواس سن کر برداشت کر رہے تھے پھٹ پڑے۔

''آج تیری بہن سارہ کو دیکھنے کچھ لوگ آ رہے ہیں...... تیری جگہ کوئی اور بھائی ہوتا تو نہ جانے وہ مہمانوں کی خاطر خدمت کے لیے کیا، کیا لے کر آتا۔ ایک تو ہے جو ہمیں کما کر دینے کے بجائے ہم سے چوبیس گھنٹے چھینا جھپٹی میں مصروف رہتا ہے۔'' سیما بیگم نے روٹی توے سے اتار کر چنگیری میں رکھی اور چولھا بند کرتے ہوئے گلو سے مخاطب ہوئیں۔

''اماں سیدھی طرح سے مجھے کہہ دے کہ میں اس گھر سے نکل جاؤں...... میری تو ویسے بھی اس گھر میں

دو ٹکے کی عزت ہے...... اور عزت ہو بھی کیسے؟ آج کل عزت صرف پیسوں والوں کی ہے آج اگر میں کماؤ ہوتا......نوٹ کما، کما کر تم لوگوں کو دیتا تو تبھی لوگوں نے میرے آگے پیچھے پھرنا تھا۔''

''ارے چل جا دفع ہو جا...... تجھے کمانے کا اتنا شوق ہوتا تو آج تو کہیں مزدوری کر رہا ہوتا...... کہیں چوکیداری کر لیتا...... کسی ہوٹل میں ویٹر لگ جاتا...... کسی فیکٹری میں کام کر رہا ہوتا...... کہیں رکشا چلا لیتا مگر تجھے تو اپنے اس نکھٹو بہنوئی خالد کی طرح کام کرنے اور کمانے کی عادت ہی نہیں ہے۔'' سیما بیگم کو آج گلو پہ کچھ زیادہ ہی غصہ آرہا تھا۔

''اماں رہنے دیں' یہ بے حس انسان ہے، اس سے بات کرنے کا کوئی فائدہ نہیں، کام کا نہ کاج کا دشمن اناج کا......'' زویا کا غصہ بھی اسی طرح برقرار تھا۔

''بس بہت ہوگئی میری بے عزتی...... بہت دے لیے تم سب نے مجھے طعنے...... جا رہا ہوں میں اس گھر سے اور اب اس وقت تک گھر نہیں آؤں گا جب تک میری جیب بھی نوٹوں سے بھر نہیں جاتی۔'' گلو غصے میں بکتا جھکتا دھڑ سے دروازہ پٹخ کر باہر نکل گیا تھا...... کچن میں موجود تینوں نفوس خاموش ہو چکے تھے ان کے پاس کہنے کو کچھ تھا بھی نہیں۔ کبھی، کبھی اندر کی خاموشی لبوں کو ایسے ہی سی دیتی ہے...... اور پھر وہ خاموشی ایک نہ نظر آنے والے دکھ کا روپ دھار کر اندر ہی اندر انسان کو کاٹنے لگتی ہے، مارنے لگتی ہے' دیمک کی طرح کھانے لگتی ہے...... سارہ باتھ روم سے نکلتے ہوئے سوچ رہی تھی۔ جب سے اس نے ہوش سنبھالا تھا...... ایسا کوئی دن نہیں گزرتا تھا جس دن ان کے گھر میں لڑائی نہ ہوتی ہو...... پہلے ہمیشہ گھر میں لڑائی سیما بیگم کی وجہ سے ہوا کرتی تھی اب سیما بیگم کے ساتھ گلو بھی شامل ہو گیا تھا۔

☆☆☆

اقصم کی صبح جب آنکھ کھلی تو دس بج رہے تھے، شدید بھوک کے احساس نے جلد ہی اسے بستر چھوڑنے پر مجبور کر دیا تھا......شاور لینے کے بعد وہ ٹراوزر شرٹ میں ملبوس باہر نکلا تو خود کو فریش محسوس کیا۔

مناب رات والے حلیے میں بغیر کسی شال یا مفلر کے vacuum cleaner سے لاؤنج صاف کر رہی تھی...... اس نے اپنے بالوں کو اونچی سی پونی میں جکڑ رکھا تھا...... اپنی شرٹ کے بازو اس نے فولڈ کر کے کہنیوں تک چڑھا رکھے تھے اور وہ پورے انہماک سے گھر کی صفائی میں مصروف تھی۔

اقصم اسے ماسیوں والے حلیے میں دیکھ کر بے اختیار مسکرایا تھا۔ وہ لابی سے لاؤنج میں آیا۔

''گڈ مارننگ......!''

''ویری گڈ مارننگ......'' مناب نے اسے مسکرا کر دیکھا۔

''چھوٹو اب تمہاری طبیعت کیسی ہے؟''

''پہلے سے بہتر فیل کر رہا ہوں......'' اقصم صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

''شکر خدا کا اب تم بہتر ہو...... صبح مامانی کی کال آئی تھی' وہ تمہارا بہت پوچھ رہی تھیں...... میں نے انہیں بتایا ہے کہ اب چھوٹو کے لیے انہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں کیونکہ میں اس کے پاس ہوں۔'' مناب نے ویکیوم کلینر رکھنے کے بعد صوفے سے اپنی شال اٹھا کر کندھے پر ڈالی۔

''مما تو بس خواہ مخواہ چھوٹی، چھوٹی باتوں پر پریشان ہو جاتی ہیں۔''

''ماں کی محبت ہوتی ہی بڑی عجیب ہے چھوٹو...... نہ سمجھ میں آنے والی...... اینی وے میں نے تمہارے لیے پاستا بنایا ہے اور رات والا سوپ بھی رکھا ہے...... یہ بتاؤ ناشتے میں کیا لو گے؟''

''پاستا میں لنچ میں لوں گا۔۔۔ ابھی مجھے گرم دودھ میں کارن فلیکس لا دیں۔''
''او کے، میں ابھی لائی۔۔۔۔۔'' مناب کچن کی طرف بڑھ گئی۔
اقصم نے ریموٹ اٹھا کر ایل ای ڈی آن کی۔ تھوڑی دیر کے بعد مناب اسے سرو کر رہی تھی۔
''تھینکس۔۔۔۔'' اقصم نے دھیرے سے مسکراتے ہوئے شکریہ ادا کیا۔
''مجھے تمہارے تھینکس کی ضرورت نہیں ہے، اپنا تھینکس اپنے پاس رکھو۔۔۔۔'' مناب خوشگوار موڈ میں قریب ہی سنگل صوفے پر آبیٹھی تھی۔
''کیا میں اکیلے ناشتا کروں گا؟''
''ایکچوئیلی میں ناشتا کر چکی ہوں۔۔۔۔ اب ایسا ہے کہ تم ناشتا کرو، میں شاور لے لوں۔۔۔۔ بعد میں مل کر کافی پئیں گے۔'' مناب اپنے بیگ سے سوٹ اور ٹاول نکالنے لگی۔
اقصم کارن فلیکس کھاتے ہوئے چینل سرچنگ کر رہا تھا۔
مناب، اقصم کے روم کی طرف بڑھ گئی تھی۔۔۔۔
کارن فلیکس کھانے کے بعد اقصم نے برتن کچن کی شیلف پر رکھے اور کچن کی صفائی دیکھ کر مسکرا دیا۔۔۔۔ ہر چیز اپنے ٹھکانے پر بڑے طریقے سے رکھی ہوئی تھی۔ ڈائننگ ٹیبل بھی صاف کی گئی تھی اور یقیناً کچن کا فرش بھی صاف کیا گیا تھا۔
وہ تھی بھی بہت صفائی پسند۔۔۔۔ اقصم کی دونوں کزنز ایشال اور عنایہ نے کبھی کچن میں جھانکنا بھی گوارا نہیں کیا تھا اور مناب اپنی ماں ساجدہ بیگم کی طرح ویل ایجوکیٹڈ ہونے کے باوجود گھر گرہستی میں بہت دلچسپی رکھتی تھی۔ مناب نے ایک ہی دن میں اس کے اپارٹمنٹ کا نقشہ بدل کر رکھ دیا تھا۔ یک دم اسے ولی سے حسد محسوس ہونے لگا تھا۔ بلاشبہ وہ دنیا کا خوش نصیب مرد تھا جسے مناب جیسی لڑکی کا ساتھ ملنے والا تھا۔۔۔۔ انہی سوچوں میں گم وہ دوبارہ لاؤنج میں بیٹھا غائب دماغی سے ٹی وی دیکھ رہا تھا۔۔۔۔ اچانک اسے خیال آیا کہ اس نے میڈیسن نہیں کھائی تھی۔
اقصم اٹھ کر اپنے روم کی طرف آ گیا اور بند دروازے کو ناک کرنے لگا۔
''یس کم آن۔۔۔۔'' مناب کی آواز سن کر وہ اندر آ گیا تھا۔
مناب آئینے کے سامنے کھڑی اپنے گیلے بالوں کو ہیئر ڈرائیر سے خشک کر رہی تھی اس نے بلیک ٹائٹس اور گرین لانگ کشمیری شرٹ پہن رکھی تھی۔۔۔۔ اس کے اوپر مناب نے بلیک کلر کا لانگ اپر پہن رکھا تھا۔
''وہ میں۔۔۔۔ میڈیسن لینے آیا تھا۔۔۔۔'' اقصم نظریں چرا کر سائیڈ ٹیبل کی جانب بڑھ گیا اور میڈیسن اٹھا کر کمرے سے باہر نکل گیا۔
مناب بھی روم سے نکل کر کچن میں آ گئی تھی۔۔۔۔ اس کے بال پشت پر بکھرے ہوئے تھے۔ ایشال اور عنایہ نے بالوں کو ڈائی کروانے کے ساتھ، ساتھ hair rebonding بھی کروا رکھی تھی۔۔۔۔ وہ دونوں باقاعدگی سے پارلر جایا کرتی تھیں۔۔۔۔ مگر وہ ان تمام خرافات سے ہمیشہ دور ہی رہی تھی۔ اس کے چہرے پر ایک عجیب سی ملاحت تھی۔۔۔۔ شاید یہ اس کے اندر کی خوب صورتی تھی جو اس کی ظاہری شخصیت میں بھی نظر آتی تھی۔
مناب کافی بنا رہی تھی اور وہ ہاتھ میں پانی کی بوتل پکڑے کھڑا تھا۔
''تم نے میڈیسن کھا لی؟''
''ہوں۔۔۔۔''
''تم ریسٹ کرو۔۔۔۔ زیادہ چلو پھر و نہیں۔۔۔۔ میں کافی بنا کر لاتی ہوں۔'' اقصم خاموشی سے لاؤنج میں

آ گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد مناب کافی کے مگ اور ڈرائی فروٹ کی پلیٹ لیے لاؤنج میں آ گئی۔ مناب نے کافی کا مگ اس کی طرف بڑھایا اور اس کے قریب ہی سنگل صوفے پر بیٹھ گئی۔

''چھوٹو تم نے ڈرنک کب سے شروع کر دی؟'' مناب نے اس کے کمرے میں اس ممنوعہ مشروب کی بوتل دیکھ لی تھی اب وہ نہایت سنجیدگی سے اس کے چہرے کو غور سے دیکھتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔ گو کہ ان کی ہائی کلاس اور یہاں کے ماحول میں یہ سب ایک عام سی بات تھی مگر وہ جانتی تھی اقصم نے کبھی اس چیز کو نہیں چھوا، ہاتھ نہیں لگایا تھا مگر اب بوتل دیکھ کر از حد حیرت ہوئی تھی۔

اقصم اس غیر متوقع سوال پر گڑبڑا گیا تھا۔ اور اب نظریں چرانے لگا تھا۔

''چھوٹو میں کچھ پوچھ رہی ہوں تم سے...... کب سے پی رہے ہو؟''

''جب سے آپ سے محبت ہوئی ہے۔'' وہ باوجود کوشش کے کہہ نہ پایا۔

''تقریباً ڈیڑھ دو سال سے ...مگر میں ریگولر نہیں پیتا، بس کبھی کبھار......'' اس نے شرمندہ لہجے میں جواب دیا۔

''تمہیں نفرت تھی ان چیزوں سے...... پھر ایسی کیا وجہ ہوئی کہ تم پینے پر مجبور ہو گئے۔'' وہ کافی کے سپ لے رہی تھی مگر اس کا انداز اسی طرح سنجیدگی لیے ہوئے تھا۔

''زیادہ نہیں پیتا...... بس ایسے ہی کبھی کبھار پی لیتا ہوں۔'' اقصم نے نظریں نیچی کرتے ہوئے اعتراف کیا۔

''ویسے چھوٹو میں جب سے انگلینڈ آئی ہوں، تم سے مسلسل رابطے میں رہنے کی وجہ سے میں نے محسوس کیا ہے...... تم اب پہلے والے اقصم نہیں رہے...... کچھ بدل سے گئے ہو......'' اس کا انداز اب بھی تفتیشی افسر جیسا تھا۔

''وقت کے ساتھ انسان بدل جاتا ہے ساری زندگی بندہ ایک جیسا تھوڑی رہتا ہے۔''

''ہاں وقت انسان کو بدل دیتا ہے مگر تمہاری عمر کے لڑکوں کو اتنی جلدی نہیں بدلتا...... تیس، چوبیس سال کے لڑکوں کی بہت سی گرل فرینڈز ہوتی ہیں، بہت سی نیٹ فرینڈز ہوتی ہیں...... تمہیں یاد ہے چھوٹو...... پاکستان میں تمہاری کتنی گرل فرینڈز ہوا کرتی تھیں...... جنہیں پٹانے کے طریقے تم مجھ سے پوچھنے آیا کرتے تھے۔''

''اور آپ ہمیشہ مجھے ایسی باتوں پر ڈانٹا کرتی تھیں۔'' اقصم مسکرایا۔

''اور ان دنوں میری ڈانٹ کا تم پر کوئی اثر نہیں ہوتا تھا۔'' مناب نے ہنستے ہوئے کافی کا مگ ٹیبل پر رکھا۔

''ہوں...... مگر ان سب کو میں پاکستان چھوڑ آیا تھا...... یہاں میری فرینڈز ضرور ہیں مگر گرل فرینڈ کوئی نہیں ہے۔''

''امپاسبل...... لڑکیاں تم پر مرا کرتی تھیں اور یقیناً اب بھی فدا ہوتی ہوں گی۔''

''بلیومی...... میں سچ کہہ رہا ہوں میری کوئی گرل فرینڈ نہیں ہے۔'' اقصم مسکرایا۔

''جھوٹ...... جھوٹ اور بالکل جھوٹ...... اپنے ملک میں اتنی رنگین لائف گزارنے والا انگلینڈ جیسے ملک میں اتنی بورنگ لائف کیسے گزار سکتا ہے؟ اب تو ہمارا ملک بھی بہت ایڈوانس ہو چکا ہے...... تمہیں یاد ہے پی سی میں saturday night special تم نے کبھی مس نہیں کی تھی۔''

''ہاں یاد ہے مجھے......'' اس نے کافی کا مگ ٹیبل پر رکھتے ہوئے مسکرا کر اعتراف کیا۔

''اگر پرانی باتیں یاد ہیں تو نئی باتیں کیوں بھول رہے ہو؟''

''کیا مطلب......؟''

''تم اچھی طرح سے جانتے ہو...... میں نے تم سے ایک سوال کیا تھا تم نے ابھی تک مجھے اس کا جواب نہیں دیا؟''

''کچھ باتوں کے جواب نہیں مانگا کرتے۔''

''مگر کچھ باتوں کا جواب لینا ضروری ہوتا ہے۔''

''زندگی میں بہت ساری چیزیں غیر ضروری بھی تو ہوتی ہیں۔مگر وہ زندگی میں شامل ہوتی ہیں۔آپ بھی میری زندگی میں اسے ایک غیر ضروری چیز ہی سمجھ لیں۔بس یہ شامل ہوگئی ہے میری زندگی میں۔''

''غیر ضروری چیزوں کو ضروری سمجھ لینا بھی تو اچھی بات نہیں ناں......''

اب کے اقصم اس کی بات کے جواب میں خاموش رہا تھا۔

''چھوڑ نہیں سکتے تم اس حرام چیز کو......؟''

''کس کے لیے چھوڑوں......؟''

''جس کے لیے پینی شروع کی ہے۔''

مناب کی بات پر وہ کتنے ہی لمحے اسے خاموشی سے دیکھتا رہا تھا اس کا دل چیخ، چیخ کر دہائی دینے لگا تھا۔

تجھے عشق ہو خدا کرے
کوئی تجھ کو اس سے جدا کرے
تیرے ہونٹ ہنسنا بھول جائیں
تیری آنکھ پرُنم رہا کرے
تجھے ہجر کی ایسی جھڑی لگے
تو ملن کی ہر پل دعا کرے
تجھے عشق ہو پھر یقین ہو
اسے تسبیحوں پہ پڑھا کرے
میں کہوں کہ عشق ڈھونگ ہے
تو نہیں نہیں کہا کرے
تجھے عشق ہو خدا کرے

اسی اثنا میں مناب کے موبائل کی بیپ بجی...... مناب نے ٹیبل سے اپنا موبائل اٹھایا...... اور اسکرین پر جگمگانے والا نمبر دیکھ کر اس کے لبوں پر ایک دلفریب سی مسکراہٹ جاگ اٹھی تھی۔

''ایکسکیوزمی...... ولی کی کال ہے......'' مناب معذرت کرتی وہاں سے اٹھ گئی تھی...... لاؤنج میں بیٹھے اقصم کو یوں لگا تھا جیسے وہ بھرے مجمع میں بالکل تنہا ہوگیا ہو...... اس عشق نے اسے کہیں کا نہیں چھوڑا تھا۔روز اسے بے بس کر کے ذلیل وخوار کرتا تھا...... کبھی اس کی حالت پر روتا کبھی اس کی مجبوریوں پر ہنستا...... کبھی اسے دلاسے دیتا اور کبھی اس کی حالت پر افسوس کرتا...... کبھی اس کا دشمن بن کر اسے ذلیل وخوار کرتا اور کبھی ایک دوست بن کر اس سے ہمدردی کرتا...... وہ اس پنڈولم میں پھنس کر رہ گیا تھا...... کہیں کوئی راہِ فرار نظر نہ آتی۔وہ مناب پر مرتا تھا...... اس کے لیے دل میں جو عشق کی آگ بھڑک رہی تھی۔رفتہ رفتہ اقصم کو وہ جلانے لگی تھی۔

☆☆☆

عنایہ جب سو کر اٹھی تو شام اپنے پنکھ پھیلائے سورج کی کرنوں کو اپنی گود میں چھپا رہی تھی۔ایشال اپنی بچپن کی فرینڈ علینہ کی طرف گئی ہوئی تھی۔سمیرا بیگم کا بھی سوشل سرکل خاصا وسیع تھا لہٰذا وہ بھی مصروف ہی رہا کرتی تھیں...... شام کو پینو، نور بیگم کو لان میں لے آیا کرتی تھی...... تازہ ہوا میں بیٹھنا، سبزہ دیکھنا نور بیگم کو بہت اچھا لگتا۔

عنایہ کے آج کل اینول ایگزامز ہو رہے تھے جس کی وجہ سے وہ زارون کو آج کل کم ٹائم دے رہی تھی......

جس پر زارون اس سے سخت نالاں نظر آتا۔

اب بھی وہ شاور لے کر نکلی تھی جب اس کے سیل فون پر Tiffany Alvord کے سونگ baby I love you کی ایک مخصوص رِنگ ٹون بجنے لگی تھی...... اس نے یہ رنگ ٹون زارون کے نمبر پر لگا رکھی تھی...... وہ کال پک نہیں کر سکی تھی...... فون ایک بار پھر بجنے لگا تھا...... عنایہ نے ٹاول بیڈ پر اچھالا اور سیل فون اٹھالیا۔

''بے صبرا کہیں کا......'' وہ مسکراتے ہوئے بڑبڑائی اور کال پک کرلی۔

''زارون! تم سے ایک منٹ بھی انتظار نہیں ہوتا......''

''تمہارے معاملے میں، میں ایسا ہی ہوں...... پتا تو ہے تمہیں...... اور بائی داوے کہاں غائب ہو تم...... میں کب سے کال کر رہا ہوں...... لنچ ٹائم میں بھی تمہیں فون کرتا رہا تھا مگر محترمہ نے کوئی لفٹ ہی نہیں کرائی۔'' زارون بے چینی سے سوال پر سوال کر رہا تھا۔

''زارون میں بہت تھک گئی تھی...... پیپر دے کر آئی اور میں سوگئی...... ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی تو اٹھی ہوں......''

''اچھا یہ بتاؤ پیپر کیسا ہوا؟''

''بہت اچھا......'' عنایہ سیل فون کال سے لگائے نیل پالش اٹھا کر صوفے پر آ گئی تھی۔

''مجھے لگتا ہے تمہارے اینول پیپرز کے ساتھ، ساتھ میرے بھی پیپرز ہو رہے ہیں۔'' زارون کے لہجے میں شکوہ تھا۔

''کیا مطلب؟'' عنایہ اپنے پیروں پر ریڈ نیل پالش لگانے لگی۔

''تم آج کل بہت بزی جو ہو...... مجھے ٹائم نہیں دے رہی ہو...... مجھے نظر نہیں آتی ہو...... تو یہ میرا امتحان ہوا ناں......'' عنایہ ہنس دی۔

''بس کچھ ہی دن کی بات ہے۔''

''تمہیں پتا ہے یہ ''کچھ دن'' میں کس طرح گزار رہا ہوں۔ ان کچھ دنوں کے لیے تم میرے لیے بھی کوئی مصروفیت کیوں نہیں ڈھونڈ دیتیں؟''

''تم بس آفس میں دل لگا کر کام کیا کرو.....'' عنایہ مسکرائی۔

''میرا دل تمہارے پاس ہے..... آج کل آفس میں نہیں لگتا.....''

''تو سمجھاؤ ناں اپنے دل کو.....'' عنایہ کے لب مسکرا رہے تھے۔

''دل آج کل میری سنتا نہیں..... ''زارون کے گنگنانے پر عنایہ ہنسی۔

''شرم کرو، آفس میں بیٹھ کر مجھ سے عشق لڑا رہے ہو۔''

''تم جو گوشہ نشین ہو بیٹھی ہو..... فون پر ہی تو عشق لڑاؤں گا ناں میں..... اچھا آج تمہارے ساتھ لنچ کرنے کا موڈ تھا..... میں نے تمہیں کال کی مگر تم نے پک ہی نہیں کی۔''

''ہاں، میرا سیل فون سائلنٹ پر تھا۔''

''اٹس اوکے..... یہ بتاؤ اس وقت کیا کر رہی ہو؟''

''میں سیلون جانے کے لیے تیار ہو رہی تھی۔''

''تم آل ریڈی اتنی خوب صورت ہو تمہیں ان چیزوں کی ضرورت ہی نہیں ہے۔''

''کیوں ضرورت نہیں ہے، دو مہینے کے بعد ہماری شادی ہے اور میں شادی والے دن دنیا کی سب سے خوب صورت لڑکی لگنا چاہتی ہوں۔''

''پتا نہیں یہ دو مہینے کب اور کیسے گزریں گے؟'' زارون نے سرد آہ بھری۔

''زارون تم بہت بے صبرے ہو.....'' عنایہ مسکرائی۔

''صرف اور صرف تمہارے معاملے میں ہوں۔'' زارون کے لہجے میں بے پناہ محبت تھی..... عنایہ کا چہرہ بلش ہوا۔

''تمہیں پتا ہے تمہاری اہمیت میری زندگی میں کیا ہے؟ just close your eyes'' زارون کے کہنے پر عنایہ نے آنکھیں بند کرلیں۔

''اوکے..... اب تم نے کیا دیکھا.....؟'' زارون نے سوال کیا۔

''تھنگ..... کچھ بھی نہیں۔'' عنایہ نے آنکھیں بند کیے، کیے نفی میں سر ہلایا۔

"that,s my life without you" زارون نے محبتوں سے چُور لہجے میں اسے اس کی حیثیت اُس کی اہمیت اپنی زندگی میں بتادی..... عنایہ کو اپنی قسمت پر رشک آنے لگا۔ ''عنایہ جس مرد کو اس کی پسند، اس کی محبت مل جاتی ہے وہ گناہوں سے بچ جاتا ہے..... میرے بہت سے دوستوں کی مختلف لڑکیوں سے فرینڈ شپ ہے مگر مجھے تمہارے علاوہ دنیا کی کوئی لڑکی کبھی متاثر نہیں کرسکی۔ آفس میں ہوتا ہوں تو کئی بار تمہیں کال کرتا ہوں، تمہاری آواز بار، بار سنتا ہوں..... گھر آتا ہوں تو نظریں بار، بار تمہیں ڈھونڈتی ہیں، تمہیں ہر وقت اپنے آس پاس دیکھنا چاہتا ہوں۔'' زارون جذبات کی رو میں بہتا ہوا اسے اپنے دل کا حال سنا رہا تھا۔

"same here zaroon" وہ پُرفسوں لہجے میں بولی ''بس تم..... تم ہمیشہ مجھ سے ایسی ہی محبت کرنا.....'' عنایہ کی آنکھیں خوشی سے اس کی محبتوں پر جھلملا جایا کرتی تھیں۔

''میری جان..... میری محبتیں صرف تمہارے لیے ہیں اور ہمیشہ تمہارے لیے ہی رہیں گی۔'' زارون اسے یقین دلا رہا تھا اس سے وعدے کر رہا تھا اور وہ خود پر ناز کر رہی تھی۔ وہ دونوں ایسے ہی تھے ایک دوسرے کو ٹوٹ

کر چاہنے والے ایک دوسرے کے لیے دیوانے......

☆☆☆

سارہ کالج سے باہر نکلی تو سامنے اسے اسجد بائیک لیے کھڑا نظر آیا...... وہ سر جھکا کر لڑکیوں کے گروپ کے ساتھ آگے بڑھ گئی...... وہ کم رفتار سے بائیک چلاتا ہوا لڑکیوں کے گروپ سے قدرے فاصلے پر ان کے پیچھے، پیچھے چلا آرہا تھا۔ اس گروپ میں شامل ہر لڑکی کو یہ خوش فہمی تھی کہ اسجد اس کے پیچھے آتا ہے...... کئی لڑکیاں گردن موڑ کر پیچھے دیکھتیں...... کئی اسے مسکرا کر دیکھتیں...... اگر پلٹ کر نہیں دیکھتی تھی تو صرف سارہ شاکر حسین...... وہ اسے نہیں دیکھتی تھی۔ آہستہ، آہستہ سب لڑکیاں اپنے گھروں کو روانہ ہوگئی تھیں اب صرف سارہ ہی رہ گئی...... آج صبح سے ہی اس کا دل اداس تھا وہ بہت چپ، چپ سی تھی۔ اس کی فرینڈ حنا نے اس کی اداسی اور خاموشی کو نوٹ کرتے ہوئے وجہ بھی پوچھی تھی مگر وہ طبیعت خرابی کا بہانہ بنا کر اسے ٹال گئی تھی...... جبکہ وجہ یہ تھی کہ ایک دن پہلے سارہ کے رشتے کے سلسلے میں کچھ لوگ آئے تھے مگر ان کے گھر کی غربت دیکھ کر ناک بھوں چڑھاتے ہوئے رشتے سے انکار کر گئے تھے۔ شاید یہ احساسِ ذلت تھا۔ اسجد بائیک کی اسپیڈ بڑھا کر سارہ کے قریب آگیا۔

''کیسی ہو سارہ؟''

وہ خاموش رہی...... آج اس کا دل بہت اداس تھا اس کے چہرے پر افسردگی تھی۔

''قسم سے آپ بہت ظالم ہیں، میں اتنی گرمی اور دھوپ میں آپ کے دیدار کے لیے بے چین رہتا ہوں اور آپ ہیں کہ ایک نظر اٹھا کر مجھے دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتیں......'' اسجد کے شکوے پر سارہ نے گردن موڑ کر اسے دیکھا...... اور چند لمحے غیر ارادی طور پر اسے دیکھتی رہی...... ایک خوب صورت سے احساس نے اسے اپنی لپیٹ میں لے لیا کہ کوئی اس کے لیے اتنا دیوانہ بھی ہوسکتا ہے...... کوئی اسے اتنا بھی چاہ سکتا ہے یک دم اسے اپنا آپ بہت معتبر سا لگنے لگا۔

''دو مہینے میں پہلی بار آج آپ نے نظر اٹھا کر مجھے اس طرح دیکھا ہے...... بہت ہینڈسم نہ سہی گزارے لائق تو ضرور ہوں میں۔'' اسجد نے مسکراتے ہوئے کہا تو وہ جھینپ گئی۔

''سارہ پتا ہے کہ کل چاند کی چودہ تاریخ تھی...... رات جب میں سونے کے لیے لیٹا تو بے اختیار رات کے تاریک آنچل پر چودھویں کے چاند نے میری توجہ اپنی طرف مبذول کرالی...... وہ مجھے بالکل تم جیسا لگا...... خوب صورت...... مغرور...... اپنے سحر میں جکڑ لینے والا...... مگر میری پہنچ سے بہت دور۔'' اسجد کا آنچ دیتا لہجہ اسے اندر تک سرشار کر گیا۔

وہ اب لاشعوری طور پر بہت آہستہ، آہستہ چل رہی تھی...... اسے آج اسجد کی باتیں سننا اچھا لگ رہا تھا۔

''لگتا ہے میرے پیچھے آنے سے پہلے احمد فراز کا سارا دیوان پڑھ کر آتے ہیں آپ!'' سارہ کے انداز اور اس کی بات پر اسجد بے اختیار مسکرایا۔

''یہ عشق بڑی ظالم چیز ہے...... اچھے بھلے انسان کی مت مار کر دیوانہ بنا دیتا ہے یہ عشق۔''

اسجد کی بیچارگی پر سارہ مسکرا پڑی۔

اسجد بائیک سے اتر گیا تھا اور اب بائیک لیے اس کے ساتھ، ساتھ چلنے لگا تھا۔

''سارہ تمہاری مسکراہٹ بھی تمہاری طرح جان لیوا ہے۔''

اب کے سارہ خاموش رہی...... وہ ایک سادہ سی گھریلو لڑکی تھی اسجد کی ایسی باتوں کے جواب میں وہ ایسے ہی خاموش ہوجایا کرتی تھی۔

''سارہ تم میری باتوں کا جواب کیوں نہیں دیتی ہو؟'' اس نے شکوہ کیا۔
''میں کیا جواب دوں؟'' وہ انجان بنی۔
تب وہ دھیرے سے بولا۔

''کوئی منتظر ہے اس کا کتنی شدت سے فرازؔ
وہ جانتا ہے مگر انجان بنا رہتا ہے''

سارہ کے لب مسکرانے لگے۔
''سارہ میرا بہت دل چاہتا ہے میں تمہیں اپنے روبرو بٹھا کر فرصت سے دیکھوں، ان چند لمحوں کی ملاقات سے دل نہیں بھرتا...... بلکہ دل اور بے چین ہو جاتا ہے...... تم پلیز...... کل میرے ساتھ چلو ناں......'' وہ التجا کر رہا تھا۔
''اسجد پلیز...... آپ ان چیزوں کی مجھ سے توقع مت رکھیں...... میں اس ٹائپ کی لڑکی نہیں ہوں...... اگر آپ مجھ سے سچی محبت کرتے ہیں تو اپنی والدہ کو میرے گھر رشتے کے لیے بھیج دیں...... مگر میں یہ سب نہیں کر سکتی جو آپ چاہتے ہیں......'' سارہ نے دوٹوک انداز میں انکار کیا۔ کل کے رجیکشن نے اسے اتنی بات کا حوصلہ دے دیا تھا۔
''میری والدہ کا دراصل چند دن پہلے ہی بائی پاس ہوا ہے، وہ فوری طور پر ابھی نہیں آسکتی ہیں...... سارہ تم میری مجبوری کو سمجھو...... میں امی کو فوری طور پر تمہارے گھر نہیں بھیج سکتا...... میں تم سے سچی محبت کرتا ہوں...... مگر مجھے بہت دکھ ہوا ہے کہ تمہیں ابھی تک میری محبت پہ یقین نہیں آیا...... تم سمجھتی ہو کہ میں تم سے عشق کا ڈھونگ رچا رہا ہوں؟ دو مہینے سے تمہارے عشق میں ان سڑکوں پر خوار ہو رہا ہوں میں اور کس طرح یقین دلاؤں تمہیں......؟'' وہ بیچارگی سے کہہ رہا تھا۔
''سچ تو یہ ہے کہ تم بہت ظالم ہو...... تمہیں میری اور میری محبت کی ذرا بھی پروا نہیں...... پتھر ہو تم...... جس سے پچھلے دو مہینے سے میں سر پھوڑ رہا ہوں'' اسجد خفا ہو گیا تھا...... اس کے لہجے میں بے پناہ دکھ تھا...... مایوسی تھی...... وہ ڈھیلے سے انداز میں بائیک پر بیٹھ کر چند لمحوں میں اس کی نظروں سے اوجھل ہو گیا تھا...... سارہ کا دل کسی نے جیسے مٹھی میں جکڑ لیا...... دکھ سے آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ وہ چند لمحے کھڑی اس سنسان سڑک کو دیکھتی رہی...... جس طرف اسجد غصے میں بائیک دوڑا کر گیا تھا...... سارہ کا دل بوجھل ہو گیا...... گھر تک آتے ہوئے اس کے دل نے یہ اعتراف کر لیا تھا کہ اسے اسجد کے ساتھ ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا اس کے ساتھ جانے پر انکار نہیں کرنا چاہیے تھا۔ ایک اچھے گھرانے کا لڑکا اس کی محبت میں یوں خوار ہو رہا تھا...... وہ لڑکا اس سے شادی کا خواہش مند تھا...... اسے سارہ کے گھریلو حالات سے کوئی سروکار نہیں تھا...... اس سے بڑھ کر اور اسے کیا چاہیے؟
سارہ دل ہی دل میں خود سے باتیں کر رہی تھی اور اعتراف کر رہی تھی۔
''پاگل لڑکی اللہ، اللہ کر کے تجھے ایک چاہنے والا ساتھی مل رہا ہے جو تیرا عاشق ہے، دیوانہ ہے تیرا...... اس کی قدر کر...... ورنہ ہر ایرے غیرے لوگوں کے سامنے چائے کی ٹرے سجا کر پیش کرتے، کرتے اور پھر لڑکے والوں کی طرف سے جہیز کی لمبی چوڑی لسٹیں وصول کرتے، کرتے اور ان لسٹوں کو پورا نہ کرنے پر مسترد ہوتے، ہوتے تو ویسے ہی تیری عمر نکل جائے گی...... پھر کون بیاہنے آئے گا تجھے؟''
باقی کے تمام راستے دل اس کو جھنجوڑتا رہا...... اس سے سوال پر سوال کرتا رہا...... سچ کا آئینہ دکھاتا رہا...... اور وہ گھر کی جانب بڑھتے ہوئے، دل کی تمام باتوں کو سچ مان چکی تھی۔ گھر کے اندر داخل ہوتے ہی وہ دل میں ٹھان چکی تھی کہ کل اسے اسجد کے ساتھ کالج سے کس طرح نکلنا تھا۔

(جاری ہے)

# ایک حقیقت ایک فسانہ

رفاقت جاوید

عنایہ نتھیا گلی کے دلنشیں نظاروں کو دیکھ کر خوش ہونے کے بجائے اداس ہوگئی۔ آج کی عید ہمیشہ کی طرح ماضی کی تمام عیدوں سے مختلف تھی۔ یہ وہ جگہ تھی جہاں وہ اپنے شوہر کے ساتھ ہنی مون منانے آئی تھی۔ بعد میں اسے اپنے قریبی رشتے داروں اور دوست احباب کے ساتھ یہاں آنا اور قیام کرنا بہت اچھا لگا کرتا تھا۔ بنگلے میں خوش رہنے والی عنایہ سب کے لیے بہترین میزبان ثابت ہوا کرتی تھی اور



سبھی بھاگ بھاگ کر یہاں آیا کرتے تھے۔ عیدالضحیٰ کے موقع پر وہ قربانی سے فارغ ہو کر اپنے بچے اور شوہر کے ساتھ وہاں پہنچ جاتی تھی۔ دوسرے دن مہمانوں کا تانتا بندھ جایا کرتا تھا۔

لیکن آج...... وہی جگہ تھی...... وہی حسین مناظر تھے...... لیکن سب کچھ سونا، سونا تھا۔ بارش کی رم جھم بین کرتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اس کا دل چاہا وہ واپس چلی جائے لیکن اگلے ہی لمحے اسے اسلام آباد کے گھر کی یاد آنے والی خاموشی نے کاٹنے کی دھمکی دی تو اس نے کھڑکی کے آگے پردہ کھینچ دیا اور ڈرائنگ روم کے صوفے پر نیم دراز ہوگئی...... خانساماں کب چائے لا کر رکھ کر بھی چلا گیا لیکن اسے خبر نہ ہوئی۔ وہ ماضی کے حسین دنوں میں شوہر کو تلاشتی ہوئی اس کے سینے سے جا لگی۔

''دیکھو مجھ سی سچی اور کھری محبت تمہیں چراغ لے کر ڈھونڈے سے بھی نہیں ملے گی۔ تم میری باتوں پر صرف ایک بار بھروسا تو کر کے دیکھو......'' شہباز نے اس کا ہاتھ پکڑنے کی کوشش کی تو وہ جھولے سے اتر کر بھاگنے لگی۔ شہباز نے بڑھ کر اس کا بازو پکڑ لیا۔

''کچھ تو جواب دو...... میں تمہیں پسند کرتا ہوں بہت ساری ڈھیر ساری خوبیوں اور صرف ایک خامی کے باوجود......'' وہ ذرا سا مسکرا کر بولا تو عنایہ بھڑک گئی۔

''بولو کون سی خامی ہے مجھ میں...... مت کرو مجھ پر احسانِ عظیم...... جاؤ اپنا رستہ ناپو...... اور اس منزل کو پالو جہاں علینہ تمہارے لیے پھولوں کے ہار لیے کھڑی ہے۔'' عنایہ نے اس کی طرف غصے سے دیکھا۔ ''خدا کے لیے اب میری جان بخشی کردو۔ میں دس بار تمہیں سمجھا چکی ہوں کہ میں تم سے شادی نہیں کرنا چاہتی۔''

''آخر کوئی تو وجہ ہوگی اس انکار کی...... بتا دو مجھے میں بھی تو بیسیوں بار یہ سوال دُہرا چکا ہوں مگر ایک بات میں بھی تمہیں بتا دوں، تمہارا پیچھا میں پھر بھی نہیں چھوڑوں گا۔ تم میری خالہ کی بیٹی ہونے کے ناتے میری فطرت کو جانتی ہو کہ میں ہار ماننے والا نہیں ہوں۔ مستقل مزاج پرلے درجے کا اور ثابت قدم تم سے بھی کہیں زیادہ سمجھیں......'' وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

''یعنی ضدی، کم عقل اور خود پسند ہو تم...... بس چلے جاؤ یہاں سے...... ورنہ خالہ سے تمہاری شکایت لگا دوں گی۔'' وہ تنگ کر بولی۔

''محبت وہ آئینہ ہے جس میں عاشق اور معشوق دونوں کے چہرے صاف نظر آتے ہیں۔ تمہاری نگاہوں میں، میں بستا ہوں ذرا اپنے دل سے تو پوچھو وہ انکاری کیوں ہے؟ آج اس سوال کا جواب میں لے کر ہی جاؤں گا۔'' وہ مستحکم لہجے میں بولا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر کرسی پر بیٹھ گیا۔

''بہت عجیب انسان ہو تم......'' وہ ہاتھ چھڑا کر سامنے ہی بیٹھ گئی۔

''یہ بتاؤ کہ مجھے تعلیم ختم نہیں کرنے دو گے؟'' وہ نرماہٹ سے بولی۔

''یعنی اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم ہاں کر رہی ہو...... میری محبت کا اقرار کرنے کا شکریہ۔'' وہ چہک کر بولا۔ ''تعلیم شادی میں رکاوٹ بن رہی ہے؟ تو تم شادی کے بعد جاری رکھنا...... اپنی تعلیم......''

''خوش فہمیوں میں رہنا تمہاری فطرت کا حصہ ہے، میری نہیں۔ خدا کے لیے حقیقت کی دنیا میں واپس آجاؤ...... مجھے تم سے نہ تو محبت ہے نہ ہی شادی وادی کا کوئی پروگرام ہے وہ بھی تم سے...... نہ جانے تمہیں خود پر اتنا غرور کس بات کا ہے۔ اس ملک میں تمہارے جیسے قدم، قدم پر ملتے ہیں۔'' وہ تمسخرانہ لہجے میں بولی۔

''لیکن یاد رکھو کہ میرے جیسا محبت نچھاور

کرنے والا ہرگز نہیں ملے گا۔ میں نے کہہ دیا ناں کہ آج انکار کی وجہ پوچھ کر ہی جاؤں گا۔'' وہ پھر مستحکم لہجے میں بولا۔

''سن سکتے ہو...... جو میں کہنے جا رہی ہوں؟ اس کے بعد میرا پیچھا چھوڑ دینا...... کیونکہ اس کا تمہارے پاس جواب نہیں ہوگا۔'' وہ پژمردہ لہجے میں بولی اور آسمان کی طرف دیکھ کر گویا ہوئی۔ ''مجھے تم سے شادی نہیں کرنی...... کیونکہ تم مجھے بہت جلد چھوڑ جاؤ گے...... روتا پیٹتا...... میری ایک نہیں سنو گے...... میں سب جانتی ہوں کہ تم ایسا ہی کرو گے۔''

''یہ تو کوئی وجہ نہ ہوئی۔ تم پر بھی بکواس ختم ہے۔ میں تڑپ رہا ہوں ماہیِ بے آب کی طرح اور محترمہ فرما رہی ہے کہ چھوڑ دوں گا۔ خدا کی قسم تم طلاق کا مطالبہ بھی کرو گی ناں تو پھر بھی نہیں چھوڑوں گا۔ تمہیں رُلا دوں گا۔ مرتے دم تک تمہیں اپنی قید میں رکھوں گا۔'' وہ غصے میں لال پیلا ہوتے ہوئے بولا۔ ''کوئی ٹھوس دلائل پیش کرو تا کہ میں اس کے بارے میں سوچ سکوں...... بہت گھٹیا سوچ ہے۔ تمہاری...... مجھے تو تمہاری نیت میں فتور لگ رہا ہے۔''

''بدھو چھوڑنے کا مطلب تم نہیں لگا سمجھے...... محبت کیسے نبھاؤ گے شادی کرنے چلے ہو عنایہ سے۔ جاؤ جی کہیں اور محبت آزما لو۔ کھلم کھلا اجازت ہے۔'' وہ قہقہہ لگا کر بولی۔ ''یہ جو فوجی ہوتے ہیں ناں...... انہیں صرف بندوق چلانی آتی ہے۔''

''مطلب تم ہی سمجھا دو یار...... میں سیدھا سادہ بندہ ہوں ناک کی سیدھ میں چلنے والا...... لکیر کا فقیر...... مجھے گھما پھرا کر نہ تو بات کرنی آتی ہے، نہ ہی تمہاری جلیبی جیسی باتیں سمجھ سکتا ہوں۔ ویسے آپس کی بات ہے تم کافی خفیہ لڑکی ہو، خدا خیر ہی کرے۔'' وہ وہیں سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ ''تم ناک سے چنے اب بھی چبوا رہی ہو۔ کل بھی ایسا ہی کرو گی۔''

''تو سنو سیدھے سادے الفاظ میں۔'' اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ آنکھیں نیر بہانے لگیں۔ شہباز اچنبھے سے اسے دیکھنے لگا۔

''میں سمجھا نہیں...... کہ ان خوب صورت آنکھوں میں ساون کیسے اتر آیا؟ جلدی بولو کہ مسئلہ کیا ہے؟ ورنہ مجھے تمہاری آنکھوں کے آنسو مار ڈالیں گے۔''

''تو سنو پھر مرنے کی باتیں مت کرو۔'' وہ آنسو صاف کر کے اپنی آشفتہ محبت کو یکجا کر کے بولی۔

''آئی لو یو سوچ...... تم نہیں سمجھ سکتے...... کیونکہ تم وہ کچھ سمجھ ہی نہیں سکتے جو میں کہنا چاہتی ہوں، آخر کو ایک فوجی جو ٹھہرے...... آہ شہباز کیسے بتاؤں۔''

اسے اس کا اشارہ سمجھ تو آ گیا تھا مگر وہ انجان بن کر اس کے خیالات کی تہ تک پہنچنا چاہتا تھا۔ وہ اسے دیر تک ستاتی رہی اور وہ اس کی باتوں سے محظوظ ہوتا رہا۔

''پگلی سمجھاؤ گی تو سمجھ پاؤں گا ناں......'' وہ کرسی اس کے قریب کرتے بولا۔

''میں اپنی خاموش محبت پر آج تو بند باندھ سکتی ہوں پر کل اس میں ناکام ہو جاؤں گی۔ اس سے پہلے کہ میں دنیا والوں کے لیے اِک عبرت ناک مثال بن جاؤں تم میری جان چھوڑ دو۔''

''تم عبرت ناک مثال، خاموش محبت...... کل کی ناکامی، میں کچھ سمجھا نہیں۔'' وہ متذبذب لہجے میں بولا۔

''سمجھو ناں...... کہ کل تم اگر شہید ہو گئے تو میں تو جیتے جی مر جاؤں گی۔ بس مجھے تم سے شادی نہیں کرنی۔'' وہ اپنی کرسی اس سے دور گھسیٹ کر بولی۔

''اب وجہ سمجھ گئے ہو ناں...... مجھے شہید کی بیوہ کہلانے کا کوئی شوق نہیں ہے۔ مجھے ایسا شوہر چاہیے جس کا عمر بھر کا ساتھ ہو، ہم بڑھاپا بھی مل جل کر گزاریں۔ تم دادا بنو میں دادی کہلاؤں۔ بیچ منجدھار میں چھوڑنے والے بے وفا ساتھی کی اس دل میں کوئی جگہ نہیں۔''

شہباز نے تمسخرانہ انداز میں قہقہہ لگایا تو عنایہ اپنی سوچ کی گہری وادی سے باہر نکل آئی۔ خالی الذہنی سے گردوپیش کا جائزہ لے کر اپنے دماغ کو حاضر کیا کہ وہ اس وقت کہاں پر ہے؟

اس نے چائے کی پیالی کو ہاتھ لگایا جو برف کے مانند ٹھنڈی ہوچکی تھی۔

''چاچا!'' اس نے وہیں سے خانساماں کو آواز دی تو وہ فوراً جن کی طرح حاضر ہوگیا۔

''بیگم صاب حکم فرمائیں.....'' ملازم سر جھکائے نہایت مؤدبانہ لہجے میں بولا۔

''چائے ٹھنڈی ہوگئی ہے، گرم گرم چائے لے آؤ اور کھڑکی کے پردے ہٹا دو، اگر تم گھر جانا چاہتے ہو تو جا سکتے ہو۔ تمہاری بیوی، بچے تمہارے منتظر ہوں گے۔ ان کی عید میری وجہ سے خراب نہیں ہونی چاہیے۔'' عنایہ نے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔

''نہیں بیگم صاب...... میں آپ کو اکیلا چھوڑ کر نہیں جاسکتا...... میں نے آپ کا وہ وقت دیکھا ہے جب آپ شادی کے بعد یہاں ایک ہفتے کے لیے رہنے آئی تھیں۔ اور پھر ہر عید پر اپنے تمام رشتے داروں کے ہمراہ آنا بھی مجھے یاد ہے۔ آج آپ اکیلی ہیں، دنیا نام ہی اسی کا ہے۔ لوگ ہنستے مسکراتے ماحول میں کھلکھلاتے لوگوں کی صحبت میں رہنا چاہتے ہیں۔ جب انسان پر رب کی طرف سے مہربانیاں برستی ہیں تو دنیا والے ان رحمتوں کے حصے دار بن جاتے ہیں اور جب آزمائش آتی ہے تو......'' اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔ ''تو وہی رشتے دار وہی پیارے پھر حصے دار نہیں رہتے...... بڑی آسانی سے اپنا دامن چھڑا کر ایک طرف ہوجاتے ہیں۔ میں آپ کے حالات سے واقف ہوں، میں نے یہ بال دھوپ میں سفید نہیں کیے۔'' وہ دکھ بھرے لہجے میں بولا۔

''چاچا...... ایسی بات نہیں، میرے بچوں کی طرح سب کے بچے جوان ہوچکے ہیں۔ وہ ان میں مصروف ہیں، بیچارے مجھے وقت کیسے دے سکتے ہیں، میں ان کی مجبوریاں جانتی ہوں۔'' عنایہ منمنائی۔

''بیگم صاب...... جب بچے چھوٹے تھے وہ پھر بھی بچوں میں مصروف ہوگئے تھے۔ صاب کے جانے کے بعد ہی اتنی بڑی تبدیلی کیوں آگئی تھی۔ آپ اپنے دو ننھے منے بچوں کے ساتھ اپنی یادیں تازہ کرنے یہاں اکیلی ہی آتی رہیں۔ صاب کے جانے کے فوراً بعد محفلیں ہی اجڑ گئیں۔ وہ گونجتے ہوئے قہقہے اور ہنسی مذاق، چھیڑ خانیاں آج بھی میرے کانوں میں گونجتی ہیں۔ اور آپ کی خدمت و خاطر آج بھی میری آنکھوں کے سامنے فلم کی طرح گھوم جاتی ہے۔ بیگم صاب آپ بہت عظیم عورت ہیں۔ کبھی شکایت نہیں کی...... کوئی گلہ نہیں کیا...... بلکہ ان کے اس رویے اور سلوک کی پردہ داری ہی رکھی ہے۔'' وہ اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے بولا۔

''میں عمر رسیدہ اور زندگی کے تجربوں اور مشاہدوں کی روشنی میں آپ کو ایک مشورہ دینا چاہتا ہوں۔ اپنے بیٹوں کے پاس چلی جائیں۔ ابھی آپ جوان ہیں، نوکری بھی کر رہی ہیں اور ہمت و حوصلہ بھی بلند ہے۔ کل جسم میں کمزوری آگئی...... بڑھاپا طاری ہوگیا تو آپ کو مجبوراً اپنے بیٹوں کے پاس جانا ہی پڑے گا۔ اس وقت آپ کی بہویں بھی پس و پیش ضرور کریں گی کیونکہ آپ نے ان کو اپنی عادت جو نہیں ڈالی ہوئی۔''

''تم ٹھیک کہتے ہو لیکن چاچا میں اس سرزمین کو کیسے چھوڑ سکتی ہوں جس پر تمہارا صاب قربان ہوگیا تھا۔ مجھے اس کی مٹی سے ان کے خون کی مہک آتی ہے۔ میں نے اسی یاد کے سہارے جوانی گزاری اور بڑھاپا بھی اسی خوشبو کے سنگ بیت جائے گا۔ میرے دونوں بیٹے آباد رہیں۔ خوشحال اور کامیاب

ہوں۔ میں ان کے لیے آزمائش نہیں بننا چاہتی......
وہ اپنی زندگی میں خوش و خرم رہیں...... یہی میری آخری خواہش ہے اور دعا ہے۔'' عنایہ نے اپنے آنسوؤں پر قابو پاتے ہوئے کہا تو چاچا نے اسے سلیوٹ کیا اور پھر کچن کی طرف چلا گیا۔ وہ کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔ دیودار کے اونچے لانبے درختوں پر بندروں کا کھیل تماشا جاری و ساری تھا۔ اسے وہ دن یاد آگیا جب شہباز نے بھی اس کے ساتھ ایسا ہی کھیل کھیلا تھا اور اسے شادی کے لیے رضامند کرلیا تھا۔ وہ دائیں طرف مڑتی تو آگے سے رستہ روک لیتا...... سامنے سے نکلنے کی کوشش کرتی تو سینہ تان کر کھڑا ہو جاتا۔ پیچھے سے بھاگنے کے لیے نکلتی تو کسی اور ترکیبوں سے اسے رکنے پر مجبور کر دیتا۔ اور آخر وہ اسے شادی کے لیے رضامند کرنے میں کامیاب ہو ہی گیا تھا۔

وہ ابھی میڈیکل کالج میں پڑھ رہی تھی۔ شادی کے بعد اس کا شہباز کے ساتھ رہنا مشکل ہو گیا تھا۔ جب اسے کالج سے ایک مہینے کی چھٹی ملتی تو شہباز بھی اینول لیو لے کر سسرال پہنچ جاتا اور اگلے ہی دن اسے لے کر نتھیا گلی آرمی گیسٹ ہاؤس میں آجاتا۔ ایک مہینہ پلک جھپکتے گزر جاتا کیونکہ ان کا ہر دن عید اور ہر رات شب برات بن جایا کرتی تھی۔ خوشیوں کی گھڑیاں گزرنے کا احساس ہی کب ہوتا ہے؟ ان لمحوں کو تو گویا پر ہی لگ جاتے ہیں، جھٹ سے گزر جاتی ہیں یہ گھڑیاں...... ہر عید کی چند چھٹیاں بھی اسی گیسٹ ہاؤس کی نذر ہو جایا کرتی تھیں۔ چاچا اس وقت جوان تھا، چھ بچوں کا باپ تھا۔ ہر وقت ان کی فکر میں گھائل ہوتا رہتا۔ عنایہ اسے سمجھاتی کہ تم بہت نادان ہو جو پیسے کی فکر میں رہتے ہو، اپنے گھر میں بیوی بچوں کے ساتھ خوش رہا کرو۔ یہی اصل زندگی ہے، باقی سب بیکار ہے۔

''بیگم صاب...... چائے پیجیے ... ورنہ پھر

ٹھنڈی ہو جائے گی۔'' چاچا کی آواز پر وہ چونکی...... اور ٹرے سے چائے کی پیالی اٹھا کر پینے لگی۔

میڈیکل کے آخری سال میں گل فراز پیدا ہوا تو کم تنخواہ کے باوجود شہباز نے اپنی یونٹ میں فراخدلی سے مٹھائی تقسیم کی۔

عنایہ ہاؤس جاب کرنے کے بعد نوکری کی کوشش کرنے لگی میجر شہباز کو سیالکوٹ بارڈر پر تعینات کیا گیا تھا۔ وہ اس کے ساتھ ہی ایک کمرے میں رہنے لگی۔ اسے میس کا کمرا اور کھانا کسی محل سے کم نہ لگتا تھا۔ وہ بہت خوش تھی لیکن دوسرے بچے کی خوشخبری سنتے ہی شہباز نے اسے اسلام آباد روانہ کر دیا تاکہ اسے مکمل طور پر آرام اور بہترین کھانا دیا جائے...... ابھی پریگنینسی کے تین مہینے ہی گزرے تھے کہ لائن آف کنٹرول پر بھارت کی اچانک اندھا دھند فائرنگ نے تین افسران کو شہید کر دیا۔ شہباز بھی ان میں سے ایک تھا۔ اس دکھ نے اسے نڈھال کر دیا تھا۔ وہ اس کی میت پر روئی نہیں تھی کیونکہ اس کا ذہن خوشیوں کے مرغزاروں میں بھی اسے خطرے کی گھنٹیوں سے بیدار رکھتا تھا۔ وہ اپنے ان منفی خیالات کو خوب کوستی اور دل کو مطمئن کرنے کی کوشش کرنے لگتی لیکن یہ ڈر و خوف اور اندیشے اور خدشے کبھی کسی کو بتا نہ سکی حتیٰ کہ شہباز کو بھی نہیں...... شاید یہی وجہ تھی کہ وہ شہباز کے ساتھ گزرنے والی ہر گھڑی سے خوب محظوظ ہوتی۔ وہ میس کے تنگ و غلیظ کمرے میں بھی خوش رہتی تھی۔ میس کے کھانے اسے بہت خوش ذائقہ لگا کرتے تھے۔ وہ میس کے کمرے سے باہر لان میں گل فراز کے ساتھ گھنٹوں کھیلتی رہتی تھی۔ اس نے نیا نیا چلنا سیکھا تھا۔ اس کے پیچھے بھاگتے ہوئے اسے الجھن یا بیزاری نہیں ہوتی تھی۔ شہباز نے بھی اسے آج تک کسی غلطی پر ڈانٹا تھا نہ ہی خفگی کا اظہار کیا تھا۔ اِک آئیڈیل زندگی گزارتے، گزارتے انہیں حاسدوں کی نظروں نے ہڑپ کر لیا تھا۔ وہ تصور میں اس سرگوشی کے انداز میں بولی۔

''میرے مالک، میری جان مجھے اسی بات کا خدشہ رہتا تھا۔ شہباز تم نے مجھے وہی دکھ دیا جس سے میں بھاگنا چاہتی تھی۔'' وہ تڑپ کر خود کلامی کرنے لگی۔ اس کے وجود میں کرب و اذیت نے شعلے بھڑکا دیے تھے۔ وہ شال کندھوں پر ڈال کر باہر نکل آئی۔ اور برآمدے میں بیٹھ کر اپنے پیاروں کو یاد کرنے لگی جو اسے اب بھی بے حد عزیز اور مقدم تھے لیکن افسوس کہ وہ ان کے لیے عزیز رہی تھی نہ ہی اہم۔

عنایہ کو سول اسپتال میں گورنمنٹ کی جاب بہ آسانی مل گئی تھی لیکن اس نے اس نوکری کو ریجیکٹ کر دیا اور آرمی جوائن کر لی۔ اسی دوران دوسرا بیٹا جو ہو بہو باپ کی کاپی تھا سی ایم ایچ میں پیدا ہوا۔ اور اس کی پوسٹنگ بھی یہاں ہی ہو گئی۔ بچوں کو اس نے آرمی کی مدد سے پروان چڑھایا۔ اپنوں میں سے کسی نے اس کی طرف پلٹ کر دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا تھا۔ وہ تمام خونی رشتے کہاں کھو گئے تھے جو اس کی خوشیوں کے توجھے دار بنے رہتے تھے مگر اب وہ تمام سہیلیاں اور شہباز کے چہیتے دوست کہاں رخصت ہو گئے...... جو اپنی محبت و لگاوٹ کے دعوے کیا کرتے تھے۔ اس کی آنکھوں سے دو موٹے، موٹے آنسو نکلے اور رخساروں پر پھیل گئے۔

''شہباز تمہارے بن میری ہر عید ماضی کو یاد... کرتے ہی گزرتی رہی۔ آج کی عید بھی میں نے صرف اور صرف تمہارے نام کر دی ہے۔'' مغرب کی اذان پر اس نے آسمان کی طرف دیکھا۔ عید ہاتھ ہلاتی ہوئی رخصت ہو رہی تھی لیکن شہباز کی یادیں وہیں بسیرا کیے ہوئے تھیں۔ ''کاش شہباز تم جاتے، جاتے اپنی محبت کے صدقے مجھ پر ایک احسان یہی کر جاتے۔ اپنی محبت کو میرے دل سے مٹا جاتے اور مجھے خوش رہنے کا سلیقہ ہی سکھا جاتے۔''



# وقعت

صدف آصف

ساتوں آسمان سر پر گرنے کا محاورہ اسے آج سمجھ میں آیا تھا۔ جس کی آنکھوں میں بچپن سے ایک سپنا پلا ہوا چانک اسے نوچ لیے جانے کے کرب پر وہ تڑپ اٹھا۔

''اسوہ پلیز...... کچھ تو سوچو یہ بڑا ظلم ہے۔'' افق کا زرد چہرہ دیکھ کر اس کا دل دھڑکا۔

''افق......!'' اس کے منہ سے ایک دم نکلا۔

''اسوہ۔'' وہ زخمی نگاہوں سے تکتے ہوئے بلبلا اٹھا۔

''اب میری مصیبتوں کو اور نہ بڑھاؤ۔ میں می کے فیصلے کے خلاف نہیں جاسکتی۔'' وہ اس بار بے بس ہو کر رو دی۔ افق محمود تڑپ کر رہ گیا۔

''اسوہ! بھلا کوئی اپنی زندگی کے بغیر بھی رہ سکتا ہے۔ میں یہ جدائی سہہ نہیں پاؤں گا۔'' وہ اب درخواست کرنے لگا۔

''اس خیال کو دل سے نکال دو۔ می نے وقاص احمد

کے ساتھ میری بات طے کردی ہے۔ اب ہمارا ساتھ ممکن نہیں...... اس حقیقت کو مان لینے میں ہی ہم دونوں کی بھلائی ہے۔'' اسوہ نے بھیگی آنکھوں کو پونچھتے ہوئے مضبوط لہجے میں کہا۔

''یہ ماما کی بے جا ضد ہے۔ وہ اپنی ذاتی چپقلش پر ہم دونوں کی زندگی خراب کرنا چاہتی ہیں'' اس کی آنکھوں سے بہتا درد اسوہ کے آس پاس پھیلنے لگا۔

''گزری باتوں کو چھوڑ دو۔ ممی نے ان لوگوں کو شادی کی تاریخ بھی دے دی ہے۔'' اسوہ نے کہا اور منہ پر ہاتھ رکھ کر سسکی لی۔

''تم ایک بار ہمت تو دکھاؤ۔ میں اسد ماموں کو منا کر دم لوں گا۔ آخر یہ ہم دونوں کی زندگی کا معاملہ ہے، اس کا فیصلہ وہ اکیلے کیسے کر سکتی ہیں۔ یہ تو سراسر زیادتی ہوگی۔'' اب وہ غصہ ہونے لگا۔ اسوہ سے اس کا دیوانہ پن جھیلا نہیں گیا۔

''افق...... ہوش میں آؤ۔ وہ کوئی اور نہیں میری ماں ہیں۔ تم پر نہیں مگر وہ مجھ پر اپنا مکمل حق رکھتی ہیں۔ بس اب مجھے کوئی دوسری بات نہیں سننی۔'' وہ اپنا پرس اٹھا کر تیز قدموں سے باہر کی جانب چل دی۔

''اسوہ سنو!'' افق پیچھے سے پکارتا رہ گیا مگر اس کی صدا رائگاں گئی۔ وہ چلی گئی۔ اس نے ہاتھوں کی لکیروں میں اپنی قسمت کو تلاشا، دل کا درد انتہاؤں تک جا پہنچا، اسوہ نے جدا ہونے کا فیصلہ کر کے، اسے خود کی نظروں میں بھی بے وقعت کر کے رکھ دیا۔

☆☆☆

کارڈ چھپنے چلے گئے شادی کی تاریخ سر پر آ گئی، اسوہ کا دل بجھنے لگا مگر وہ مجبور تھی، افق کو بے انتہا چاہنے کے باوجود وہ اپنی ماں کا مان نہیں توڑ سکتی تھی۔ اس کی ممی تاجور بانو کو شروع سے اپنی نند فریدہ سے پتا نہیں کیا مسئلہ تھا، ان کی اچھی بات پر بھی وہ برا مان جاتیں، کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو کسی بھی سسرالی رشتے سے بلاوجہ کا بیر باندھ کر تا عمر بڑی ڈھٹائی سے اپنی سوچ پر قائم رہتے ہیں۔ تاجور کا بھی یہ ہی حال رہا، دراصل ان کی ساس مرحومہ نے مرتے وقت یہ بڑا سا گھر جس میں اسد اللہ اپنی فیملی کے ساتھ رہائش پزیر تھے بیٹے کے نام کر دیا اور ترکے میں اپنا سارا زیور بیٹی کو دے دیا موٹے، موٹے خالص سونے کے بنے بھاری سیٹ پر ان کی بہو کی شروع سے نگاہ تھی مگر فضیلت کے فیصلے سے تاجور کو یوں لگا جیسے ''دل کے ارماں آنسوؤں میں بہہ گئے۔''

فریدہ کو بھابی کی مطلب پرستی سے بہت دکھ پہنچا، تاجور نے اس بات پر تو کوئی اعتراض نہیں اٹھایا کہ گھر میں فری کو حصہ کیوں نہیں دیا گیا مگر اس بات پر مہینوں سوگ منایا کہ اتنے بھاری، بھاری تین سیٹ صرف بیٹی کو کیوں دیے گئے' پوتیوں کا بھی اس میں حق بنتا تھا۔ فضیلت بیگم نے یہ فیصلہ کر کے دور اندیشی کا ثبوت دیا تھا کہ اگر مکان بیچ کر اس میں سے بیٹی کا حصہ دیا جاتا تو مہنگائی کے اس دور میں اسد اللہ میں اتنی سکت کہاں تھی کہ اتنا عالیشان گھر دوبارہ بنا پاتے، اسی لیے انہوں نے بیٹی کو حصے کے طور پر زیور دے دیے، جو فریدہ کا شرعی حق بنتا تھا۔

''اماں کو رکھا ہم نے.... آخری وقت میں ساری خدمت یہاں سے لی اور سارا زیور لپیٹ کر فری کو دے دیا۔ اگر ایک سیٹ بہو کو بھی دے جاتیں تو کیا تھا۔ مگر بھیا بیٹی تو بیٹی ہی ہوتی ہے ناں!'' وہ خاندان بھر میں اس قسم کی باتوں کا ڈھنڈورا پیٹتی رہیں، باتیں ضرب، تقسیم ہو کر فریدہ کے کانوں تک بھی جا پہنچتیں۔ اگر وہ اپنی صفائی دیتی تو سامنے والا آگ لگانے والے انداز میں بات تاجور کے سامنے بیان کرتا۔ اس وجہ سے دلوں کے بیچ فاصلے دھیرے، دھیرے بڑھتے چلے گئے۔ فریدہ دل کی بہت اچھی تھی مگر تاجور کے رویے سے کافی محتاط رہنے لگیں۔ بھائی کے گھر بھی خاص، خاص موقع پر ہی جاتی، حالانکہ اسد اللہ نے ہمیشہ چھوٹی بہن کو اولاد سے بڑھ کر چاہا مگر تاجور نے بہن بھائی کے بیچ، اجنبیت کی ایسی دیوار کھڑی کر دی، جس کا گرانا مشکل ہو گیا۔

خاندانی چپقلش سے پیچھا چھڑانے کے لیے اسد اللہ نے فرار کی بہترین راہ ڈھونڈ نکالی۔ وہ نہ بیوی کے معاملے میں بولتے نہ ہی بہن کو کچھ کہتے، بس اپنے کام دھندے

میں مصروف رہتے یا شام کو فراغت کے لمحات میں مرزا صاحب کی سنگت میں شطرنج کی بساط بچھا کر بیٹھ جاتے۔

☆☆☆

افق، اسوہ کو بہت شدت سے چاہتا تھا، وہ اس سے شادی کرنے کا خواہشمند تھا۔ ماں پر زور بھی دیا کہ وہ ماموں کے پاس اسوہ کا ہاتھ مانگنے جائیں، فری کو بیٹے کی پسند پر کوئی اعتراض نہیں تھا، اسوہ اپنی دادی فضیلت بیگم کی کاپی تھی، گوری رنگت، خوب صورت آنکھیں، کھڑے نقوش، لمبے گھنے کالے بال اور پُرکشش سراپا...... فریدہ کو شروع سے اپنی اس بھتیجی سے خاص انسیت تھی مگر تاجور کی فطرت کو پہچانتے ہوئے وہ صحیح وقت کی تلاش میں تھیں، جانتی تھیں کہ بھاوج کو تو انکار کا بہانہ چاہیے۔ فریدہ نے افق کو جلد از جلد اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کے لیے کہا تا کہ وہ بھائی سے اسوہ کا ہاتھ مانگ سکیں، فری اس جانب سے اٹھنے والے سارے اعتراضات کا منہ توڑ جواب تیار رکھنے میں لگی رہیں اور بات ان کے ہاتھ سے نکل گئی۔

تاجور، ان کی سوچ سے بھی آگے کی دنیا دیکھ رہی تھیں، دور رس نگاہوں نے بیٹی کے چہرے پر افق کو دیکھتے ہی...... اترنے والے محبت کے رنگوں کو پہچان لیا، یہ ان کے لیے ناقابلِ برداشت بات تھی۔

خواب دیکھنے کی کچی عمر اُن پر بھی آئی تھی۔ اسوہ کا اپنی پھپو کے گھر جانے کے لیے بے چین رہنا...... بہانے، بہانے سے افق سے فون پر لمبی باتیں کرنا۔ باپ کے سامنے ہر وقت پھپو کی تعریفیں کرنا۔ وہ چوکنا ہو گئیں۔

تاجور کی روک ٹوک کے باوجود وہ اکثر کالج سے سیدھے پھپو کے گھر چلی جاتی اور ماں کو وہاں سے فون کر کے بتاتی تو وہ تن فن کرتی رہ جاتیں۔

تاجور کو بیٹی کے رنگ ڈھنگ نے ہولا دیا، انہوں نے اسی لیے اسوہ کے لیے آنے والے رشتوں پر سنجیدگی سے غور کرنا شروع کر دیا۔ وقاص کا رشتہ مرزا صاحب کے جاننے والوں کے توسط سے آیا، وہ وقاص کے شاندار فیملی بیک گراؤنڈ سے بری طرح سے متاثر ہو گئیں۔ لڑکا ان کے معیار پر پورا اترتا تھا۔ یوں جھٹ پٹ وقاص کے گھر والوں کو ہاں کر دی گئی۔ اسوہ ماں کی جلد بازی پر روتی رہ گئی مگر تاجور نے اس معاملے میں اس کی ایک نہ سنی۔

اُدھر فری، اسوہ کا رشتہ مانگنے کا پلان ہی بناتی رہ گئیں اور ان کے بھائی، بیوی کے ساتھ منگنی کی مٹھائی لے کر ان کے یہاں بھی پہنچ گئے۔ وہ بھائی کے یوں غیریت برتنے پر منہ دیکھتی رہ گئیں، افق البتہ اپنی اس بے وقعتی پر غصے میں بائیک اٹھا کر گھر سے باہر نکل گیا۔

☆☆☆

''افق مجھے کچھ کہنا ہے......!'' اسوہ نے مدھر آواز میں پکارا۔ وہ آنکھوں پر ہاتھ رکھے لیٹا تھا۔

''تم یہاں۔'' اسوہ کو اپنے کمرے میں پا کر اس کے دل کی حالت عجب ہونے لگی۔ وہ ایک دم اٹھ کر بیٹھ گیا۔

اسوہ کالج کے سفید یونیفارم میں سرسوں کا زرد پھول بنی ہوئی تھی۔ افق کو ایسا لگا جیسے وہ ایک خواب کی کیفیت میں ہو...... اس کا سوگوار چہرہ، زرد پڑتی رنگت، متورم آنکھیں جن کے گرد سیاہ حلقے پڑ گئے تھے۔ افق نے دکھ سے اپنی زندگی کو دیکھا، جو چند روز قبل تک کھلا گلاب لگتی تھی۔

''ہاں بولو...... کیا اب بھی کچھ رہ گیا ہے؟'' اس نے استہزائیہ انداز میں پوچھا۔

''پلیز...... افق!'' اس کا چہرہ مزید اتر گیا۔

''کیا میرے برباد ہونے کا تماشا دیکھنے آئی ہو؟'' تاک کر ایک اور وار کیا۔

''ایسے لہجے میں مجھ سے بات نہ کرو۔ میری مجبوری کو سمجھو!'' اس کی آنکھوں سے شفاف موتیوں کی لڑی گرنے لگی۔

''سب کی مجبوریوں کو میں ہی دیکھوں، کوئی میری حالت پر بھی تو ترس کھائے۔'' وہ جلبلا اٹھا۔

''تم کتنے بے درد ہو گئے ہو۔ میرے ساتھ ایسا نہ کرو۔'' وہ اذیت سے چیخ پڑی، افق کو کیا خبر کہ وہ اضطراب کی کن کڑی منزلوں کو طے کر کے آخری بار اس سے ملنے آئی تھی، چند سنہری پل اپنی یادداشت میں محفوظ کرنا چاہتی تھی۔

''مجھے معاف کر دو، میں اپنے والدین کا دل توڑ کر

خوشیاں حاصل کرانے کا جرم نہیں کرسکتی۔'' وہ ایک دم اس کا ہاتھ تھام کر رو دی۔ جان سے عزیز ہستی کی آنکھوں میں آنسو دیکھنا، محبت کرنے والے کے بس کی بات نہیں ہوتی اس کا دل ڈوبنے لگا۔

''اُف، میں کس موڑ پر آ گیا ہوں۔ جہاں آگے بڑھنا ممکن نہیں اور پیچھے ہٹنے پر دل آمادہ نہیں'' ۔افق نے بال نوچ لیے۔ زبان ایک دم بند ہو گئی، اس کی سرخ آنکھوں سے ضبط کے باوجود ایک قطرہ زمین پر گرا اور کھو گیا۔

وہ اسوہ کی مجبوری سمجھتا تھا...... مگر جسم سے جاں نکلنے کی اذیت اس سے سہی نہیں جا رہی تھی۔ اتنی تکلیف میں ہونے کے باوجود اسوہ کو یوں بچوں کی طرح سوں، سوں کر کے روتا دیکھ ٹشو سے اس کی چھوٹی سی ناک پونچھنے لگا۔ اسوہ کے ہونٹوں پر ایک درد بھری مسکراہٹ ابھر آئی۔ وہ بھی زبردستی مسکرا دیا۔

☆☆☆

گلابی شیفون پر باٹل گرین بنارسی بیچ ورک اور نفیس کام والا ایک نامور ڈیزائنر کے یہاں سے تیار کردہ عروسی لباس نگاہوں کو خیرہ کر رہا تھا۔ تاجور نے فخر سے ساری بری بڑے ہال میں سجا دی، سسرال سے آیا ہوا قیمتی سامان اس کے سامنے پھیلا ہوا تھا پھر بھی دل میں کوئی امنگ یا خوشی کا کوئی احساس نہ جاگا۔

''واؤ اسوہ! ساری چیزیں بہت زبردست ہیں۔'' ساری کزنز نے سسرال سے آئی ہوئی بری دیکھنے کے بعد اسے مبارک باد دینا شروع کر دی۔

''اُف سینڈل تو دیکھو کتنی آفت ہے۔'' سنہری نگوں سے جڑی خوب صورت ہائی ہیل ہاتھ میں لے کر سونیا چیخی۔

''مجھے تو لگتا ہے، ساری شاپنگ وقاص بھائی نے بہت دل لگا کر خود کی ہے، ایک، ایک چیز اپنی قیمت بتا رہی ہے۔'' بڑی خالہ کی عینی نے ابٹن کی زردی میں لپٹی اسوہ کو ٹہوکا مار کر چھیڑا۔ اس سے مسکرایا بھی نہیں گیا۔

''پتا ہے آپی کی ساس نے اتنا خوب صورت سونے کا بڑا بھاری سیٹ چڑھایا ہے۔'' اس کی چھوٹی بہن حسنہ کے لہجے میں اتراہٹ سمٹ آئی۔

محفل میں موجود رشتے دار خواتین تاجور کی دور اندیشی پر واہ، واہ کرنے لگیں، جنہوں نے ایسے دل والے لوگوں میں رشتہ جوڑا۔ ساری کزنز بھی اسوہ کی خوش قسمتی کو دل ہی دل میں سراہتے ہوئے، اپنے لیے بھی ایسے ہی بر کی دعا مانگ رہی تھیں۔

اسوہ کی نگاہیں اچانک فری پھپو کے چہرے پر جا ٹکیں، جہاں اپنی سب سے قیمتی چیز کھونے کا ملال طاری تھا۔ افق کی یاد نے جیسے یک دم اسے جکڑ لیا۔ وہ ایک دم بے چینی محسوس کرنے لگی۔ اس ماحول میں دم گھٹنے لگا، وہ سر تھام کر بیٹھ گئی۔ فری پھپھو تو دو دن قبل یہاں آ کر رک گئی تھیں مگر افق ایک دو گھنٹے کے لیے مہمانوں کی طرح آتا اور تقریب میں شرکت کر کے چلا جاتا۔

اسوہ سارے شور ہنگاموں سے بیزار ہو کر دھیرے سے اٹھی اور اپنے کمرے میں جا لیٹی۔ آنسو پلکوں کی باڑ سے رستہ بناتے بہہ نکلے۔ اس کا دل بری طرح سے گھبرانے لگا تو اس نے اٹھ کر وضو کیا اور دو رکعت نفل پڑھنے کے بعد ہاتھ اٹھا کر۔ اللہ سے گڑگڑا کر اپنے دل کے سکون کی دعائیں مانگیں۔ دل کی کیفیت تبدیل ہونے لگی، رفتہ رفتہ قرار آنے لگا، اسوہ نے آنکھیں موند لیں۔

☆☆☆

اسوہ خلافِ توقع صبح کافی دیر تک سوتی رہی، حیرت کی بات یہ ہوئی کہ اسے کسی نے اٹھایا بھی نہیں، خود ہی منہ ہاتھ دھو کر وہ بالوں کو سمیٹتی باہر نکل آئی، ہر سو خاموشی سی چھائی ہوئی تھی۔ وہ حیران، پریشان ماں کے کمرے کی جانب بڑھی۔

''اوں ہوں، آپی اندر نہیں جایئے گا۔ ممی کو دوا دے کر لٹایا ہے، ان کی طبیعت ٹھیک نہیں۔'' حسنہ نے دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھ کر اسے اندر جانے سے روکا۔

''اچھا مگر رات تو ممی ٹھیک تھیں، اچانک کیا ہوا۔ کوئی بات ہوئی ہے کیا؟'' اسوہ نے حیرانی سے چھوٹی بہن کی روئی، روئی سی صورت دیکھ کر سوال کیا۔

''نہیں، کوئی بات نہیں۔ وہ بس تھک گئی ہیں۔'' حسنہ نے ڈرتے، ڈرتے کہا اور نگاہیں چرا لیں۔

''ایک منٹ...... تم ذرا میرے کمرے میں چلو۔'' اسوہ کا

ماتھا ٹھنکا، وہ اسے اپنے کمرے میں کھینچتی ہوئی لے آئی، کمرا لاک کر کے مڑی تو حسنہ کی سسکیاں کانوں میں پڑیں۔

''ک... کیا ہوا؟'' اسوہ نے پریشان ہو کر پوچھا۔

''وہ آپی دراصل وقاص بھائی کی امی نے رشتہ توڑنے کی دھمکی دی ہے۔'' حسنہ نے روتے ہوئے جواب دیا۔ اسوہ ہکا بکا بہن کا منہ تکنے لگی۔

''رشتہ توڑنا چاہ رہی ہیں، وہ کیوں؟'' اسوہ کے منہ سے سرسراتی ہوئی آواز نکلی۔ اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا، شادی سے چار دن پہلے ان کی یہ دھمکی بلا جواز تھی۔ وہ بہن کی پیٹھ پر ہاتھ پھیر کر دلاسا دینے لگی تاکہ وہ مزید کچھ بتانے کے قابل ہوسکے۔

''محترمہ فرماتی ہیں کہ ہم لوگ تو ان کے معیار کے نہیں نکلے۔ وہ صرف بڑے گھر کو دیکھ کر دھوکا کھا گئیں۔'' حسنہ نے دانت کچکچا کر بتایا۔

''انہوں نے یہ کیسی بات کردی۔'' اسوہ کو بھی غصہ آنے لگا۔

''اصل میں جب یہاں سے آپ کے جہیز کا سامان گیا تو وہ ان کو پسند نہیں آیا، انہوں نے اس میں سو، سو کیڑے نکالے، اس کے بعد وقاص بھائی کے کپڑے جوتے، شیونگ کٹ وغیرہ جو بھی سامان یہاں سے گیا، اس پر انہوں نے صمد بھائی کو خوب سنائیں، بقول ان کے وقاص تو ڈیزائنر کے سوٹ اور برانڈڈ چیزیں استعمال کرتا ہے۔ ہم نے تو آپ کو پہلے ہی بتادیا تھا مگر آپ نے اس کا صرف ناپ لیا اور باقی اپنی مرضی کے عام سے سوٹ بنوادیے جو ہمارے معیار کے ہرگز نہیں ہیں۔ اس سے تو ہماری خاندان میں ناک کٹ جائے گی انہوں نے اپنی بری میں بھیجی جانے والی ایک، ایک قیمتی چیز کا حوالہ دے کر شوبازی کی...... صمد بھائی تو افسردہ سے سر جھکائے وہاں سے لوٹ آئے۔'' حسنہ نے روتے ہوئے بتایا تو اسوہ کپکپا اٹھی۔ اپنے بڑے بھائی کا کسی کے سامنے بھی جھکا ہوا سر دیکھنا، اس کی برداشت سے باہر تھا۔

''اوہ، اچھا پھر کیا ہوا؟'' ان دونوں کے درمیان، خاموشی کا ایک طویل وقفہ آیا۔ پھر اسوہ نے پوچھا۔

''پھر کیا ہونا تھا، انہوں نے دولھا کے جوڑے، جوتوں کے لیے دو لاکھ کی ڈیمانڈ کی ہے۔'' حسنہ کی دکھی آواز نے اسوہ کا دل چیر دیا۔ وہ جانتی تھی کہ اس کے بابا اور بھائی نے اپنی حیثیت سے بڑھ کر جہیز دیا ہے مگر لالچ کی کوئی حد نہیں ہوتی۔ وقاص کی فیملی کے پاس تو پیسوں کی کوئی کمی نہیں، اس لیے ان سے مقابلے بازی بیکار تھی۔ اب جبکہ ساری جمع پونجی شادی کے اخراجات پر لگ چکی تھی، اس طرح کی فرمائش...... ان لوگوں پر یقیناً جبر ہوگی۔ وہ کافی دیر تک ٹہل ٹہل کر کچھ سوچتی رہی پھر ایک عزم کے ساتھ کمرے سے باہر نکلی۔

☆☆☆

بڑا ہال جو کل تک شادی بیاہ کے گیتوں سے گونج رہا تھا، لڑکیوں کی ہنسی کی کھنک اور عورتوں کے ہنسی مذاق نے یہاں ایک سماں باندھا ہوا تھا، آج اس کا منظر ہی بدل گیا۔ ہر شے پر ان دیکھی اداسی کا قبضہ تھا۔ اسوہ آگے بڑھی تو اس کے پیروں تلے آکر گلاب اور گیندے کی پتیاں پس گئیں۔

وہ اندر داخل ہوئی۔ اسد اللہ اور صمد سب کے بیچ میں سر جھکائے بیٹھے تھے ان کے ارد گرد قریبی رشتے دار بیٹھے اظہارِ افسوس کر رہے تھے۔ خاندان کے دو چار بڑوں پر مشتمل ٹیم وقاص کے گھر جانے کو تیار کھڑی تھی تاکہ بگڑی بات بنائی جاسکے، کوئی مالی مدد کی پیش کش کر رہا تھا تاکہ خاندان کی لڑکی عزت سے اپنے گھر کی ہوسکے۔ وہ سب اتنے مصروف تھے کہ کسی نے بھی اسوہ کی آمد کا نوٹس نہیں لیا۔

''ایک منٹ چچا انور اور معیز خالو، آپ کی مدد کا شکریہ مگر میں بابا اور بھائی کو مزید ایسی کسی پریشانی میں نہیں ڈالوں گی۔'' اسوہ کے مضبوط لہجے پر سب ہی چونک اٹھے، وہاں ایک دم خاموشی چھا گئی۔

''اسوہ! یہاں بڑے بات کر رہے ہیں۔ تم اپنے کمرے میں جاؤ...'' تاجور نے صوفے پر لیٹے لیٹے، بیٹی کو ڈانٹ پلائی، سب سے بری حالت انہی کی ہورہی تھی۔

''ممی، یہاں میری قسمت کا فیصلہ کیا جارہا ہے، مجھے جانتے بوجھتے ان لالچی لوگوں میں بیاہنے کی تدبیریں کی جارہی ہیں۔ میں کیسے چپ رہوں، آپ لوگ

ایک بات سوچیں، شادی سے پہلے ان کا یہ حال ہے تو نکاح کے بعد جب وہ مضبوط ہوجائیں گے پھر ہمارے ساتھ وہ کیا سلوک کریں گے؟'' اسوہ نے اپنا مقدمہ لڑنا شروع کیا، سب خاموشی سے اسے سننے لگے۔

''اے لڑکی تم کیا چاہتی ہو۔ ہم سب ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھے رہیں۔ وہ لوگ رشتہ ختم کر کے ہمارے خاندان کا تماشا بنادیں؟'' بڑی خالہ نے ناک کھجاتے ہوئے تیز لہجے میں سوال کیا۔

''نہیں، میں تو چاہتی ہوں۔ آپ لوگ خود فون کر کے یہ رشتہ ختم کردیں۔ یوں ان کا طمانچہ ان کے منہ پر جا پڑے گا۔'' اسوہ نے سر سے سرکتا دوپٹا کس کر واپس ٹکایا اور اپنا فیصلہ سنایا۔ اس کی ہمت پر سب کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔ فری پھوپو نے نگاہوں ہی نگاہوں میں اسے داد پیش کی... انہیں بھی وقاص کے گھر والوں کا چلن ٹھیک نہیں لگ رہا تھا مگر تاجوران میاں، بیوی کی ہمدردی کو بھی شک کی نگاہ سے دیکھتیں۔ اس لیے زبان بند کیے بیٹھی رہیں۔

''اس لڑکی کا تو دماغ خراب ہوگیا ہے۔ ایک داغ لگ جائے گا۔ ہر طرف ہنسی اڑائی جائے گی۔ مرد پر تو کوئی الزام نہیں دھرتا، سارا قصور عورت کا نظر آتا ہے سب کہیں گے آخر شادی ہوتے، ہوتے کیوں رک گئی۔'' تاجور نے ہاتھ نچا کر کہا۔ ان کا بی پی اوپر کی جانب بڑھنے لگا۔

''اچھا میری آخری بات بھی سن لیں۔ پھر آپ لوگوں کا جو فیصلہ ہوگا، میں اس پر سر جھکا دوں گی۔'' وہ دھیرے سے بولی۔

''بیٹی کہو کیا کہنا ہے۔'' اسد اللہ نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور اجازت دی۔ وہ دل سے اس سے متفق ہونے لگے تھے۔

اس نے نگاہ اٹھا کر بھائی کو دیکھا، صمد نے بھی سر ہلا کر اجازت دی۔

''ابھی تو میں اپنے گھر پر ہوں۔ کسی کا مجھ پر بس نہیں، اس پر ان لوگوں کا یہ حال ہے۔ شادی کے بعد تو وہ ہر موقع پر اپنے اسٹیٹس کو ہمارے رشتے کے بیچ لائیں گے۔ آپ لوگوں سے ہر چیز میں مقابلہ کیا جائے گا۔ بالفرض ابھی قرضہ لے کر ان کی فرمائش پوری کر بھی دی گئی تو بعد میں کیا ہوگا؟ وہ تو ایسی ہی توقعات باندھ بیٹھیں گے۔ کیا آپ لوگوں میں ساری عمر بے جا فرمائشیں پوری کرنے کا حوصلہ ہے؟'' اسوہ کے چہرے پر سچائی کی چھاپ، اس کا انداز تاجور کے دل میں اترتا چلا گیا۔

''یہ بھی تو سوچو رشتہ ختم ہونے کے بعد دنیا کتنی ہنسی اڑائے گی، چھوٹی بہن پر کیا اثر پڑے گا۔'' تاجور نیم رضامند ہونے لگیں تو ایک اور اندیشے نے سر ابھارا۔

''ممی! آج کے انکار سے میرے دامن پر گندگی کے چند چھینٹے ضرور پڑیں گے مگر ان لوگوں نے جس قسم کی ذہنیت اور سوچ کا مظاہرہ کیا ہے، کچھ بعید نہیں یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ کل کسی اور بات پر اختلاف رائے ہوجائے اور وہ پروانۂ آزادی میرے ہاتھوں میں تھما کر مجھے وہاں سے چلتا کردیں۔ اس کے بعد ساری عمر کے لیے ماتھے پر وہ داغ لگ جائے گا۔ جو کبھی مٹائے نہیں مٹے گا۔'' ایسی بات کہتے ہوئے اسوہ کی آواز گلوگیر ہوگئی۔ وہ رکی نہیں باہر کی طرف بھاگی۔ فری دوپٹے سے آنکھیں مسلتی ہوئی اس کے پیچھے چل دیں۔ تاجور سمیت سب لوگوں نے ان باتوں سے اتفاق کیا۔ اسد اللہ نے مشورے کے بعد فون ملایا اور بڑی ہمت سے لڑکے والوں کو انکار کردیا۔

☆☆☆

''کھانے کا آرڈر دیا جا چکا ہے، عزیزوں میں دعوت نامے بٹ گئے ہیں، بنکوئٹ ہال بک ہوگیا۔ ایسے میں انکار کر کے میں نے کوئی غلطی تو نہیں کی؟'' اسد اللہ نے سر پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔

''بھائی پریشان نہ ہوں۔ آپ نے کچھ غلط نہیں کیا۔'' فریدہ نے انہیں تسلی دی۔ باقی لوگ جا چکے تھے مگر وہ آج رک گئی تھیں۔

''اب کیا ہوگا، میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آرہا۔'' اسد اللہ نے کافی عرصے بعد بہن سے دل کی بات کی۔

''بھائی! اوپر والے پر بھروسا رکھیں۔ سب ٹھیک ہوجائے گا۔'' فریدہ نے بھائی کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا۔

''آہ ...... ہاں۔'' تاجور نے آہ بھری اور بھیگی ہوئی نظروں سے اسوہ کے کمرے کی طرف دیکھا، جہاں سرِ شام سے اندھیرا چھایا ہوا تھا۔

''اب میں اور سب لوگوں کو کیا منہ دکھاؤں گا۔ ابھی تو رشتہ ختم ہونے کی بات صرف قریبی لوگوں کو پتا ہے۔'' وہ فکرمندی سے بولے۔

''بھائی، آپ ساری فکروں کو ایک طرف رکھیں اور میری بات سنیں۔ میں آج اپنا دامن پھیلا کر اسوہ کا رشتہ اپنے افق کے لیے مانگنے آئی ہوں۔ شادی اسی تاریخ پر اسی جگہ ہوگی۔ آپ میرے لیے باپ کی جگہ ہیں۔ مجھے ہمیشہ نوازا ہے۔ اس بار بھی ہاں بول کر اسوہ کو میری بہو بنادیں۔'' فری نے بھائی بھاوج کی جانب دیکھ کر عاجزی سے کہا، اسد اللہ تو جیسے جی اٹھے، ان کا دماغ بھانجے کی طرف گیا ہی نہیں تھا۔

''ایک بار افق سے بھی پوچھ لو۔ ابھی اسوہ کا رشتہ ختم ہوا ہے۔ وہ جوان لڑکا ہے اسے کوئی اعتراض نہ ہو۔'' اسد اللہ نے تھوڑی دیر سوچنے کے بعد کہا۔

''بھائی! اللہ کا شکر ادا کریں، جس نے آپ کو اتنی باہمت بیٹی سے نوازا ہے۔ افق کو اس رشتے پر کوئی اعتراض نہیں۔ آپ سے بات کرنے سے پہلے ہی میری اس سے فون پر طویل بات ہو چکی ہے۔'' فریدہ نے خوشگوار انداز میں بتایا۔ اسد اللہ نے سکون کی سانس لی پھر بیوی کی جانب دیکھا جو خاموشی سے بھائی، بہن کی باتیں سن رہی تھیں۔

''بھابی، مجھے کچھ نہیں چاہیے۔ میں نقلی پتھر کی لالچ میں اصلی ہیرے کو گنوانے کی غلطی کبھی نہیں کروں گی۔ یہ بھی نہیں سمجھیے گا کہ کوئی ترس کھا کر دامن پھیلا رہی ہوں۔ میری شروع سے ہی یہ خواہش رہی کہ اسوہ، افق کی دلہن بنے۔ اب تو آپ لوگوں کی ہاں کا انتظار ہے۔'' فری نے بھائی بھاوج کے گرد بازو پھیلا کر نرمی سے کہا۔ حسنہ جو تھوڑی دیر قبل چائے لے کر آئی تھی، اس کے پیر خوشی کے مارے وہیں جم گئے۔

''چلو ٹھیک ہے، ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔'' تاجور نے وقت کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے آگے بڑھ کر نند کو گلے لگالیا۔ وہ دنیا کی حقیقت جان چکی تھیں، ایک بار پھر خالص رشتوں سے منہ موڑنے کی غلطی کیسے کرتیں۔

''افق بھائی کہاں ہیں؟ انہیں تو بلالیتیں۔'' حسنہ نے محبت سے پوچھا۔

''وہ ابھی یہاں پہنچنے والا ہوگا۔ میرے بچے کی شادی اتنی اچانک ہو رہی ہے تو کیا ہوا؟ اس کے بھی تو ارمان ہیں۔ ہم لوگ اسوہ کے لیے خریداری کرنے ابھی جارہے ہیں۔ تم بھی ساتھ چلو۔'' فری نے پیش کش کی تو حسنہ نے سر ہلا کر حامی بھرلی۔

''سب کچھ اتنی جلدی ہو رہا ہے۔ تم تیاری کرلو گی؟'' تاجور نے حیرت سے پوچھا۔

''شکر ہے۔ زیور تو تیار رکھے ہیں۔ بس فی الحال عروسی لباس اور دوسرے لوازمات خریدنا ہیں۔ باقی شاپنگ اسوہ شادی کے بعد خود کرلے گی۔'' فری نے بتایا تو تاجور نے بھی دلچسپی لینا شروع کردی۔

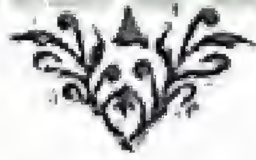
''اچھا کیا جو افق کی دلہن کے لیے زیور پہلے ہی بنوا کر رکھ دیے۔'' تاجور نے ریلیکس ہو کر پاؤں پھیلائے۔ اسد اللہ، مطمئن ہونے کے بعد دوسرے کام نمٹانے چل دیے۔

''نہیں بھابی، امی کے دیے ہوئے زیورات میں نے اپنی اکلوتی بہو کے لیے ہی تو رکھ چھوڑے تھے۔ اب وہ ہی کام آئیں گے۔'' فری نے مسکرا کر بتایا۔

تاجور کے چہرے کا رنگ لمحے بھر کو پھیکا پڑا، اس کے بعد وہ مسکرادیں۔ دل میں بڑی میٹھی سی لہر اٹھی تھی۔

''پھپھو، میں دو منٹ میں آئی۔'' حسنہ، پیٹ پکڑ کر بڑی بہن کے کمرے کی جانب دوڑی، اتنی بڑی خوش خبری اس سے اکیلے ہضم نہیں ہو رہی تھی۔

''آخر ہماری محبت کی جیت ہوگئی ناں۔'' ماموں کے گھر کے آگے گاڑی کھڑی کرنے کے بعد افق نے ایک طویل انگڑائی لے کر سوچا۔ قسمت نے اس کی ''وقعت'' سب پر ظاہر کردی تھی۔ وہ مکمل ہو گیا تھا۔ محبت پالینے کی خوشی اس کے چہرے سے عیاں تھی۔



منی ناول

# زندگی خاک نہ تھی

شیریں حیدر

چوتھا حصہ

جہاز چلتے، چلتے اچانک ہچکولے کھانے لگا۔ پھر یوں لگا کہ بالکل بے وزن ہو گیا اور جانے کتنے ہزار فٹ نیچے چلا گیا...... چیخوں کی آوازیں آئیں اور ہر مسافر نے اپنی، اپنی زبان میں اللہ کو یاد کرنا شروع کر دیا...... میں نے مصطفیٰ کا سر اپنے سینے سے لگا لیا اور کلمۂ طیبہ کا ورد کرنے لگی... سیٹ بیلٹ باندھنے کے سگنل آن ہو گئے اور سب نے سیٹ بیلٹ باندھنا شروع کر دیں۔ کوئی اناؤنسمنٹ ہو رہی تھی مگر سمجھ میں نہیں آ رہا



تھا کہ دل کی بے چینی اور بلند فشارِ خون کے باعث فقط اپنے ہی دل کی دھڑکن کانوں کو سنائی دے رہی تھی اور دھڑکنوں میں ہلچل مچی تھی، جانے کون سی گھڑی تھی جو یوں اچانک پروگرام بن گیا تھا۔ کاش میں نے انکار کر دیا ہوتا آنے سے...... موت کا خوف میرے اوپر طاری ہونے لگا۔ میری آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑی بہنے لگی۔ کیا گھڑی تھی جو میں نے عابد کے بغیر کہیں جانے کا سوچا تھا۔ میرے بغیر عابد کا کیا ہوگا۔ مجھے عابد کی تنہائی کا خیال تڑپانے لگا۔ مما اور پاپا کی کیا حالت ہوگی اگر میرے اور مصطفیٰ کے ساتھ کچھ ہو گیا تو؟ میں سوچتی جا رہی تھی اور آنسو میری آنکھوں سے تواتر سے بہہ رہے تھے۔

جہاز کا عملہ بھاگ، بھاگ کر مسافروں کو تسلی و تشفی دے رہا تھا۔ شاید کسی مسافر کی طبیعت خراب تھی کیونکہ اعلان کر کے پوچھا گیا تھا کہ اگر جہاز پر کوئی ڈاکٹر ہو تو...... فرسٹ کلاس سے ایک ڈاکٹر ہماری سیٹ کے پاس سے گزر کر پیچھے گیا، مسلسل اعلانات کیے جا رہے تھے کہ انجن میں خرابی کے باعث جہاز کو ایمرجنسی میں لینڈ کرنا پڑے گا۔ ایک قریبی ائرپورٹ کے لیے اجازت طلب کی جا رہی تھی مگر اس ملک سے تعلقات دوستانہ نہ ہونے کے باعث اس کے امکانات کم تھے۔ سفارتی کوششیں یقیناً جاری ہوں گی، جہاز میں مسلسل جھٹکے لگ رہے تھے، ڈاکٹر میری سیٹ کے پاس سے گزر کر واپس گیا تھا۔ پچھلی سیٹوں سے سسکیوں کی آوازیں آ رہی تھیں، ایک دو خواتین کی چیخوں کی بھی...... یقیناً وہ مسافر جانبر نہ ہو سکا تھا۔ آنے والا وقت جانے ہمارے لیے کیا، کیا خبریں لانے والا تھا۔

آنسو تھمنے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے، اس وقت تک جب تک کہ اعلان نہ ہوا کہ قریبی ائرپورٹ پر ہنگامی لینڈنگ کی اجازت مل گئی۔ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا...... مصطفیٰ کی طرف دیکھا۔ میں نے اپنے منتوں میں اپنے بیٹے کے لیے جانے کیا، کیا سوچ لیا تھا۔ اس نے تو ابھی دنیا میں دیکھا ہی کچھ نہ تھا، اس کی محدود سی دنیا تھی جس میں وہ پابندیوں بھری زندگی گزار رہا تھا۔ سکون دل تک اتر گیا تھا۔ جتنی آیات قرآنی یاد تھیں میں زیرِ لب پڑھنے لگی...... خدا خدا کر کے جہاز انتہائی جھٹکوں بھری لینڈنگ کر کے گرنے کے سے انداز میں اس انجان ائرپورٹ پر اتر گیا، ہمارے جہاز کو ائرپورٹ کی عمارت سے انتہائی دور کھڑا کیا گیا تھا اور ہمیں جہاز سے نکلنے کی اجازت نہ تھی۔ یقیناً یہ سب کچھ خبروں میں دکھایا جا رہا ہوگا اور عابد دیکھ رہے ہوں گے...... مگر وہاں تو رات کے نصف سے زائد کا وقت ہوگا میں نے اپنی کلائی پر بندھی گھڑی دیکھ کر سوچا۔ مما لوگوں کو تو علم ہی نہ تھا اس لیے۔ اگر وہ خبریں سن بھی رہے ہوں گے تو انہیں کیا علم کہ اس مشکل میں پھنسے جہاز میں ان کی بیٹی اور نواسہ بھی تھے۔

جانے کتنے ہی گھنٹے گزر گئے تھے، جہاز کے لیے کچھ ایندھن دیا گیا تھا غالباً...... جہاز اڑ تو نہیں سکتا تھا مگر جہاز کے اندر درجۂ حرارت کو مناسب رکھنے کے لیے اس کا انجن چلتے رہنے کی ضرورت تھی۔ چھوٹے بچے تنگ پڑ گئے تھے اور چیخ چلا رہے تھے، مصطفیٰ بہت خاموش طبع اور صابر بچہ سہی مگر وہ بھی بے چین ہو رہا تھا، میں اسے اپنے فون میں سے تصاویر دکھا کر بہلا رہی تھی۔ اللہ نے ہماری سن لی اور اعلان کیا گیا کہ بوڑھی خواتین اور کم عمر بچوں کے ساتھ ان کی مائیں حوائج ضروریہ کے لیے ائرپورٹ کی عمارت تک جا سکتی تھیں...... میں بھی اپنا بیگ اٹھا کر چل دی، اس کے علاوہ ہمیں کچھ اٹھانے کی اجازت نہ تھی۔ دل تو چاہ رہا تھا کہ ائرپورٹ کے کسی غسل خانے میں مصطفیٰ کو نہلا لیتی تاکہ ذرا اس کی تھکاوٹ اتر جاتی مگر ناچار اسی طرح چل دی۔

جہاز کے باہر سیڑھی لگا دی گئی تھی اور اس کے اختتام پر ایک بس کھڑی تھی، ہم لگ بھگ تیس چالیس عورتیں تھیں جو جہاز سے اتری تھیں، چند ایک نے نہ اترنے کو ترجیح دی تھی، غالباً ان کے بچے ان سے

اکیلے سنبھالے نہ جاتے تھے اور اجازت ہر بچے کے ساتھ صرف اس کی ماں کو ملی تھی، کسی مرد کو جہاز سے اترنے کی اجازت نہیں تھی...... پرواز بھی پاکستانیوں سے بھری ہوئی ہو اور ''نیک نامی'' تو ہماری ہے ہی دنیا بھر میں اسی لیے تو...... یہ بھی شکر تھا کہ یہ ایک غیر ملکی ائر لائن کی پرواز تھی تو کسی اور ملک میں اترنے کی اجازت مل گئی تھی ورنہ ہماری قومی ائر لائن ہوتی تو جہاز فضاؤں میں ہی پھٹ جاتا مگر اسے زمین پر نہ اترنے دیا جاتا۔

کوئی غلیظ سا غلیظ ائر پورٹ تھا۔ مجھے تو اپنے ملک کے ائر پورٹ بھی اس کے مقابلے میں بہت اچھے لگنے لگے۔ لاؤنج میں ایک علاقہ محدود کر کے اس کے گرد جنگلوں کی حفاظتی دیوار بنائی گئی تھی۔ درمیان میں بینچ تھے اور دیوار کے ساتھ ساتھ ائر پورٹ سیکیورٹی کے اسلحہ بردار درجنوں افراد...... ہم بھلا کیا کر لیتے۔ مگر ان کا اپنا نظام اور اپنے طریقے تھے۔ شکر کیا کہ کم از کم جہاز کی ان تنگ نشستوں سے کم از کم کچھ دیر کے لیے ہی سہی مگر نجات ملی تھی۔ ہم نے باری، باری غسل خانے استعمال کیے۔ بچوں کے بعد خواتین بھی باتھ روم استعمال کر چکیں تو ہمیں اسی طرح حفاظتی حصار میں اور قطار بنوا کر واپس جہاز کی طرف لایا گیا۔ گھنٹوں کے انتظار کے بعد لنک کے طور پر چپس اور جوس کے چھوٹے پیکٹ جہاز میں بھجوائے گئے جو کہ اونٹ کے منہ میں زیرے کے برابر تھے مگر اسے قبول کرنے کے سوا چارہ کوئی نہ تھا۔

اعلان کیا گیا کہ کسی قریبی ملک سے کوئی پرواز ہمارے جہاز کے انجن کے لیے مطلوبہ پرزہ لے کر روانہ ہو چکی تھی، اس کے آنے کے بعد جہاز کا پرزہ تبدیل کیا جائے گا اور اس کے بعد جہاز اڑنے کے قابل ہو سکے گا......

''کیا؟'' لوگوں کی اس اعلان پر چیخیں نکل گئیں۔ ''کیا ہم اس وقت تک اس جہاز میں اسی طرح محبوس رہیں گے۔ تنگ تنگ سیٹیں، گھٹی گھٹی فضا

اور باہر جانے پر پابندی......'' اس سارے عمل میں چوبیس گھنٹے بھی لگ سکتے تھے اس لیے لوگوں کو صبر و تحمل کا مظاہرہ کرنے کو کہا جا رہا تھا اور بتایا گیا کہ کوششیں جاری تھیں کہ جہاز کی مرمت کے دوران سب مسافروں کو ائر پورٹ پر اترنے کی اجازت دی جائے تا کہ لوگ چل پھر سکیں، باتھ روم استعمال کر سکیں اور ممکن ہو تو کچھ کھا پی لیں...... انتہائی تشویش ناک حالات تھے مگر کم از کم ہم سب زندہ بچ گئے تھے......

میں نے تصویر کا روشن پہلو دیکھا، کاش سب لوگ اس طرح سوچیں تو ان کی بے چینی دور ہو جائے۔ یہ کیا اللہ کا کم احسان تھا ہم سب پر کہ اس نے ہم سے زندگی جیسی نعمت نہ چھینی تھی۔ جس طرح جہاز فضاؤں میں بے وزن ڈول رہا تھا اس سے تو اس کے بچ جانے کے امکانات کم، کم تھے...... اللہ تیرا لاکھ، لاکھ شکر ہے۔ میں نے دل کی گہرائیوں سے کہا۔

مما کیا کر رہی ہوں گی...... میں نے سوچا۔ صدف بھی پہنچ گئی ہو گی...... باہر رات کی تاریکی پھیل رہی تھی۔

☆☆☆

اس نے میری طرف دیکھ کر سیٹی کے انداز میں منہ سکیڑا تو میں نے اک ادائے بے نیازی سے شانہ اچکایا۔ اس نے جرأت کر کے میرے ہاتھ کی پشت کو اپنی انگلی کی پور سے ہولے سے یوں چھوا جیسے ایسا حادثاتی طور پر ہوا ہو، اس پر بجائے اسے ڈانٹ دینے کے...... میں مسکرا دی تھی، ابرو اچکا کر میں نے سوالیہ نظر سے اسے دیکھا، اس کی مسکراہٹ نے میرے حسن کی تعریف کی...... سر کو جھٹک کر میں نے اسے جتلا دیا تھا کہ میں اپنے حسن کی طاقت سے آشنا تھی، وہ کرن کا منگیتر تھا، کرن نے اپنی منگنی کی ٹریٹ دی تھی، آئس کریم پارلر میں بیٹھے، بیٹھے ہی اس نے کال کر کے اپنے منگیتر کو بھی بلا لیا تھا...... ان دونوں کا دھماکے دار عشق ہم سب سے کہاں چھپا تھا، کرن کے والدین نے انکار کیا تو اس نے دھمکی دی کہ وہ خودکشی کر لے گی

مگر کسی اور سے شادی نہیں کرے گی۔
اس کے والدین اسے اپنے خاندان میں بیاہنا چاہتے تھے، انہیں تو علم ہی نہ ہوا کہ ان کی ذہین اور خوب صورت بیٹی، گھر سے حصولِ تعلیم کے لیے جانے والی...... کب عشق و محبت کے کھیل میں شریک ہو گئی، کب اپنے دل کے ہاتھوں اس حد تک بے قابو ہو گئی...... وہ بھی اس لڑکے کے ساتھ جس کی شہرت کچھ انہیں اچھی نہ ملی تھی مگر کرن کے سر پر سوار بھوت نہ اتر سکا اور یوں اس کے مجبور کرنے پر کرن کے ماں پپا نے ان دونوں کی منگنی کر دی ہمارے امتحانات چل رہے تھے پھر چھٹیاں ہو گئیں اور یوں چھ ماہ کے بعد وہ دن آیا تھا کہ ہمیں کرن ٹریٹ دے رہی تھی۔ ان چھ ماہ میں ہر روز کرن کال کر کے مجھے اس کی دیوانگی کے قصے سناتی، اس کی فرزانگی کی کہانیاں مجھے گھنٹوں سننا پڑتیں، کوئی لڑکا آج کے دور میں اس طرح دیوانہ بھی ہو سکتا ہے؟ میں سوچا کرتی...... 'کیا یہ وہی تھا جو اس لمحے سے قبل کرن پر مرتا تھا......' میں آئس کریم پارلر میں پاگلوں کی طرح اس کا چہرہ دیکھ کر کچھ کھوجنے کی کوشش کر رہی تھی۔ مجھے اپنی محویت میں اندازہ بھی نہ ہوا کہ کوئی اور مجھے یوں دیکھ کر کیا سوچے گا۔ اس وقت چونکی جب میرے ہاتھ کی پشت کو اس کی انگلی نے چھوا۔ اشاروں ہی اشاروں میں گفتگو ہوئی۔

''آپ کی آئس کریم ٹھنڈی ہو رہی ہے...... مس؟'' اس نے مجھے خواب سے جگا دیا۔

''حنا......'' میں نے اسی گم خیالی میں کہا۔

''خوش رنگ حنا......'' اس نے ہولے سے مسکرا کر کہا تھا۔ میں آئس کریم کی طرف متوجہ ہونے کی ناکام کوشش کرنے لگی۔

''کرن میں ایسا کیا ہے جو اسے بھایا ہے...... کیا وہ مجھ سے زیادہ خوب صورت ہے؟ ہاں، کرن ہے تو خوب صورت...... حسین کہیں مجھ سے زیادہ مگر...... دانیال جیسا اسمارٹ اور چاہنے والا اسے ہی کیوں ملا، مجھے کیوں نہیں......؟'' میں سوچ رہی تھی۔

''تم پہلے نظر آ جاتیں تو کرن تو مجھے نظر بھی نہ آتی......'' اس نے کہا تھا۔ ''تمہارا حسن تو جادوئی ہے!''

''اچھا......'' میں ہنسی تھی۔ ''باتوں کے تم بادشاہ ہو!''

''تم نے ہی کوئی سحر پھونکا ہے جو میں ایسی باتیں کرنے لگا ہوں۔''

''ایسی باتیں تم نے کرن سے بھی بہت کی ہیں پچھلے ایک برس میں۔''

''کہاناں تمہیں کہ تم پہلے مل جاتیں تو وہ نظر بھی نہ آتی مجھے......''

''پر وہ تمہیں ملی کہاں؟'' یہ وہ سوال تھا جو مجھے کرن سے پوچھنے میں ہچکچاہٹ محسوس ہوئی تھی کہ کہیں وہ یہ نہ سمجھ لے کہ مجھے اس کے منگیتر سے اتنی دلچسپی کیوں ہو رہی تھی۔ کرن خوب صورت اور ذہین تھی، اچھے خاندان سے تھی اور اس کے خاندان میں سے ہی کئی لوگ اس کے رشتے کے لیے خواہاں تھے...... یہ سب کرن نے مجھے خود بتایا تھا۔ مگر اس کی اور دانیال کی ملاقات کہاں ہوئی۔ یہ اس نے نہیں بتایا تھا۔

''ہم ایک حادثے کے نتیجے میں ملے تھے......'' دانیال نے مسکرا کر بتایا۔ ''میرے ایک دوست کی بائیک کو کرن کی گاڑی نے ٹکر مار دی تھی، میرے دوست نے مجھے اپنی مدد کے لیے بلایا کیونکہ وہ زخمی ہوا تھا، گیا میں اس کی مدد کو تھا کہ وہ زخمی تھا...... مگر میں تو قتل ہی ہو گیا۔'' وہ ہنسا... میں اس کی کیفیت کو سمجھ سکتی تھی۔ کرن کے حسن کے ساتھ سادگی کا تڑکا تھا، اپنے حسن سے بے خبری تھی، اسے اپنے حسن کی طاقت کو استعمال کرنا نہیں آتا تھا اس لیے اس میں دھیما پن تھا...... اس کے برعکس مجھے علم تھا کہ حسن کی طاقت کیا ہے اور اس سے جلا کر بھسم کیسے کیا جاتا ہے، میرا حسن تخریب کاری کی طاقت رکھتا تھا کیونکہ میں ایسی ہی تھی، بے باک اور خطرناک کھیل کھیلتے ہوئے خوفزدہ نہ ہونے والی۔

اسی لیے دانیال سے پہلی ملاقات میں مجھے یقین ہو گیا کہ وہ کرن کے لیے نہیں، میرے لیے بنا

تھا، اسی لیے میں نے اس کی حوصلہ شکنی نہیں کی تھی...... اس نے ایک انگلی کا اشارہ کیا تھا، میں نے اس کا پہنچا تھام لیا اور اس کے ساتھ آنکھیں بند کیے اس راہ پر بگٹٹ بھاگ رہی تھی جس کے دوسرے سرے پر کرن اسی طرح بے خبر دانیال کو چاہے جا رہی تھی، پھر وہ دن آ گیا۔ جب وہ میرے گھٹنے پکڑے رو رہی تھی اور میری منتیں کر رہی تھی اس وقت بھی میں کسی اور گمان میں تھی......

''ایک بار حنا جانی...... فقط ایک بار کہہ دو کہ دانیال کا خیال غلط ہے...... وہ جھوٹ کہتا ہے کہ تم بھی اسے چاہتی ہو...... وہ کہتا ہے کہ تم نے آگے بڑھنے میں اس کی حوصلہ افزائی کی ہے...... ایک بار کہہ دو کہ وہ سب کچھ جھوٹ کہتا ہے۔'' میں نے جن خاموش نظروں سے اسے دیکھا تھا وہ اس کے قتل کے مترادف تھیں۔

''میں نہیں مان سکتی حنا کہ تم ایسی کٹھور ہو سکتی ہو۔ میری سال بھر کی منگنی ٹوٹ رہی ہے...... ساری دنیا جانتی ہے کہ ہم دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں اور میں نے سب سے ٹکر لے کر اسے حاصل کیا تھا...... میرے پیچھے تین اور جوان بہنیں ہیں۔ یوں بے وجہ میری منگنی ٹوٹنے سے نہ صرف میری زندگی پر اثر پڑے گا بلکہ میری بہنوں کے لیے آنے والے رشتے...... پہلے میری منگنی ٹوٹنے کا سبب پوچھیں گے، خدارا حنا...... نہ کرو یہ سب......'' وہ میری منتیں یوں کر رہی تھی جیسے مجھے اپنے یا دانیال کے دل پر اختیار تھا کچھ۔

''مجھے کیا کہہ رہی ہو کرن...... دانیال سے بات کرو۔'' میں نے بے پروائی سے کہا تھا۔

''اس سے بات کی تھی حنا...... وہ کہتا ہے کہ تم سے بات کروں...... مجھ پر ایسا ظلم تم دونوں مل کر مت کرو۔''

''دل پر کس کو اختیار ہوتا ہے کرن جان......''

''جب وہ میرے ساتھ ایسی باتیں کرتا تھا تو میں ہواؤں میں اڑتی تھی، اب وہ یہی باتیں تم سے کہہ رہا ہے...... اسے کوئی اور حسین مل گئی تو وہ اس سے بھی ایسی باتیں کرے گا، تم اسے واپس مجھے مت لوٹاؤ حنا...... مگر اپنی راہ بدل لو۔ مجھے دوستی پر اعتبار رہنے دو...... وہ ہم دونوں کے بیچ آ گیا ہے تو اسے نکال دو۔ ہماری پندرہ سال کی دوستی اس کی چند مہینوں کی رفاقت سے ٹوٹ رہی ہے...... وہ کسی ایک کا ہو کر رہنے والا نہیں ہے حنا...... میری مان لو!''

''کرن...... اگر میں کہوں کہ تم میرے اور دانیال کے بیچ میں آ رہی ہو تو؟'' میں نے غصے سے ابرو اچکائے تو اس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ ''جس کے حسن میں طاقت ہے وہی جیتتا ہے، دانیال کا میری طرف متوجہ ہو جانا اور مجھے تم سے زیادہ چاہنا...... یہ سب میں نے تو نہیں کیا۔''

''یہ لو......'' اس نے اپنے بائیں ہاتھ کی انگلی سے انگوٹھی اتاری اور میری طرف بڑھائی۔

''مجھے کیوں دے رہی ہو یہ انگوٹھی......'' میں نے رخ پھیرا۔ ''کیا میں تمہاری اتاری ہوئی انگوٹھی پہنوں گی؟'' میں اس وقت خود غرضی کی انتہا پر تھی۔

''تمہیں وقت بتائے گا حنا...... جو کسی سے چھین کر کھاتا ہے اسے عمر بھر سکون نصیب نہیں ہوتا۔''

''بند کرو یہ سب فضولیات کرن! کیا چھین کر کھایا ہے میں نے تم سے جو تم مجھے بددعائیں دے رہی ہو؟''

''میں نے تمہیں کوئی بددعا نہیں دی ہے حنا ابھی تک......'' اس نے کمال تحمل سے کہا، اس کی آنکھوں سے آنسو بھی خشک ہو گئے تھے۔ ''بس یہ دعا ہے کہ دانیال کی یہ عادت برقرار رہے...... وہ جو حسین چہرہ دیکھے، اس کی طرف لپکے تب تمہیں احساس ہو گا کہ حسن کی طاقت کتنی عارضی ہے......''

''جسٹ شٹ اپ......'' میں نے دانت پیس کر کہا تھا، وہ اٹھ کر چلی گئی۔ اس وقت مجھے احساس بھی نہیں ہوا کہ میں ایک اچھی دوست کو کھو رہی تھی، اس سراب کے پیچھے بھاگتے ہوئے جس کے ساتھ زندگی

گزارنے میں جانے لیا، کیا عذاب سہنا تھے مجھے۔
دانیال دیوانگی کی حدوں کو چھو رہا تھا، پاگل ہو رہا تھا مجھے پانے کے لیے...... میرے ماں باپ کو اس کی دیوانگی سے خوف آتا تھا اور وہ سمجھتے تھے کہ یہ عارضی نشہ ہے اور جلد اتر جائے گا مگر مجھے یقین تھا اس پر تو کسی اور کی کیا چلتی۔ ماں باپ کو ہم پر بے پناہ اعتماد تھا اور ہماری زندگیوں کا کوئی فیصلہ وہ ہم سے پوچھے بغیر نہیں کرتے تھے۔ دانیال کے بارے میں انہوں نے مجھے اپنے خدشات سے آگاہ کیا اور میں نے ان کے ہر خدشے کو جھٹلا دیا۔ ان کے ساتھ دلائل میں، میں تلخ بھی ہوگئی مگر اس وقت مجھے ان سب باتوں کی کوئی پروا نہ تھی۔ میں نے لڑ جھگڑ کر، کتنے ہی لوگوں کو ناراض کر کے دانیال کو جیت لیا تھا اور اس جیت کے نشے میں سرشار دن رات گزر رہے تھے۔ وہ صرف پرکشش اور اسمارٹ مرد ہی نہیں...... ایک کامیاب کاروباری بھی تھا اور میں زندگی میں ہر اس خوشی کی مستحق ٹھہری جس کے کوئی عورت خواب دیکھ سکتی ہے مگر کب تک؟ مجھے یہ خوشیاں کسی اور کی خوشیوں کے مزار پر بیٹھ کر ملی تھیں۔ شاید میں کسی کی بددعاؤں کے حصار میں تھی مگر پھر بھی ہواؤں میں اڑ رہی تھی۔

میں اس وقت جن ہواؤں میں تھی...... ان ہواؤں میں مجھ جیسی کم عقل لڑکیاں یونہی اڑتی ہیں، میں اس وقت کسی اور زعم میں تھی، کسی اور نشے میں تھی، جانتی تھی کہ میرا حسن کائنات کو سر کرنے کی طاقت رکھتا ہے...... دھیمی، دھیمی آنچ سلگانے والا نہیں، آگ لگانے والا حسن ہے مگر یہ نہیں جانتی تھی کہ حسن کی طاقت بہت عارضی ہے یہ نہیں سمجھتی تھی کہ جس حسن پر وہ مرمٹا ہے وہ حسن کسی اور کے پاس ہوگا تو اس کا لالچی من پھر للچا جائے گا۔ اس وقت میں انتہا کی خود غرض جو بن گئی تھی۔

☆☆☆

''مجھے کچھ علم نہیں مما کہ خالہ نے ایسا کیوں کیا؟'' میں نے پاپا کے چہرے پر لکھی وہ التجا پڑھ لی تھی جو ان کی ایک جھلک دیکھنے پر مجھے نظر آئی تھی اور یوں بھی خالہ کے بارے میں مما کبھی منفی سوچ ہی نہیں سکتی تھیں تو میں جو بھی بتاتی خواہ وہ حقیقت ہوتی یا افسانہ...... انہیں یقین ہی کہاں آنا تھا۔ یوں بھی ان کے جس عیب کو اللہ تعالیٰ نے عمر بھر ڈھکے رکھا تھا، پاپا کے جس راز کو مما پر آشکار نہ کیا تھا، اسے آشکار کرنے کا میرا کوئی ارادہ نہ تھا۔ پہلے ہی مما جانے کس بات کے نتیجے میں پاپا سے خلع لینے کا فیصلہ کر چکی تھیں۔ ابھی تک تو یہ بھی راز تھا، مما کو پاپا کے بارے میں کئی ایسی باتوں کو علم رہا ہوگا جن کی بنیاد پر وہ کسی بھی وقت یہ فیصلہ کر سکتی تھیں مگر اب یقیناً کچھ ایسا ہوا تھا جو اُن کی برداشت کی حدوں کو توڑ گیا تھا۔

''تمہیں اس نے خاص طور پر ملنے کے لیے بلوایا تھا فاطش......؟'' مما کے لہجے میں آنسو تھے۔

''وہ اکیلا محسوس کر رہی تھیں مما......'' میں نے بات بنائی۔ ''میرے ساتھ تو ان کا بچپن سے پیار ہے۔ آپ کو معلوم ہے ان کے اپنے بچے نہیں ہوئے تو ان کی ساری ممتا میرے لیے تھی......'' میرے آنسو بھل بھل بہنے لگے، مجھے ایک دم سے محسوس ہوا کہ میں جو کچھ کہہ رہی تھی اس میں کچھ جھوٹ نہ تھا۔ وہ واقعی مجھے اتنا ہی چاہتی تھیں...... میں نے تو انہیں بچپن سے اپنے پاپا کے ساتھ یوں دیکھ لیا کہ عمر بھر اس واقعے کی یاد کو بھلا نہ سکی مگر مجھے اس واقعے کے پس منظر کا علم نہ تھا...... سات سال کی بچی کیا ہوتی ہے...... میں ان کی بے بسی، ان کی تکلیف اور اس چھوٹی سی عمر میں ان کی ذہنی اذیت کو سوچ کر ہچکیوں سے رونے لگی...... مما نے میرا سر اپنے ساتھ لگا لیا۔

''چلو گی میرے ساتھ ملتان تم؟'' مما نے پوچھا۔

''یہ کوئی پوچھنے کی بات ہے مما......'' میں نے آنسو اپنے ہاتھ کی پشت سے پونچھے۔

''میں نے سوچا...... شام کو ہی تو واپس پہنچی ہو۔''

''کون، کون جا رہا ہے؟'' میں نے اٹھ کر اسود کو اٹھا لیا جو نیند سے جاگ کر اپنی ماں کو روتے ہوئے

دیکھ کر منہ بسور رہا تھا۔
''کبھی کو جانا ہوگا!'' مما نے کہا۔
''میں سوچ رہی تھی کہ صرف میں اور آپ جاتے ...... اسود کو گھر پر چھوڑ دیتے ہیں...... صدف ہے، پاپا ہیں۔ میں اور آپ جا کر دو دن میں لوٹ آئیں گے......'' دل میں خیال آیا کہ خالہ نے خودکشی کی ہے، کہیں وہ کوئی خط وط نہ لکھ کر چھوڑ گئی ہوں، اس میں اپنے اور پاپا کے بارے میں کچھ الا بلا لکھ دیا ہو تو پاپا کیا منہ دکھائیں گے لوگوں کو؟ پاپا سے بھی بڑھ کر مجھے فکر تھی کہ مما کو جب یہ صدمہ پہنچے گا تو کیا وہ سہار پائیں گی؟ کوئی پاپا کا گریبان تھام لے تو......؟ میں نے بھی اشعر کی بے وفائی سہی تھی اور جانتی تھی کہ مما کے لیے پاپا کی ساری بے وفائیاں ایک طرف اور خالہ کے ساتھ جو کچھ ہوا...... وہ سب پر بھاری ہو گا شاید تابوت کی آخری کیل ثابت ہو...مما مرتے دم تک خود کو اپنی بہن کا مجرم سمجھتی رہیں گی۔
''کیا بات کر رہی ہو بیٹا...... دانیال کس طرح رکیں گے...... جانتی نہیں ہو کہ تانیہ ان کی پانچویں بیٹی جیسی تھی۔'' مما سسکیں تو میرے دل سے خون کے آنسو بہنے لگے...... کیا کوئی باپ ایسا کر سکتا ہے اپنی بیٹی کے ساتھ؟
''مگر مما!'' میں کچھ کہنے ہی والی تھی کہ کسی طرح پاپا نہ جائیں، کیا معلوم وہ نادیہ، خالو کی بھتیجی، جو سب کچھ جانتی تھی۔ وہ سب کے بیچ کوئی ایسی بات کہہ دے...... پھر تو مما کو بھی نہیں جانا چاہیے۔ مگر.......
...... ایسا کیسے ممکن تھا کہ میرے کہنے سے وہ خود رکتیں یا پاپا کو رکنے دیتیں۔ اسود، صدف کے پاس ہرگز نہ رکتا کہ وہ اس سے مانوس نہ تھا سو اسے بھی ساتھ لے جانا پڑا۔ تمام راستے مما کی آنکھوں سے آنسو بار، بار بند توڑ کر بہنے لگتے اور میں ممکنات کے خوف میں مبتلا رہی۔
گاڑی خالہ کے گھر کی طرف مڑی، پاپا گاڑی چلا رہے تھے...... پوری گلی میں سوائے مردوں کے کچھ نظر نہ آ رہا تھا، پاپا کے چہرے پر کوئی تاثر نہ تھا، جانے وہ اس گلی میں کتنی بار آئے ہوں گے...... آج وہ اس چہرے کو کس منہ سے دیکھ سکیں گے جس چہرے کی معصومیت انہوں نے سات برس کی عمر میں چھین لی تھی...... اس وجود کو کندھا دے پائیں گے جسے وہ عمر بھر پامال کرتے رہے تھے؟ میں ان کے بے تاثر چہرے کو دیکھ رہی تھی، دانت پر دانت جمائے تمام راستہ وہ تقریباً خاموش ہی رہے تھے۔ وہ جسے دوسروں کے سامنے بیٹی کہتے تھے۔ اس کے ساتھ بیٹی کے رشتے کو کس طرح پامال کیا...... خالہ نے مجھے کہا تھا کہ انہوں نے انتقام میں ایسا کیا...... کس سے انتقام لیا آپ نے خالہ؟ خود کو ہی تباہ کیا ناں آپ نے......
آپ کی بے وفائی نے آپ کے شوہر کی جان لے لی اور آپ کے ضمیر کے بوجھ نے آپ کو جینے نہ دیا...... جانے کیسے میں گاڑی کے رکتے ہی بھاگ کر باہر نکلی، مردوں کے بیچ میں سے راستہ بناتے ہوئے اندر پہنچی۔ برآمدے سے مجھے عین صحن کے وسط میں چارپائی نظر آئی۔
''خالہ......'' میں وہیں سے چیخ، چیخ کر رونے لگی۔

☆☆☆

''چند دن قبل تم نے مجھ سے کچھ مانگا تھا ناں نیل......'' عمر پوچھ رہے تھے اور مجھے کچھ یاد نہ آ رہا تھا کہ میں نے ایسا کیا مانگا تھا۔ ''مجھے تمہارے سچ پر بھی شک ہوا تھا اور تمہاری نیت پر بھی......''
''کوئی بات نہیں عمر...... ہو جاتا ہے ایسا میاں بیوی کے بیچ...... بلکہ ہر رشتے کے بیچ۔'' میں سمجھ گئی تھی کہ ان کا اشارہ بلی اور نبیل کے رشتے کی طرف تھا اور میری طرف سے یہ کہنا کہ بلی کی بھی مرضی اس رشتے میں شامل تھی، اس سے ان کے پندار کو ٹھیس پہنچی تھی مگر اب وہ بلی کا مسکراتا اور مطمئن چہرہ دیکھتے تو انہیں یقین آ گیا تھا کہ میں نے جھوٹ نہیں کہا تھا۔
''اب میں تم سے شرمندہ ہوں نیلم...... تم بلی کے لیے ماں بن کر سوچتی ہو اور میں سمجھتا رہا کہ تم......''

'' ارے کیا ہو گیا، کس بات پر شرمندہ ہیں آپ؟'' میں نے ان کا ہاتھ تھاما۔

'' میں نے اسی خدشے کے تحت تمہیں عمر بھر محروم رکھا نیل ...... '' ان کی آنکھوں میں کوئی ستارہ چمکا تھا۔'' مجھے ناہید آپی نے بتا دیا ہے جو باتیں ان کے اور اماں کے مابین ہوئیں اور انہیں غالب گمان ہے کہ تم نے وہ باتیں سن لیں...... '' میرے اندر سے درد اٹھا۔

'' کوئی بات نہیں عمر...... '' میں نے جی کڑا کر کے کہا۔'' انسان کو زندگی میں ہر حقیقت کا کبھی نہ کبھی سامنا کرنا ہی پڑتا ہے...... ''

'' میں خود کو کس قدر بے وقوف سمجھ رہا ہوں۔ تم سوچ بھی نہیں سکتیں نیل...... '' عمر کی آواز بھرا گئی۔

'' کئی بار سوچا کہ میرے اور تمہارے بچے ہوں مگر اماں سے کیا گیا عہد...... کیوں کیا میں نے ایسا غیر فطری وعدہ ان سے اور کیا نبھانا اتنا ضروری تھا، تمہارا اپنے بچوں سے ممتا بھرا برتاؤ دیکھ کر بھی سوچا نہیں کہ تمہارا دل کتنا بڑا ہے...... ''

'' ان باتوں کو ہم کسی اور وقت کے لیے اٹھا رکھتے ہیں، مجھے نیند آ رہی ہے اس وقت۔'' میں دوا کے زیر اثر تھی اور سونا چاہ رہی تھی۔

'' ابھی بات کرنا بہت ضروری ہے نیل...... پہلے ہی بہت اہم وقت ضائع ہو چکا ہے...... ''

'' پلیز عمر...... '' میں نیم غنودگی میں تھی۔

'' کیا تم ماں بننا چاہتی ہو نیل؟'' اس نے سوال کیا۔

'' وہ تو میں ہوں...... '' میں نے نیم خوابیدہ لہجے میں کہا۔

'' اپنے بچوں کی؟'' عمر نے سرگوشی کی۔

'' میرے ہی ہیں وہ بچے...... '' میں ہولے سے بڑبڑائی۔

'' میرے اور تمہارے اپنے بچے نیل جان!'' میں جواب دینے کے بجائے اونگھ رہی تھی، وہ کچھ اور بھی پوچھ رہے تھے...... کچھ کہہ رہے تھے مگر میری حسیں سو چکی تھیں۔ میرے فون پر پیغام کی گھنٹی بجی تھی مگر مجھ میں فون اٹھا کر دیکھنے کی سکت بھی نہ تھی۔

'' نیل...... جانِ عمر!'' میں نے عمر کی آواز کسی کنویں میں سے آتے ہوئے محسوس کی۔

'' ہوں...... '' میں نے نیند کے عالم میں کہا تھا۔

'' تمہارے لیے تمہاری مما کا پیغام آیا ہے...... ''

عمر نے کہا تھا اور میں غالباً خراٹے لے رہی تھی۔

☆☆☆

'' تم میرے ساتھ کس بات پر ناخوش ہو صدف؟'' احمد مجھ سے پوچھ رہا تھا اور میں الجھی، الجھی سی اس کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔

'' میں نے کب کہا کہ میں ناخوش ہوں احمد؟''

'' تم روز رات کو سوتے میں بڑبڑاتی ہو کہ تم مجھ سے خوش نہیں ہو...... غالباً خلع کا فیصلہ کر لیا ہے تم نے۔''

'' اوہو...... '' میں نے تاسف سے کہا۔'' مجھے تو علم نہیں کہ میں رات کو سوتے میں کیا بڑبڑاتی ہوں اور کیوں؟''

'' کوئی الجھن ہے تمہارے ذہن میں صدف تو تم مجھ سے شیئر کیوں نہیں کرتیں؟'' احمد میرا ہاتھ تھامے نرمی سے پوچھ رہا تھا۔

'' الجھن کیا ہو گی بھلا......؟'' میں نے کھوئے، کھوئے لہجے میں کہا۔

'' کچھ تو ہے ورنہ تمہاری عمر ایسی تو نہیں کہ یوں اچانک تمہارا نروس بریک ڈاؤن ہو جاتا...... ''

'' میرے اختیار میں تو نہیں احمد کہ خود کو نروس بریک ڈاؤن ہونے سے بچا سکوں یا سوتے میں نہ بولوں ...... یہ سب تو بے اختیاری کے کام ہیں ڈیئر...... '' میں نے اپنے ان اعمال کا دفاع کیا جو انجانے میں سرزد ہو رہے تھے مگر حقیقت تو یہ تھی کہ ان کی بنیادی وجہ سے میں آگاہ تھی، یہ اور بات کہ اپنا مان توڑنا نہیں چاہتی تھی...... اپنے ماں باپ کی عزت پر حرف نہ آنے دینا چاہتی تھی۔

''پھر بھی کچھ تو ایسا ہوا ہوگا جان..... کوئی وجہ، کوئی واقعہ کوئی حادثہ..... کسی پرانے واقعے کی یاد..... کسی نے تمہارے ساتھ کوئی زیادتی کی ہو جس کے باعث.....''میرا دماغ بھک سے اڑ گیا..... احمد کیا سوچ رہا تھا، مجھے یہ خیال کیوں نہیں آیا کہ سچ کو چھپانے کے لیے..... جس لاعلمی کے پردے میں ڈال رہی تھی وہ میرے شوہر کو کسی اور شک میں مبتلا کر سکتا تھا۔ احمد اب میرا وہ کزن نہیں تھا جس کے ساتھ میں بچپن سے ہی ہر چھوٹی بڑی بات شیئر کر لیتی تھی، نہ ہی وہ منگیتر کہ جسے دنیا میں سب سے پہلے میری خوشی کا خیال ہوتا اور وہ میرے لیے ہر کسی سے لڑائی مول لے لیتا تھا۔ میاں بیوی کے رشتے میں بندھ کر میری طرف سے ذرا سا تکلف در آیا تھا، میں اسے احترام دینے کی کوشش کرتی کیونکہ اب وہ میرا شوہر تھا۔ بچپن سے ہی جس تو تڑاخ کی عادت تھی اس سے چھٹکارا پانا کافی مشکل کام تھا مگر احمد تو ویسا ہی تھا، اسی طرح میرا خیال رکھتا بلکہ اب تو اور بھی چاہتا تھا۔ میری چھوٹی سے چھوٹی خوشی کے لیے، وہ خود کو بڑی بڑی مشکل میں ڈال لیتا..... یوں کسی بھی بیوی کی طرف سے اس طرح کی ذہنی بیماری میں مبتلا ہونا کسی بھی شوہر کو شک میں ڈال سکتا ہے۔

''بتاؤ گی نہیں مجھے، کیا بات تمہیں اتنا پریشان کرتی ہے کہ احمد کا پیار اور توجہ بھی اس کے سامنے ہیچ ہو جاتے ہیں؟'' اس نے اپنے بازو میرے گرد لپیٹے۔

''احمد.....'' میں سسک پڑی، اس کی ہمدردی پا کر میں بکھر گئی اور احمد کے شانے پر سر رکھ کر اسے اپنا مسئلہ بتانے لگی۔ مما کا پیغام..... اس سے منسلک اپنے خدشات۔ مما سے پاکستان آ کر جو میری ایک دفعہ اس موضوع پر مختصر بات ہوئی تھی، سب کہہ سنایا۔

''ہوں..... تو تم نے اس بات کو اپنے سر پر سوار کر لیا ہے؟'' احمد کے لہجے میں کوئی تاثر نہ تھا۔

''تو کیا یہ ایسی بات نہیں کہ اسے سر پر سوار کیا جائے..... کیا تمہیں یہ سب سن کر حیرت نہیں ہوئی احمد؟''

''نہیں کوئی زیادہ نہیں!'' اس نے کمالِ بے نیازی سے کہا۔

''یعنی مما..... پاپا پر بے وفائی کا الزام لگا رہی ہیں..... ان سے خلع حاصل کرنے کا سوچ رہی ہیں اور اس کے لیے یہ جواز پیش کر رہی ہیں تو یہ کوئی بڑی بات نہیں.....؟''

''مجھے کوئی حیرت نہیں ہوئی ڈیئر.....'' اس نے مسکرا کر کہا، وہ مسکراہٹ جو مجھے زہر لگ رہی تھی۔ ''اس دنیا میں یہ سب اور اس سے زیادہ بھی بہت کچھ ہوتا ہے۔''

''لیکن یہ سب کچھ میرے مما اور پاپا کے بیچ ہونا..... ناممکن ہے۔'' میں نے احتجاج کیا۔

''کیوں؟'' اس نے زور دے کر کہا۔ ''وہ دونوں کیا اس دنیا کی مخلوق نہیں ہیں؟''

''ہیں مگر..... تم سنو تو سہی احمد کہ مما، پاپا پر کس، کس طرح کے شک کرتی ہیں۔''

''میں جانتا ہوں یہ.....''

''کیا.....'' میں چلائی۔ ''تمہیں یہ سب مما نے خود بتایا ہے؟''

''آہستہ بولو.....'' احمد نے میرے منہ پر ہاتھ رکھا۔ ''سب لوگ سو رہے ہیں، کوئی جاگ کر آ کر پوچھے گا تو کیا سب بتاؤ گی؟''

''بتاؤ ناں احمد.....'' میں ضدی بچے کی طرح مچلنے لگی۔ ''مما نے خود بتایا ہے تمہیں اس بارے میں؟''

''نہیں..... ممانی نے مجھے نہیں بتایا.....'' وہ رکا، میں نے سوالیہ نظروں سے اس کے چہرے کو دیکھا۔ ''ممانی کو میں نے بتایا ہے یہ سب کچھ۔''

''کیا؟'' میں روکتے، روکتے بھی ایک بار پھر چلا دی۔ ''کیا بتایا تم نے مما کو؟''

''کہ ماموں کیا کرتے پھر رہے ہیں، ان کے ساتھ کس طرح دھوکا کر رہے ہیں۔''

''کیوں تم نے یوں جھوٹے سچے واقعات مما کو

بتائیے..... کیوں انہیں پاپا سے بدظن کیا ہے؟'' میں اس کے ساتھ یوں جھگڑ رہی تھی جیسے بچپن میں جھگڑا کرتی تھی، اس کا گریبان میں نے تھام لیا۔ ساتھ، ساتھ آنسو بہے جارہے تھے۔

''ممانی نے اپنی ساری عمر سچائی اور خلوص کے ساتھ گزاری ہے صدف.....'' اس نے مجھے سمیٹ لیا۔'' مجھے ان کی وفا اور خلوص پر کوئی شبہ نہیں ہے..... صرف ماموں کے ساتھ ہی نہیں۔ وہ ہم سب کے ساتھ بھی بہت اچھی ہیں، مجھ سے برداشت نہیں ہوا کہ وہ لاعلمی میں دھوکے کی زندگی گزاریں..... اس لیے میں نے انہیں اس خطرے سے آگاہ کر دیا۔ ماموں یہ سب کچھ ماضی میں کر کے چھوڑ چکے ہوتے صدف تو میں خاموش رہتا..... مگر حد تو یہ ہے کہ وہ اس عمر میں بھی اور چار، چار بیٹیوں اور دامادوں کے ہوتے ہوئے دھڑلے سے سب کچھ جاری رکھے ہوئے ہیں، میں تو ان کا بھانجا ہوں سو ان کے سامنے کھڑا نہیں ہوا مگر کوئی اور ہوگا تو وہ ان کا گریبان پکڑ لے گا.....'' احمد نے اپنا گریبان میرے ہاتھ سے چھڑوایا، میں سسک دی۔

''کیا ثبوت ہے تمہارے پاس احمد ان الزامات کا؟'' میں نے ہارتے ہوئے اس سے پوچھا، جانتی تھی کہ وہ جو کچھ کہہ رہا ہوگا اس میں کچھ نہ کچھ سچائی تو ہوگی۔

''سب کچھ ہے میرے پاس صدف..... مگر میں تمہیں وہ سب کچھ دکھا کر صدمہ نہیں پہنچانا چاہتا! پہلے ہی جس کیفیت سے ممانی گزر رہی ہیں اس کے لیے میں خود کو مجرم سمجھتا ہوں مگر یہ سب ضروری تھا صدف، کبھی، کسی زخم کو علاج کے لیے نشتر سے چھیڑنا پڑتا ہے..... بسا اوقات گل جانے والے عضو کو جسم سے علیحدہ بھی کرنا پڑ جاتا ہے..... ممانی کو خود فیصلہ کرنے دو، ان کے ساتھ بہت ظلم کیا ہے ماموں نے میری جان.....'' احمد مجھے سمیٹنے کی کوشش کر رہا تھا اور میں اور بھی بکھر رہی تھی۔

☆☆☆☆

میں سو رہی تھی اور جانے کس وقت مما کا پیغام آیا تھا کہ خالہ نے خودکشی کر لی تھی، جانے اب یہ پیغام عمر نے پڑھا تھا کہ نہیں..... کیونکہ مجھے یاد آ رہا تھا کہ عمر نے رات کو آخری بات یہی کی تھی کہ میری مما کا پیغام تھا۔ میں نے ٹٹولنے والی نظروں سے عمر کو دیکھا۔

''عمر..... رات کو سونے سے پہلے کچھ کہہ رہے تھے آپ مجھے؟''

''میں نے تو بہت کچھ کہا تھا جانِ عمر!'' عمر نے مسکرا کر کہا۔

''تم کس بارے میں کہہ رہی ہو؟''

''مجھے واقعی یاد نہیں..... آپ کو علم ہے کہ میری دواؤں میں نیند کی دوا بھی ہے غالباً!''

''میں نے تو بہت کچھ کہا تھا میری پیاری..... اب افسوس ہو رہا ہے کہ سب ضائع گیا۔''

''فون کے بارے میں کچھ کہا تھا شاید آپ نے؟'' میں نے محتاط انداز میں سوال کیا۔

''ہاں وہ..... یہ رہا تمہارا فون.....'' وہ سرہانے کے نیچے ہاتھ مار رہے تھے۔'' تمہاری مما کی طرف سے افسوس ناک پیغام تھا.....'' فون میرے ہاتھ میں تھا۔ میں پہلے ہی سرہانے کے نیچے سے نکال چکی تھی، میں نے فون عمر کو دکھایا، آنسو میری آنکھوں سے بہہ نکلے.....'' میں نے جان بوجھ کر نہیں پڑھا تھا پیغام..... اسکرین پر نظر آ رہا تھا جان، خودکشی کا لفظ پڑھ کر فطری طور پر تجسس کے ہاتھوں پورا پیغام پڑھ لیا۔'' میں خاموش تھی۔'' جانا ہوگا ناں ہمیں؟'' عمر نے سوال کیا، میری خاموشی ہی میرا جواب تھی۔'' کیا بات ہے نیل، تم ٹھیک تو ہو؟''

''ہوں'' میں نے گہری سانس لی، خالہ کے بارے میں سوچا، بیچاری اکیلی رہ گئیں تو مستقبل کے اندیشوں کے باعث اپنی جان ہی لے لی، کاش ان کی کوئی اولاد ہوتی تو انہیں اپنے بڑھاپے کا سہارا نظر آتا، میں نے دل ہی دل میں سوچا۔'' جانا تو ہوگا

عمر......'' میں نے کہا۔ ''مگر کیا ممکن ہے کہ ہم اماں کو یہ نہ بتائیں کہ خالہ نے خودکشی کی ہے؟'' میں نے درخواست کی، مما کے پیغام کے بعد فاطش کا صبح سویرے آنے والا پیغام بھی تھا کہ کسی کو یہ نہ بتائیں کہ خالہ نے خودکشی کی ہے...... میں نے جواب میں اس سے وجہ پوچھی تو اس نے جواب نہیں دیا۔ غالباً وہ کہیں مصروف ہوگی۔

''کیوں نہیں...... جو تم چاہو وہ بتاؤ!'' عمر نے کہا۔ ''میں تیاری کرتا ہوں چلنے کی!''

''آپ نہ جائیں بے شک......''

''ارے نہیں......'' عمر نے فوراً کہا۔ ''پہلے بھی خالو کی وفات پر مجھے جانا تھا اور کسی مصروفیت کے باعث نہ جاسکا تھا۔ حالانکہ زندگی کی کوئی مصروفیت اس سے اہم نہیں ہوتی......'' ان کے لہجے میں تاسف تھا۔

''جس طرح آپ مناسب سمجھیں۔'' میں نے اٹھ کر تیاری شروع کی نہیں تو شاید ہم جنازے پر نہ پہنچ پاتے مگر جانا تو تھا کہ مما، پاپا، فاطش اور اسود وہیں تھے...... جانے کسی نے رانی کو بتایا ہے کہ نہیں...... سوچ کر میں نے اسے کال کی مگر اس کا فون بند آ رہا تھا۔ پیغام بھیجا مگر جواب نہ آیا، غالباً وہ سو چکی ہوگی، چلو جاگے گی تو پڑھ لے گی، میں غسل خانے کی طرف بڑھ گئی تاکہ تیار ہو جاؤں اور پھر اماں کو بھی بتانا تھا روانگی سے پہلے۔

☆☆☆

''آپا جی...... اندر آ کر بات سن سکتی ہیں میری؟'' نادیہ کے ابا تھے، مما غم سے نڈھال خالہ کی چارپائی کے پاس زمین پر ہی بیٹھی تھیں۔ اسود اندر سو رہا تھا اور کوئی کام والی اس کے پاس تھی، میں مسلسل مما کے ساتھ تھی۔ وہ میری طرف دیکھ کر اٹھنے لگیں تو میں نے جلدی سے اٹھ کر سہارا دے کر انہیں اٹھایا۔ ہم دونوں اندر پہنچیں تو پاپا پہلے سے وہاں موجود تھے۔ میرے ذہن میں تھا کہ شاید خالہ کے مرنے کے کھانے کا کوئی مسئلہ ہوگا۔

## ادبی لطائف

دہلی کے ایک مشاعرے میں جب بشیر بدر کا نام پکارا گیا تو راجندر سنگھ بیدی نے ساتھ بیٹھے مجتبیٰ حسین سے کہا۔ ''یار ہم نے دربدر ملک بدر شہر بدر تو سنا تھا، یہ بشیر بدر کیا ہوا؟''

☆☆☆

سعادت حسن منٹو نے راجندر سنگھ بیدی کو خط لکھا کہ......

''بیدی تمہاری مشکل یہ ہے کہ تم لکھنے سے پہلے سوچتے ہو، لکھتے وقت بھی سوچتے ہو اور لکھنے کے بعد بھی سوچتے ہو۔'' اس پر بیدی نے جواب میں منٹو کو لکھا۔

''منٹو تمہاری مشکل یہ ہے کہ تم نہ لکھنے سے پہلے سوچتے ہو، نہ لکھتے وقت سوچتے ہو اور نہ لکھنے کے بعد سوچتے ہو۔''

## داغ دہلوی

داغ نماز پڑھ رہے تھے کہ ایک صاحب ان سے ملنے آئے اور انہیں نماز میں مشغول دیکھ کر لوٹ گئے۔ اسی وقت داغ نے سلام پھیرا...... ملازم نے کہا۔ ''فلاں صاحب آئے تھے اور واپس چلے گئے۔'' فرمانے لگے۔ ''دوڑ کر جا، ابھی راستے میں ہوں گے۔'' وہ بھاگا بھاگا گیا اور ان صاحب کو بلا لایا۔ داغ نے ان سے پوچھا کہ ''آپ آ کر چلے کیوں گئے؟'' وہ کہنے لگے۔ ''آپ نماز پڑھ رہے تھے۔ اس لیے میں چلا گیا۔'' داغ نے فوراً کہا۔ ''حضرت! میں نماز پڑھ رہا تھا، لاحول تو نہیں پڑھ رہا تھا جو آپ بھاگے۔''

پسند: عرشیہ جنید، کراچی

''آپا جی، بھائی صاحب! آپ سے ایک درخواست کرنی ہے کہ کسی کے سامنے یہ ذکر نہ کریں کہ بھرجائی نے خودکشی کی ہے۔ ہم نے سب کو یہی بتایا ہے کہ کسی برتن میں کسی نے دوا ڈال کر رکھی تھی اور وہ بغیر دیکھے اس میں پانی ڈال کر پی گئیں......'' میں حیرت سے ان کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔

''کیوں انکل؟'' میرے منہ سے سوال نکل گیا، جاننا چاہتی تھی کہ خالہ کی خودکشی کے اسباب کو وہ کس حد تک جانتے تھے۔

''اصل میں پتر...... خودکشی کا سن کر لوگ سو طرح کی باتیں سوچتے ہیں، کوئی کچھ سوچے گا کوئی کچھ...... کوئی اگر یہ سوچے گا کہ جاوید کے جانے کا غم برداشت نہ کرسکی اور خودکشی کرلی تو دوسرا یہ بھی سوچ سکتا ہے کہ جانے اس کے ساتھ کیا غلط تھا جو اس نے اپنی جان لے لی...... زمانہ کسی کو کسی حال میں جینے نہیں دیتا، مرنے والی تو ہمیں دکھ دے کر چلی گئی اب اس کی میت پر لوگ انگلیاں اٹھائیں۔ یہ مجھ سے برداشت نہیں ہوگا......'' وہ اپنے آنسو پونچھنے لگے۔ ''میرے مرے ہوئے بھائی کی عزت پر بٹا لگے یہ میں نہیں دیکھ سکتا...... اور پھر اس کا تو کوئی جنازہ بھی نہیں پڑھائے گا، اسے کوئی گاؤں کے قبرستان میں دفن کرنے کی اجازت بھی نہیں دے گا...... یہی ہمارے ہاں کا دستور ہے......'' میرا جسم سن ہوگیا۔ میرے تو وہم وگمان میں بھی یہ باتیں نہ تھیں......

''ہوں......'' بہ مشکل مما کے منہ سے نکلا۔

''ایک بات نکالو منہ سے یہاں کسی کے سامنے بھرجائی کی خودکشی کی...... پھر دیکھنا تماشا کہ کس طرح یہاں کیمرے اور خبروں والے پہنچیں گے جو کتوں کی طرح چٹخارے دار خبریں سونگھتے پھرتے ہیں...... اس کی میت کی چیر پھاڑ کروا کر ہی دم لیں گے......'' وہ جاہل سا شخص جو باتیں کررہا تھا وہ ہمارے گمان میں بھی نہ آئی تھیں۔

''کس، کس کو معلوم ہے حقیقت کی بابت؟'' مما نے سوال کیا۔

''صرف مجھے اور نادیہ کو...... اس نے نادیہ کے نام خط لکھا تھا اس سے علم ہوا کہ اس نے خودکشی کی تھی۔'' میرے کان کھڑے ہوگئے۔

''کہاں ہے وہ خط اور اس میں کیا لکھا تھا؟'' مما نے فوراً پوچھا۔

''خط نادیہ کے پاس ہی ہوگا، مجھے اس نے زبانی ہی بتایا ہے کہ بھرجائی نے لکھا تھا کہ وہ اپنی زندگی سے تنگ آگئی ہے......'' وہ رکے۔ ''جانے کیوں تنگ آگئی وہ اپنی زندگی سے۔ چند دنوں میں ہی...... اچھی بھلی ہی تو تھی۔''

''ہوا کیا اسے اچانک......؟'' مما خود سے سوال کررہی تھیں، اس سوال کا جواب شاید کسی کے پاس بھی نہیں تھا...... یا شاید کسی کے پاس تھا۔

''میں نے تو نادیہ سے کہا ہے کہ اپنی اماں کو بھی نہ بتائے...... عورتوں کا پیٹ ہلکا ہوتا ہے، اتنی بھاری بات کا بوجھ نہیں اٹھاسکتی اور کسی نہ کسی سے کہہ ڈالتی۔'' انتہائی عقلمندی کی تھی انہوں نے۔

''ٹھیک ہے......'' کہہ کر مما دوبارہ باہر کو چل دیں، میں ان کے پیچھے چل دی۔ مما کی چال میں جو کمزوری تھی وہ صرف مجھے ہی نظر نہیں آرہی تھی بلکہ ہر کوئی دیکھ سکتا تھا کہ وہ جس طرح ٹوٹ گئی تھیں۔ بیٹیوں جیسی بہن کی موت نے ان کے جسم کا جیسے خون نچوڑ لیا تھا۔ ان کا پیلا زرد چہرہ اور بے رونق آنکھیں...... میرے دل میں کھد بدی مچ گئی تھی، میں اس ہجوم میں نادیہ کو ڈھونڈ رہی تھی اور پھر اس کے بعد مجھے وہ موقع تلاش کرنا تھا کہ میں اس کے پاس موجود خالہ کا خط دیکھ سکتی۔ یہ تو میں جانتی تھی کہ اسے خالہ اور پاپا کے بیچ تعلقات کی کچھ سن گن تھی اور یہ بات اس نے خالہ سے کہہ بھی دی تھی اور خالہ نے مجھے بلا کر اپنے ضمیر کا بوجھ بھی ہلکا کیا تھا۔

☆☆☆

چوبیس عذاب ناک گھنٹے گزر چکے تھے...... جہاز

کا پرزہ پہنچ گیا تھا اور ہمیں اس متروک قسم کے ائر پورٹ کی عمارت میں ایک گوشے میں محدود کر کے رکھا گیا تھا، اتنے مسافروں کی دیکھ بھال کی قابلیت سے محروم وہ ائر پورٹ اس دنیا سے باہر کی کوئی جگہ لگ رہا تھا۔ بچے بلبلا رہے تھے، بڑے بھی بھوک سے نڈھال تھے، اگرچہ انہیں اپنے احساسات کو قابو کرنے کا سلیقہ تھا مگر ان کی حالت سے اندازہ ہو رہا تھا۔ کئی طرح کے مریض تھے، عورتیں تھیں، ضعیف لوگ تھے اور ائر پورٹ کی عمارت، سیکیورٹی کے حصار میں بینچوں پر بیٹھے ہوئے بے بسی سے اس مژدے کا انتظار کر رہے تھے کہ جہاز پرواز کے قابل ہو گیا ہے۔

میرے نام کی کوئی اناؤنسمنٹ ہو رہی تھی، جانے کوئی اور زبان تھی یا پھر اسپیکر کا نظام اتنا برا تھا کہ مجھے سوائے رانیہ کے کچھ سمجھ میں نہ آیا، میں مصطفیٰ کو اٹھائے ہوئے سیکیورٹی کی ڈیوٹی پر مامور ایک باوردی شخص کے پاس گئی اور اس سے انگریزی میں پوچھا کہ کیا اناؤنسمنٹ ہو رہی تھی......

''ائر پورٹ کے کاؤنٹر نمبر نو پر آپ کو رپورٹ کرنے کو کہا جا رہا ہے۔'' اس نے شستہ انگریزی میں کہا۔

''کیا میں وہاں جا سکتی ہوں؟'' میں نے اس سے اجازت طلب کی۔

''میں چیک کر کے بتاتا ہوں......'' کہہ کر وہ چند قدم چل کر دوسرے باوردی آدمی کی طرف گیا، غالباً وہ اس کا انچارج تھا۔ تھوڑی دیر رک کر اس سے بات کی، واپس آ کر مجھ سے پوچھا کہ میرے پاس کس ملک کی شہریت تھی، میرے بتانے پر اس نے حفاظتی حصار میں سے راستہ بنایا اور مجھے جانے کو کہا، ساتھ ہی بتایا کہ مجھے کس طرف جانا تھا، میرے ساتھ ایک اور نوجوان لڑکا چلنے لگا جسے اسی آدمی نے میرے ساتھ جانے کو کہا تھا۔ کاؤنٹر پر جا کر میں نے اپنا تعارف کروایا۔ فون کا چونگا مجھے پکڑا دیا گیا، حسب توقع عابد ہی تھے......

''کیسی ہو رانی؟ مصطفیٰ کیسا ہے؟'' چھوٹتے ہی عابد نے پوچھا۔

''السلام علیکم......'' میں نے تحمل سے کہا۔

''آپ کیسے ہیں؟''

''وعلیکم...... میں ٹھیک ہوں رانی، تم بتاؤ...... جانے کہاں، کہاں سے کوشش کر کے تم سے بات کرنے کا وسیلہ بنا ہے۔'' بے تابی عیاں تھی۔

''اللہ کا بڑا کرم ہے عابد جو ہم کسی حادثے سے بچ گئے...... ذرا سی آزمائش ہے، اس کا کوئی مسئلہ نہیں، مشکل تو ہے لیکن اللہ بہتر کرے گا، یہ وقت بھی گزر ہی جائے گا، آپ بس دعا کریں...... اور ہاں اپنے امی ابو کو نہ بتایئے گا......'' میں نے اپنے لہجے کو حتی الامکان نارمل رکھنے کی کوشش کی ورنہ میں ایسی بہادر نہیں...... موت کو جتنا قریب سے سوچا اور محسوس کیا تھا اس کے بعد میرے اندر یہ معمولی سی تبدیلی آئی تھی ورنہ عام حالات میں تو میں عابد کی آواز سنتے ہی دہاڑیں مار مار کر رو دینے لگتی۔

''اچھا تم پریشان نہ ہونا......'' عابد نے کہا۔ ''ابو کو معلوم ہے، انہوں نے ہی مجھے بتایا تھا اور میں نے ٹی وی آن کر کے سنا بھی اور میرا تو دماغ بھک سے اڑ گیا یہ سوچ کر کہ تم کس قدر پریشان ہو گی۔''

''اللہ کا لاکھ، لاکھ شکر ہے عابد...... اس نے ہمیں محفوظ رکھا، اس آزمائش میں، میں اور مصطفیٰ تنہا نہیں...... بہت سے لوگ ہیں، ہم سب اکٹھے ہیں اور سب کے لیے ایک جیسی آزمائش ہے......'' میں نے رسان سے کہا۔

''واؤ...... رانی!'' عابد نے یقیناً سیٹی کے انداز میں ہونٹ سکوڑے ہوں گے۔ ''میں تو تم سے بہت متاثر ہو گیا ہوں۔''

''میں سمجھی کہ آپ بہت سال پہلے مجھ سے متاثر ہو گئے تھے۔'' میں نے ہنس کر کہا تھا اور فون بند کر کے لوٹی تو وہ محافظ میرے ساتھ، ساتھ چل رہا تھا، مصطفیٰ جیسے نیند میں چل رہا تھا، میں نے ایک بینچ پر بیٹھ کر اسے اپنی گود میں لٹا لیا اور اس کے بالوں میں ہولے، ہولے

انگلیاں پھیرنے لگی۔
اچھا ہی ہوا کہ میں نے مما کو سرپرائز دینے کا سوچا تھا ورنہ اس وقت وہ جس کیفیت اور پریشانی میں ہوتیں وہ ان کی فکروں میں اضافہ ہی کرتا۔ مصطفیٰ کے ننھے، ننھے خراٹے...... میں نے اسے اپنے سینے سے لگا لیا۔ اس کے تھکے، تھکے وجود سے ہلکی، ہلکی بو آرہی تھی، اسے ہر روز نہانے کی عادت تھی اور اس وقت دوسرا دن چل رہا تھا کہ اسے نہلا نہ سکی تھی، میں نے اپنے پرس میں سے چھوٹی سی پرفیوم کی بوتل نکالی، اپنی ہتھیلی پر اس میں سے تھوڑا سا پرفیوم نکال کر ملا اور اسے مصطفیٰ کے جسم کے مختلف حصوں پر ملنے لگی، ہلکی سی خوشبو پھیل گئی مما جیسی، یہ پرفیوم مجھے مما نے پرس میں رکھنے کے لیے دیا تھا، یہ اسی پرفیوم کا miniature تھا جو وہ استعمال کرتی تھیں۔ ''مما!'' میں نے جیسے بے خیالی میں ان کو پکارا۔ گھڑی دیکھی۔ پاکستان میں کیا وقت ہوگا۔ صبح سویرے کا وقت ہوگا۔ میرا فون بند تھا اور اس وقت اس پر کوئی سروس نہ تھی، سوچا کہ آن کروں اور مما سے بات کروں، انہیں تشویش تو ہوگی کہ مجھ سے بات نہ ہوئی تھی، کال کی ہوگی تو عابد نے کیا بہانہ گھڑا ہوگا۔ پوچھ ہی لیتی عابد سے...... میں بھی کچھ اور بھی کچھ سوچ رہی تھی۔

☆☆☆

''میں دن بھر موقع ڈھونڈتی رہی تم سے بات کرنے کا نادیہ......'' رات کھلی چھت پر چارپائیوں کی قطار میں، میں نے کوشش کر کے نادیہ کے ساتھ والی چارپائی لی تھی، میرے ساتھ مما کی چارپائی تھی اور وہ چھت کی آخری چارپائی تھی...... پاپا کہیں مردانے میں تھے۔
''میں جانتی تھی کہ ایسا ہی ہوگا۔'' کیسی تیز تھی وہ جسے میں سادہ سا سمجھ رہی تھی۔
''تم کیسے جانتی تھیں؟'' میں نے پوچھا۔
''یہ بھی جانتی ہوں کہ آپ کو اس خط کے پڑھنے کی بے تابی بھی ہوگی۔'' اس نے کہا تو میں خاموش ہو گئی، یہ بھی نہیں کہہ سکتی تھی کہ کون سا خط؟
''جب تمہیں سب علم ہی ہے تو مجھے کچھ پوچھنے کی ضرورت ہی نہیں...... تم خود ہی بتا دو مجھے۔''
''چاچی نے جو خط لکھا ہے وہ ایسا نہیں کہ میں کسی کو بھی اس کے مندرجات بتاؤں......'' اس نے ہولے سے کہا، ہم کوشش کر رہے تھے کہ ہماری آواز مما تک بھی نہ پہنچے مگر......
''کیا لکھا ہے اس خط میں جو بتانے کے قابل نہیں...... میں جاننا چاہوں گی۔'' مما نے اچانک کہا تھا گویا وہ ہماری گفتگو سن رہی تھیں۔
''آپ تو نہ ہی پوچھیں آنٹی......'' نادیہ نے کہا۔
''کیوں نہ پوچھوں......؟'' مما ذرا غصے میں آ گئیں۔ ''کیونکہ کوئی خط اس نے لکھا ہی نہیں ہوگا۔ یا یہ بھی تو ممکن ہے کہ اس نے سرے سے خودکشی کی ہی نہ ہو۔ اسے کسی نے زہر دے کر مار دیا ہو اور سارا ڈراما خودکشی کا ترتیب دے دیا ہو......'' مما غصے میں بول رہی تھیں۔ ''دیکھنا تو یہ ہے کہ اس کی خودکشی سے کس، کس کو فائدہ پہنچ سکتا ہے...... اس کے تو بال نہ بچہ۔ اس کے بعد کون والی وارث ہے......''
''آنٹی......'' نادیہ کچھ بولنے ہی لگی تھی کہ میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ اسے ہولے سے دبایا کہ وہ خاموش رہے۔ میں اس سے جو بات تنہائی میں کرنا چاہ رہی تھی اس میں مما کی مداخلت سے بھی بات بگڑ سکتی تھی۔
''اچھا چھوڑیں اس بات کو سو جائیں مما...... نادیہ سو جاؤ تم بھی۔'' میں نے اس کا ہاتھ تھامے، تھامے کہا۔ مما نے کروٹ بدل لی مگر تھوڑی دیر کے بعد انہیں گھبراہٹ ہونے لگی۔ ان سے باہر سویا نہیں جا رہا تھا۔
''میں نیچے جا رہی ہوں سونے کے لیے...... تانیہ کے کمرے میں۔'' مما نے اٹھ کر اپنی چپل پہنی۔ ''کھلے آسمان تلے سونے کی عادت نہیں

مجھے...... تم بھی آجاؤ!''

''میں ٹھیک ہوں یہاں مما...... اور اسود بھی اب سو رہا ہے!''

''اسے کوئی مچھر وچھر کاٹ گیا تو!'' مما نے سمجھانے کی کوشش کی۔

''میں نے اس پر اپنا دوپٹا لپیٹ رکھا ہے مما، آپ پریشان نہ ہوں اس کے لیے!'' میں نے کہا تو وہ چل دیں، مجھے نادیہ سے بات کرنے کا اس سے بہترین موقع اور کون سا مل سکتا تھا۔

''انہوں نے خط میں خودکشی کرنے کی وجہ کیا لکھی ہے......'' وہ رکی۔

''دانیال انکل ہیں!'' میرا دماغ بھک سے اڑ گیا، میں اندھیرے میں اس کے چہرے کو گھور رہی تھی۔

''اور......'' کافی دیر کے بعد بہ مشکل میرے منہ سے الفاظ ادا ہوئے۔'' اور کیا لکھا ہے انہوں نے؟''

''چاچی نے اپنے بعد اپنے حصے کی ساری جائداد...... رفاہی اداروں کو دینے کا کہا ہے...... یہ گھر انہوں نے مجھے دینے کو کہا ہے اور لاہور میں... چاچا نے ان کے لیے دو کنال کا پلاٹ لیا تھا...... اور ان کا زیور......'' وہ رکی، میں سن رہی تھی...... ''یہ سب کچھ آپ کے لیے ہے!'' میں بے یقینی سے سب سن رہی تھی۔

''مم...... میرے لیے کیوں؟'' میں ہکلائی۔

''چاچی نے لکھا ہے کہ انہوں نے ہمیشہ آپ کو بیٹی کی طرح چاہا ہے......'' وہ پھر گویا ہوئی۔'' کچھ چیزیں تو انہوں نے چاچا کی زندگی میں قانونی طور پر ہی ان لوگوں کے نام لگا دی تھیں جنہیں دینا تھیں...... باقی زمینیں وغیرہ ہیں، ان کا فیصلہ شرعی طریقے سے ہو گا، زمین تو یوں بھی ساری چاچا کی تھی سو اس کے بارے میں مجھے علم نہیں......''

گویا خالہ کے پاس اپنا جو کچھ تھا، اس میں سے حق مہر میں ان کے نام لکھا گیا گھر انہوں نے خالو کی بھتیجی کو دیا تھا...... اس کا جانے کیا سبب تھا۔ شہر کی جائداد جو کہ مہنگی ترین ہو گی۔ اس کی وارث میں، تنہا میں...... مگر کیوں؟

''نادیہ......'' میں گہری سوچ میں تھی کہ اس سے یہ بات کہوں یا نہ کہوں۔'' تم سے ایک درخواست کرنا تھی۔''

''کہیں آپی!'' اس نے اندھیرے میں ہی میری طرف دیکھا۔

''میں تمہیں بہت زیادہ نہیں جانتی...... مگر جتنا جان پائی ہوں۔ اس سے مجھے لگتا ہے کہ تم بہت سمجھدار ہو۔''

''مکھن لگا رہی ہیں آپی؟'' وہ ہولے سے ہنسی۔

''نہیں، سچ کہہ رہی ہوں......'' میں نے کہا۔

''جس طرح تم نے خالہ کے بارے میں چیزوں کو صیغۂ راز میں رکھا...... جس طرح انہیں سمجھایا اور جس طریقے سے تم نے ان کے خط کے مندرجات اپنے ابا تک کو بھی نہیں بتائے۔''

''اس میں ایسا ہے کیا آپی جو میں ڈھول پیٹتی پھروں...... چاچی مجھے بہت چاہتی تھیں، اسی طرح جس طرح وہ آپ کو بیٹی سمجھتی تھیں اور میرے اوپر ان کا ایک ایسا احسان ہے کہ اس کے بدلے مجھے ان کے راز کو راز رکھنا ہے...... اور اب تو وہ خود نہیں رہیں تو ان کے راز کو افشا کر کے مجھے کئی زندگیوں میں زہر کیا گھولنا۔''

''تم اس سے کہیں زیادہ عقلمند ہو پیاری...... جتنا میں تمہیں سمجھ رہی تھی۔'' میں نے دل سے اعتراف کیا۔

''اب تم سے ایک اور درخواست بھی کرنی ہے۔''

''حکم فرمائیں آپی...... مجھے آپ بہت پیاری ہیں۔ میں تب سے آپ سے متاثر ہوں جب آپ چھوٹی سی تھیں اور چاچا کے ہاں رہنے آتی تھیں، میں آپ کو اپنے گھر کی چھت سے چھپ چھپ کر تا کا

(دیکھا) کرتی تھی۔‘‘
’’چھپ، چھپ کر کیوں بھئی؟‘‘ میں ہنسی۔
’’کیونکہ مجھے لگتا تھا کہ پھولے، پھولے گالوں والی اور پیارے، پیارے فراک پہننے والی یہ لڑکی بہت مغرور ہوگی......‘‘ میرا اس بات پر قہقہہ نکل جاتا جو عام حالات ہوتے، میں نے اپنی مسکراہٹ کو دبایا۔
’’بہت افسوس ہے بھئی...... تم نے مجھے بچپن سے ہی ایک اچھی دوست سے محروم کردیا!‘‘ میں نے اس کے گال کو پیار سے چھوا۔
’’آپ کچھ کہنے والی تھیں؟‘‘ اس نے بات بدلی، جو روشنی ہوتی تو میں دیکھتی کہ اس کے گال کیسے لال ہوگئے ہوں گے۔
’’مما...... اصل میں اپنی بہن کی اس طرح وفات پر بہت جذباتی ہو رہی ہیں...... تم ان کی کسی بات کا برا نہ ماننا، وہ کچھ کہیں تو میں ان کی طرف سے معافی مانگ لوں گی، ویسے بھی وہ کچھ جانتی بھی تو نہیں...... جو تم اور میں جانتے ہیں......‘‘
’’یہ بھی کوئی کہنے کی بات ہے آپی، وہ میری بھی ماں جیسی ہیں۔‘‘ اس نے کہا تو اطمینان میرے دل تک اتر گیا۔
سوچتے، سوچتے جانے کس وقت میں نیند کی وادی میں چلی گئی تھی...... صبح کاذب کے وقت آنکھ کھلی تو اسود کو لے کر نیچے چلی گئی، خالہ کے کمرے میں مما تنہا سو رہی تھیں، میرے جانے سے جاگ اٹھیں۔

☆☆☆

ماموں کا لیپ ٹاپ خراب تھا...... انہوں نے پیغام بھیج کر مجھے بلوایا، میں نے آکر دیکھا تو اس کی ہارڈ ڈسک میں کوئی مسئلہ تھا، ماموں کو بتایا تو انہوں نے کہہ دیا کہ اسے پھینک کر میں انہیں کوئی اور بہتر لیپ ٹاپ لے دوں...... میں نے انہیں بتایا کہ اچھا خاصا لیپ ٹاپ تھا، تھوڑی سی مرمت کے بعد جیسی تیسی قیمت پر ہی سہی مگر اسے بیچا جا سکتا تھا۔ انہیں بہر صورت نیا لیپ ٹاپ ہی چاہیے تھا۔

’’تم اسے مرمت کروا کر رکھ لو اگر تم برا محسوس نہ کرو تو مجھے نیا لیپ ٹاپ لینے میں مدد کردو۔‘‘ ماموں نے سخاوت کا مظاہرہ کیا، وہ میرے فقط ماموں ہی نہیں، سسر بھی ہونے والے تھے، یوں بھی ان کی طرف سے مجھے گاہے بگاہے تحائف ملتے رہتے تھے کہ ان کے پاس پیسے کی کوئی کمی نہ تھی۔
میں ان کے دفتر گیا اور انہیں اپنے لیپ ٹاپ پر نئے لیپ ٹاپ کے ماڈل دکھائے...... انہیں ان کے فیچر سمجھائے مگر مجھے اندازہ ہو گیا کہ ماموں کو لیپ ٹاپ کے استعمال... کا کچھ خاص اندازہ نہیں تھا۔ انہوں نے بتایا کہ وہ لیپ ٹاپ صرف اپنی ای میل اور فیس بک کو چیک کرنے کے لیے لینا چاہتے تھے۔ اگرچہ انہیں اس مقصد کے لیے اتنی رقم استعمال کرنے کی ضرورت نہ تھی تاہم مجھے ان کے انتخاب پر کوئی اعتراض تھا نہ اعتراض کا حق۔ انہوں نے نیا لیپ ٹاپ لے لیا اور پرانے والا میرا ہوا۔
ماموں والا لیپ ٹاپ ملا تو وہ میرے پہلے لیپ ٹاپ سے بہت بہتر تھا، میں نے اپنے لیپ ٹاپ کو بیچنے کا سوچا، اس کے لیے مجھے اپنی ساری معلومات ماموں والے لیپ ٹاپ میں منتقل کرنا تھیں، ان کے لیپ ٹاپ کو خالی کر کے ہی میں اپنے لیپ ٹاپ کی معلومات اور ڈیٹا اس میں منتقل کر سکتا تھا۔ پاس ورڈ ماموں نے مجھے بتا دیا تھا، میں نے اسے کھولا، تھوڑی دیر اپنی ماہرانہ تکنیک سے میں نے اس کی فائلیں کھولیں کہ اگر ان میں کچھ اہم ہو تو وہ یو ایس بی پر منتقل کر کے ماموں کو دے دوں۔ اور میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں...... میں دیکھتا جا رہا تھا، پڑھتا جا رہا تھا اور حیرت کی وادیوں میں کھوتا جا رہا تھا۔ ’’تو یہ سب ہو رہا تھا!‘‘ ماموں کو تو میں بہت شریف سمجھتا تھا، آئیڈیل تھے وہ میرے اور میرے آئیڈیل کی تصویر کا دوسرا رخ کتنا مکروہ تھا۔

☆☆☆

''اپنے پاپا کو بلواؤ فاطمہ باہر سے...... مجھے ان سے کوئی بات کرنی ہے۔'' مما نے کہا تو میں نے کسی سے کہہ کر پاپا کو پیغام بھجوایا۔ تھوڑی دیر میں پاپا آ گئے۔

''آپ سے ایک بات کرنا تھی دانیال!''

''ہوں؟'' پاپا نے سوالیہ انداز میں مما کو دیکھا۔

''میں تانیہ کے قتل کی رپورٹ لکھوانا چاہتی ہوں...... مجھے شک ہے کہ اسے جاوید کے بھائیوں نے مار دیا ہے، زمین کے لالچ میں، ان سب جائدادوں کے لالچ میں جو یہاں ملتان اور لاہور میں تانیہ کے نام تھیں۔''

''ٹھیک ہے...... میں دیکھتا ہوں۔'' پاپا کے انداز میں ایسی بے پروائی تھی جو مما کو کھٹک گئی۔

''آپ کو نہیں لگتا کہ جائداد کے لالچ میں تانیہ کو قتل کروا دیا گیا ہے...... آپ کیس کروائیں، دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے گا۔ جن لوگوں کو اس کی جائداد ملنے والی ہے ان کے نام مشکوک لوگوں میں نامزد کروا دیں۔'' مما نے سوال بھی کیا اور وضاحت بھی کر دی۔

''ممکن ہے کہ ایسا ہی ہو......'' پاپا نے کہا۔ ''میں کچھ کرتا ہوں۔''

''جب آپ خالہ کی وفات سے مستفید ہونے والوں کے نام لکھوائیں پاپا تو ان میں میرا نام بھی لکھوائیں کہ انہوں نے اپنی جائداد کا ایک حصہ میرے نام بھی لگایا ہے، جس کی مالیت کروڑوں تک ہے!'' مما مجھے گھور رہی تھیں۔ میں نے اپنے فون میں سے اس خط کے اس حصے کی کھینچی گئی تصویر مما کو دکھائی جہاں پر انہوں نے اپنے لاہور والے پلاٹ کو میرے نام لکھا تھا۔

''خط کہاں ہے...... میں پورا خط دیکھوں گی!'' مما کا اصرار تھا۔ ''اور ان پر اپنی بہن کے قتل کا مقدمہ بھی ضرور کروں گی......''

''ہاں، ہاں...... کیوں نہیں!'' پاپا نے شاید اوپری دل سے مما کی تائید کی تھی مگر مما کا غم ناک چہرہ بھی اس بات پر کھل اٹھا تھا، ان کے اور پاپا کے بیچ تناؤ کو عام لوگ محسوس نہیں کر سکتے تھے مگر چونکہ ہم جانتے تھے سو میرے لیے اندازہ کرنا مشکل نہ تھا کہ مما کے دل میں پاپا کے لیے تمام نفرت یا ناپسندیدگی کے باوجود بھی احساس تشکر جاگا ہوگا۔

''خط خالہ نے نادیہ کے نام لکھا ہے مما...... اسے وہ صرف اس وقت عدالت میں پیش کرے گی جب اس پر اس خط کو دکھانے کے لیے مقدمہ کیا جائے گا...... خط اس نے اپنے باپ کو بھی نہیں دکھایا، آپ دیکھیں خط پاپا!'' میں نے خط کی ایک اور تصویر پاپا کو دکھائی۔

''میں دانیال کے اور اپنے مابین تعلقات کی وجہ سے ہونے والی شرمندگی کے باعث خودکشی کر رہی ہوں۔'' اسکرین پر خالہ کی لکھائی میں خط کا پہلا فقرہ...... صرف پاپا کو نظر آیا تھا اور ان کے چہرے کا رنگ زرد پڑ گیا تھا۔

''خالہ ہی کی لکھائی ہے ناں پاپا؟'' میں نے سوال کیا۔

''ہاں!'' پاپا جیسے کسی کنوئیں سے بولے تھے۔

''کیا آپ سمجھتے ہیں پاپا کہ ہمیں ابھی نادیہ سے پورا خط دیکھنے کے لیے اصرار کرنا چاہیے؟'' میں نے پاپا سے سوال کیا۔

''نہیں!'' پاپا کے لہجے میں ایسی لرزش تھی جو ان لوگوں کے لہجے میں ہوتی ہے جنہیں شاید سزائے موت دی جاتی ہوگی۔

''جب عدالت میں ضرورت ہوگی تو......'' پاپا کے لہجے میں جان کہاں تھی، میرے دل میں ہوک اٹھی مگر فقط ایک لمحے کے لیے ساتھ ہی مجھے خالہ سے وابستہ تکلیف یاد آئی۔

''آپ ٹھیک ہیں ناں پاپا؟'' میں نے ان کے چہرے پر نظر جما کر سوال کیا۔

''ہوں......'' انہوں نے مسکرانے کی ناکام کوشش کی۔

''کسی سے کہہ کر ناشتے کا کوئی بندوبست کروا پایا کے لیے...فاطش بیٹا، انہوں نے دوا کھانا ہوتی ہے!'' مما نے فکرمندی سے کہا، میں ان کا سادہ چہرہ دیکھ رہی تھی۔ کیا نہیں مما...... کیا پاپا ایسی عورت کی محبت اور توجہ کے لائق تھے؟ کیا میرا دل اتنا بڑا نہیں ہو سکتا تھا کہ میں ہر شے کو اسی طرح برداشت کر پاتی، کیا میں اپنی ماں جتنا حوصلہ کر کے...... اشعر کی بے وفائیوں کے ساتھ گزارہ کر سکتی تھی؟ کہاں سے ایک بھولی ہوئی یاد آ گئی تھی...... کیا میں اسود کی خاطر قربانی دے کر زندگی نہیں گزار سکتی تھی؟ مما نے ایک بار کہا تھا۔ ''اولاد بہت بڑی مجبوری ہوتی ہے، عورت کے پیروں میں بندھی زنجیر...... جس کی لمبائی گھر کی چار دیواری تک ہوتی ہے، اس زنجیر میں بندھی عورت اپنے جوگی نہیں رہتی......'' کتنا بڑا سچ تھا اور کیسی تلخ حقیقت مگر میں اسے سمجھ نہ پائی تھی، مما نے بھی تو آبلہ پائی کا اتنا طویل سفر کیا تھا، ہماری خاطر ہی ناں اور اب اگر انہوں نے پاپا سے خلع لینے کا سوچا تھا تو اس کا مطلب تھا کہ وہ برداشت کے آخری درجے تک پہنچ گئی تھیں۔ اس درجے تک جس پر میں چند ماہ میں ہی پہنچ گئی تھی۔

☆☆☆

میں اپنے دوستوں کے گروپ کے ساتھ بھوربن گیا تھا، گھر میں کسی کو میرے پروگرام کا علم نہ تھا، وہاں میں نے رات کے کھانے کے وقت ہوٹل میں ماموں کو دیکھا...... مگر اکیلے نہیں بلکہ کسی اور عورت کے ساتھ، میں سمجھا کہ وہ کسی کاروباری سلسلے میں اس عورت سے مل رہے ہوں گے انہوں نے مجھے نہیں دیکھا اس لیے میں بہانہ کر کے وہاں سے اٹھا اور اپنا کھانا کمرے میں منگوا لیا، ریسپشن پر کال کر کے ماموں کا نام بتایا اور پوچھا کہ وہ کس کمرے میں ٹھہرے ہوئے تھے۔

''سوری سر...... ہم اپنے مہمانوں کے بارے میں تفصیلات دوسروں سے شیئر نہیں کرتے!'' جواب آیا۔

''دیکھیے وہ میرے سگے ماموں ہیں یار، ہم اکٹھے ہی آ رہے تھے، گاڑی خراب ہونے کی وجہ سے راستے میں رک گیا تھا، اب مجھے ان سے ملنا ہے...... آپ بے شک انہیں کال کر کے چیک کر لیں۔'' میں نے چال چلی۔

''وہ تو تین دن سے یہاں ہیں اور آپ آج پہنچے ہیں؟'' اس نے میرا کمرا نمبر پوچھا اور چیک کر کے کہا۔

''بتایا ہے ناں کہ گاڑی خراب ہو گئی تھی اس لیے۔ میں رک گیا تھا اور ماموں کرائے کی گاڑی لے کر آ گئے تھے......'' میں نے ہوا میں تیر چھوڑا جو کہ نشانے پر لگ گیا تھا۔

''میں نے کال کیا ہے ان کے کمرے میں سر...... وہ فون نہیں اٹھا رہے، غالباً ابھی تک وہ کھانا کھا رہے ہیں یا ممکن ہے کہ باہر سیر کے لیے نکل گئے ہوں......''

''اچھا، چلیں میں خود ہی فون کر کے ان سے رابطہ کر لیتا ہوں۔''

''ان کا کمرا نمبر 214 ہے سر...... وہ جب بھی آتے ہیں وہیں ٹھہرتے ہیں، اصل میں ان کی بیگم کو اس کمرے سے پہاڑوں کا نظارہ بہت پسند ہے، اس لیے۔ وہ جب بھی آنے والے ہوں، پہلے سے اطلاع کر دیتے ہیں تو ان کا کمرا بک ہو جاتا ہے......'' میں فون بند کرنے ہی لگا تھا کہ اس نے مجھے ضرورت سے زیادہ ہی معلومات دے دیں...... میرے اردگرد دھماکے سے ہونے لگے۔

''نام کیا ہے تمہارا یار، بھول گیا میں؟'' میں نے پوچھا۔

''نام تو میں نے بتایا ہی نہیں سر...... کلیم نام ہے میرا ویسے!''

''بہت شکریہ کلیم...... میں نے آج تک اتنا مہذب فون آپریٹر نہیں دیکھا......''

''بہت شکریہ سر۔'' وہ یقیناً باچھیں کھول کر مسکرایا ہوگا۔ ''میں ریسیپشن ڈیسک پر ہوتا ہوں، دن کی ڈیوٹی میرے بھائی سلیم کی ہوتی ہے اور رات کی میری......''

''اچھا...... ماشاء اللہ...... کہاں کے رہنے والے ہو؟'' میں نے اس سے فری ہونے کی کوشش کی، شاید اس سے مجھے کچھ اور معلومات مل سکیں، وہ بھی غالباً اس وقت فارغ تھا۔

''جی میں ہوں تو دیول شریف کا مگر اب ہم دونوں بھائی یہیں قریب ہی رہتے ہیں، کرائے کا کمرا ہے، زیادہ وقت تو ہمارا یہیں گزرتا ہے۔''

''اچھا...... بہت شکریہ!''

''کوئی کام ہو جناب...... تو ہمیں خدمت کا موقع دیں۔'' اس نے رازدارانہ لہجے میں کہا۔

''کیا کام کر سکتے ہو تم میرا؟'' میں اس کے لہجے سے چونک گیا تھا۔

''سر آپ کے ماموں تو...... وہ تو بہت مالدار آدمی ہیں، بڑی بڑی آسامیاں لے کر آتے ہیں...... میرا مطلب ہے کہ آپ کو بھی کوئی...... میں بہت کم نرخوں میں بندوبست کر سکتا ہوں۔'' اس کی بات کا متن سمجھ کر میرے کان گرم ہوگئے۔

''اچھا میں بتاؤں گا......'' مجھے علم ہوگیا کہ وہ مجھے بہت سی معلومات دے سکتا تھا۔

''ویسے سر...... وہ آپ کے ماموں ہی ہیں یا آپ میڈیا کے کوئی آدمی ہو؟'' اس نے سوال کیا، پس منظر میں کسی کی آواز آئی، وہ کمرے کا چیک کر رہے تھے...... ''بہت شکریہ سر!'' کہہ کر اس نے فون بند کر دیا، گاہک کو اٹینڈ کرنا اس کا پہلا فرض تھا، میرے دل میں کھد بد مچا کر وہ فون بند کر گیا تھا۔

''ماموں کہاں ہیں؟'' میں نے صدف کو پیغام بھیجا......

## بچپن

کیوں نہ اس گزرے ہوئے پل کو دیکھ لیں۔ جس میں زندگی چمکتے جھلملاتے ستارے کے مانند مگر پُرفریب سی تھی، خواہشات اور آرزوئیں تو اس وقت بھی بہت تھیں مگر ان کے پورا ہونے اور نہ ہونے کا احساس اتنا زیادہ شدت آمیز نہ تھا۔ دیرپا مسکراہٹیں تو آج بھی مل ہی جاتی ہیں۔ مگر وہ لمحات تو تھے ہی مسکراہٹوں کے جو مسکراہٹ ملتی دل تک اثر کرتی۔ اس وقت دوریوں کا احساس فاصلوں کی بنیاد پر کیا جاتا تھا اور جب نزدیکیاں ملتیں تو بھی دوریاں برقرار رہتیں۔ حرارت اس قدر نہ تھی کہ حالات کی برف سے پگھل کر ڈھکے ہوئے احساسات نمودار ہو کر دل کی آنکھ کے سامنے آسکتے۔

اچھا تھا کہ اس وقت تنہائیوں سے آگاہی نہ تھی کہ تنہا ہو کر خود کو تنہا نہ سمجھتے تھے سوچیں صرف محدود تھیں مگر ان کا انجام غیر محدود کسی سے جدا ہو کر ملن کی خواہش کم کم ہی تھی، آنسو آنکھوں ہی سے ٹپکتے تھے مگر دل تک رسائی کچھ بھی نہیں تھی اور اگر تھی بھی تو دماغ سے بالاتر ہو کر...... چاہتیں عارضی تھیں اور دکھ پل بھر کے لیے ہی ہوتے، اب کے برعکس روشنیاں زیادہ مسرت آمیز تھیں اور اندھیروں سے خوف محسوس ہوتا۔ زندگی کا ایک ہی روپ تھا جس میں زمانے نے رنگ بھر لیے اور وقت کے ساتھ، ساتھ مختلف رنگوں میں ڈھلتا گیا۔ غرض کے وہ پل بھی گزر گئے اور جو کچھ اب ہے یا آنے والے پل میں وہ بھی نہیں رہے گا کیونکہ یہی زندگی کے ارتقائی مراحل ہیں شاید۔

از: صائمہ جواد، کراچی

''پاپا کراچی گئے ہیں کسی کام کے سلسلے میں.....''
''کب گئے ہیں اور کب لوٹیں گے؟'' میں نے پوچھا۔
''تین دن ہو گئے ہیں احمد...... خیریت تو ہے؟'' اس کے لہجے میں تشویش در کر آئی تھی۔
''ہاں ہاں...... سب ٹھیک ہے، بس پوچھنا تھا کہ ان کا نیا لیپ ٹاپ ٹھیک ہے، کوئی مسئلہ تو نہیں کر رہا؟'' مجھے فوراً بہانہ سوجھا۔

''تم کہو تو میں چیک کرلوں ان کی اسٹڈی میں جا کر......'' اس نے پوچھا۔
''نہیں نہیں...... وہ تو ساتھ لے کر گئے ہوں گے۔ٹھیک ہے...... میں انہی کو کال کر کے پوچھ لوں گا۔'' میں نے گھبرا کر فون بند کیا۔

تو گویا ماموں دوہری زندگی گزار رہے تھے...... ممانی کے ساتھ دھوکا کر رہے تھے۔ مجھے یہ سب سوچ کر دکھ ہوا اور میرا سر واقعی درد سے پھٹنے لگا۔ کیا میں ماموں کا سامنا کروں یا......' میں نہیں چاہتا تھا کہ ماموں نہ صرف ممانی کو دھوکا دیں بلکہ گناہ بھری زندگی گزاریں۔ ممانی ان کے ساتھ مخلص تھیں، ان کے پورے خاندان کے ہر فرد کی من پسند تھیں کیونکہ انہوں نے باہر سے آ کر بھی ہم سب لوگوں کو اس طرح اپنا لیا تھا کہ وہ ہمیں اپنوں سے بڑھ کر اپنی لگتی تھیں اور میں تو ان کا خاص الخاص منظورِ نظر تھا کہ میں ان کی سب سے لاڈلی بیٹی کا منگیتر تھا۔

یا میں ماموں کے اس گناہ یا جرم سے چشم پوشی کروں...... اگر اللہ نے ان کا راز کسی پر آشکار نہیں کیا تھا تو میں بھی خاموش رہوں؟ میرے دل و دماغ میں جنگ جاری تھی، کیا پیسے والوں کو حق حاصل ہوتا ہے کہ وہ اپنے پیسے کو منفی کاموں کے لیے استعمال کریں؟ ممانی کو کال کر کے بتاؤں کہ کال کر کے ماموں سے پوچھیں کہ وہ کراچی میں کہاں ٹھہرے ہوئے تھے؟ ممانی کے اندھے اعتماد کو وہ ٹھیس پہنچا

رہے تھے۔

☆☆☆

میں سیٹ کی پشت سے سر ٹکائے، آنکھیں موندے بیٹھی تھی، مصطفیٰ میری گود میں سو رہا تھا، میں نے آہستہ، آہستہ اس کی پشت پر اپنے ہاتھ پھیرتے ہوئے گزرے ہوئے چوبیس گھنٹوں کی بابت سوچا، جہاز کو اس قابل بنا دیا گیا تھا کہ وہ کسی قریبی ائر پورٹ تک پہنچ سکے...... وہاں سے ہمیں کوئی اور جہاز اپنی منزلِ مقصود...یعنی پاکستان تک پہنچاتا۔ جہاز کی لینڈنگ کے لیے ہدایات دی جا رہی تھیں اور بتایا گیا کہ اگلے چند منٹوں میں ہم لینڈ کرنے والے تھے، دل ہی دل میں اللہ کا شکر ادا کیا۔

دبئی ہماری عارضی منزل ٹھہرا، یہاں سے تین گھنٹے میں ہمیں اگلی پرواز سے پاکستان بھیجا جانا تھا، مزید ساڑھے تین گھنٹے کی پرواز اور میں پاکستان میں ہوتی، اپنے پیاروں کے پاس!

تمام مسافروں کی تقلید میں، میں بھی مصطفیٰ کا ہاتھ تھامے چل رہی تھی، کوشش کر رہی تھی کہ گروپ کے ساتھ رہوں، ہم سب سامان وصول کرنے جا رہے تھے...... چونکہ یہ فلائٹ ایمرجنسی میں یہاں اتری تھی اس لیے اس کے سامان کی دوبارہ چیکنگ کی تو اصولاً ضرورت نہ تھی مگر جانے کیوں ہمیں اسی طرف لے جایا جا رہا تھا...... بعدازاں معلوم ہوا کہ کسی قسم کی دہشت گردی کی افواہ پھیلی ہوئی تھی سو ساری پروازوں کی سخت چیکنگ ہو رہی تھی۔ میں نے اپنے دو سوٹ کیس وصول کر لیے تھے...... تیسرے سوٹ کیس کا گلابی ربن غائب ہونے کے باعث میں اسے پہچان ہی نہ سکی اور وہ کہیں میرے پاس سے گزر گیا۔ چند گز کے فاصلے پر وہ سوٹ کیس مجھے زمین پر پڑا نظر آیا، اس کا ہینڈل ٹوٹ چکا تھا...... گلابی ربن ہینڈل کے ساتھ ہی تو بندھا تھا اسی لیے وہ غائب تھا۔ پورٹر نام کی کوئی مخلوق نظر نہ آئی تو میں نے خود ہی ٹرالی گھسیٹی اور جا کر وہ سوٹ

کیس اٹھا لیا، معمول سے بھاری بھی تھا وہ سوٹ کیس یا شاید اس کا ہینڈل ٹوٹ جانے کے باعث مجھے ایسا محسوس ہوا تھا۔

میں اپنا سامان لے کر ان لوگوں کے پیچھے چل پڑی جو کہ چیکنگ کی طرف جا رہے تھے...... مصطفیٰ کو بھی میں نے ٹرالی پر بٹھا لیا تھا کہ وہ چل، چل کر تھک گیا تھا۔ قطار کافی طویل تھی اور وہاں بیٹھنے کو کوئی جگہ بھی نہ تھی۔ تھکاوٹ اب نئے انداز سے طاری ہو رہی تھی...... جماہیاں آ رہی تھیں۔ میری باری بالآخر آ گئی۔

وہاں سے باہر نکلی تو ایک طویل قطار اپنے، اپنے سامان کے انتظار میں کھڑی تھی مگر سامان کو کلیئر کرنے کا عمل کافی سست تھا، کنویئر بیلٹ رکی ہوئی تھی، تھوڑی دیر کے بعد چلتی، ایک سوٹ کیس گزرتا اور پھر چند منٹ کا وقفہ آ جاتا۔ تبھی وہاں چند اور لوگ آئے جو کہ پولیس کی وردی میں تھے، اس کے تھوڑی دیر کے بعد کچھ اور باوردی افراد آئے، ان کے ہاتھوں میں لمبی چینیں تھیں جن کے دوسرے سروں پر بڑے، بڑے کتے تھے جو جوش سے بھونک رہے تھے...... انہیں ہمارے اس سامان کے پاس لے جایا گیا جو کنویئر بیلٹ پر سے اتار کر ایک ڈھیر کی صورت نیچے رکھا گیا تھا۔ وہ تیزی سے سامان کے گرد گھوم رہے تھے۔ ان سب نے مل کر ایک' ایک سوٹ کیس کو سونگھنا شروع کر دیا، ہم سب بیزاری سے کھڑے اس عمل کو دیکھ رہے تھے، پولیس کی وردیوں میں ملبوس وہ سارے اس منظر سے لطف اندوز ہو رہے تھے یقیناً......

کتوں کی چیکنگ کے بعد...... ایک، ایک کر کے سوٹ کیس واپس کنویئر بیلٹ پر رکھے جا رہے تھے، کتوں کو واپس لے جایا گیا تھا مگر باقی پولیس والے وہیں تھے۔

''یہ سوٹ کیس کس کا ہے؟'' ہم سب اچک' اچک کر دیکھ رہے تھے۔ میرے سامنے کتنے ہی لوگ تھے اس لیے مجھے نظر نہ آ رہا تھا۔ ذرا سی بھیڑ چھٹی۔ میں آگے بڑھی اور دیکھنے لگی۔ وہ میرا سوٹ کیس ہی تھا، میں اس کی طرف بڑھی۔ ''میرا سوٹ کیس ہے یہ!'' میں نے دعویٰ کیا تو دو پولیس والے آگے بڑھے۔

''ہمارے ساتھ چلیں......'' ایک نے کرخت آواز میں انگریزی میں کہا۔

''کہاں......'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''چلیں تو علم ہو جائے گا۔''

''میں اپنا باقی سامان تو لے لوں!'' میں نے اپنے لہجے کو نارمل رکھنے کی کوشش کی۔

''اس کی آپ فکر نہ کریں، وہ یہیں پر ہے......'' میں ان کی تقلید میں چل پڑی، ان کے پاس ٹرالی میں میرا سوٹ کیس تھا۔ ایک کمرے کے دروازے کے باہر پردہ ہٹا کر وہ اندر داخل ہوئے اور مجھے اس کے ساتھ ایک کمرے میں جا کر جامہ تلاشی دینے کو کہا گیا۔ ابھی تو جامہ تلاشی ہوئی تھی...... میں نے دل ہی دل میں سوچا۔

''بچے کو باہر بھیجنا ہوگا......'' اندر موجود خاتون نے کہا، میں نے بہ مشکل مصطفیٰ کو باہر بٹھایا اور دوبارہ اندر گئی...... اس روز مجھے جامہ تلاشی کا صحیح مطلب سمجھ میں آ گیا۔

''میری اس طرح تلاشی کیوں لے رہے ہیں؟'' میں نے حیرت سے اس سے سوال کیا۔

''تمام مشکوک لوگوں کی اسی طرح تلاشی لی جاتی ہے میڈم......'' اس نے غالباً اس لیے احترام سے بات کی تھی کہ میرے پاسپورٹ کا رنگ سبز نہ تھا ورنہ تو شاید اس کا لہجہ ہی کچھ اور ہوتا۔

''مشکوک؟'' میرے دماغ میں اس کا کہا ہوا لفظ اٹک گیا۔

''مجھے اس سے زیادہ کچھ علم نہیں ہے...... اس کے بعد آپ دوسرے دروازے سے نکل کر اگلے کمرے میں چلی جائیں......''

''مگر میرا بیٹا تو اس وقت اس سے پہلے والے

کمرے میں ہے......'' میں نے احتجاج کیا۔'' اس کمرے میں!'' اشارہ کر کے میں نے اس سے کہا۔ وہ عربی میں کچھ بڑبڑائی اور باہر جا کر مصطفیٰ کو لے کر آئی۔ میں نے لپک کر اسے اٹھایا اور دوسرے دروازے کی طرف چل دی۔ وہاں کئی لوگ تھے...... دو ایک عورتیں بھی تھیں، وہ سب لوگ پولیس کی وردیوں میں تھے یا غالباً ائرپورٹ سیکیورٹی کی۔

''یہ سوٹ کیس آپ ہی کا ہے ناں میڈم...... رانیہ دانیال!'' اس نے میرے ہاتھ سے پاسپورٹ لے کر کھول کر اس میں سے میرا نام پڑھا۔

''جی!'' میں نے پورے اعتماد سے کہا۔ وہیں پر موجود لوگوں میں سے دو کے ہاتھ میں کیمرے تھے، وہ غالباً وڈیو بنا رہے تھے، دونوں مخالف سمتوں میں کھڑے تھے۔

''آپ کو پورا یقین ہے کہ یہ آپ کا سوٹ کیس ہی ہے؟'' پھر سوال کیا گیا۔

''جی، مجھے پورا یقین ہے......'' میں نے جواب دہرایا۔

''کیا اسے آپ نے خود ہی پیک کیا تھا...... اس میں سارا سامان خود رکھا تھا؟'' عجیب سا سوال تھا۔

''ہاں...... زیادہ تر، ممکن ہے کہ کچھ سامان میرے شوہر نے رکھا ہو۔'' مجھے سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ اس نوعیت کے سوالات کیوں پوچھ رہے تھے وہ۔

''اس بچے کو ذرا وہاں بٹھا دیں!'' ایک آدمی نے صوفے کی طرف اشارہ کیا، میں نے مصطفیٰ کو پیار سے سمجھایا کہ وہ بیٹھ کر ٹی وی دیکھے اور خود واپس اسی جگہ پر آ گئی۔

''کیا آپ اپنے پورے ہوش و حواس میں ہیں رانیہ دانیال؟''

''میرا خیال ہے......'' میں نے طنز سے کہا۔

''مجھے اپنا خیال نہ بتائیں...... میرے سوال کا سیدھا سادہ جواب دیں۔'' اس نے غصے سے کہا۔

''جی......'' میں ڈر سی گئی، اس کے لہجے میں کچھ بہت زیادہ عجیب تھا۔

''سوٹ کیس کھولیں......'' اس نے کہا۔ میں آگے بڑھی۔ ''آپ نہیں......'' وہ دہاڑا۔ ''آپ اس سوٹ کیس کو چھو بھی نہیں سکتیں۔'' اس کا لہجہ انتہائی غصیلا تھا۔ کیمروں والے اپنے کام میں مصروف تھے۔

''مگر یہ میرا سوٹ کیس ہے...... میں اسے کیوں نہیں چھو سکتی؟'' میرے لہجے میں حیرت بھی تھی اور غصہ بھی، اسی اثنا میں کسی نے وہ سوٹ کیس کھول دیا تھا...... میں ڈر سے چیخ مار کر پیچھے کو ہٹی...... ''نہیں نہیں......''

''کیا ہوا...... کیا نہیں، نہیں؟'' سوال داغا گیا۔

''یہ سوٹ کیس میرا نہیں ہے......'' میں نے ہکلا کر کہا۔

''سارے مجرم پکڑے جانے پر اسی طرح کہتے ہیں۔'' اس نے میرے چہرے کو گھورتے ہوئے کہا۔

''یقین مانیں یہ سوٹ کیس میرا نہیں ہے۔'' میں گڑگڑائی۔ ''یہ...... میرا کیسے ہو سکتا ہے؟''

''اچھا، کیوں نہیں ہو سکتا آپ کا؟'' وہ ہنسا تھا۔

''میرا کیسے ہو سکتا ہے یہ......'' میں ہکلا رہی تھی مسلسل...... ''میں تو پاکستان جانے کے لیے اپنا ٹکٹ بھی کریڈٹ کارڈ پر لائی ہوں، اگر یہ میرا ہوتا تو......'' میری آواز کانپ رہی تھی اور آنکھیں اس سوٹ کیس کو دیکھ کر پھٹی جا رہی تھیں...... جس میں چند کپڑے تھے، جو شاید صرف اوپری تہ میں رکھے گئے تھے اور ان کے نیچے سیکڑوں کے حساب سے ڈالروں کے نئے نوٹوں کی گڈیاں بھری ہوئی تھیں۔

زندگی کیسے کیسے رنگ و روپ بدلتی ہے۔ یہ خود وہ بھی نہیں جانتے جوان مرحلوں سے گزر رہے ہوتے ہیں مگر ہماری مصنفہ نے خوب جانا ہے، سب کے دلوں کا حال، اسی احوال کی مزید داستان پڑھیے اگلے ماہ کے شمارے میں......





# جیت

غزالہ عزیز

محبت ایک الہامی کیفیت کا نام ہے۔ اسی لیے یہ محب پر خود بخود آشکار ہو جاتی ہے۔ اسی وجہ سے اسے آسمانی تحفہ بھی کہا جاتا ہے۔ اب چاہے محبت حقیقی محبوب سے ہو یا مجازی، بندے کو کشف عطا کرتی ہے۔

محبت میں الہام نہ ہو تو محبت، محبت نہیں ہوتی۔ محض وقتی جذباتی کشش ہوتی ہے جو وقت گزرنے کے بعد اپنا تاثر کھو دیتی ہے۔ اور خرد حسن کو صرف

محبت نہیں ہوئی تھی، محبت میں الہام بھی ہونے لگے تھے۔ حشام کہاں ہے، کیا کررہا ہے...... کب اسپتال کے لیے نکلتا ہے، خرد کو سب پتا چل جاتا تھا۔ حالانکہ وہ اس کے پڑوس میں رہتا تھا نہ ہی محلے میں اور اسے تو حشام کی روٹین کا بھی علم نہیں تھا۔ یقیناً اس کی چھٹی حس بہت اسٹرانگ تھی یا شاید محبت ہو تو الہامی کیفیت اور حساسیت خود بخود بندے میں بیدار ہوجاتی ہیں۔ خرد حسن کے ساتھ بھی ایسا ہی کچھ تھا۔ محبت میں ہونے والے الہام نے اس کے دامن میں دائمی خوشیاں ڈالنے کے بجائے اس کی ذات کو عمر بھر کا روگ لگادیا۔

☆☆☆

حشام حسین کا تعلق اپر مڈل کلاس سے تھا۔ حشام کے والد حسین احمد کا اپنا گارمنٹس کا بزنس تھا۔ حسین احمد کے دو بچے تھے۔ حشام اور نرما...... نرما، حشام سے بڑی تھی۔ نرما کی اپنے پھوپی زاد اسد سے شادی ہوئی تھی۔ ان کے دو بچے تھے۔ وہ اسد کے ساتھ خوشگوار زندگی گزار رہی تھی۔ اسد اس سے بہت محبت کرتا تھا۔

خرد حسن، اسد کی چھوٹی بہن تھی۔ اسد اور نرما کی شادی کے وقت حسین احمد نے بیوہ بہن کی بیٹی خرد کو حشام کے ساتھ منسوب کردیا تھا۔ اس وقت حشام میڈیکل کی تعلیم حاصل کررہا تھا۔ اگرچہ اسے اپنی اسٹڈیز ختم ہونے سے پہلے ایسے کسی سلسلے میں کوئی دلچسپی نہیں تھی مگر باپ کے اصرار اور خواہش پر اس نے چپ چاپ اس رشتے کو قبول کرلیا...... مگر یہ کوئی نہیں جانتا تھا کہ حشام کے دل میں کیا ہے، وہ خرد حسن کے لیے اپنے دل میں کیا جذبات رکھتا ہے۔ البتہ خرد، ماں اور ماموں کے طے کیے اس رشتے سے خوش تھی کیونکہ جس شخص کو اس نے اپنے لیے خدا سے دعاؤں میں مانگا تھا۔ وہ اسے بنا کسی مشکل کے مل گیا تھا۔

وہ میٹرک میں تھی اور ماں کے اچانک انتقال کے بعد بڑے بھائی اسد اور نرما بھابی نے ہی اسے اس عظیم صدمے کو برداشت کرنے کا حوصلہ اور ڈھارس دی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ان کی زندگی کا یہ بڑا خلا رفتہ رفتہ صبر سے پُر ہونے لگا۔ میٹرک کے بعد خرد نے کالج میں ایڈمیشن لینا تھا اور اسد نے اس ذمے داری کو بخوبی نبھایا تھا۔ اس کے کالج آنے جانے کے لیے وین بھی لگوادی۔

جبکہ حشام اس وقت میڈیکل کے سیکنڈ ایئر میں پڑھ رہا تھا۔ ڈاکٹر بننا اس کا خواب تھا۔ حالانکہ حسین احمد کی خواہش تھی کہ وہ ان کا بزنس سنبھالے لیکن حشام کے شوق اور رجحان کو دیکھتے ہوئے انہوں نے اکلوتے بیٹے کے ساتھ زبردستی کرنا مناسب نہیں سمجھا۔

کیونکہ خرد سے رشتے طے ہونے پر حشام نے ان کی خواہش اور فیصلے کا مان رکھا تھا۔ حالانکہ وہ اپنی کلاس فیلو مائرہ کو پسند کرتا تھا۔ مائرہ بھی اسے پسند کرتی تھی اور شاید دونوں مناسب وقت کا انتظار کررہے تھے۔ اس سے پہلے ہی حسین احمد نے حشام کو اپنی بھانجی کے ساتھ منگنی کے رشتے میں باندھ دیا۔ چونکہ فی الحال وہ اپنا سارا فوکس اپنی اسٹڈیز پر رکھنا چاہتا تھا۔ اس لیے خاموش تھا اور اس خاموشی میں کون سا طوفان پنہاں تھا۔ یہ کون جانتا تھا۔

جبکہ خرد، حشام سے رشتہ جڑنے کے بعد کون سے اپنی اسٹڈیز میں مگن ہوگئی۔ البتہ منگنی کے بعد بھی حشام اور اس کے درمیان تکلف اور گریز کی لکیر حائل تھی۔ اور خرد کو حشام کا منگنی کے بعد بھی یہ گریز اور لیا دیا سا انداز اور سنجیدہ رویہ اکثر بے چینی میں مبتلا کردیتا کہ حشام کی اس رشتے میں خود اپنی مرضی شامل ہے یا نہیں...... مگر وہ اس سلسلے میں نہ بھی نرما بھابی سے بات کرسکی اور حشام سے بات کرنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ وہ حشام

سے بات کرتے ہوئے بہت گھبراتی تھی یا پھر اسے کھو دینے کے خوف نے خرد کے ہونٹوں پر چپ کی مہر لگا دی تھی۔ مگر اس کی چھٹی حس کہتی تھی کہ حشام اور اس کے درمیان وہ میٹھا سا تعلق نہیں ہے جو منگنی جیسے رشتے میں بندھنے کے بعد دونوں فریقین کے درمیان خود بخود بن جاتا ہے۔

شاید اس لیے کہ محبت تو اسے ہوئی تھی حشام سے...... حشام کو بھی یا نہیں اور محبت میں اب الہام بھی ہونے لگے تھے۔ اور اپنی اس کیفیت سے اسے ہمیشہ ڈر لگتا تھا۔

☆☆☆

منگنی کے بعد بہت سے دن بے کیف گزر گئے تھے...... جب ایک دن نرما بھابی نے اس سے وہ سوال کرلیا۔ جس کا جواب اسے ہمیشہ سے مشکل لگتا تھا۔ وہ اپنی اسٹڈیز میں جی جان سے محنت کررہی تھی تاکہ اچھی پوزیشن لے کر پاس ہوسکے اور میڈیکل کی تعلیم کے لیے کوالیفائی کرسکے۔ وہ حشام کی طرح ڈاکٹر بننا چاہتی تھی۔

وہ اپنے روم میں بیٹھی کیمسٹری کا جنرل لیے تھیوری لکھ رہی تھی۔ جب نرما بھابی اس کے روم میں چلی آئیں۔ ان کے ہاتھ میں دودھ کا گلاس تھا۔

''خرد...... تم اس رشتے سے خوش تو ہوناں......؟'' اور نرما کے اس اچانک سوال نے اسے بوکھلا کر رکھ دیا...... وہ مزاجاً بہت خاموش طبع اور اپنی ذات میں مگن رہنے والی لڑکی تھی۔ نرما بھابی کے سوال پر خاموشی سے انہیں تکنے لگی۔ جبکہ بھابی مسکراتی نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھیں۔ ہاتھ میں پکڑا دودھ کا گلاس انہوں نے بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پر رکھ دیا تھا اور خود خرد کے سامنے بیڈ پر کچھ فاصلے پر بیٹھ گئیں۔

''یہ سوال تو آپ کو اپنے بھائی سے پوچھنا چاہیے تھا...... جس نے ابھی تک اپنے دل کی خبر کسی کو لگنے نہیں دی ہے۔ اس کے دل میں کیا ہے...... وہ اس رشتے کے حوالے سے کیا احساسات رکھتا ہے؟'' اس نے نرما بھابی کی طرف دیکھتے ہوئے سوچا تھا مگر کہا نہیں...... اور نرما بھابی اس کی خاموشی کو شرم و جھجک سمجھ رہی تھیں۔

''کیا ہوا...... اس طرح کیا دیکھ رہی ہو...... میں تمہاری بھابی ہی نہیں کزن بھی تو ہوں، تم چاہو تو دوست سمجھ کر اپنے دل کی بات شیئر کرسکتی ہو۔ ابھی سے مجھے نند بھجنے کی تو ضرورت نہیں ہے۔'' نرما بھابی نے شرارت سے مسکراتے ہوئے دوستانہ لہجے میں کہا تو وہ جھینپ کر مسکرانے لگی۔

''جی بھابی...... کالج میں کوئی دوست نہیں بنائی ہے میں نے...... آپ جو ہیں...... رہی بات حشام کی تو اگر وہ مجھے پسند نہ ہوتے تو یہ منگنی کی انگوٹھی میری انگلی میں نہ ہوتی۔'' اور یہ بات اس نے نرما بھابی کے سامنے بڑی مشکل سے کہی تھی۔ جسے سنتے ہی نرما نے بے اختیار اسے خود سے لپٹا لیا تھا۔

''میں جانتی تھی...... میرے اتنے ہینڈسم اور اسمارٹ سے بھائی کو بھلا کوئی لڑکی ناپسند کرسکتی ہے۔'' نرما نے پُرجوش لہجے میں کہا تو خرد ایک بار پھر جھینپ کر مسکرانے لگی۔ جبکہ نرما بیڈ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

''اچھا...... تم اپنا کام کرو...لیکن یہ دودھ ٹھنڈا ہونے سے پہلے پی لینا۔ اور ہاں...... رات دیر تک جاگ کر اسٹڈیز مت کرنا...... جلدی سو جانا ورنہ آنکھوں کے گرد ڈارک سرکلز بن جائیں گے اور میں اپنی ہونے والی بھابی کو ہمیشہ خوب صورت دیکھنا چاہتی ہوں۔'' نرما کی شرارت پر خرد بلش کرگئی تھی۔

''کیا مجھے اس بارے میں حشام سے بات کرنی چاہیے۔'' بھابی کے کمرے سے جانے کے بعد وہ اپنے اور حشام کے بارے میں سوچنے لگی۔ خرد نے ایک لمحے کے لیے دل میں سوچا تھا مگر پھر وہی خوف

کی کیفیت نے اسے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اگر حشام نے اس کا من چاہا جواب نہیں دیا تو وہ کیا کرے گی۔ کیا حشام کی محبت سے دستبردار ہونے کا حوصلہ ہے اس میں......؟ یہ اور ایسی بہت سی پریشان کن سوچوں نے اس کے ذہن کے گرد اپنا جال بُننا شروع کر دیا تھا مگر فی الحال وہ اس بارے میں مزید گہرائی میں جا کر سوچنا نہیں چاہتی تھی۔ اس لیے سر جھٹک کر اپنے کام میں مصروف ہوگئی۔ ابھی بہت وقت پڑا تھا...... سو سب کچھ وقت اور حالات پر چھوڑ کے زبردستی دل و دماغ کو اپنی اسٹڈیز پر مرکوز کرنے کی کوششیں کرنے لگی۔

☆☆☆

''تم سوچ بھی نہیں سکتے شام...... تمہیں پالینے کی خواہش کی تکمیل میرے لیے کسی معجزے سے کم نہ ہوگی...... میں سچائی جانتی ہوں۔ مگر مجھے اپنے جذبوں کی صداقتوں پر بھی پورا بھروسا ہے...... تم چاہے کسی سے بھی منسوب ہو جاؤ۔ میری محبت کی شدت ایک دن اپنا آپ منوالے گی...... میں اپنے رب کے معجزوں سے مایوس نہیں ہوں اگر اس کی رحمت میرے ساتھ رہی تو میں کبھی مایوس نہیں ہوں گی۔ بس اب یہ دیکھنا ہے کہ میرے یقین کو کب کامیابی میں بدلنا ہے۔ میری محبت میں کب یہ کمال ہونا ہے۔''

اور حشام حسین سامنے بیٹھی مائرہ کے پُریقین لہجے اور پُراعتماد انداز کو دیکھ رہا تھا۔ وہ حشام کی کلاس فیلو تھی۔ اپنے ماں، باپ کی اکلوتی، لاڈلی بیٹی اور حشام کی بہترین دوست بھی...... وہ کبھی کبھی حشام کو شام کہا کرتی تھی اور حشام اس کے یقین کو دیکھ کر سوچ میں پڑ گیا تھا کہ جیت کس کی ہوگی۔ مائرہ کے یقین اور بھروسے کی یا پھر اس کے ماں، باپ کے فیصلے کی جو خرد حسن کی صورت میں اس پر مسلط کیا گیا تھا۔

''تم کچھ نہیں کہو گے شام......! کم از کم میرے یقین کو حوصلہ ہی عطا کر دو۔'' حشام...... کی گمبھیر ہوتی خاموشی پر مائرہ نے لجاجت سے کہا۔

''مجھے بھی انتظار رہے گا مائرہ...... تمہاری محبت میں یہ کمال کب ہوتا ہے۔ کیونکہ مجھے تمہارے یقین پر کوئی شک نہیں ہے۔'' حشام کی پُرسکون آواز نے ان کے درمیان قائم خاموشی اور سکوت توڑا تھا۔

''اور محبت...... !تمہیں اپنی محبت پر ایسا ایقان نہیں ہے شام......؟ کیا تمہاری محبت میں اتنی طاقت نہیں ہے کہ وہ وقت کے فیصلے کو اپنی خواہش کی شدت سے بدل دے۔'' مائرہ نے برجستہ کہا تو حشام اسے سنجیدگی سے دیکھنے لگا۔

''آئی ایم سوری مائرہ...... یہ میرے ماں، باپ کا فیصلہ ہے، ان کی خواہش ہے جسے میں رد نہیں کر سکتا...... میں کتنا بھی چاہوں لیکن انہیں مایوس کرنے کا حوصلہ نہیں کر سکوں گا مگر میں تقدیر کے فیصلے بدلنے پر قادر نہیں ہوں۔ اگر میری اور تمہاری قسمت میں ہجر و فراق لکھا ہے تو میں تو کیا کوئی بھی تقدیر کے فیصلے کو ٹال نہیں سکتا سوائے ایک ذات کے...... بس اب میرے اور تمہارے درمیان ہمارا مقدر اور وقت فاصلوں کی دیوار بن کر حائل ہے۔ اور یہ دیوار کب، کیسے گرتی ہے۔ اس کا فیصلہ وقت اور قدرت ہی کرے گی۔ میرا یہ ایقان ہے۔''

اور حشام کے جواب نے اسے لاجواب کر دیا۔ واقعی تقدیر کے فیصلے اوپر آسمان پر ہوتے ہیں۔ اور آسمانی فیصلے چیلنج کرنے کی اس کی اوقات نہیں تھی لیکن اسی آسمانوں پر بیٹھے طاقتور ہستی جس کے ہاتھ میں ہر انسان کی طرح اس کی تقدیر کی ڈور بھی تھی۔ اسے اپنے اس رب کی رحمتوں پر پورا بھروسا تھا۔ دعا مانگنا بھی تو اسی کا حکم ہے۔ اگر حشام اس کے نصیب کا ستارہ نہیں تھا تو اس کے سچے جذبوں کی شدت تقدیر کے فیصلے کو بدلنے پر مجبور ہو جائے شاید...... یہ مائرہ کی سوچ اور خواہش تھی۔

"تم نے ٹھیک کہا شام...... ہم قدرت کے فیصلوں سے نہیں لڑ سکتے...... مگر اپنے جذبوں کی سچائی اور دعا سے ضرور جیت سکتے ہیں۔ اب دعا ہی میرے اور خرد حسن کے حق میں صائب فیصلہ کرے گی۔ جس کی دعاؤں میں زیادہ شدت و طاقت ہوگی۔ جیت اسی کا مقدر بنے گی کیونکہ میں تمہاری محبت سے دستبردار ہونے کا سوچ بھی نہیں سکتی۔" مائرہ نے مسکراتے ہوئے پُرسکون لہجے میں کہا تو حشام بھی نرمی سے مسکرانے لگا۔ اسے مائرہ کی محبت اور یقین دونوں پر بھروسا تھا پھر اسے بے سکون اور فکر مند ہونے کی کیا ضرورت تھی۔

"چلیں...... کافی دیر ہوگئی ہے کلاسز آف ہوئے۔ اب ہمیں گھر چلنا چاہیے۔" حشام نے کلائی پر بندھی رسٹ واچ پر نگاہ کرتے ہوئے کہا تو مائرہ بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ کیمپس کے سب سے پُرسکون اور سرسبز گوشے...... (لان) میں رکھی بینچ پر بیٹھے تھے۔ وہ دونوں اکثر اپنا فری ٹائم ایک دوسرے کے ساتھ اسی جگہ شیئر کرتے تھے اور اب دونوں ایک ساتھ اٹھ کر کیمپس کے پارکنگ ایریا کی جانب بڑھ گئے۔

☆☆☆

بلال کی برتھ ڈے تھی۔ گھر پر تمام قریبی رشتے دار اکٹھا تھے۔ حشام اور اس کی فیملی بھی انوائٹڈ تھی۔ خرد نے نرما کے ساتھ مل کر خود پورے گھر کو سجایا تھا۔ وہ بہت خوش نظر آرہی تھی اور نرما بھابی اس کے چہرے پر چھلکتی خوشی دیکھ کر حشام کے حوالے سے اسے وقتاً فوقتاً چھیڑ بھی رہی تھیں اور وہ بس مسکرا کر رہ جاتی۔ اسے برا نہیں لگ رہا تھا۔ چونکہ حشام اس کے بچوں کا اکلوتا ماموں تھا۔ اس لیے نرما نے اسے بلال کی برتھ ڈے میں شریک ہونے کی خاص تاکید کی تھی۔ حشام بھی اپنے بھانجے، بھانجی سے خاصا اٹیچڈ تھا۔ اس لیے اس کا آنا ضروری تھا خرد کو شام کے چھ بجنے کا بے چینی سے انتظار تھا۔ وہ نرما بھابی کے اصرار پر اچھی طرح تیار ہوئی تھی۔ پنک شیفون کی فراک اور تنگ پاجامے کے ساتھ بڑا سا دوپٹا لیے، ہونٹوں پر پنک نیچرل لپ اسٹک اور آنکھوں میں کاجل کی لکیریں سجائے وہ بہت پیاری لگ رہی تھی۔ بس یہی اس کی تیاری اور پارٹی میک اپ تھا۔ وہ ہمیشہ سے اتنی ہی سمپل رہتی تھی۔ اور آئے دن نت نئے بدلتے فیشن سے اسے کوئی لگاؤ نہیں تھا۔ وہ وہی لباس پہنتی جو اس کی شخصیت سے میچ کرتا...... لیکن اس سادگی میں بھی وہ دیکھنے والوں کے لیے بے حد کشش اور انفرادیت رکھتی تھی۔

برتھ ڈے کا انتظام لان میں کیا گیا تھا۔ گھڑی کی سوئی کے چھ کے ہندسے پر پہنچتے ہی مہمانوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ خرد، نرما بھابی اور اسد لان میں مہمانوں کی آمد کے منتظر تھے اور جس کا شدت سے انتظار تھا وہ شاہکار بالآخر اپنی تمام تر وجاہت اور پُروقار شخصیت کے ساتھ خرد کے سامنے موجود تھا۔ حشام، ماموں، ممانی کے ساتھ چلا آرہا تھا۔ حشام نے بلیک شلوار قمیص پہن رکھی تھی وہ دراز قد تھا۔ سلیقے سے جمے ہوئے بال اور نکھری ہوئی رنگت، ہونٹوں پر بجی مسکراہٹ اسے نمایاں کررہی تھی۔ تب ہی نرما بھابی نے شرارت کی۔

"آج تو تم دونوں ماشاء اللہ چاند، سورج کی جوڑی لگ رہے ہو، حشام کو تو کالا ٹیکا بھی لگانے کی ضرورت نہیں ہے کہیں کسی حسینہ کی نظر بد نہ لگ جائے میرے ہینڈسم سے بھائی کو۔"

اور ساتھ کھڑی خرد کے ساتھ، ساتھ دوسرے لوگ بھی مسکرانے لگے تھے۔

"چلو...... حشام کی تو خیر ہے...... اس نے پہلے ہی بلیک ڈریس پہن رکھا ہے لیکن میری معصوم سی نند کا کیا ہوگا۔ اسے تو میں کالا ٹیکا لگانا بھول گئی ہوں۔ حشام...... اب تم خرد کے ساتھ، ساتھ

رہنا...... تا کہ کسی کی بری نظر نہ لگ سکے میری پیاری سے بھابی کو۔''

اور لفظ بھابی پر خرد بری طرح بلش کر گئی......

حسین احمد کے ساتھ عذرا بیگم اور اسد بھی نرما کی بات پر مسکرانے لگے جبکہ حشام یوں ہی پُروقار سے سنجیدہ انداز میں کھڑا رہا۔ مسکراہٹ ہونٹوں سے غائب تھی۔ اس نے بس ایک نظر نرما کے ساتھ کھڑی گلابی ڈریس میں گلاب کی کلی کی طرح کھلتی خرد کی طرف دیکھا تھا پھر لان کی ارینجمنٹ کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''آپی...... بلال اور عینی کہاں ہیں، نظر نہیں آرہے؟'' حشام نے نرما سے پوچھا۔

''وہ اپنے روم میں میڈ کے ساتھ ہیں، آپ لوگ اِدھر لان میں بیٹھیں، میں اور اسد انہیں لے کر آتے ہیں۔ بس آپ لوگوں کے آنے کا انتظار تھا۔ خرد...... تم امی، ابو اور حشام کو لے کر چلو...... ہم بس ابھی آتے ہیں۔'' نرما بھابی نے پاس کھڑی خرد سے کہا...... اور خود اسد کے ساتھ اندر کی جانب بڑھ گئی تو خرد نے کن انکھیوں سے سامنے کھڑے حشام کی طرف دیکھا مگر وہ کسی اور جانب دیکھ رہا تھا۔ وہ خجل سی ہو کر ان کی طرف بڑھی۔

''چلیں ممانی...... آپ لوگ وہاں چل کر بیٹھیں۔''

''ضرور بیٹا...... ویسے آج تم واقعی بہت پیاری لگ رہی ہو، نرما ٹھیک کہہ رہی تھی...... کہیں کسی کی نظر نہ لگ جائے۔''

عذرا بیگم نے پیار سے دیکھتے ہوئے اس کے نرم ہاتھوں کو تھام کر کہا تو وہ واقعی جھینپ کر رہ گئی۔ جبکہ حشام پہلے ہی لان میں سیٹ کی گئی کرسیوں کی جانب بڑھ چکا تھا۔

☆☆☆

بلال کی برتھ ڈے کا چھوٹا سا فنکشن اپنی تمام تر رونقوں کے ساتھ بالآخر رات بارہ بجے اختتام کو پہنچا تھا۔ سب مہمان اپنے گھروں کو جا چکے تھے...... وہ اپنے کمرے میں ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھی خود کو مرر میں دیکھ رہی تھی۔ کیک کٹنے سے پہلے نرما بھابی نے اسے موتیے کے کنگن پہنائے تھے جو عذرا بیگم، نرما اور خرد کے لیے لائی تھیں۔ وہ ہاتھوں کی کلائی میں پڑے ان ہی کنگن سے کھیل رہی تھی۔ برتھ ڈے کی تقریب میں تقریباً سب نے ہی ستائشی نگاہوں سے اس کی ذات کو اعتماد بخشا تھا۔ سوائے حشام کے جس نے حق رکھنے کے باوجود اس کے لیے ایک لفظ بھی نہیں کہا تھا۔

حالانکہ وہ تقریب کے آغاز سے حشام کے چند لفظوں کی پزیرائی اور چند لمحوں کی رفاقت کی آرزو مند رہی تھی مگر حشام تو نرما بھابی کے دیے گئے موقعوں کے باوجود اس کے قریب پھٹکا تک نہیں تھا اور حشام کا یہ گریز خرد کو اپنے اندیشوں اور واہموں کی سچائی پر یقین کرنے پر مجبور کر رہا تھا۔ اس کی چھٹی حس ایکٹو ہو کر الارم دینے لگی کہ کہیں کچھ غلط ضرور ہے۔

حشام کا اس سے گریز اسے سب کچھ سمجھانے کے لیے کافی تھا۔ ان کے درمیان بندھے اس خوب صورت ترین رشتے میں حشام کی مرضی اور پسند شامل نہیں ہے۔ وہ کب تک اپنے دل کی تسلی کے لیے اپنے ذہن میں آنے والی منفی سوچوں کو لفظوں کی جھوٹی تسلی دے کر جھٹک سکتی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اس کی چھٹی حس اسے کبھی غلط سگنلز نہیں دیتی۔ شاید یہی سوچ کر اس کی خوب صورت آنکھوں میں آنسو ستاروں کی طرح چمکنے لگے۔ جنہیں وہ اندر ہی اندر پینے کے جتن کر کے ہلکان ہو رہی تھی کہ مبادا نرما بھابی نہ آجائیں اسے روتے دیکھ کر جانے کیا سمجھیں۔

خود کو لاکھ سمجھانے پر اس کا دل دہائی دے رہا تھا کہ آخر اس کے ساتھ ہی ایسا کیوں ہوتا ہے۔ ہر پسندیدہ شے اس سے چھن جاتی ہے، پہلے ماں، باپ

اور اب حشام..... وہ کوئی شے نہیں تھے، جیتے جاگتے انسان تھے۔ جو خرد کی متاعِ جان کی حیثیت رکھتے تھے۔ ماں، باپ کی جدائی تو حیثیتِ ایزدی تھی لیکن حشام کو، کون سی نادیدہ قوت اس سے چھین کر دور لے جا رہی تھی۔

خرد کی سوچیں قیاس کے اس ایک نقطے پر آ کر جم کر رہ گئیں کہ حشام کی زندگی میں کوئی اور ہے..... جس نے اس کے دل و دماغ پر پہلے ہی سے اپنے نام کی مہر ثبت کر دی ہے۔ اب خرد کا حشام کے دل تک رسائی کا داخلہ ممنوع قرار دیا ہے۔ اس سے آگے وہ سوچنا نہیں چاہتی تھی یا شاید اس میں ابھی اس تلخ سچائی کو فیس کرنے کا حوصلہ نہیں تھا۔ وہ بے دلی سے ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے سے اٹھ کر واش روم کی جانب بڑھ گئی..... آنکھوں میں شدید جلن جو ہو رہی تھی۔

☆☆☆

خرد نے بھر پور محنت سے ایف ایس سی کا ایگزام دیا تھا اور شاندار رزلٹ کے ساتھ اس کی محنت رنگ لائی تھی۔ اس کے میڈیکل کالج میں ایڈمیشن کے چانسز روشن ہو چکے تھے۔ سب نے اس کی اس شاندار کامیابی پر مبارک باد دی تھی۔ جس میں حشام بھی شامل تھا اور اس نے خرد کو پاس ہونے پر گفٹ بھی دیا۔ نازک سی قیمتی برانڈڈ رسٹ واچ تھی۔ اور یوں حشام کے ذرا سے التفات نے خرد کی پچھلے دنوں کی ساری مایوسی کو ختم کر ڈالا تھا۔ وہ پھر سے خوش فہمی کی خوشنما دنیا میں کھونے لگی۔ حشام کے اپنی ذات سے متعلق روکھے پھیکے رویے کو وہ اس کا مزاج جان کر خود کو خود ہی مطمئن کرنے لگی۔ یہ سوچ کر کہ وقت گزرنے کے ساتھ ان کا رشتہ تبھی مضبوط ہو جائے گا۔ اور وقت کا کام تو گزرنا ہی ہوتا ہے۔ لہٰذا چار سال یوں گزر گئے جیسے زندگی دھوپ چھاؤں کا موسم ہو، حشام کا میڈیکل ہو چکا تھا اور وہ آج کل ہاؤس جاب کے آخری مراحل میں تھا۔ اس کے بعد اس کا ارادہ ملک سے باہر جا کر میڈیسن کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا تھا۔ البتہ گھر والے چاہتے تھے کہ حشام شادی کر کے باہر جائے، خاص طور پر اسد، حشام کے باہر جانے کا سن کر روایتی طور پر بہن کے حوالے سے طرح، طرح کے خدشات میں مبتلا ہو گیا جیسا کہ ملک سے باہر جانے والے نوجوانوں کے حوالے سے ماں، باپ اور ان کے رشتے داروں کو تحفظات ہوتے ہیں لیکن حشام نے یہ کہہ کر شادی سے فی الوقت منع کر دیا کہ ابھی خرد کی میڈیکل کی تعلیم مکمل نہیں ہوئی ہے۔ وہ اسے ڈسٹرب کرنا نہیں چاہتا۔ دوسرے خود اسے بھی اعلیٰ تعلیم کے لیے یکسوئی درکار ہوگی جبکہ شادی شدہ زندگی ایک فل ٹائم ذمے داری ہوتی ہے اور اس معاملے میں خرد نے بھی حشام کو ہی سپورٹ کیا تھا۔ سو باقی لوگ بھی سمجھ گئے تھے کہ حشام اپنی جگہ درست ہے۔ باہر سے میڈیسن میں ڈگری لینا آسان کام نہیں تھا۔ البتہ یہ ضرور تھا کہ خرد اپنے ذہن و دل میں جاری کشمکش اور خدشوں کا خاتمہ چاہتی تھی جو اسے حشام کے گریز کی وجہ سے مستقل لاحق تھے۔ وہ اگلے مزید چند اور سال حشام کی طرف سے ان خدشوں اور واہموں کی سولی پر لٹکتے رہنا نہیں چاہتی تھی۔ اس لیے اس نے بالآخر حشام سے دو ٹوک بات کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

وہ جاننا چاہتی تھی کہ والدین کے طے کیے ان کے اس رشتے میں حشام کی اپنی کیا مرضی اور پسند کس حد تک شامل ہے۔ وہ اپنی چھٹی حس کی مسلسل تنبیہ کرتی سچائی کو چاہ کر بھی جھٹلا نہیں سکتی تھی جو ہمیشہ اسے صحیح وقت پر غلط ہونے کا الارم دیتی تھی۔

ان دنوں حشام یو کے جانے کے لیے اپنے ضروری کاموں میں مصروف تھا اور وہ آج اس سے

حتمی بات کرنے آئی تھی۔ حشام اپنی اسٹڈی میں تھا جب وہ ممانی جان کو بتا کر اس کے پاس چلی آئی۔
وہ انگلیوں سے ہلکی دستک دے کر اندر چلی آئی تھی۔ لیپ ٹاپ پر جھکا کام کرتا حشام حیرانی سے سامنے کھڑی خرد کو دیکھ کر چونکا تھا۔
''تم...... اس وقت......؟'' حشام نے بے ساختہ کہا تھا کیونکہ اس سے پہلے وہ کبھی اس طرح اس کی اسٹڈی میں نہیں آئی تھی۔
''جی...... مجھے آپ سے کچھ ضروری بات کرنی تھی۔'' خرد کی سنجیدگی سے کہی بات پر حشام سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔
''ٹھیک ہے...... آؤ بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔'' حشام نے ایک صوفے کی جانب اشارہ کیا تھا مگر وہ بدستور وہیں کھڑی رہی تھی۔
''نہیں...... میں بس یوں ہی ٹھیک ہوں...... میں آپ کا زیادہ وقت نہیں لوں گی۔'' خرد نے سنجیدگی سے کہا تو حشام نے بھی جواباً سنجیدگی اختیار کی۔
''ٹھیک ہے...... کہو...... کیا کہنا چاہتی ہو، میں سن رہا ہوں۔'' وہ لیپ ٹاپ آف کر چکا تھا۔
وہ ہاتھوں کو مسلنے لگی۔ وہ ہمت کر کے یہاں آ تو گئی تھی لیکن اب حشام سے سوال، جواب کرنے کا حوصلہ ٹوٹنے لگا تھا جبکہ حشام بدستور اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ تب خرد کو اپنا حوصلہ خود ہی بڑھانا پڑا۔
''میں آپ سے یہ پوچھنا چاہتی ہوں حشام...... کہ کیا میرے اور آپ کے درمیان جو رشتہ طے پایا ہے اس میں آپ کی مرضی اور پسند شامل ہے؟''
بالآخر، خرد نے کہہ ڈالا تھا اور حشام نے چونک کر اسے ایسے دیکھا جیسے اسے خرد سے اس سوال کی توقع نہیں ہو۔ یہی وجہ تھی کہ اس کی پیشانی پر خود بخود ناگواری کی لکیریں ابھر آئیں۔ اور وہ اپنے رویّے اور لہجے کو تلخ ہونے سے نہیں روک سکا۔
''بہت جلدی خیال آ گیا تمہیں اس بات کا...... مگر اب ان باتوں کا کوئی فائدہ نہیں ہے، جو ہونا تھا وہ ہو چکا ہے۔'' خرد جو دم سادھے کھڑی حشام کے جواب کی منتظر تھی اس کے لبوں سے نکلے جملوں کی کاٹ سے اندر ہی اندر ٹوٹنے لگی...... جس بات کا اسے ڈر تھا۔ وہ ہونے جا رہی تھی۔ وہ حشام کی زبان سے وہ سب کچھ سننا نہیں چاہتی تھی۔ جو وہ اس کے رویّے کے بارے میں سوچتی رہی تھی۔ لیکن اس کے لہجے اور زبان سے نکلے لفظوں سے اس کے بد ترین خدشات حقیقت میں بدلتے نظر آنے لگے تو اس نے ہراساں ہو کر اس کی طرف دیکھا...... پھر اپنے ٹوٹتے حوصلوں کو مجتمع کر کے بولی۔
''مگر اب بھی زیادہ دیر نہیں ہوئی ہے اور ہم دونوں اتنے کمزور بھی نہیں کہ وقت کے فیصلوں کو اپنے تابع نہ کر سکیں، کم از کم میں تو اتنی کمزور نہیں ہوں۔''
خرد کے اندر ہی اندر ٹوٹتے حوصلوں نے اس کے سامنے اس حساس معاملے میں دنیا کی کمزور ترین لڑکی کو بہت مضبوط اور بہادر بنا دیا کیونکہ معاملہ اب اس لڑکی کی خودداری اور نسوانی انا کا تھا اور اس معاملے میں وہ کسی قسم کے سمجھوتے کے لیے تیار نہیں تھی۔ کسی کی ذات پر زبردستی مسلط ہونا اسے ہرگز گوارا نہیں تھا۔ جبکہ حشام چند لمحوں کے لیے چپ رہ گیا تھا۔ خرد نے گیند اس کے کورٹ میں پھینک دی تھی۔
''سچائی چاہے کتنی بھی تلخ ہو...... میں آپ کی زبان سے سننا چاہتی ہوں حشام...... پلیز...... مجھ سے کچھ بھی چھپانے کی کوشش مت کیجیے گا۔ میں سچ سننے کا حوصلہ رکھتی ہوں۔'' اور حشام کے لیے اب مزید خاموش رہنا ممکن نہیں رہا۔
''ٹھیک ہے، میں بھی تمہیں اندھیرے

میں رکھنا نہیں چاہتا۔ نہ ہی اپنے بڑوں کے طے کیے ہوئے اس رشتے کو جھوٹ سے شروع کرنا چاہوں گا۔ تمہیں سچائی کا علم ہونا چاہیے۔'' اور حشام کے لب کھلتے ہی خرد کو اپنے وجود سے جان اور روح کھنچتی ہوئی محسوس ہوئی جو الہام اسے ہوتے تھے اس کی سچائی بس چند لمحوں میں خرد حسن کے زندہ وجود کو بے جان کرنے کے لیے کافی تھی۔ حشام چند لمحوں بعد بولا تھا۔

''میں تم سے جھوٹ نہیں بولوں گا خرد، یہ رشتہ میں نے صرف اور صرف امی، ابو اور آپی کی وجہ سے قبول کیا ہے، اس میں میری مرضی اور پسند کو ہرگز دخل نہیں...... سچ تو یہ ہے کہ میں اپنی کلاس فیلو مائرہ کو پسند کرتا ہوں، ہماری بہت دوستی ہے اور ہم دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں مگر میں امی، ابو اور نرما آپی کو بھی مایوس کرنا نہیں چاہتا۔ اس لیے تمہیں فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں اپنا اور تمہارا یہ رشتہ ضرور نبھاؤں گا۔'' اور خرد حسن کے وجود کی مضبوط عمارت ٹوٹ کر دھڑام سے اس کے اندر ہی گری تھی۔ جس کی تباہی حشام کی آنکھوں سے اوجھل تھی۔ خرد حسن کے الہام نے سارے خدشے سچ ثابت کیے تھے۔ جس بات سے وہ خوف زدہ رہتی تھی آج وہ خوف ہمیشہ کے لیے اپنی موت مرگیا تھا۔ اس لیے اس نے حشام کو اپنا فیصلہ سنانے میں دیر نہیں کی۔

''مگر میں سمجھوتے اور مجبوری میں قبول کی جانے والی نئی زندگی اور اس رشتے کو کبھی قبول نہیں کروں گی۔ مجھ میں سچائی کا سامنا کرنے کا حوصلہ ہے مگر آپ فکر مت کریں، میں زبردستی آپ کی ذات پر مسلط نہیں ہوں گی۔ مجھے آپ کی ہمدردی یا ترس کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ میں آج اور ابھی اس بے معنی رشتے کو ختم کرتی ہوں۔ مجھے آپ

## آمنہ ولید لاہور اور درنگلہ (نازیہ) کے نام

کچھ لوگوں کے لیے ہاتھ اٹھاتے نہیں پڑتے ان کے لیے دعا دل سے نکلتی ہے اور آپ دونوں کا شمار انہی لوگوں میں ہوتا ہے۔ میری دعاؤں میں آپ دونوں ہمیشہ شامل رہو گی۔

میری سوچیں، میرے لفظوں کا
جب روپ دھار لیتی ہیں تو
تمہاری تصویر بنتی ہے

منجانب: فریحہ شبیر، شاہ نکڈر

## حاصل سبق

ستم کے موتی پرو کے ہم نے
اذیتوں کی بنی ہے مالا
وہ جس کو مانا تھا اپنا محسن
اسی ستم گر نے مار ڈالا
نہ چنار اہیں محبتوں کی
وہاں کی کلیاں بھی کانٹوں سی ہیں
بھلا چکے ہیں جو مجھ کو کب سے
بس ان کی یادوں کو ہم نے پالا
نہ ہونا خوشیوں میں خوش کسی کی
نہ بانٹنا غم کسی سے اپنا
بہت ستاتی ہیں ان کی یادیں
لگالیں جب وہ دلوں پہ تالا
وہ جس سے کہتے تھے سب فسانے
وہ جس کو سمجھے تھے خضر اپنا
اسی مسافر نے رہ بدل لی
ہمیں ویرانوں میں جھونک ڈالا

پسند: فرح طاہر لاہور

سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ کیونکہ آپ نے سچ بولا ہے اور مجھے منافقت بھری زندگی سے نفرت ہے۔'' خرد نے اپنی بات مکمل کر کے انگلی سے انگوٹھی اتار کے حشام کے سامنے اس کی اسٹڈی ٹیبل پر رکھی اور تیزی سے مڑ کے اسٹڈی روم سے باہر نکل گئی جبکہ حشام گم صم حیرت زدہ..... اس کمزور سی لڑکی کی بہادری اور حوصلے کو دیکھ کر غیر یقینی کیفیت میں گھرا کھڑا رہ گیا۔

وہ مرد ہو کر کمزور نکلا تھا...... اس میں اپنے بڑوں کے سامنے سچ بولنے کا حوصلہ نہیں تھا اور وہ جسمانی طور پر کمزور نظر آنے والی عورت ہو کر بھی چٹانوں جیسے حوصلے کا اظہار کر کے گئی تھی۔ جس نے حشام کو اگلے ہی لمحے اس خوف میں مبتلا کر دیا کہ اب وہ سب کو کیا جواب دے گا۔ اور کہیں اس کے اس عمل سے اس کی بہن نرما اور اسد کے رشتے پر ردعمل کے طور پر کیا اثر پڑے گا...... اسد چاہے نرما سے کتنی بھی محبت کرتا مگر اپنی بہن کے ساتھ ہونے والی اس زیادتی پر چپ نہیں رہ سکتا تھا۔ حشام کو اب خود پر غصہ آرہا تھا، اپنے سچ بولنے پر...... کیا تھا جو وہ ساری عمر سچائی چھپا کر خرد کے ساتھ منافقت بھری زندگی گزار دیتا...... مگر وہ یہ سوچتے وقت بھول گیا کہ مائرہ کے یقین اور بھروسے کی جیت ہوئی تھی۔ جو اسے اپنے رب پر تھا۔ وہ رب جو دعاؤں سے تقدیریں بدل دیتا ہے۔ کیونکہ اسے یقین تھا کہ اب سچائی جاننے کے بعد خرد بھی اس سے شادی نہیں کرے گی اور سچائی جاننے کے بعد اسد نے بھی اپنی بہن کو اس پر مسلط نہیں کرنا تھا۔ ہاں البتہ پرانے رشتوں میں ضرور اس نئے رشتے کے ختم ہونے سے دراڑ آجانی تھی۔

وہ حیران تھا، مائرہ کے جذبوں کی صداقت نے اس کے نصیب کو بدل دیا تھا۔ مائرہ جیت گئی اور خرد کے حصے میں ہار آئی تھی۔ وہ حشام حسین کو اپنا سمجھتی تھی اس لیے اس نے کبھی ہاتھ اٹھا کر حشام کو دعاؤں میں نہیں مانگا تھا۔ حالانکہ سچ تو یہ تھا کہ حشام تو کبھی خرد کا تھا ہی نہیں۔ شاید خرد یہی سمجھتی تھی کہ جو اپنا ہو اسے مانگنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ اور پھر نصیب کے فیصلوں سے کون لڑ...... کے جیتا ہے اسے کب معلوم تھا کہ مائرہ کی دعاؤں نے اپنے نصیب سے لڑ کر حشام کو جیت لیا ہے یا پھر حشام کا ساتھ لکھا ہی مائرہ کے مقدر میں تھا۔ اور یہ سچ ہی تو ہے، دعاؤں سے تقدیریں بدل جایا کرتی ہیں، کاتب تقدیر تو وہی ہے جو مانگنے پر دینے والا ہے۔ بس مانگ اور طلب میں جذبے کی صداقت اور لگن کے ساتھ دینے والے پر پورا یقین اور بھروسا ہونا چاہیے۔ یوں بالآخر مائرہ کا اعتقاد جیت گیا تھا۔

☆☆☆

حشام میں اگر ہمت ہوتی تو وہ یہ سچائی اپنے اور خرد کا رشتہ طے ہونے سے پہلے ہی سب کو بتا سکتا تھا مگر یہ بہادری خرد نے دکھائی تھی اس نے حشام سے بات کرنے کے بعد ڈائریکٹ حسین احمد سے بات کی۔ اور انہیں پوری سچائی بتا کر اس رشتے کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ جبکہ حسین احمد شرمندہ کھڑے تھے۔

''مجھے معاف کر دیں ماموں...... مگر سچائی جاننے کے بعد میں کبھی حشام کے ساتھ منافقت اور سمجھوتے والی زندگی نہیں گزار سکوں گی۔ چاہے آپ لوگ حشام کو زبردستی ایک بار پھر اس رشتے کو نبھانے پر مجبور کر دیں...... لیکن میں اس رشتے کو قبول کرنے پر مجبور نہیں ہوں...... کیونکہ میری خوشی اس میں ہے کہ حشام جس کے ساتھ بھی رہے خوش رہے۔ چاہے وہ لڑکی کوئی بھی ہو، پلیز...... آپ بھی حشام سے اس کی اس خوشی کو مت چھینیے گا۔'' خرد نے ملتجی لہجے میں حسین احمد سے کہا تھا۔ جو سچائی جان کر اپنی جلد بازی میں کی جانے والی غلطی پر نادم اور خرد کی اس غلطی کو

سدھارنے پر اس کی اعلیٰ ظرفی پر کچھ بھی بولنے سے قاصر رہے تھے۔ پھر چند لمحوں بعد اپنا ہاتھ اس کے سر پر رکھ دیا تھا۔

''مگر بیٹا...... میں اسد کو کیا جواب دوں گا۔ اور تمہاری خوشی...... مجھے تو تمہارے ساتھ تمہاری خوشی بھی عزیز ہے۔ اور میں جانتا ہوں تم اس رشتے پر دل سے خوش تھیں۔'' حسین احمد نے افسردگی سے کہا تھا اور خرد سے ماموں کی یہ افسردگی دیکھی نہیں گئی تو برجستہ بولی تھی۔

''میں اب بھی خوش ہوں ماموں...... میرا یقین کریں مجھے اس رشتے کے ختم ہونے کا کوئی افسوس نہیں ہے۔ جو منافقت اور مجبوری کی بنیاد پر قائم کیا جا رہا تھا۔ حشام کو پہلے ہی آپ کو سچائی بتا دینی چاہیے تھی لیکن حشام نے کوئی جرم نہیں کیا ہے۔ صرف اپنی پسند کا اظہار کیا ہے...... اس لیے اسے کوئی سزا بھی نہیں ملنی چاہیے۔ مجھے امید ہے، آپ حشام پر کوئی دباؤ ڈالنے کے بجائے اس کی خوشی اور خواہش کا احترام کریں گے۔ کیونکہ مجھے حشام سے کوئی شکایت نہیں ہے۔''

حسین احمد نے محبت سے سامنے کھڑی خرد کو دیکھتے ہوئے اپنا ہاتھ اس کے سر پر تھپتھپایا تھا۔ اس نے چھوٹی ہو کر کتنے بڑے پن کا مظاہرہ کیا تھا اس نے حشام اور انہیں شرمندگی سے ہی نہیں بچایا بلکہ تین زندگیوں کو برباد ہونے سے بھی بچا لیا تھا مگر حسین احمد کب جانتے تھے کہ اس نے اپنے ہی ہاتھوں اپنے دل کو برباد کر لیا ہے جو صرف حشام کے لیے دھڑکتا تھا۔

''جیتی رہو بیٹا...... اللہ تمہارے نصیب روشن کرے...... اور تمہیں ایک ایسے شخص کا ساتھ ملے جو تم کو صرف چاہتا ہی نہیں ہو بلکہ تمہاری قدر بھی کرے، آمین۔''

خرد نے عقیدت سے ان کی طرف دیکھا تھا۔

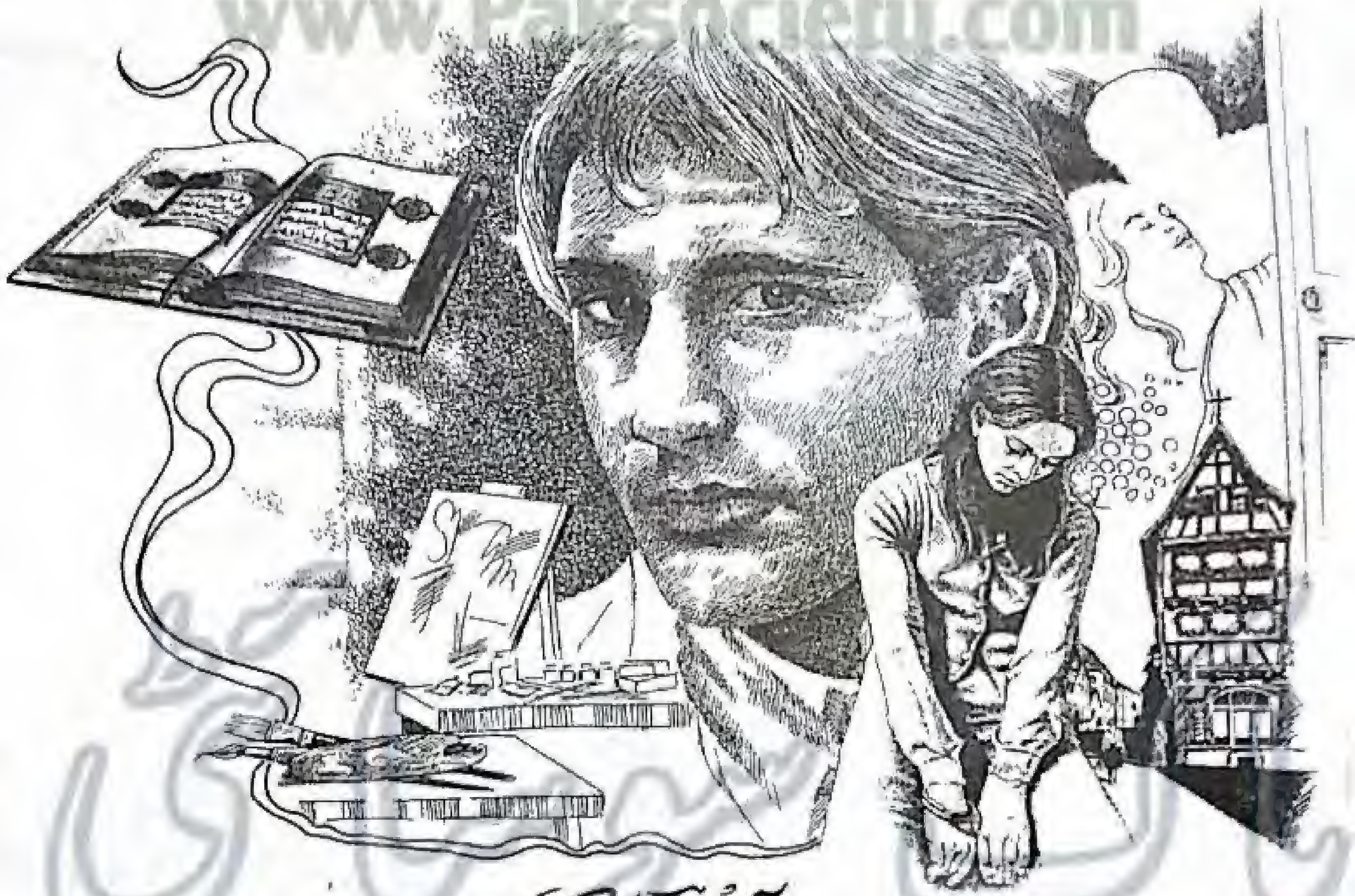
انہوں نے اپنا ہاتھ اس کے سر پر سے ہٹا لیا تھا اور وہ وہاں سے چلی گئی۔ حسین احمد وہیں کھڑے دیکھتے رہے تھے۔

☆☆☆

بعد میں خرد نے کس طرح بھائی کو سمجھا کے راضی کیا۔ یہ الگ کہانی ہے، بہرحال یو کے اسپیشلائزیشن کے لیے جانے سے پہلے مائرہ اور...... حشام کا نکاح کر دیا گیا تھا۔ وہ دونوں میڈیسن کی اعلیٰ تعلیم کے لیے اکٹھا یو کے گئے۔ البتہ حشام نے خرد کا شکریہ ادا کیا تھا۔ اس نے اپنی اعلیٰ ظرفی اور تدبر سے حشام کو ساری فیملی کی نظروں میں گرنے سے بچا لیا تھا۔ سب کو اس طرح سمجھایا تھا کہ حشام کی ذات پر کوئی آنچ بھی نہیں آنے دی اور اس کی محبت کے ساتھ اس کی خوشیاں بھی لوٹا دیں۔

وہ عمر بھر کے لیے خرد کا مقروض ہو گیا تھا۔ اگرچہ خرد محبت میں اپنے دل کی بازی ہار گئی تھی مگر اس کی اعلیٰ ظرفی اور بڑے پن نے حشام کا دل جیت لیا تھا۔ وہ پہلے حشام کے دل میں نہیں تھی لیکن اب اس کے دل میں ہمیشہ کے لیے اپنی جگہ بنا لی تھی۔ وہ ہار کے بھی جیت گئی تھی۔

حشام اور مائرہ کے جانے کے بعد خرد اپنی اسٹڈیز میں مگن ہو گئی۔ وہ میڈیکل کے فورتھ ائیر میں تھی۔ اسے حشام کی طرح ڈاکٹر بننا تھا۔ زندگی کے سفر میں بہت سی کامیابیوں کا آغاز کرنا تھا۔ آج اس کی چھٹی حس نے اسے جیت سے ہم کنار کیا تھا۔ وہ اب پُرسکون تھی جس کے باعث محبت میں مبتلا ہو کر ہونے والے الہام نے محبت کرنے والے دو انسانوں (حشام اور مائرہ) کے ایک ساتھ دھڑکنے والے دلوں کو ٹوٹنے سے بچا لیا۔ اس سے بڑی اور جیت اس کے لیے کیا ہو سکتی تھی۔ وہ حشام کی ہی نہیں اپنی ساری فیملی کے دل میں اونچا مقام بنا گئی تھی۔



# آخری امید

قسط 4

## قیصرہ حیات

مکاں فانی ، مکیں آنی ، ازل تیرا ابد تیرا
خدا کا آخری پیغام ہے تو جاوداں تو ہے

ایک ایسی لڑکی کی کہانی . . . جو حق کی جستجو میں اپنے سفر کا آغاز کرتی ہے اور اس ابدی، لافانی حقیقت کو پالینے کے اس سفر میں اسے جن مسائل، جن شدائد کا سامنا کرنا پڑتا ہے، ہماری مصنفہ نے اپنے ماہرانہ قلم سے اسے بہت خوب صورت اور پُر اثر انداز میں اُجاگر کیا ہے۔

اس کہانی کی اشاعت نوجوان نسل کی اسلام کے بارے میں معلومات مطالعے اور علم کو مزید وسعت دے گی۔

مایہ ناز مصنفہ کے منفرد انداز بیاں کا

ایک اور شاہکار


READING
Section

رات کو کیتھی نیٹ پر عبدالرحمٰن کے ساتھ چیٹ کرنے میں مصروف تھی اور وہ عبدالرحمٰن کو اللہ، حضرت محمدؐ اور اسلام کے بارے میں اپنی ریسرچ کے بارے میں بتا رہی تھی اور وہ اس سب کے بارے میں اس کے خیالات جان کر بے انتہا خوش بھی ہو رہا تھا اور حیران بھی۔

''کیتھی...... اس کا مطلب ہے تم بہت جلد مسلمان ہو جاؤ گی۔ یعنی کہ اسلام قبول کر لو گی؟'' عبدالرحمٰن نے قدرے خوش ہو کر پوچھا۔

''ہاں...... انشاء اللہ......'' وہ رک رک کر بولی تو عبدالرحمٰن مسکرانے لگا۔

''گڈ...... ویری گڈ...... کیتھی تم نے بہت اچھا فیصلہ کیا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ اللہ تم پر بہت مہربان ہے جو تمہیں ہدایت کے راستے پر لا رہا ہے...... کیتھی اللہ جن لوگوں سے محبت کرتا ہے ان کے دلوں میں اپنی اور اپنے پسندیدہ دین اسلام کی محبت پیدا کر دیتا ہے۔'' عبدالرحمٰن نے اس کی تعریف کرتے ہوئے کہا۔

''ہاں، مجھے بھی یہی محسوس ہو رہا ہے۔ مجھے اللہ سے...... پیغمبر محمدؐ اور اسلام سے ایک دم بہت محبت ہونے لگی ہے۔'' کیتھی نے مسکرا کر کہا۔



''تو...... پھر...... تم کس بات کا انتظار کر رہی ہو؟'' عبدالرحمٰن نے پوچھا۔

''میں اسلام کے بارے میں اپنی اسٹڈی کمپلیٹ کر لوں...... پھر۔'' کیتھی نے جواب دیا۔

''تو کیا...... ابھی تک تمہاری اسٹڈی کمپلیٹ نہیں ہوئی؟'' عبدالرحمٰن نے حیرت سے پوچھا۔

''بہت زیادہ کر لی ہے۔ اسلامک لاز اور اسلامک ہسٹری کے بارے میں ابھی کچھ اسٹڈی رہتی ہے۔ عبدالرحمٰن میرے لیے یہ بہت بڑا فیصلہ ہوگا۔ اس لیے میں اس کے کسی بھی پہلو کو چھوڑنا نہیں چاہتی۔ مکمل اسٹڈی کرنے کے بعد پھر میں اسلامک سینٹر جاؤں گی۔'' کیتھی نے کہا۔

''او کے...... دیٹس ویری گڈ۔'' عبدالرحمٰن نے اس کی سوچ کو سراہا تھا۔ وہ ہمیشہ ہی اس کی حوصلہ افزائی کرتا تھا۔

''ہاں، مجھے بھی اس دن کا شدت سے انتظار ہے۔'' کیتھی نے مسکرا کر کہا۔

''اور میں اس روز اپنے سب فرینڈز کو مٹھائی کھلاؤں گا۔'' عبدالرحمٰن نے مسکرا کر کہا۔

''کیوں؟'' کیتھی نے حیرت سے آنکھیں پھیلاتے ہوئے پوچھا۔

''جب کسی ایک فرینڈ کو دنیا اور آخرت کی سب سے بڑی خوشی ملے تو دوسرے فرینڈ کو اس کی خوشی کو ضرور سیلی بریٹ کرنا چاہیے۔'' عبدالرحمٰن نے انتہائی خوش ہو کر کہا۔

''تھینک یو ویری مچ، یو آر اے ٹرو فرینڈ۔'' کیتھی نے بھی مسکراتے ہوئے کہا تو عبدالرحمٰن نے اس کے کمنٹس پر شکریہ کہا تھا۔

''اچھا تم نے تو یہ بتایا ہی نہیں کہ تمہیں اسلام کی کس بات نے سب سے زیادہ متاثر کیا؟'' عبدالرحمٰن نے متجسس ہو کر پوچھا۔

''Concept of God نے۔ عبدالرحمٰن خدا کا ایسا تصور میں نے کسی اور مذہب میں نہیں پڑھا اور پھر یہ کہ حضرت محمدؐ صرف اللہ کے messenger اور پرافٹ (پیغمبر) ہیں Jesus کی طرح گاڈ نہیں۔ جس طرح کسی اسکول کا پرنسپل ٹیچر کو کلاس میں اسٹوڈنٹس کو پڑھانے کے لیے بھیجتا ہے۔ اسی طرح اللہ نے حضرت محمدؐ کو ساری دنیا کو تعلیم دینے کے لیے بھیجا ہے۔ جس طرح اسٹوڈنٹس کے لیے ضروری ہے کہ وہ ٹیچر کا کہنا مانیں اور اس کی عزت کریں۔ اسی طرح اسلام میں حضرت محمدؐ کی باتیں ماننے اور ان کی عزت کرنے کو کہا ہے۔ اصل اتھارٹی تو پرنسپل یعنی اللہ تعالیٰ ہے۔ ٹیچر...... پرنسپل کے آرڈرز کو اسٹوڈنٹس تک convey کر کے انہیں گائڈ کرتا ہے کہ ان

آرڈرز پر کس، کس طرح عمل کرنا ہے۔ حضرت محمدؐ بھی ساری دنیا کو گائیڈ کرتے ہیں کہ یہ اسلام کا راستہ ہے اور اس پر چلنے کے لیے کیا طریقے اختیار کرنے چاہئیں کہ راستہ آسان ہو جائے۔ انہوں نے تو ہمارے لیے بہت آسانیاں پیدا کی ہیں کہ ہم کسی اور طرف نہ بھٹکیں اور سب سے اچھی بات یہ لگی ہے کہ محمدؐ نے کہیں بھی نہیں کہا کہ میری عبادت کی جائے بلکہ اس بات کو سختی سے منع فرمایا ہے اور میں نے یہ بھی آبزرو کیا ہے کہ آج اتنی صدیاں گزرنے کے باوجود بھی مسلمان ان کی عزت کرتے ہیں اور احترام کرتے ہیں، خدا جان کر عبادت نہیں کرتے بلکہ ان سے محبت کرتے ہیں۔ عقیدت رکھتے ہیں مگر سجدہ وہ صرف 'اللہ' کو کرتے ہیں۔'' کیتھی نے قدرے جذباتی ہو کر روانی سے بتایا تو عبدالرحمٰن انتہائی متوجہ ہو کر دلچسپی سے اس کی باتیں سنتا رہا۔ دل ہی دل میں وہ حیرت میں بھی مبتلا تھا۔

''ماشاءاللہ کیتھی...... اللہ نے تمہیں کتنا کچھ سمجھا دیا ہے۔ تم نے واقعی اسلام کے بارے میں ٹھیک پڑھا ہے۔ یہ درست بات ہے جو لوگ Converted مسلم ہوتے ہیں وہ اسلام کو زیادہ بہتر طور پر جانتے ہیں اور اس پر زیادہ سے زیادہ عمل کرنے کی کوشش کرتے ہیں، جزاک اللہ!'' عبدالرحمٰن نے اس کی بھرپور تعریف کرتے ہوئے کہا تو کیتھی بھی خوش ہو کر مسکرانے لگی اور یوں دونوں کافی دیر تک اسلام کے بارے میں خوب ڈسکشن کرتے رہے۔ بلکہ کیتھی ہر روز لائبریری سے جو کچھ اسٹڈی کر کے آتی تو وہ رات کو عبدالرحمٰن کو ضرور بتاتی اور اگر کوئی پوائنٹ وضاحت طلب ہوتا تو عبدالرحمٰن اسے گائیڈ کرتا اور اس کے ذہن کو مطمئن کرنے کی کوشش کرتا۔ اس کے ذہن کی پراگندگی اور تذبذب دور کرنے میں عبدالرحمٰن کا بڑا کردار تھا۔

☆☆☆

کیتھی نے ان دنوں کالج جانا بالکل چھوڑ دیا تھا جبکہ کالج میں وہ خصوصی طور پر Sculpture making اور پورٹریٹس بنانے کی تعلیم لے رہی تھی مگر جیسے ہی اس نے پڑھا تھا کہ اسلام میں مجسمے یا مورتیاں بنانا جائز نہیں تو وہ خود بخود رک گئی اور اسے اپنے اس فیصلے پر..... خود بھی حیرانی ہونے لگی کہ اس آرٹ سے اسے بچپن سے لگاؤ تھا۔ وہ اس قدر جذباتی تھی کہ کئی، کئی گھنٹے وہ کوئی اسکیچ بنانے میں لگا دیتی تھی۔ اسے کھانے پینے کا کوئی ہوش نہ ہوتا تھا۔ پیسے جمع کر کے وہ آرٹ میٹریل خریدتی تھی۔ اس کا ایک ہی passion تھا آرٹ کی اس فیلڈ میں نام پیدا کرنا اور اب جو اس کی سوچ کا زاویہ بدلا تھا تو خود بخود اس کا انٹرسٹ اس میں کم ہو گیا تھا۔ اب ایک ہی لگن تھی۔ سر پر ایک ہی دُھن سوار تھی کہ اس کی جستجو کا سفر مکمل ہو اور جس ٹریک پر وہ آنا چاہ رہی ہے خدا اسے اس راہ میں کامیابی عطا کرے۔

پہلے وہ کالج کے بعد لائبریری جاتی تھی اور اب سارا سارا دن لائبریری میں گزارتی۔ گھر آ کر نیٹ پر ریسرچ کرتی یا پھر عبدالرحمٰن سے باتیں کرتی۔ عبدالرحمٰن بھی بہت خوش تھا اور اسے اسلام کی نئی ریسرچ شدہ کتابوں کے بارے میں بتاتا۔ وہ اب جوائے کو بالکل بھولنے لگی تھی۔ جب بھی ذہن میں اس کے بارے میں کوئی سوچ آتی تو وہ اپنے آپ کو یہ کہہ کر مطمئن کر دیتی کہ اسلام قبول کرنے کے بعد بھی تو اس نے اسے چھوڑنا ہی تھا۔ اگر تب وہ اسے چھوڑتی تو شاید جوائے کے لیے یہ شاکنگ ہوتا مگر اب جوائے کے پاس مارینہ تھی اس لیے کیتھی کے چھوڑنے اور جانے کا اسے دکھ نہیں ہوگا۔ اسے جوائے کی مارینہ کے ساتھ انگیجمنٹ خدا کی پلاننگ محسوس ہونے لگی اور اس کے بارے میں سوچ کر اس کا دل مکمل طور پر مطمئن ہو گیا۔

☆☆☆

جمعے کی صبح تھی جب کیتھی نے غسل کر کے نیا ڈریس، لوز ٹراؤزر کے ساتھ لانگ شرٹ پہنی، بالوں کو ڈرائے کر کے ان کی پونی بنائی اور اسکارف کو سر پر اچھی طرح لپیٹ کر اپنے آپ کو آئینے میں دیکھا تو اس کی آنکھوں میں خوشی کی ایک خاص چمک پیدا ہونے لگی۔ تبھی عبدالرحمٰن کا فون آ گیا۔ اس نے اسے مسکرا کر وش کیا۔ کیتھی بیگ کندھے پر

ڈال کر باہر نکلی اور مسز ولسن کو پکارنے لگی مگر اسے کوئی جواب نہ ملا۔ وہ اِدھر اُدھر کمروں میں انہیں تلاش کرنے لگی... کہ اچانک ایک کمرے میں مسٹر ولسن پر اس کی نظر پڑی۔ وہ بیڈ پر لیٹے ہڈیوں کا ڈھانچا لگ رہے تھے۔ چہرے کی سیاہ رنگت اور اندر کو دھنسی آنکھیں...... بیماری نے ان کا برا حال کر رکھا تھا۔ کیتھی نے ان کی طرف دیکھ کر ایک سرد آہ بھری اور ان کے قریب آکر حال پوچھنے لگی۔ ولسن نے چونک کر اسے سر سے لے کر پاؤں تک دیکھا اور اس کے اسکارف کو بغور دیکھنے لگے۔

''کیا تم مسلم ہوگئی ہو؟'' ولسن نے خفگی سے پوچھا۔

''ہاں، ابھی باقاعدہ ہونے جارہی ہوں۔'' کیتھی نے مسکرا کر جواب دیا۔

''بدبخت......'' اور ولسن نے پاس پڑا ایک ڈیکوریشن پیس غصے سے اس کی طرف پھینکا جو اس کے سر پر لگا مگر اسکارف کی وجہ سے بچت ہوگئی۔ شکر ہے وہ ہلکا ہی تھا کیتھی کو غصہ آگیا مگر ان کی حالت دیکھ کر وہ خاموش رہی اور جلدی سے باہر نکل آئی۔

اب اسے احساس ہونے لگا تھا کہ مسز ولسن واقعی بہت مجبور ہیں۔ وہ بھی اس شخص کی بیماری کی وجہ سے بے بس ہیں اور وہ انتہائی بری حالت میں بیڈ پر ایڑیاں رگڑ رہے ہیں مگر اسلام دشمنی میں کتنے توانا ہیں۔ اس نے اسلامک ہسٹری کا جو مطالعہ کر رکھا تھا اس نے اس کی بھرپور مدد کی اور اس کے حوصلے اور ہمت کو توانا رکھا کہ حضرت محمدؐ کے پیروکاروں کو تو اس سے بھی زیادہ اذیتوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا مگر جن کے دلوں میں اسلام بس جائے ان کے لیے ایسی اذیتیں کیا معنی رکھتی ہیں۔ وہ لوگ بھی تو تھے جنہیں جلتے کوئلوں پر برہنہ کر کے چت لٹایا جاتا تھا اور کہا جاتا تھا کہ اسلام سے انکار کردیں مگر وہ صرف کلمۂ طیبہ کا ورد کرتے رہتے۔ کافروں کا غصہ اور غضب مزید بڑھنے لگتا تھا۔ وہ انہیں پہلے سے بھی زیادہ اذیتیں دینے لگتے۔ وہ جتنی زیادہ ان کی اذیتوں میں اضافہ کرتے اتنا ہی ایمان والوں کا ایمان بڑھنے لگتا۔ یہاں تک کہ کئی ایمان والے شہید ہوگئے مگر ان کے جذبۂ ایمانی میں کمی نہ آئی۔ یہ سب اس نے ان کتابوں میں پڑھا تھا اسی طرح مسٹر ولسن کی پہنچائی گئی چوٹ پر اس نے مسکرا کر ہاتھ رکھا اور اپنے دل کو یہ کہہ کر تسلی دی کہ ''اللہ کی راہ پر چلنا آسان نہیں۔ ایسی بہت سی مشکلات اور اذیتیں اسے برداشت کرنی ہوں گی۔'' اس کے دل میں ایمان اور مضبوط ہونے لگا اور اسلامک سینٹر تک کا راستہ اس نے اپنے دل کو تسلی دیتے ہوئے طے کیا۔

جمعے کی وجہ سے لوگوں کی آمدورفت کچھ زیادہ تھی۔ اسلامک سینٹر میں جا کر وہ ایک باپردہ خاتون زینب سے ملی اور انہیں بتایا کہ وہ اسلام قبول کرنا چاہتی ہے۔ زینب نے مسکرا کر اس کے چہرے پر ہاتھ پھیرا اور اسے ویلکم کہا۔ زینب نے اس سے پوچھا کہ وہ اسلام کے بارے میں کیا کچھ جانتی ہے اور جب کیتھی نے انہیں بتایا کہ وہ اسلام کے بارے میں مکمل ریسرچ کر کے آئی ہے تو وہ بہت خوش ہوئیں۔ پھر ایک ادھیڑ عمر شخص کو بلا کر لائیں۔ انہوں نے پینٹ کوٹ کے ساتھ سر پر سفید ٹوپی پہن رکھی تھی۔ سفید داڑھی کے ساتھ ان کا چہرہ بہت نورانی لگ رہا تھا۔ زینب نے انہیں کیتھی کے بارے میں بتایا تو وہ بھی بہت خوش ہوئے۔ اس سے کچھ سوال جواب کیے پھر بسم اللہ پڑھا کر اسے کلمۂ پاک پڑھایا۔ خوشی سے کیتھی کی آنکھوں میں بار، بار آنسو آرہے تھے۔ زینب اور تمام دوسری خواتین بھی اس کے پاس اکٹھی ہوگئیں۔

ان صاحب نے پھر اسے کلمۂ شہادت پڑھانے سے پہلے کچھ سمجھایا۔

''اب جو کلمہ تم پڑھنے جارہی ہو اس کی گواہی تم سے زیادہ تمہارے دل نے دینی ہے۔ کیا تمہارا دل یہ گواہی دینے کو تیار ہے؟'' انہوں نے پوچھا۔

''جی ہاں!'' کیتھی نے گہری سانس لے کر بڑے اطمینان سے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے۔...... پھر پڑھو...... لیکن اپنے دل اور ذہن کی اس قدر سچائی کے ساتھ پڑھو کہ تمہاری روح پر اس کا اثر ہو۔'' انہوں نے پڑھایا تو کیتھی کے اقرار کے ساتھ، ساتھ سب لوگوں نے بھی بلند آواز سے کلمہ شہادت پڑھا۔ ہر طرف کلمے کے الفاظ گونجنے لگے۔ ہر ایک کی آنکھیں فرطِ جذبات سے نم ہونے لگیں۔ کیتھی کا دل بھی انتہائی جذباتی کیفیت سے لبریز ہونے لگا اور وہ آہستہ، آہستہ سسکنے لگی۔

''مسلمان ہونا مبارک ہو۔'' اس سے پوچھ کر اس کا نام، آمنہ رکھا گیا۔ ان صاحب نے اس کے سر پر اپنائیت سے ہاتھ رکھا اور پھر دونوں ہاتھ بلند کر کے اس کے لیے بہت سی دعائیں کیں۔ اس کے بعد تمام خواتین نے اسے باری، باری گلے لگا کر مبارک باد دی۔ کیتھی بے حد خوش تھی۔ اس کا دل کس قدر خوش ہو رہا تھا اور اس وقت جس خوب صورت کیفیت سے وہ دوچار ہو رہی تھی، ایسی کیفیت اس نے زندگی بھر محسوس نہیں کی تھی۔ کچھ خواتین عمرے سے واپس آئی تھیں اور وہ اپنے ساتھ آبِ زم زم اور کھجوریں لائی تھیں۔ زینب نے وہ سب تمام لوگوں میں تقسیم کیں اور آمنہ (کیتھی) کو بھی کھلائیں۔ آبِ زم زم پیتے ہوئے اسے ایک روحانی مسرت سی محسوس ہوئی۔

''اب تم ہر روز میرے پاس آنا تاکہ میں تمہیں اسلامی عبادات اور دوسرے ادب و آداب پر عمل کرنا سکھاؤں۔ اسلام صرف زبان اور دل سے اقرار کرنے کا نام نہیں۔ وہ عمل کرنے پر زیادہ زور دیتا ہے اور سب سے پہلے میں تمہیں وضو کرنا اور نماز پڑھنا سکھاؤں گی۔ کیونکہ تمام عبادات میں اللہ نے سب سے زیادہ نماز پر زور دیا ہے۔ اس کے ساتھ، ساتھ قرآن پاک بھی پڑھنا سکھاؤں گی اور تمام دوسرے مسائل کے بارے میں اسلامی تعلیمات اور احکامات بھی بتاؤں گی۔'' زینب نے مسکراتے ہوئے کہا تو اس نے اثبات میں سر ہلایا اور وہاں سے جانے لگی تو زینب نے اپنے پاس رکھا ایک ہار محبت سے اس کے گلے میں ڈالا اور ایک حجاب اسے گفٹ کیا۔ اس نے شکریہ ادا کیا اور خوشی، خوشی گھر کی راہ لی۔

وہ بے حد خوش تھی کہ سب سے پہلے خوشی کی یہ خبر وہ مسز ولسن کو اور پھر عبدالرحمٰن کو سنائے گی۔ عبدالرحمٰن کو معلوم تھا کہ وہ اسلامک سینٹر جا رہی ہے مگر مسز ولسن کو کوئی خبر نہ تھی۔ وہ یہی سوچ رہی تھی کہ مسز ولسن بھی آج بہت خوش ہوں گی اور حقیقت میں اس راہ پر لانے اور گائڈ کرنے والی مسز ولسن ہی تھیں۔ مگر بیچاری خود کتنی مجبور تھیں۔ وہ خوشی، خوشی گھر پہنچی تو گھر میں ہر طرف گہرا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ اس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ مسز ولسن اسے کہیں دکھائی نہ دیں۔ وہ پریشان ہونے لگی۔ وہ جلدی سے مسٹر ولسن کے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر گئی اور ان سے مسز ولسن کے بارے میں پوچھنے لگی۔ وہ ایک دم سسکیاں بھر کر رونے لگے۔

''ک...... کیا ہوا...... مسز ولسن کہاں ہیں؟'' کیتھی جو اب آمنہ بن چکی تھی نے گھبرا کر پوچھا۔

''اسپتال میں۔'' ولسن نے روتے ہوئے جواب دیا۔

''کیوں...... کیا ہوا؟'' آمنہ نے پھر گھبرا کر پوچھا۔

''روڈ ایکسیڈنٹ میں اس کی ڈیتھ ہوگئی ہے۔'' ولسن نے سسکی بھر کر کہا۔

''کیا......؟'' آمنہ کا منہ حیرت سے کھلے کا کھلا رہ گیا اور ایک دم اس کی آنکھوں سے آنسو رواں ہونے لگے اور وہ ہچکیاں بھرنے لگی۔ وہ تو نہ جانے کیا کچھ سوچ کر آئی تھی کہ مسز ولسن اس کے بارے میں جان کر کتنی خوش ہوں گی...... اور وہ خود اس موقع کی منتظر تھیں۔ شاید مسز ولسن کی ڈیتھ کا انتظار کر رہی تھیں اور خود ان کی اپنی ڈیتھ ہوگئی۔ انہیں کلمہ پڑھنے کا موقع ہی نہ ملا۔ ان کا دل مسلمان ہو چکا تھا مگر زبان سے اقرار کرنے کی توفیق نہیں ملی تھی۔ اسے اسی بات کا شدید صدمہ ہو رہا تھا۔ مسٹر اینڈ مسز جانسن بھی آگئے تھے اور جب انہیں کیتھی کے مسلم ہونے کا پتا چلا تو انہوں نے بھی ناگواری کا اظہار کیا اور وہ جو پہلے اس کے ساتھ بہت محبت سے پیش آتے تھے اب ان کے چہروں پر

اس کے لیے خفگی کے تاثرات تھے۔ آمنہ کو ان کا رویہ بہت ہرٹ کرنے لگا مگر وہ خاموش رہی۔
مسز ولسن کی burial (تدفین) تک الزبتھ بھی پہنچ گئی تھی اور جب مسز ولسن کی تدفین کرسچن grave yard میں کرسچنز رسومات کے مطابق ہونے لگی تو آمنہ نے پریشان ہو کر الزبتھ کی طرف دیکھا اور اس کے کانوں میں سرگوشی کرنے لگی۔
''مسز ولسن...... مسلم تھیں۔ انہوں نے مجھے بتایا تھا کہ وہ دل سے مسلم ہو چکی ہیں۔ الزبتھ ان کو کرسچنز کی طرح مت دفن کرو۔'' آمنہ نے پریشان ہو کر کہا تو الزبتھ نے آہ بھر کر اس کی طرف دیکھا۔
''مگر ممی نے اپنا مسلم ہونا اناؤنس نہیں کیا تھا۔ ابھی وہ کرسچن کمیونٹی کا ہی حصہ ہیں۔ میں انہیں کیسے روک سکتی ہوں؟'' الزبتھ نے پریشان ہو کر کہا مگر آمنہ بری طرح پریشان ہو گئی۔
''لیکن میں انہیں روک سکتی ہوں۔'' آمنہ نے جذباتی ہو کر کہا اور جیسے ہی پادری مسز ولسن کے لیے دعائیں پڑھنے لگا تو آمنہ خفگی سے آگے بڑھی۔ الزبتھ پریشان ہو کر اسے دیکھنے لگی۔
''مسز ولسن...... مسلمان تھیں آپ انہیں یہاں ایسے دفن نہیں کر سکتے۔'' آمنہ نے آگے بڑھ کر پادری کو کہا تو مسٹر اینڈ مسز جانسن کے علاوہ مسز ولسن کے تمام فیملی ممبرز اور فرینڈز غصے میں آ گئے۔
''شٹ اپ...... کیتھی...... تم نے کیوں ایسی فضول بکواس کی۔ مسز ولسن کبھی مسلمان نہیں ہوئیں...... تم ان پر الزام لگا رہی ہو۔ کیونکہ تم مسلم ہو کر خود جنونی اور پاگل ہو رہی ہو جسٹ گیٹ آؤٹ فرام ہیئر۔'' مسٹر جانسن نے اسے غصے سے بازو پکڑ کر دھکے دیتے ہوئے وہاں سے باہر نکال دیا۔ الزبتھ پریشان ہو کر رونے لگی۔ آمنہ بھی روتی ہوئی گھر واپس آ گئی۔ اسے شدید دکھ ہو رہا تھا اور اس کے کانوں میں بار، بار اس آیت کے الفاظ گونج رہے تھے۔ ''اور تم مرنا تو مسلمان ہی مرنا۔'' مسز ولسن مسلم دل رکھنے کے باوجود بھی مسلمان ہو کر نہیں مری تھیں اور اس بات کا اسے شدید رنج ہو رہا تھا۔ رات کو جب اس نے عبدالرحمٰن کو یہ بات بتائی تو بتاتے ہوئے وہ رو پڑی تھی۔ وہ اسے دلاسا دینے لگا۔
''اسی لیے تو کہتے ہیں کہ جب آپ کسی نیک کام کو کرنے کا ارادہ کریں تو اسے فوراً انجام دے دیں، ہو سکتا ہے بعد میں آپ کو اس کی توفیق یا مہلت ملے نہ ملے۔ اب یہ معاملہ تو اللہ کے پاس ہے کہ اگر مسز ولسن نے تنہائی میں بھی کلمہ پڑھا ہو گا تو اللہ ان کے ایمان کو ضائع نہیں کرے گا مگر ہم لوگ دنیاوی مصلحتوں کا شکار ہو کر اپنی آخرت بھی گنوا بیٹھتے ہیں۔'' عبدالرحمٰن نے آہ بھر کر کہا تو وہ بھی یک دم پریشان ہو گئی اور جلدی سے الزبتھ کے پاس گئی اور جا کر اس سے پوچھنے لگی کہ کیا مسز ولسن نے تنہائی میں کلمہ پڑھا تھا۔
''نہیں، وہ منتظر تھیں...... کہ......'' الزبتھ اتنا کہہ کر خاموش ہو گئی اور اس کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔
''اور...... الزبتھ...... کیا تم نے کلمہ پڑھ کر اسلام قبول کر لیا ہے؟'' آمنہ نے اس کی طرف بغور دیکھتے ہوئے پوچھا۔
''نہیں...... میں ان دنوں پلان کر ہی رہی تھی کہ......'' الزبتھ نے آہ بھر کر کہا۔
''پلیز...... اب تم اپنا ٹائم مت ویسٹ کرو۔ جس طرح مسز ولسن کو موقع نہیں ملا ممکن ہے تمہیں بھی نہ ملے تو اس لیے تم بس جلدی سے اپنے مسلم ہونے کا اناؤنس کر دو۔'' آمنہ نے اسے سرگوشی میں کہا تو مسز جانسن کمرے سے باہر نکلیں اور آمنہ کو یہ کہتے سن کر وہ ایک دم ہائپر ہو گئیں۔
''کیتھی...... تم ہر ایک کو ٹریپ کرنے کی کوشش کیوں کر رہی ہو؟ اگر تم راستے سے بھٹک گئی ہو تو دوسروں کو مت بھٹکاؤ۔'' مسز جانسن نے اس کی طرف بغور دیکھتے ہوئے کہا۔
''میں بھٹکی ہوئی نہیں بلکہ اب صراطِ مستقیم پر چلنا شروع کیا ہے اور میرا نام آمنہ ہے کیتھی نہیں۔'' اس نے گہری سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔

''ہونہہ...... بھنگی نہیں۔ دیکھنا اب تم کیسے جنونی اور پاگل ہوتی جاؤ گی۔ الزبتھ تم اس کی باتوں میں بالکل نہیں آنا۔ we are pruod of being christians۔'' مسز جانسن نے قدرے خفگی سے آمنہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تو آمنہ آہ بھر کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔

''مسز جانسن! کیا آپ میرے خلاف اس لیے ہوگئی ہیں کہ میں مسلم ہوگئی ہوں؟'' آمنہ نے اس کی طرف بغور دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں...... تم نے اپنے ریلیجن کو چھوڑ کر یہ بتانا چاہا ہے کہ کرسچن ریلیجن ٹھیک نہیں ہے اور تم نے ہم کرسچنز کو جھوٹا ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔'' مسز جانسن نے خفگی سے کہا۔

''ہاں...... اور یہ بات بالکل سچ ہے کہ اسلام سے بڑھ کر سچا مذہب کوئی اور نہیں آپ لوگ صرف اسلام سے grudge کی وجہ سے اس کی blessings سے جان بوجھ کر محروم ہو رہی ہیں۔ آپ لوگ نہیں جانتے کہ اسلام دنیا کے لیے کتنی بڑی نعمت ہے۔'' آمنہ نے کہا۔

''بکواس بند کرو۔ ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ کیا ٹھیک ہے اور کیا غلط۔ مسلمان اسی طرح دوسروں کے دلوں میں زہر بھرتے ہیں کہ ان کے اپنے بھی ان کے خلاف ہو جاتے ہیں۔'' مسز جانسن نے نہایت غصے سے کہا۔

''مسلمان کسی کے دل میں زہر نہیں بھرتے، اسلام میں اتنی پوٹینشل ہے کہ جب وہ پوری سچائی کے ساتھ کسی کے دل میں بستا ہے تو وہ اس کے لیے ایسی طاقت بن جاتا ہے کہ وہ انسان ہر مخالفت کا سامنا کرنے کو تیار ہو جاتا ہے۔'' آمنہ نے قدرے جذباتی انداز میں کہا تو مسز جانسن نے چونک کر اسے دیکھا۔

''الزبتھ! تم اس کی باتوں میں نہ آنا...... بلکہ تم میرے ساتھ چلو...... اب تمہیں یہاں رہنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ الزبتھ تم میرے ساتھ چلو۔'' مسز جانسن نے انتہائی غصے سے آمنہ کی طرف دیکھتے ہوئے الزبتھ کا ہاتھ پکڑنا چاہا۔

''ڈیڈ کی طبیعت بھی ٹھیک نہیں ہے۔ میں انہیں چھوڑ کر کیسے جاسکتی ہوں؟'' الزبتھ نے آہ بھر کر کہا۔

ولسن کے بھی آخری لمحات آگئے تھے اور جانسن نے اسے اسپتال میں ایڈمٹ کر دیا تھا۔ آمنہ خاموشی سے اپنے کمرے میں چلی گئی۔ اسے سب کے بدلے ہوئے رویے دیکھ کر بہت دکھ ہو رہا تھا۔

☆☆☆

اگلے روز آمنہ بیدار ہوئی تو اسے اپنے کمرے کے باہر عجیب سی ہلچل سنائی دی اور کہیں، کہیں سسکیاں بھی سنائی دینے لگیں وہ ایک دم گھبرا کر اٹھی اور باہر لاؤنج میں آئی تو الزبتھ، مسز جانسن کے گلے لگ کر رو رہی تھی اور مسز جانسن اسے پیار کرتے ہوئے تسلیاں دے رہی تھیں۔

''کک...... کیا ہوا؟'' آمنہ نے قدرے حیرت سے پوچھا۔

''ڈیڈ کی ڈیتھ ہوگئی ہے۔'' الزبتھ نے روتے ہوئے بتایا تو آمنہ ایک دم پریشان ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔

''اوہ، آئی ایم سوری۔'' اس نے آہ بھر کر کہا۔ الزبتھ روتی جا رہی تھی۔ آمنہ نے آگے بڑھ کر اسے اپنے ساتھ لگانا چاہا تو مسز جانسن نے قدرے خفگی سے اسے دیکھتے ہوئے اس کا ہاتھ پیچھے ہٹایا تو آمنہ کو ایک دم شاک لگا۔ اس نے نم آنکھوں سے مسز جانسن کی طرف دیکھا اور ہونٹ کاٹتے ہوئے وہاں سے چلی گئی۔ اپنے کمرے میں جا کر اس نے کوٹ پہن کر اسکارف لیا اور اس سے اپنے سر کو اچھی طرح کور کر کے باہر چلی گئی۔

''الزبتھ...... تم آج ہی یہ گھر چھوڑ دو۔ اب ہم تمہیں یہاں نہیں رہنے دیں گے ورنہ یہ لڑکی تمہارا بھی دماغ خراب کر دے گی۔'' مسز جانسن نے قدرے خفگی سے کہا اور الزبتھ کا ہاتھ پکڑ کر وہاں سے باہر چلی گئیں۔

آمنہ اسلامک سینٹر پہنچی تو بہت زیادہ اپ سیٹ تھی۔ زینب نے اس کے چہرے پر پریشانی کے تاثرات دیکھے تو

اس کا ہاتھ پکڑ کر نرمی سے وجہ پوچھنے لگیں۔ آمنہ کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔

''مجھے سمجھ میں نہیں آرہا کہ لوگوں کو اسلام سے اتنی دشمنی کیوں ہے۔ وہی لوگ جو مجھ سے محبت کرتے تھے جب ان کو پتا چلتا ہے کہ میں نے اسلام قبول کرلیا ہے اور مسلمان ہو چکی ہوں تو ایک دم ان کی محبت، نفرت میں بدل جاتی ہے اور ان کا رویہ میرے ساتھ اتنا تلخ ہو جاتا ہے کہ مجھ سے برداشت نہیں ہوتا۔'' آمنہ نے نہایت دکھی لہجے میں بتایا تو زینب مسکرا کر اس کی طرف دیکھنے لگیں۔

''صبر اور برداشت یہی تو مومن کی نشانیاں ہیں۔ اگر تم نے اسلامک ہسٹری پڑھی ہے تو تمہیں معلوم ہوگا کہ ایک کلمے کی خاطر ابتدائی مسلمانوں نے کیا، کیا تکلیفیں برداشت نہیں کیں جبکہ وہ لوگ سچے بھی تھے اور انہوں نے سچ کو ہی قبول کیا تھا۔ اگر دیکھا جائے تو ایک انسان کے سچ قبول کرنے سے کسی دوسرے کو کیا تکلیف ہو سکتی ہے، یہ تو ہر انسان کا ذاتی فیصلہ ہوتا ہے کہ وہ سچ کو مانے یا جھوٹ کو؟ کسی دوسرے انسان کو اس میں دخل اندازی کا کوئی حق نہیں ہوتا لیکن پھر بھی کافروں نے صرف اور صرف اسلام دشمنی کی وجہ سے ان لوگوں کو تکلیفیں پہنچائیں مگر وہ صبر پر ڈٹے رہے اور پھر وہ وقت آیا کہ کافروں نے ان کے حوصلے، ایمان اور صبر کے سامنے ہتھیار ڈال دیے اور اسلام کو قبول کر کے انہوں نے اپنی ہار مان لی۔ اسی لیے تم بھی صبر کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑو۔ اللہ انسان کے ایمان کا سب سے بڑا قدردان ہے اور جو اس کے راستے میں ذرا سی تکلیف اٹھاتا ہے تو اللہ اسے ضرور اپنی رحمت سے نوازتا ہے۔'' زینب نے اس کا ہاتھ پکڑ کر محبت اور نرمی سے سمجھایا تو آمنہ نے مسکرا کر ان کی طرف دیکھا اور اس کے بے قرار دل کو سکون سا ملنے لگا۔

''لیکن لوگ اسلام کے اتنے خلاف کیوں ہیں؟ کیا اتنی اسلام دشمنی کی وجہ ان کا حسد ہے مگر کس قسم کا حسد......؟'' آمنہ نے انتہائی حیرت سے پوچھا۔

''ہاں، دنیا کے تمام مذاہب کا مطالعہ کرو اور پھر اس مذہب کی تعلیمات کا اثر اس کے پیروکاروں میں دیکھو تو تمہیں صاف پتا چلے گا کہ جو کامیابی اسلام کو نصیب ہوئی ہے اور ابھی تک ہو رہی ہے وہ کسی اور مذہب کو نہیں ہوئی۔ اسلام کے علاوہ کسی اور مذہب نے اتنی شدت سے لوگوں کے دلوں اور ذہنوں کو نہیں بدلا اور نہ ہی کسی اور مذہب کے پیروکاروں نے اپنے مذہب کی خاطر جان و مال کی اتنی قربانیاں دی ہیں جتنی کہ مسلمانوں نے دی ہیں۔ جب سے اسلام دنیا میں آیا ہے۔ تب سے اس کے منکرین اس کی طاقت سے خوف زدہ ہیں اور ان کا یہ حسد مختلف انداز سے ظاہر ہوتا رہتا ہے۔ اس لیے تم اپنے دل کو مضبوط رکھو اور ہرگز گھبرانے کی ضرورت نہیں کیونکہ یہ اللہ کا وعدہ ہے کہ وہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے اور جس کے ساتھ اس کا اللہ ہوتا ہے تو اسے دنیا کی کسی جھوٹی طاقت سے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی۔'' زینب نے اس قدر پُراثر انداز میں اسے سمجھایا کہ اس کے دل میں ایک دم حرارت سی پیدا ہونے لگی اور اس کے مضطرب دل میں ایک دم اطمینان سا پیدا ہونے لگا۔ اس نے مسکرا کر زینب کی طرف دیکھا تو انہوں نے محبت سے اس کے کندھے پر تھپکی دی۔

''آؤ میں آج تمہیں نماز سکھاتی ہوں اور جب تم کسی بات سے پریشان ہو تو نماز پڑھنا۔ تمہارے دل کو خود بخود سکون مل جائے گا۔ کیونکہ نماز میں ہم اپنے اللہ سے باتیں کرتے ہیں۔ اور دعا پڑھتے ہوئے اپنے سارے دکھ اسے بتا کر اس سے مدد مانگتے ہیں اور وہ ہمارے لیے آسانیاں پیدا کرتا ہے۔'' زینب نے مسکرا کر کہا اور اسے نماز کی بابت بتانے لگیں۔ اس سے پہلے زینب نے طہارت اور پاکیزگی کے بارے میں اسے خاصی تفصیل سے بتا دیا تھا۔ اب اس کا زیادہ تر وقت یہیں گزرتا تھا۔

☆☆☆

اس روز آمنہ اسلامک سینٹر جانے کے لیے اپنے اپارٹمنٹ سے باہر نکلی تو الزبتھ قدرے بھاگتی ہوئی اس کے

پیچھے آئی اور اسے بلند آواز میں پکارنے لگی۔ آمنہ نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو مسکرا کر اس کے پاس پلٹ گئی۔ الزبتھ بری طرح ہانپ رہی تھی۔
''ہائے..... الزبتھ کیا ہوا؟'' آمنہ نے اس کا بازو پکڑتے ہوئے پوچھا۔
''تم کہاں جارہی ہو..... کیا اسلامک سینٹر.....؟'' الزبتھ نے پوچھا۔
''ہاں..... مگر تم کیوں پوچھ رہی ہو؟'' آمنہ نے حیرت سے پوچھا۔
''میں بھی تمہارے ساتھ جاؤں گی۔'' الزبتھ نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔
''وہاٹ..... رئیلی.....؟'' آمنہ نے قدرے خوشی سے چلاتے ہوئے پوچھا۔
''ہاں..... لیکن پلیز..... اس بات کی خبر مسز جانسن کو نہ ہو۔ وہ میرے بہت خلاف ہوگئی ہیں لیکن آج میں نے پکا ارادہ کرلیا ہے کہ میں بھی مسلم ہوجاؤں گی۔ مام کو اللہ نے موقع نہ دیا مگر میں آج یہ چانس avail کرنا چاہتی ہوں۔ میں سوچتی تھی یہاں آکر مام کے ساتھ جا کر اسلامک سینٹر میں اسلام قبول کروں گی..... مگر.....'' وہ آہ بھر کر نم آنکھوں سے بولی۔
''لیکن مسز ولسن تو کہتی تھیں کہ تم نے امریکا میں اسلام قبول کرلیا ہے؟'' آمنہ نے حیرت سے پوچھا۔
''میں، مام کا حوصلہ بڑھانے کے لیے کہتی تھی۔ نہ جانے کیوں میرے دل میں ان کے لیے خوف سا تھا۔ خیر ان باتوں کو چھوڑو..... چلو..... اب چلتے ہیں۔'' الزبتھ نے اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔
''کیا تم نے غسل کر کے صاف ڈریس پہنا ہے؟'' آمنہ نے پوچھا۔
''کیا یہ ضروری ہے؟'' الزبتھ نے چونک کر پوچھا۔
''نہیں..... لیکن اپنے اطمینان کے لیے ہم پاک ہونے جارہے ہیں۔ پاک ڈریس پہننا چاہیے۔ شاور لے کر اپنے جسم کو پاک کرنا چاہیے۔'' آمنہ نے مسکرا کر اس سے کہا۔
''اوکے..... پھر میں ابھی شاور لے کر آتی ہوں۔ تم میرا یہیں ویٹ کرنا۔'' الزبتھ نے جلدی سے کہا اور بھاگتی ہوئی گھر چلی گئی۔
آمنہ روڈ سائڈ پر بنی ایک بینچ پر بیٹھ گئی اور اپنے بیگ سے ایک اسلامک بک نکال کر پڑھنے لگی۔
جوائے، کالج جانے کے لیے گھر سے باہر نکلا تو نہ جانے کیوں اسے کیتھی بہت یاد آنے لگی اور پیرن نے بھی اسے بہت زور دیا تھا کہ وہ اس کے بارے میں پتا کرے کہ وہ کہاں ہے۔ وہ کالج جانے کے بجائے کیتھی (آمنہ) سے ملنے آگیا۔ جب وہ کیتھی کے اپارٹمنٹ کے باہر پہنچا تو اس نے کیتھی کو بینچ پر بیٹھے دیکھا۔ وہ ایک دم اسے دیکھ کر چونکا اور گاڑی ریورس کر کے اس کے قریب آیا۔ وہ کتاب پڑھنے میں اتنی محو تھی کہ اسے جوائے کی آمد کا احساس ہی نہیں ہوا۔ جوائے قدرے تیزی سے گاڑی سے نکل کر اس کے قریب آیا اور انتہائی حیرت سے کیتھی کے اسکارف کی طرف دیکھنے لگا۔
''کیتھی..... تم؟'' جوائے نے قدرے حیرت سے پوچھا تو اس نے ایک دم سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔
''جوائے..... تم یہاں.....؟'' اس نے قدرے حیرت سے پوچھا۔
''یہ..... تم نے سر پر کیا پہن رکھا ہے؟'' جوائے نے قدرے بدتمیزی سے اس کے سر سے اسکارف کو کھینچتے ہوئے کہا تو آمنہ کے سر سے اسکارف اتر گیا۔ اس کی آنکھوں میں ایک دم خون اتر آیا۔ غصے اور شرمندگی سے اس کا چہرہ سرخ ہونے لگا اور اس نے زور سے ایک تھپڑ جوائے کے چہرے پر لگایا۔
''ایک مسلم عورت کی عزت اس کا یہ حجاب ہے اور وہ کسی کو اجازت نہیں دے سکتی کہ وہ اس کو ہاتھ بھی

لگائے۔" آمنہ نے انتہائی غصے سے چلاتے ہوئے کہا تو جوائے ایک دم ہکا بکا ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔

"وہاٹ..... مسلم..... ہاؤ ڈیئر یو..... تم جانتی بھی ہو کہ آئی ہیٹ مسلمز۔" جوائے غصے سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"how dare you to hate Muslims?" آمنہ نے بھی غصے سے کہا تو جوائے اس کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر مزید حیران رہ گیا۔ وہ کبھی اس کے ساتھ اس لہجے میں نہیں بولی تھی اور نہ ہی اس کے چہرے پر اتنے غصے کے تاثرات پہلے کبھی اس نے دیکھے تھے۔ اس کی آنکھیں شعلے برسا رہی تھیں۔ جوائے کو ایک دم خوف سا محسوس ہونے لگا اور اس نے ایک دم اپنا لہجہ نرم کرتے ہوئے کہا۔

"کیتھی....." جوائے نے کچھ کہنا چاہا۔

"اب میں آمنہ ہوں۔" اس نے اس کی بات کاٹ کر چلاتے ہوئے کہا تو جوائے ایک دم پریشان ہو کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔

"تم..... تم نے یہ سب کب اور کیوں کیا؟" جوائے نے قدرے خفگی سے پوچھا۔

"میں نے بہت ریسرچ کرنے کے بعد جو مناسب سمجھا وہی کیا ہے اور مجھے اسلام کا راستہ ہی ٹھیک لگا اس پر میں نے چلنے کا فیصلہ کر لیا۔" آمنہ نے اسکارف کو اپنے سر پر دوبارہ اوڑھتے ہوئے کہا تو اسی لمحے الزبتھ شاور لینے کے بعد نیا ڈریس پہن کر آ گئی اور دونوں کو باتیں کرتے دیکھ کر کچھ فاصلے پر ہی رک گئی اور حیرت سے ان کی باتیں سننے لگی۔

"کیا تم نہیں جانتیں کہ ہم دونوں نے شادی کے بارے میں کیا پلان کر رکھا ہے؟" جوائے نے خفگی سے پوچھا۔

"میں تم سے ہر گز شادی نہیں کروں گی اور ویسے بھی اسلام میں مسلم عورت، غیر مسلم مرد سے شادی نہیں کر سکتی۔ جوائے تمہارے اور میرے راستے جدا، جدا ہیں اور اب تم مجھ سے ملنے کبھی مت آنا کیونکہ میں بھی تم جیسے اینٹی مسلم کو پسند نہیں کرتی۔" آمنہ نے قدرے خفگی سے کہا تو جوائے اس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔

"تو کیا تم کالج بھی نہیں آؤ گی؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"میں نے کالج جانا چھوڑ دیا ہے کیونکہ میں جو آرٹ سیکھ رہی تھی وہ بھی اسلام میں جائز نہیں۔" آمنہ نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا تو جوائے ایک دم irritate ہونے لگا۔

"اسلام..... اسلام..... ٹو ہیل ود یو اینڈ یور اسلام۔" جوائے غصے سے دانت کچکچا کر بولا تو آمنہ کو اس کی بات سن کر شدید غصہ آ گیا۔

"جسٹ شٹ اپ۔" آمنہ نے اسے غصے سے کہا اور الزبتھ کا ہاتھ پکڑ کر وہاں سے چلی گئی۔ جوائے نے انتہائی غصے سے گاڑی پر مکے مارے اور انتہائی ریش ڈرائیونگ کرنے لگا۔ وہ غصے میں آپے سے باہر ہو رہا تھا اور اس کا سر چکرانے لگا تھا۔ اسے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ اسے کیتھی کے ساتھ گزارا ایک، ایک لمحہ یاد آنے لگا تھا۔ وہ دونوں بہت اچھے فرینڈز رہے تھے گو کہ وہ آج کل اپنی نئی گرل فرینڈ مارینہ کے ساتھ بہت زیادہ انوالو ہو گیا تھا مگر اس کے دل میں مارینہ کے لیے کبھی وہ فیلنگز پیدا نہیں ہوئی تھیں جو کیتھی کے لیے تھیں۔ اس نے کبھی مارینہ کے ساتھ شادی کا نہیں سوچا تھا۔ شادی کے لیے اس کا انتخاب صرف کیتھی تھی اور کیتھی نے اس کی جتنی انسلٹ کی تھی اس نے اسے قدرے پاگل بنا دیا تھا اور اس پر مزید یہ کہ وہ "مسلم" ہو گئی تھی۔ یہ سن کر تو اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی تھی اور اب وہ اس آگ کے شعلوں میں بری طرح جھلس رہا تھا۔ اس نے کالج جانے کے بجائے مارینہ کے اپارٹمنٹ کا رخ کیا۔ مگر وہ بھی گھر پر موجود نہیں تھی۔ اس لمحے اسے کسی ایسے دوست یا سہارے کی ضرورت تھی جس کے ساتھ وہ شیئر کر کے شدت سے ..... وہ ڈرائیو کرتا ہوا ویران سڑک پر تنہا جا رہا تھا اور

اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ اسے کیتھی پر غصہ بھی آرہا تھا اور انتہائی افسوس بھی ہورہا تھا۔

☆☆☆

الزبتھ اسلامک سینٹر سے مسلمان ہو کر آئی تو اس کا نام عائشہ رکھا گیا اور اس نے جیسے ہی مسٹر اینڈ مسز جانسن کو اس کے بارے میں بتایا تو انہوں نے غصے میں اسے دیکھ کر منہ پھیر لیا اور لاتعلقی کا اظہار کیا۔ وہ انہیں چھوڑ کر باہر نکل آئی۔ اس کے پاس کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ کیتھی اسے اپنے گھر لے آئی اور اسے تسلیاں دینے لگی۔

''عائشہ! (الزبتھ) تم ہمت نہ ہارو اور بالکل پریشان نہ ہو۔ مسلمان بن کر تمہارے دل کو جو اطمینان اور سکون نصیب ہوگا اس کے سامنے یہ ساری پریشانیاں بہت معمولی ہیں۔ جب کسی کو یہ احساس ہوتا ہے کہ اس کے ساتھ اس کا 'اللہ' ہے اور وہ اس کے راستے میں تکلیفیں اٹھا رہا ہے تو ان تکلیفوں میں بھی ایک لذت محسوس ہوتی ہے۔ تم میرے پاس یہاں رہ سکتی ہو اور جب تک تمہیں کوئی مناسب جاب نہیں ملتی تمہیں فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔'' آمنہ (کیتھی) نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

''تھینک یو...... لیکن میں واپس امریکا جانے کا سوچ رہی ہوں...... مجھے وہاں جابز کی بہت اچھی آفرز تھیں......'' عائشہ نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

''ایز یو وش...... تم جیسا مناسب سمجھو...... مگر یہاں تم میری فرینڈ ہو...... میری اسلامک سسٹر ہو۔'' آمنہ نے مسکرا کر کہا۔

''شکریہ تمہاری اس محبت کا......'' عائشہ نے بھی مسکرا کر کہا اور اس کے ساتھ باتیں کرنے لگی۔ باتوں باتوں میں عائشہ نے اس سے جوائے کے بارے میں پوچھا۔

''وہ مجھ سے محبت کرتا تھا...... اور مجھ سے شادی کرنا چاہتا تھا...... لیکن...... وہ اسلام اور مسلمز کے سخت خلاف ہے۔'' آمنہ نے بھرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

''کیوں......؟'' عائشہ نے حیرت سے پوچھا۔

''معلوم نہیں...... اس نے اسلام دشمنی کی وجہ کبھی نہیں بتائی...... میں نے کئی بار پوچھا بھی...... لیکن وہ خاموش رہا...... مگر اس کے اندر مسلمز کے خلاف اتنا زہر بھرا ہوا ہے کہ اس کا بس چلے تو وہ سب مسلمز کو ختم کر ڈالے اور دنیا میں کسی مسلم کو بھی زندہ نہ چھوڑے۔'' آمنہ نے اسے بتایا۔

''رئیلی......؟'' عائشہ نے حیرت سے آنکھیں پھیلا کر پوچھا۔

''ہاں...... اسی لیے تو وہ میرے ایک دم خلاف ہوگیا جب اسے پتا چلا کہ میں مسلم ہوگئی ہوں۔ اس نے اپنے سارے تعلقات، فرینڈ شپ...... محبت سب کچھ بھلا دیا...... اور میں اسے ایک دم سخت بری لگنے لگی کیونکہ میں مسلم ہوگئی ہوں......'' آمنہ نے اِک ٹھنڈی آہ بھر کر بتایا۔

''کیا تمہیں اس کے جانے کا افسوس ہورہا ہے...... آف کورس تم نے اس کے ساتھ لائف کے بارے میں پلاننگ تو کی ہوگی۔'' عائشہ نے کریدتے ہوئے پوچھا۔

''اگر میں مسلم نہ ہوتی اور وہ مجھے چھوڑ کر چلا جاتا تو شاید مجھے شدید دکھ محسوس ہوتا مگر اب مجھے کوئی ملال نہیں ہورہا۔'' آمنہ نے گہری سانس لیتے ہوئے پُرسکون لہجے میں کہا۔

''کیوں......؟'' عائشہ نے چونک کر پوچھا۔

''اس لیے کہ جب اللہ کہتا ہے کہ تمہارا جینا، تمہارا مرنا، تمہاری محبت اور نفرت سب کچھ میرے لیے ہونی چاہیے تو پھر دل خود بخود مطمئن ہونے لگتا ہے۔'' آمنہ نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا تو عائشہ مسکرا کر اسے دیکھنے لگی۔

''عائشہ اب تم ریسٹ کرو میں تمہارے لیے کافی بنا کر لاتی ہوں۔'' آمنہ نے کہا اور مسکراتی ہوئی کمرے سے باہر چلی گئی۔

رات کو جب وہ اپنے کمرے میں سونے کے لیے لیٹی تو اسے جوائے کی حرکت پر انتہائی افسوس اور غصہ آنے لگا جب اس نے..... اس کے سر سے حجاب اتارا تھا..... اس کی آنکھیں نم ہونے لگیں۔

''معلوم نہیں..... تم مسلمز سے کیوں اتنی نفرت کرتے ہو..... کاش تم مجھے موقع دو تو میں تمہیں بتاؤں کہ تم کتنی بڑی نعمت کو ٹھکرا رہے ہو..... تمہیں احساس ہی نہیں کہ اسلام دنیا کے لیے کتنی بڑی رحمت اور نعمت ہے مگر جن لوگوں کے دلوں پر اللہ نے مہر لگا دی ہے۔ وہ واقعی گونگے، بہرے اور اندھے بن جاتے ہیں..... ہدایت ان پر بھی اثر نہیں کرتی۔'' وہ کتنی ہی دیر جوائے کے رویے پر افسوس کرتی رہی..... وہ اپنی ہی سوچوں میں گم تھی جب عبدالرحمن کا فون آ گیا..... اور وہ موڈ بدل کر اس سے باتیں کرنے لگی۔ عبدالرحمن اسے خوشی، خوشی بتانے لگا کہ اس نے اپنی آرٹ ایگزیبیشن لگائی تھی جو بہت کامیاب رہی ہے۔ اس نے قرآنی آیات کی بہت خوب صورت انداز میں abstract painting کے ساتھ کیلیگرافی کی تھی اور اسے میڈیا نے بہت زیادہ کوریج دی..... اور اسے اتنی زیادہ appreciation ملی تھی کہ وہ بے حد خوش تھا..... وہ آمنہ کو ایک، ایک بات بتا کر خوش ہو رہا تھا اور اس نے اپنی پینٹنگز کی پکچرز بھی اسے بھجوائی تھیں اور آمنہ بھی بہت تعریف کر رہی تھی۔

''جب میں جرمنی سے آیا تھا تو بہت زیادہ مایوس تھا لیکن صرف خدا پر یقین تھا کہ وہ میرے لیے کوئی بہتر وسیلہ پیدا کرے گا اور مجھے اب بھی یقین نہیں آ رہا کہ وہ میرے لیے کیسے، کیسے اسباب پیدا کر رہا ہے..... اس نے میرے آرٹ ٹیچر عبداللہ کی صورت میں میری ایسی مدد کی ہے کہ میں اب پہلے سے بھی زیادہ کونفیڈنٹ ہوتا جا رہا ہوں..... عبداللہ کی وجہ سے میں خود بھی بہت کچھ سیکھ رہا ہوں۔ اور میرا کالج بھی بہت پروگریس کر رہا ہے۔'' عبدالرحمن نے خوش ہو کر بتایا۔

''عبدالرحمن..... تمہارے اس یقین کی وجہ سے میرے اندر بھی بہت چینجز آئی ہیں..... جب تم اپنی اسٹڈیز اور اپنا کیریر صرف اللہ کے بھروسے پر چھوڑ کر چلے گئے اور صرف اس وجہ سے کہ جوائے تمہارے مذہب کو برا کہہ کر تمہیں tease کرتا تھا اور تم یہ سب برداشت نہیں کر سکتے تھے تو میں بہت چونکی تھی کہ تمہارے لیے اپنے وجود سے بڑھ کر اپنا مذہب زیادہ عزیز ہے تو اس سوچ نے میرے اندر اسلام کے لیے جستجو اور بڑھا دی تھی۔ اور اسلام کا مطالعہ کرتے ہوئے بھی تم میرے ذہن میں تھے..... میں نے تم سے بھی بہت کچھ پریکٹیکلی سیکھا ہے۔'' آمنہ نے اسے صاف گوئی سے بتایا تو عبدالرحمن متجسس ہو کر سنتا رہا۔

''ارے ہاں..... جوائے کو تمہارے مسلم ہونے کا پتا چلا تو اس کا کیا ری ایکشن تھا؟'' عبدالرحمن نے ایک دم چونک کر پوچھا۔

''کیا..... ری ایکشن ہو سکتا ہے؟ تم بتاؤ کیا ایکسپیکٹ کرتے ہو؟'' آمنہ نے متجسس ہو کر پوچھا۔

''آف کورس..... اس نے بہت مائنڈ کیا ہو گا؟'' عبدالرحمن نے کہا۔

''ہاں.....'' وہ ٹھنڈی سانس بھر کر خاموش ہو گئی۔

''کیا ہوا..... تم اتنی سیریس کیوں ہو گئیں۔ کیا اس نے بہت شدید ری ایکٹ کیا.....؟'' عبدالرحمن نے پوچھا۔

''ہاں..... ہمارا جھگڑا ہوا..... اور مجھے اسے تھپڑ بھی لگانا پڑا.....'' آمنہ نے آہ بھر کر کہا تو عبدالرحمن ایک دم چونکا۔

''رئیلی! کیا واقعی تم نے جوائے کو تھپڑ لگایا؟'' عبدالرحمن نے پوچھا۔

''ہاں.....'' آمنہ نے کہا۔

''اس کا مطلب ہے..... اس نے کچھ زیادہ ہی برا بھلا کہا ہو گا؟'' عبدالرحمن نے کہا۔

''ہاں..... اور اب میں اس کے ساتھ اپنے ٹرمز ختم کر چکی ہوں۔'' آمنہ نے اسے بتایا۔
''کیا تم اس کے ساتھ تعلق توڑنے پر اپ سیٹ ہو رہی ہو؟'' عبدالرحمٰن نے پھر پوچھا۔
''نہیں بالکل مجھے اس کا کوئی افسوس نہیں۔'' آمنہ نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔
''پھر تم اتنی افسردہ کیوں ہو رہی ہو؟'' عبدالرحمٰن نے حیرت سے پوچھا۔
''نہیں..... میں افسردہ نہیں ہوں..... بس یونہی بات کرتے ہوئے سیریس ہو گئی ہوں۔'' آمنہ نے اسے کلیئر کیا۔
''آمنہ..... میں بہت دنوں سے تم سے ایک بات کہنا چاہتا ہوں مگر سوچتا ہوں تم مائنڈ نہ کرو.....'' عبدالرحمٰن نے کچھ سوچتے ہوئے رک، رک کر کہا۔
''کیا.....؟'' آمنہ نے ایک دم چونک کر پوچھا۔
''آمنہ تم بہت اچھی انسان ہو، بہت genuine اور kind اور آئی ایم شیور کہ تم ایک بہت اچھی مسلم بھی ہو گی۔'' عبدالرحمٰن اس کی تعریفیں کرتے ہوئے بولا تو آمنہ انتہائی حیرت سے اس کی باتیں سننے لگی۔
''آمنہ..... میرے دل میں تمہاری بہت عزت ہے.....'' عبدالرحمٰن مسکرا کر بولا۔
''تھینک یو.....'' اس نے مسکرا کر جواب دیا۔
''لیکن..... اب عزت کے ساتھ، ساتھ میرے دل میں تمہارے لیے بہت محبت بھی پیدا ہونے لگی ہے۔'' عبدالرحمٰن نے کہا تو آمنہ ایک دم چونکی۔
''کیا..... محبت.....؟'' وہ حیرت سے بولی۔
''ہاں..... کیا تمہیں میری محبت پر یقین نہیں آ رہا..... یا پھر میں تمہاری محبت کے قابل نہیں ہوں؟'' عبدالرحمٰن نے قدرے متفکر ہو کر پوچھا۔
''نہیں ایسی بات نہیں..... مجھے..... مجھے یقین نہیں آ رہا..... کہ..... تم اور..... میں.....؟ آئی مین..... تم میرے بارے میں ایسے بھی سوچ سکتے ہو؟'' آمنہ نے قدرے حیرت سے کہا۔
''ہاں، میں خود بھی حیران ہوتا ہوں..... اور میں جب بہت سوچتا ہوں تو یوں لگتا ہے جیسے شاید میں جرمنی صرف تم سے ہی ملنے گیا تھا..... مگر میں سوچتا تھا کہ تمہارے اور میرے درمیان مذہب کی مضبوط دیوار حائل ہے اور تمہاری جوائے کے ساتھ اسٹرانگ فرینڈشپ کو دیکھ کر میں نے اپنے دل میں جنم لینے والے تمام خیالات کو اپنے ذہن سے کھرچنے کی کوشش کی مگر میرا دل تھا کہ ہر وقت تمہاری سوچوں میں لگا رہتا تھا..... اور پھر جب تم نے اپنے مسلم ہونے کے بارے میں بتایا تو مجھے یوں لگا جیسے میرا اللہ تمہیں..... میرے قریب لا رہا ہے..... اور اب میرا دل کہتا ہے کہ تم میرے بہت قریب آ چکی ہو۔'' آمنہ اس کی باتیں حیرت سے سن رہی تھی..... کیا ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ دو مختلف لوگ اس قدر قریب آ جائیں، یہ عبدالرحمٰن کس محبت کی بات کر رہا ہے۔ وہ ابھی یہ سب سوچ رہی رہی تھی کہ عبدالرحمٰن نے اسے ہیلو کہہ کر چونکا دیا۔ ''آمنہ میں تمہیں بہت پسند کرتا ہوں۔ اگر تم مجھے اس قابل سمجھتی ہو تو میں تمہیں پرپوز کرنا چاہتا ہوں۔'' عبدالرحمٰن نے جب یہ سب کہا تو آمنہ ہکا بکا رہ گئی۔
''پرپوز.....؟'' وہ حیرت سے بڑبڑائی تھی۔
''کیوں..... تمہیں یہ اچھا نہیں لگا.....؟'' عبدالرحمٰن نے گھبرا کر پوچھا۔
''نہیں..... میں تو یہ سوچ رہی ہوں کہ میں اور تم..... کیسے؟ تم پاکستان کے کسی علاقے کے رہنے والے ہو میں یہاں کی اور..... ہمارے کلچر میں بھی بہت فرق ہے۔'' آمنہ نے صاف گوئی سے کہا۔
''آمنہ..... مسلمان مرد اور عورت کے درمیان مذہب کا تعلق مضبوط ہو تو کلچر پھر کچھ میٹر نہیں

کرتا..... میرے گھر میں میری بیوہ ماں، دو بھائی، دو بھابیاں اور صرف تین بھتیجیاں ہیں...... اور وہ سب میری خاطر تم سے بھی بہت محبت کریں گے۔'' عبدالرحمٰن نے کہا تو وہ اس کی باتیں بغور سنتی رہی اور کچھ دیر کے لیے چپ ہوگئی۔

''آمنہ کیا بات ہے، تم خاموش کیوں ہوگئی ہو؟'' عبدالرحمٰن نے پوچھا۔

''مجھے تو کچھ سمجھ میں نہیں آرہا کہ میں تمہیں کیا کہوں، تم نے اتنی اچانک مجھے اپنی محبت کا بھی بتایا ہے اور پھر پرپوز کرنے کا بھی...... کہ میرا ذہن الجھنے لگا ہے۔'' آمنہ نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے، میں تمہیں سوچنے کے لیے وقت دیتا ہوں، تم اچھی طرح سوچ لو، میرے بارے میں سب کچھ جان لو۔ آمنہ اگر تمہارا دل مجھے قبول کرتا ہے تو مجھے بہت خوشی ہوگی اور اگر تمہارا دل مجھے قبول نہیں کرتا تو کوئی بات نہیں۔ میں تمہیں کبھی فورس نہیں کروں گا اور نہ ہی میرے دل میں تمہارے لیے کبھی بدگمانی کے احساسات ہوں گے۔ یہ سب تمہاری اپنی مرضی اور پسند پر منحصر ہے۔ مجھے ہمیشہ اپنا ویل وشر (خیر خواہ) سمجھنا۔'' عبدالرحمٰن نے قدرے ملائمت سے کہا تو آمنہ اس کی بات سن کر زیرِلب مسکرانے لگی۔

''چلو اب تم ریسٹ کرو...... میں پھر کال کروں گا۔'' عبدالرحمٰن نے کہہ کر موبائل آف کردیا اور آمنہ انتہائی حیرت کے عالم میں اس کے جملوں پر غور کرتی کسی گہری سوچ میں ڈوب گئی۔ زندگی کیسے لمحہ، لمحہ بدل رہی تھی...... اسے یقین نہیں آرہا تھا۔ کیسے جوائے اس کی زندگی میں آیا پھر کیسے اس کی زندگی کے ٹریکس بدلے...... صرف چند ماہ کے لیے عبدالرحمٰن آیا بھی اور چلا بھی گیا...... اور اب عبدالرحمٰن نے اسے اپنی زندگی میں شامل کرنے کی بات سنا کر اسے چونکا دیا تھا۔ وہ عبدالرحمٰن کے بارے میں گہرائی میں جا کر سوچنے لگی۔ نرم اور سادہ مزاج انسان لگا تھا۔ وہ بالکل بھی جھگڑالو طبیعت کا سخت خو انسان نہیں تھا...... بہت ہمدردی سے دوسروں کے بارے میں سوچتا اور بہت محبت اور اپنائیت سے دوسروں کو ٹریٹ کرتا...... عبدالرحمٰن کے ساتھ گزارا ہوا ایک، ایک پل اس کی نظروں کے سامنے گزرنے لگا...... اسے کوئی بھی ایسا موقع یاد نہیں آیا جس نے اس کے ذہن میں کوئی منفی تاثرات چھوڑے ہوں۔ تب بھی نہیں جب جوائے نے اسے بہت تنگ کیا تھا...... وہ جتنا زیادہ عبدالرحمٰن کے بارے میں سوچتی...... اتنی ہی زیادہ اس کے بارے میں پازیٹو فیلنگز پیدا ہونے لگتیں۔

''عبدالرحمٰن کے ساتھ زندگی کیسے گزرے گی......؟'' اس سوال کے بارے میں وہ ہر اینگل سے سوچنے لگی تو اسے ہر اینگل پازیٹو لگنے لگا...... اس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیلنے لگی۔

''عبدالرحمٰن اچھا لائف پارٹنر ہوسکتا ہے۔'' اس نے ہر زاویے سے سوچنے کے بعد تقریباً ایک ہفتے کے غور و فکر اور اسلامک سینٹر میں زینب سے مشورے کے بعد اوکے کہہ دیا۔ عبدالرحمٰن کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا اور وہ بھی اپنے اس فیصلے پر بہت خوش تھی۔

☆☆☆

عبدالرحمٰن نے آمنہ کو باقاعدہ پرپوزل دینے سے پہلے ماں سے ذکر کردیا تھا۔ جس پر ماں نے کافی حیل و حجت کی تھی۔

''کیا وہ تمہارے لیے مسلمان ہوئی ہے؟'' جمیلہ (ماں) نے قدرے حیرت سے عبدالرحمٰن سے پوچھا تھا۔

''نہیں اماں! اسے اسلام سے پہلے ہی بہت لگاؤ تھا۔'' اس نے مسکرا کر کہا۔

''پھر اسلام سے لگاؤ تمہاری محبت میں کیسے بدل گیا؟'' جمیلہ نے قدرے معنی خیز انداز میں پوچھا۔

''کیا مطلب......؟ کیا آپ کو آمنہ کو بہو بنانے پر کوئی اعتراض ہے؟'' عبدالرحمٰن نے چونک کر پوچھا۔

''بیٹا...... رشتے داریاں اپنے لوگوں، اپنے خاندان اور اپنے مذہب میں ہوں تو بہتر ہوتی ہیں۔ غیر اور اجنبی

عورتیں کبھی اچھی بہویں ثابت نہیں ہوتیں۔'' جمیلہ نے اپنا خدشہ ظاہر کیا۔

''اماں اسلام میں ان باتوں کی کوئی گنجائش نہیں، جب باقاعدہ کلمہ پڑھ لیا اور ارکانِ اسلام پر عمل کرنا شروع کر دیا تو پھر تو غیر نہ ہوئی ناں...... اور آمنہ بہت اچھی لڑکی ہے۔ اسے مجھ سے نہیں بلکہ مجھے اس سے محبت ہوئی ہے...... اور میں نے اس سے شادی کے بارے میں سوچا ہے اس نے تو کبھی کچھ نہیں کہا بلکہ اس نے تو ہمیشہ اسلام کے موضوع پر ہی مجھ سے باتیں کی ہیں۔''

''تو کیا تم ہم سب کو چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے اس کے پاس چلے جاؤ گے؟'' جمیلہ نے قدرے گھبرا کر پوچھا اور ان کے چہرے پر انتہائی پریشانی کے تاثرات نمایاں ہونے لگے۔

''نہیں ماں...... میں اسے بیاہ کر یہاں لاؤں گا اور آپ دیکھیے گا کہ وہ آپ کی ساری بہوؤں میں سب سے اچھی ثابت ہوگی۔'' عبدالرحمٰن نے مسکرا کر کہا تو جمیلہ چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگیں۔

''بیٹا تم ابھی سے اس کی اتنی تعریفیں کر رہے ہو۔'' جمیلہ نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔

''اماں وہ بہت اچھی انسان ہے۔ جب میرا اور اس کا کوئی تعلق بھی نہیں تھا اور میں وہاں صرف پڑھنے کے لیے گیا تھا تو اس نے میری بہت مدد کی اور ہر قدم پر میری حوصلہ افزائی کی۔'' عبدالرحمٰن نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا تو جمیلہ اس کی باتیں سن کر خاموش ہوگئی تھیں۔

''ٹھیک ہے بیٹا جیسی تمہاری مرضی...... میرے لیے تمہاری خوشی سے بڑھ کر کچھ اہم نہیں اور وہ خوشی میں تمہارے چہرے پر دیکھ رہی ہوں۔'' جمیلہ نے اس کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا تو عبدالرحمٰن ان کی بات سن کر خوش ہوگیا۔

جمیلہ نے خوشی، خوشی اپنی بہو کے لیے خوب صورت کام دار عروسی جوڑا بنوایا اور اس کے ساتھ زیورات اور دوسرے ملبوسات بھی بنوائے۔ اس کی دونوں بھابیاں اور بھائی دبے، دبے لفظوں میں اس شادی پر اعتراض کر رہے تھے کہ عبدالرحمٰن بہت بڑی غلطی کرنے جا رہا ہے مگر عبدالرحمٰن مطمئن تھا کہ یہ سب لوگ آمنہ کو جانتے نہیں اس لیے ایسی باتیں بنا رہے ہیں۔

عبدالرحمٰن نے جب سے آمنہ کو بتایا تھا کہ وہ اس کے ساتھ شادی کرنے جرمنی آ رہا ہے تو وہ بہت زیادہ خوش تھی۔ اس نے کمپیوٹر پر ماں اور آمنہ کی آپس میں بات بھی کروادی تھی۔ اسلامک سینٹر میں باقاعدہ جانے سے وہاں کی مسلم خواتین سے اس کی بہت زیادہ دوستی ہوگئی تھی اور زینب تو اسے اپنی بیٹیوں کی طرح چاہتی تھی۔ امام صاحب کو بھی اس کے ساتھ بہت انسیت تھی کیونکہ وہ اپنے آپ کو ایک اچھی مسلمان بنانے کی ہر ممکن کوشش کرتی رہتی، ان سے اسلامی احکامات اور سوالات پوچھتی رہتی اور اس وجہ سے وہ اس کی بہت زیادہ عزت کرتے تھے اور جب آمنہ نے سب کو اپنی شادی کے بارے میں بتایا تو ہر طرف خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ تمام مسلم خواتین نے اس کی شادی کو اچھے طریقے سے منعقد کرنے کا پروگرام بنایا...... آمنہ کا اپنا تو کوئی تھا نہیں...... لیکن مسلم کمیونٹی کے سب لوگ یوں بی ہیو کر رہے تھے جیسے ان کی اپنی عزیزہ کی شادی ہو...... عبدالرحمٰن جب وہاں پہنچا تو ان لوگوں نے بہت اچھے انداز میں اس کا استقبال کیا۔ آمنہ کے گھر کو صاف ستھرا کر کے بہت اچھا ڈیکوریٹ کیا گیا...... عبدالرحمٰن نے اسے پہننے کے لیے وہ عروسی جوڑا اور زیورات دیے...... جو اس کی ماں نے خصوصی طور پر اس کے لیے بھیجے تھے۔ آمنہ اتنی محبت اور چاہت پر خوشی سے پھولی نہ سما رہی تھی۔ انہی خواتین نے اسے تیار کیا تو وہ بہت زیادہ خوب صورت لگ رہی تھی۔ اسلامک سینٹر میں اس کا نکاح پڑھایا گیا تھا اور بہت اچھے انداز میں اس کی رخصتی کی گئی۔ آمنہ کو دلہن بنے دیکھ کر... عبدالرحمٰن کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا...... وہ محبت پاش نظروں سے اس کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔

''ایسے کیا دیکھ رہے ہو؟'' آمنہ نے مسکرا کر پوچھا، وہ شرما رہی تھی۔

''اپنی قسمت پر حیران ہو رہا ہوں اور پھر تمہیں دیکھ کر اپنے آپ کو یقین دلانے کی کوشش کر رہا ہوں کہ تم واقعی میری بیوی بن چکی ہو...... آمنہ مجھے پھر بھی یقین نہیں آ رہا کہ تم واقعی دلہن بن کر میرے سامنے بیٹھی ہو...... قدرت نے کیسے ہم دونوں کو ایک دوسرے سے ملا دیا ہے۔'' عبدالرحمٰن نے محبت بھرے انداز میں اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔

''میں خود بھی سوچتی ہوں تو حیران ہو جاتی ہوں کہ تم سے ملاقات صرف ایک کلاس فیلو کی حیثیت سے ہوئی تھی اور جب تم یہاں سے گئے تو میں بہت ڈپریشن میں تھی کہ تم یہاں کبھی نہیں آؤ گے...... لیکن انسان کو کیا معلوم ہوتا ہے کہ اللہ نے اس کی قسمت میں کیا لکھا ہوتا ہے اور میری زندگی میں تو خدا نے اتنے زیادہ ٹرننگ پوائنٹس رکھے ہیں کہ تمہارے ساتھ شادی مجھے بالکل انہونی نہیں لگ رہی......'' آمنہ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ان کی شادی کا کھانا خاص طور پر اسلامک سینٹر کی طرف سے ہی دیا گیا تھا۔ شادی کے بعد تمام لوگوں نے ان دونوں کی بہت پُرتکلف دعوتیں کیں۔ آمنہ کے لیے یہ سب کچھ نیا تھا مگر بہت خوش کن...... سب لوگ اتنی اپنائیت کا مظاہرہ کر رہے تھے کہ اس کا دل خوشی سے پھولے نہیں سماتا تھا۔ عبدالرحمٰن بھی ان لوگوں کے حسنِ سلوک سے بہت زیادہ متاثر ہوا تھا۔ دونوں شادی کے بعد بہت خوش تھے اور ان کے لیے ایک، ایک لمحہ انتہائی مسحور کن تھا۔ وہ دونوں زندگی کے اس فیز کو بہت زیادہ انجوائے کر رہے تھے اور اللہ کا شکر ادا کر رہے تھے کہ اس نے دونوں کو ایک دوسرے کا لائف پارٹنر بنا دیا تھا۔

☆☆☆

اس روز آمنہ اور عبدالرحمٰن ایک شاپنگ مال میں شاپنگ کرتے ہوئے باتیں کر رہے تھے کہ جوائے نے انہیں دیکھا۔ وہ ان کے قریب جا کر غصے سے چلّایا۔

''کیتھی، تم...... تم اس (گالی) کے......'' ساتھ وہ دانت کچکچا کر عبدالرحمٰن کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''شٹ اپ...... ہی از مائی ہسبینڈ ناؤ...... ہم دونوں نے شادی کر لی ہے۔'' آمنہ نے غصے سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تو جوائے ہکا بکا رہ گیا۔

''وہاٹ...... وہاٹ...... تم نے اس کے ساتھ شادی کر لی ہے؟ آر یو ان یور سینس۔'' جوائے نے قدرے طنزیہ انداز میں عبدالرحمٰن کی طرف دیکھا جو جوائے کے مقابلے میں معمولی شکل صورت کا مالک تھا۔ درمیانہ قد، دبلا پتلا جسم، چہرے پر داڑھی...... اور اس کے مقابلے میں جوائے خوب صورت دراز قد، صحت مند جسم کا مالک، خوب صورت نقوش اور صاف رنگت کے ساتھ عبدالرحمٰن کے مقابلے میں بے انتہا پُرکشش اور اسمارٹ لگ رہا تھا۔

''ہاں...... میں نے عبدالرحمٰن کے ساتھ شادی کر لی ہے اور ہم دونوں ایک دوسرے کے ساتھ بہت خوش ہیں...... اب تمہیں ہمارے راستے میں آنے کی کوئی ضرورت نہیں، سمجھے تم......'' آمنہ نے غصے سے آنکھیں نکال کر اسے دیکھتے ہوئے کہا تو جوائے اس کے تیور دیکھ کر چونک گیا۔

''کیتھی...... تم......؟'' وہ حیرت سے بڑبڑایا۔

''میں آمنہ عبدالرحمٰن ہوں...... کیتھی مر چکی ہے اور اس کیتھی سے وابستہ تمام رشتے، باتیں اور یادیں سب ختم ہو چکی ہیں اور میں تمہیں بھی نہیں جانتی......''

''چلیں عبدالرحمٰن......'' وہ عبدالرحمٰن کا ہاتھ پکڑ کر خفگی سے جوائے کی طرف دیکھتی ہوئی وہاں سے چلی گئی اور جوائے کو اس پر غصہ آنے لگا وہ پاؤں پٹختا ہوا آگے بڑھ گیا۔

گھر آ کر بھی وہ سارا وقت غصے سے تلملاتا رہا...... اسے یوں محسوس ہونے لگا جیسے عبدالرحمٰن اور کیتھی کا افیئر بہت پرانا تھا اور کیتھی نے اس سے اتنا عرصہ چھپائے رکھا۔ اسی لیے عبدالرحمٰن کے واپس پاکستان جانے کے بعد وہ جوائے کے ساتھ پہلے کی طرح فرینک نہیں رہی تھی...... کیتھی کو اس سے چھیننے والا عبدالرحمٰن یعنی کہ ایک مسلم تھا اور

اس کی ماں کی زندگی کو برباد کرنے والا بھی ایک مسلم ہی تھا۔ اس کی ماں کے الفاظ اس کے کانوں میں گونجنے لگے۔
''کسی مسلم پر کبھی اعتبار نہیں کرنا......'' وہ الفاظ اس کے کانوں میں نشتر چبھونے لگے اور اس کے اندر غصہ ایک لاوے کی صورت میں ابلنے لگا۔ کیتھی اور عبدالرحمٰن کی شادی کا سن کر اس کے اندر سلگتی آگ ایک دم انتہائی شدت سے بھڑک اٹھی تھی۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ کس طرح مسلمز کے خلاف اپنا زہر اگلے...... انہیں کس، کس طرح برباد کرنے کی کوشش کرے۔

''کاش...... میرے بس میں کچھ ہوتا...... اور میں ان کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا سکتا......'' وہ ساری رات کروٹیں بدلتا رہا اور انتہائی غصے میں یہ سب سوچتا رہا۔ اس کا ذہن بہت انتشار کا شکار ہو رہا تھا۔

☆☆☆

آمنہ اور عبدالرحمٰن ایک دوسرے کو پا کر بہت خوش اور مطمئن تھے۔ پاکستان میں عبدالرحمٰن کی فیملی ان کی آمد کی شدت سے منتظر تھی۔ آمنہ نے اس کی فیملی کے لیے بہت گفٹس خریدے اور یہاں کی مسلم کمیونٹی نے انہیں بہت تحائف بھی دیے اور دعاؤں کے ساتھ انہیں رخصت کیا۔ آمنہ نے جینز کے ساتھ کرتا اور حجاب لے رکھا تھا اور اس کا چہرہ ہر قسم کے میک اپ سے عاری تھا مگر پھر بھی وہ بہت خوب صورت لگ رہی تھی۔ ائرپورٹ پر عبدالرحمٰن کے دونوں بڑے بھائی عبدالوہاب اور عبدالرب اپنی بیویوں اور بچوں کے ہمراہ انہیں لینے آئے تھے...... ان کے خیال میں آمنہ بجی سنوری، چمکیلا لباس اور زیورات پہنے ہوئے ہوگی مگر آمنہ کو جینز، کرتے اور حجاب میں دیکھ کر وہ ایک دم چونک گئے۔ عبدالوہاب کی بیوی ہاجرہ اور عبدالرب کی بیوی شبنم نے برقع پہن رکھے تھے۔ دونوں بہت عام اور معمولی شکل صورت کی عورتیں تھیں مگر دونوں بہت چمکیلے بھڑکیلے لباس پہنے اور میک اپ کیے اسے لینے آئی تھیں۔ گوکہ آمنہ بالکل سمپل تھی پھر بھی بہت خوب صورت دکھائی دے رہی تھی لیکن اسے اتنا سادہ دیکھ کر وہ سب مایوس ہو گئے۔ عبدالرحمٰن جتنا نارمل اور عام لگ رہا تھا آمنہ اتنی ہی زیادہ خوب صورت اور کیوٹ لگ رہی تھی۔ وہ سب لوگوں کے ساتھ بہت محبت اور تپاک سے مل رہی تھی۔ عبدالرحمٰن کے دونوں بھائی اسے دیکھ کر بری طرح چونکے تھے اور عبدالرحمٰن کی قسمت پر رشک کر رہے تھے کہ اسے اتنی خوب صورت بیوی ملی ہے مگر انہوں نے اپنی سوچ اپنے تک ہی محدود رکھی۔ گھر پہنچتے، پہنچتے رات کے دو بج گئے تھے، دونوں کو گھر لایا گیا تو جمیلہ نے بہت محبت سے آمنہ کو چوم کر اور اسے اپنے گلے لگا کر دونوں کا بھرپور استقبال کیا۔ نو بیاہتا دولہا، دلہن کی ساری رسمیں ادا کی گئیں اور ان کی نظر بھی اتاری گئی، صدقے نکالے گئے۔ آمنہ ان سب باتوں کو بہت انجوائے کر رہی تھی اور بہت متجسس ہو کر دیکھ رہی تھی۔ باتوں اور رسموں میں ہی فجر کی اذانیں ہونے لگیں۔ سب لوگ بہت شور مچا کر ہلا گلا کر رہے تھے۔ ڈھولک رکھی گئی تھی۔ سب گا بجا رہے تھے۔ اذان کی آواز سن کر آمنہ ایک دم چونکی اور حیرت سے سب کی طرف دیکھ کر دونوں ہاتھ ہلا، ہلا کر سب کو خاموش ہونے کو کہنے لگی تو سب نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

''کیا آپ لوگ نہیں جانتے کہ ہمارے پرافٹ حضرت محمد ﷺ نے کیا فرمایا ہے کہ جو شخص اذان کے وقت خاموش نہیں رہتا موت کے وقت اسے کلمہ نصیب نہیں ہوگا۔'' آمنہ نے قدرے بلند آواز میں انگلش میں کہا تو ہاجرہ اور شبنم نے قدرے خفگی سے منہ بنا کر اپنے، اپنے شوہروں کی طرف دیکھا۔ سب کو سمجھ آ گیا تھا کہ وہ اذان کے بارے میں کچھ کہہ رہی تھی۔ سب خاموش ہو کر ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ خود آمنہ خاموش ہو کر بیٹھ گئی۔ جمیلہ اس کی بات سن کر بہت خوش ہوئیں اور عبدالرحمٰن نے بھی مسکرا کر تعریفی انداز میں اس کی طرف دیکھا جبکہ ہاجرہ اور شبنم کو بہت انسلٹ محسوس ہوئی۔ دونوں نے اپنے، اپنے بچوں کو اٹھ کر جانے کو کہا کہ جا کر سب آرام کریں...... کسی کو شور مچانے اور کسی کا چاؤ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔

''ہم تو پاگل ہیں جو ہفتے بھر سے گھر کی صفائیاں، ستھرائیاں کر کے دلہن کے استقبال کی تیاریوں میں ہلکان ہو رہے ہیں۔ دلہن نے تو آتے ہی سب کی بے عزتی کر دی۔'' ہاجرہ خفگی سے منہ بنا کر بولی۔ آمنہ کو قطعی احساس نہیں ہوا کہ ہاجرہ نے کیا کہا تھا...... وہ مسکرا کر اسے دیکھتی رہی۔

''بھابی...... اس نے کوئی غلط بات نہیں کہی، آپ کیوں ناراض ہو رہی ہیں؟'' عبدالرحمٰن آمنہ کے دفاع میں بولا۔

''ہاں...... بھیا، تم تو ابھی سے جورو کے غلام ہو گئے ہو...... اس سے بڑھ کر تو سچی پکی اور نیک مسلمان کوئی ہے ہی نہیں ناں......'' ہاجرہ نے غصے سے کہا اور شوہر، بچوں کو لے کر پاؤں پٹختے ہوئے وہاں سے چلی گئی۔

''عبدالرحمٰن مجھے نماز پڑھنی ہے، فجر کی نماز کا وقت ہو گیا ہے۔'' آمنہ نے کہا تو عبدالرحمٰن نے بڑے بھائی کی بیٹی فریحہ کو کہا کہ وہ آمنہ کو وضو کرا دے۔ اس نے منہ بناتے ہوئے لوٹے میں پانی ڈالا اور اسے وضو کرانے لگی۔

وہ اسے وضو کرا کے اور جانماز بچھا کر دے گئی اور خود اپنے کمرے میں جا کر سو گئی۔ عبدالرحمٰن مسجد کی طرف نماز پڑھنے چلا گیا۔ گھر میں صرف جمیلہ نے نماز ادا کی تھی باقی گھر کے سب افراد اپنے، اپنے کمروں میں جا کر سو گئے۔ آمنہ، نماز پڑھ کر فارغ ہوئی اور اپنے بیگ سے پاکٹ سائز قرآن پاک نکال کر پڑھنے لگی۔ عبدالرحمٰن مسجد سے واپس آیا تو حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔

''آمنہ، تم ابھی تک سوئی نہیں...... کیا اتنے سفر کے بعد تمہیں تھکاوٹ نہیں ہوئی؟'' عبدالرحمٰن نے اس کے چہرے پر انتہائی تھکاوٹ کے آثار دیکھتے ہوئے کہا۔

''میں بس تھوڑا سا قرآن پاک پڑھ لوں...... عبدالرحمٰن جب سے میں مسلم ہوئی ہوں، فجر کے بعد تھوڑا سا قرآن پاک ضرور پڑھتی ہوں۔ اس سے میرے دل کو سکون ملتا ہے۔'' آمنہ نے مسکرا کر کہا تو عبدالرحمٰن پُرستائش نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا...... تھوڑی دیر بعد اس نے قرآن پاک پڑھ کر چوم کر بند کر دیا۔

''تم نے قرآن پاک پڑھنا کہاں سے سیکھا ہے؟'' عبدالرحمٰن نے مسکرا کر پوچھا۔

''اسلامک سینٹر سے...... میم زینب سے۔'' اس نے مسکرا کر جواب دیا اور نماز کا دوپٹا اتار کر بیڈ پر آ گئی۔

چھوٹے سے کمرے کو رنگ برنگے چمکیلے کاغذی پھولوں اور لڑیوں سے آراستہ کیا گیا تھا۔ عبدالرحمٰن کا گھر چھوٹا سا تھا جس میں تینوں بھائیوں کے لیے ایک ایک کمرا مخصوص تھا۔ ایک چھوٹا سا کمرا جمیلہ کے پاس تھا۔ صحن، کچن اور ڈرائنگ روم، دو واش رومز آمنہ نے گھر کی طرف تو کوئی خاص توجہ نہ دی مگر گھر والوں پر حیران ہو رہی تھی۔

''عبدالرحمٰن سب لوگ میرے اذان کی طرف توجہ دلانے پر غصہ کیوں ہو رہے تھے؟'' آمنہ نے قدرے پریشانی سے عبدالرحمٰن کی طرف دیکھ کر پوچھا تو وہ ایک دم شرمندہ ہونے لگا پھر اس نے سب کو سونے کے لیے جاتے دیکھا تھا نماز پڑھنے کے بجائے۔ اب وہ اس کے جواب میں کیا کہتا...... اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ جو کہہ رہی تھی بالکل ٹھیک کہہ رہی تھی لیکن اس کے اس سچ کو سننے کا کسی میں بھی حوصلہ نہیں تھا۔ نہ ہی وہ اسے یہ کہہ سکتا تھا کہ تم اپنے کام سے کام رکھنا...... ان باتوں کو نہ چھیڑنا...... ان کے معاملات میں دخل نہ دینا...... عبدالرحمٰن نے ایک گہری سانس لے کر اس کی طرف دیکھا اور خاموش ہو گیا۔

''عبدالرحمٰن آپ میری باتوں کو سن کر خاموش کیوں ہو گئے ہیں؟'' آمنہ نے عبدالرحمٰن کو قدرے الجھے ہوئے دیکھ کر پوچھا تو وہ اس کی بات سن کر ایک دم ہڑبڑا گیا۔

''نہیں...... تم نے بالکل ٹھیک کہا ہے...... اب تم سو جاؤ، بہت تھکی ہوئی لگ رہی ہو اور میں بھی سونے لگا ہوں۔'' عبدالرحمٰن نے لائٹ بند کرتے ہوئے کہا۔ اس نے بیڈ پر لیٹ کر آنکھیں بند کر لیں۔

(جاری ہے)

# دلہن میں تجھ کو لے کے جاؤں گا

اقبال بانو

دوسرا اور آخری حصّہ




''یہ مشعل رو کیوں رہی ہیں؟'' اللہ دتہ نے پریشانی سے پوچھا۔

''جاؤ عائزہ، اللہ دتہ کے لیے کوئی جوس وغیرہ لاؤ۔'' ملیحہ اس کی بات نظر انداز کر کے بولیں۔

''جی اچھا......'' عائزہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

''ہاں، ہمیں بہت زوروں کی پیاس لگی ہے، بڑا جگ بھر کر شربت لانا......'' وہ مسخرے پن سے بولا۔ ''ہم تو پورا جگ دودھ پی لیتے ہیں۔''

اس اثنا میں مشعل اٹھ کر بیٹھ چکی تھی اور وہ اللہ دتہ کو دیکھے جا رہی تھی جو اس کی جانب بڑی محبت سے دیکھ رہا تھا۔

''تم جاؤ یہاں سے۔'' مشعل بولی۔

''کہاں جائیں ہم۔'' اللہ دتہ گڑ بڑا کر بولا۔ ''شکر ہے آپ کو ہوش آ گیا اب ہم شکرانے کے نفل پڑھیں گے۔''

''آپ پلیز یہاں سے جائیں۔'' مشعل نے اللہ دتہ کو کہتے ہوئے دروازہ کی طرف اشارہ کیا۔

''مگر ہم کیوں جائیں، ہم نے آپ کا کیا بگاڑا ہے؟'' وہ آنکھیں پٹ پٹا کر معصومیت سے بولا۔

''میں کہہ رہی ہوں ناں بس جائیں یہاں سے۔'' مشعل چلائی۔ وہ دادو کو دیکھنے لگا۔

''چلو بیٹا ہم باہر چلتے ہیں۔'' عشرت جہاں تمام صورتِ حال سمجھتے ہوئے بیڈ سے اٹھیں۔

''ہم شربت تو پی لیں......'' اللہ دتہ ملتجی لہجے میں بولا۔

''عائزہ وہیں لے آئے گی۔'' عشرت جہاں بولیں اور اللہ دتہ کو لے کر کمرے سے باہر چلی گئیں۔ ان کے جانے کے بعد مشعل ماں سے لپٹ گئی۔

''ممی میں اس شخص کے ساتھ مر جاؤں گی۔'' وہ ماں سے لپٹ کر زور زور سے رونے لگی۔ ملیحہ بھی دکھی ہو کر اس کا سر چومنے لگیں۔

''تم پریشان نہ ہو بیٹا، میں تمہیں دکھی نہیں ہونے دوں گی۔''

☆☆☆

اللہ دتہ صوفے پر پالتی مارے بیٹھا دادو سے باتوں میں مصروف تھا کہ ملیحہ بھی وہیں چلی آئیں۔

''اب مشعل ٹھیک ہے ناں......؟'' عشرت جہاں پوچھنے لگیں۔

''ہاں ٹھیک ہے، میں نے کہا کہ سو جاؤ تو اب سوئی ہوئی ہے۔''

''ہاں سناؤ اللہ دتہ! تمہارے ابو، امی تو ٹھیک ہیں؟'' ملیحہ پوچھنے لگیں۔

''ہاں بالکل ٹھیک ہیں امی آپ کو سلام کہہ رہی تھیں آپا جی......''

''ارے یہ تیری آپا نہیں ہے، چاچی لگتی ہے...... تمہارے ابا...... عثمان کے کزن ہوئے تو ملیحہ تمہاری ''چچی'' ہوئی ناں......''

''اچھا مگر مجھے تو یہ آپا ہی لگتی ہیں، بہت اسمارٹ سی ہیں۔'' اب وہ بہت غور سے ملیحہ کو دیکھ رہا تھا۔ ''چاچا جی سے تو بہت چھوٹی ہوں گی؟''

''اے ہٹ صرف دو سال کا فرق ہے۔'' عشرت جہاں تڑخ کر بولیں۔

''دادو آپ نے اپنے بیٹے کی عمر میں ضرور ڈنڈی ماری ہے......'' وہ انگلی نچا کر بولا۔

''چل ہٹ شریر...... فریدہ اور ملیحہ کلاس فیلو تھیں، ایک عرصہ ساتھ پڑھیں، اپنے پڑوس میں ہی تو فریدہ لوگ رہے تھے...... اچھی لگی تو دونوں کو بہوئیں بنا لیا، ایک میں نے لی اور دوسری آپا نے اخلاق کے لیے پسند کر لی۔''

''اس کا مطلب ہے میرے ابا اور عثمان چاچا عاشق مزاج تھے، لو میرج ہوئی ہو گی یقیناً......''

''نہیں بھئی، انتہائی شریف بچے تھے ہمارے۔'' عشرت جہاں ہنسنے لگیں۔

''یہ کیسے ہو سکتا ہے اتنی خوب صورت لڑکیاں دیکھ کر دل نہ دھڑکے......'' اللہ دتہ عجب بے ڈھنگے سے انداز میں بولا۔

''اللہ دتہ تمہارا دل بھی خوب صورت لڑکیاں دیکھ کر دھڑکتا ہے؟'' عشرت جہاں کو بھی مذاق سوجھا۔

''اونہوں...... میں تو خوب صورت یہ لمبی پونچھ (دم) والی گائے بھینس دیکھ لوں تو دل دھڑکتا ہے۔''

''اے لو اس میں دل دھڑکنے والی کون سی بات ہے......'' عشرت جہاں حیرت زدہ ہو کر بولیں۔

''دادو آپ کو نہیں پتا جس طرح لمبی چٹیا اور کالی آنکھیں لڑکی کی خوب صورتی ہوتی ہیں اسی طرح

بھینس، گائے کی خوب صورتی لمبی دم ہوتی ہے۔''

''نرے گاؤدی ہی رہے تم......''عشرت جہاں نے ہنس کر اسے چپت لگائی۔ تبھی موجو دونوں ہاتھوں میں شاپرز لیے اور کھجور کے پتوں کی بنی ٹوکری سر پر رکھے آن وارد ہوا۔

''اتنی دیر کردی کب سے تو گئے تھے۔''ملیحہ ڈپٹ کر بولیں۔

''وہاں یوٹیلٹی اسٹور پر بہت رش تھا۔''موجو نے ان کے قریب ہی سامان رکھ دیا تھا۔

''ارے آپا آپ لوگ سستے اسٹور سے سامان لیتے ہیں...یہ جو یو ٹی لے ٹی (یوٹیلیٹی) اسٹور ہیں ناں یہ غریبوں کے لیے ہیں...... آپ تو امیر لوگ ہیں پھر بھی......''اللہ دتہ حیرت سے آنکھیں پٹ پٹا کر بولا۔

''نہیں تو یہ کم بخت خود ہی وہاں گھس گیا ہوگا۔'' ملیحہ موجو کو گھورتے ہوئے بولیں۔

''چل اٹھا سامان اور جا کر کچن میں رکھ۔''

''یہ کون ہیں؟''موجو نے حیرت سے پوچھا۔

''ہم......ہم اللہ دتہ ہیں۔''وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔

''گھر میں بڑا ذکر تھا آپ کا۔''باچھیں پھیلا کر موجو نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

''اچھا، اچھا......اور بھئی موجو غصہ نہ کرنا، ہم نوکروں سے ہاتھ نہیں ملاتے......''اللہ دتہ نے مغرورانہ انداز میں کہا اور ہاتھ پیچھے کرلیا۔

''چل اب یہاں سے جا بھی......''ملیحہ نے گھور کر کہا۔

''لگتا ہے آپا جی خفا ہوگئی ہیں، ہے ناں دادو......''اللہ دتہ بولا۔

''ارے نہیں، وہ موجو دیر سے آیا ہے ناں اس لیے بہو کو غصہ آگیا۔ تم پریشان نہ ہو۔'' اللہ دتہ سر ہلا کر رہ گیا۔

☆☆☆

عشرت جہاں بیٹھی تسبیح پڑھ رہی تھیں اور اللہ دتہ بھی وہیں بیٹھا تھا......خاموش، چپ سا۔

''کیا بات ہے تم اداس ہو؟''

''ہاں دادو، ہم اپنی امی کے لیے بہت اداس ہیں۔''

''دو ہی دن تو ہوئے ہیں اور ابھی سے ماں کے لیے اداسی کا دورہ پڑ گیا۔''

''اصل میں امی سے تھوڑا عرصہ بھی دور رہیں ناں تو ہم اداس ہوجاتے ہیں۔''

''چلو فریدہ کو کہوں گی جلدی آجائے...... اور آکر تمہاری منگنی کردے۔''

''یہ لوگ مان جائیں گے؟''

''لو بھلا کیوں نہیں مانیں گے۔''وہ جلدی سے بولیں۔

''مجھ سے تو نہ بلو بھائی نے اچھی طرح سلام دعا کی نہ ملیحہ آنٹی نے۔''وہ دکھ سے بولا۔

''اے چھوڑو، انہیں کون پوچھتا ہے......کرنا تو سب عثمان نے ہے۔''عشرت جہاں وثوق سے بولیں۔

''اور مشعل......؟''اللہ دتہ پریشانی سے بولا۔

''وہ بھی مان جائے گی تم فکر نہ کرو بس...... مشعل کی شادی تمہارے ساتھ ہی ہوگی۔''

''سچ دادو......آپ اسے بتائیں میں پورا فارم ہاؤس اور ڈیری فارم بھی اس کے نام کردوں گا۔ وہ اگر مجھے نہ ملی تو میں کبھی شادی نہیں کروں گا۔''وہ روہانسا ہو کر بولا۔

''تم دل چھوٹا نہ کرو جو تمہاری منشا ہے وہی ہوگا۔''دادو نے بڑھ کر اسے گلے لگالیا۔

☆☆☆

رات کو کھانے پر سب ہی موجود تھے۔ آج دادو کے برابر والی کرسی پر اللہ دتہ براجمان تھا۔ مشعل، ملیحہ کے ساتھ بیٹھی تھی۔ وہ نہ جانے میز کھرچتے ہوئے کیا سوچ رہی تھی۔ اللہ دتہ اسے دیکھ دیکھ کر خود ہی مسکراتا اور شرما جاتا۔

سب سے پہلے عشرت جہاں نے حسب روایت اپنی پلیٹ میں سالن ڈالا پھر اللہ دتہ کی پلیٹ میں ڈالا اب ڈونگے سب کی طرف گردش کررہے تھے۔

''واہ بڑے مزے کا قورمہ ہے۔'' اللہ دتہ ستائشی لہجے میں بولا۔
''مشی آپ نے کیا پکایا ہے؟'' وہ بڑے ہی بے تکلف انداز میں بولا۔
''زہر......!'' مشی نے چلبلا کر جواب دیا۔
''یہ کوئی نئی ڈش ہے شاید، ہم نے پہلے کبھی نام نہیں سنا...... کہاں ہے؟'' اللہ دتہ نے ہونقوں کی طرح پوچھا۔ تبھی مشعل کرسی کھسکا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔
''ممی میرا کھانا میرے کمرے میں بھجوادیں۔'' وہ تنتنائی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔
''اے ہے اسے کیا ہوا؟'' عشرت جہاں بولیں۔
''بہت کچھ ہوا ہے اسے۔'' ملیحہ بڑبڑا کر رہ گئیں۔

☆☆☆

عشرت جہاں لان میں بیٹھی تھیں اور شہناز ان کے کندھے دبا رہی تھی کہ مشعل غصے سے ان کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔
''واہ دادو مان گئی آپ کو بھی اور آپ کی محبت کو بھی......''
''اے ہے کیا ہوا تجھے......؟'' عشرت جہاں حیرت سے بولیں۔
''یہی محبت ہے آپ کی...... یہ نمونہ میرے لیے پسند کیا ہے آپ نے......''
''میں سمجھی نہیں۔'' عشرت جہاں حیرت سے بولیں۔
''سمجھ تو خیر آپ گئی ہیں مگر میں بھی صاف، صاف کہہ رہی ہوں کہ مرجاؤں گی مگر آپ کے اللہ دتہ سے شادی ہرگز نہیں کروں گی آئی سمجھ......''
''کیا برائی ہے اس میں؟''
''پہلے تو مجھے اس کا نام عجیب لگتا تھا اور...... اور اب اس کی حرکتیں، انداز...... عجب لوفرانہ طریقے سے مجھے سرخ، سرخ آنکھوں سے گھورتا ہے۔ یہ سب میری برداشت سے باہر ہے۔'' وہ حد درجہ تنگ کر بولی۔
''تم اس کی منگیتر جو ہو......'' وہ بڑے اطمینان سے بولیں۔
''یونہی خواہ مخواہ...... میں کہہ رہی ہوں آپ اس کو چلتا کریں ورنہ......''
''ورنہ کیا کروگی؟'' عشرت جہاں بھی تنک گئیں۔
''پہلے بھی میں کہہ چکی ہوں، اسے گولی ماردوں گی سن لیں آپ۔'' مشعل تنتناتی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔
''پتا نہیں اس لڑکی کا کیا ہوگا۔'' عشرت جہاں اپنے ماتھے پر ہاتھ مار کر بولیں۔
''آپ مشعل کی بات مان لیں بڑی بیگم صاحبہ......'' اس کے جانے کے بعد شہناز آہستہ سے بولی۔
''اے لو ابھی تو وہ بچی ہے، نا سمجھ ہے۔''
''پھر انہیں اللہ دتہ پسند جو نہیں۔''
''پسند کیوں نہیں، کیا کمی ہے، اتنا سوہنا گبرو جوان ہے، لوگ تو اسے اپنا داماد بنانے کے لیے مرے جارہے ہیں۔''
''ہاں ہے تو مگر مشعل بی بی کو جو پسند نہیں پھر......''
''یہ سب ملیحہ کی شہ پر ہو رہا ہے، وہی اس کا دماغ خراب کیے ہوئے ہے امریکا، لندن کے رشتے جب ماں بتائے گی تو میری مشی کو یہاں کے رشتے کب پسند آئیں گے؟'' بہو پر سارا غصہ ان کی غیر موجودگی میں اتر رہا تھا اور شہناز تیزی سے دادو کے کندھے دبا رہی تھی۔

☆☆☆

''دیکھ لیا آپ نے اللہ دتہ کو......؟'' دو تین دن اللہ دتہ کو برداشت کر کے بلال بالآخر آج باپ کے سامنے پھٹ پڑا تھا۔
''ہاں بیٹا......''
''آپ دادو کو زمان انکل کے ہاں جانے دیں، کہیں تو میں خود چھوڑ آتا ہوں۔''
''دماغ تو صحیح ہے تمہارا...... میں ماں کو گھر سے نکال دوں ایک ذرا سی بات پر......''
''یہ ذرا سی بات ہے، میری بہن کا فیوچر وہ تباہ کر رہی ہیں اور آپ ذرا سی بات کہہ رہے ہیں، حد ہے پپا......'' وہ بہت طیش میں تھا۔
''میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آرہا کہ آپ اور آپ

کی والدہ کیا چاہتی ہیں؟''
''تم یہ کس لہجے میں بات کر رہے ہو بلال......؟''
''میں صحیح کہہ رہا ہوں...... آپ دادو کی ناراضی مول لے لیں، خدارا میری بہن کو اس پینڈو سے نہ بیاہیں۔''
''خاندان میں ہر طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔ کیا برا ہے، ہینڈسم ہے، دولت مند ہے کیا ہے جو ویل ڈریسڈ نہیں...... اور دیکھو بھولا بھالا ہے باقی اور سنور جائے گا۔''
''سب سے بڑھ کر تعلیم اور ایٹی کیٹس کاؤنٹ کرتے ہیں پپا۔''
''اپنا تو ہے...... میں کس طرح اماں کی بات لوٹا دوں۔''
''پھر مشی کو گولی ماردیں۔'' بلال غصے سے بولا۔
''سنو بلال ہم کچھ عرصہ اللہ دتہ کو یہیں رکھتے ہیں کم از کم اسے شہر کے طور طریقے تو سکھاؤ۔ یقیناً ٹھیک ہو جائے گا۔'' وہ کچھ سوچتے ہوئے بولے۔
''مجھ سے ایسا نہیں ہو سکتا...... نہ ہی اتنی فرصت ہے۔''
''لوگ تو جانوروں کو بھی سدھار لیتے ہیں، اللہ دتہ تو پھر انسان ہے۔''
''جانور نما انسان ......'' بلال بڑبڑایا۔
''بیٹا میں اخلاق سے بات کروں گا کہ وہ اللہ دتہ کو سمجھائے...... اگر واقعی یہ مشعل سے شادی کرنا چاہتا ہے تو پھر اسے مشعل کی پسند میں ڈھلنا ہوگا۔'' عثمان احمد بولے۔
''اور اگر وہ پھر بھی نہ مانی تو......؟'' ملیحہ جلدی سے بولیں۔
''کیوں نہیں مانے گی، اگر تم اسے شہ نہ دو تو وہ فوراً مان جائے گی۔ اللہ دتہ بہت اچھا ہے، ذرا پالش کی ضرورت ہے اسے۔ تم اپنی بہن کے لیے اتنا نہیں کر سکتے۔''
''پپا میں اللہ دتہ کو بدلوں......؟'' ذیشان بھی بولا۔
''کتنا بھی وہ بدل جائے مشی تو کبھی نہیں مانے گی۔'' ملیحہ نے کہا۔
''تم نے ضرور کچھ الٹا سیدھا بولنا ہے، تم چاہتی

## چند کارآمد ٹپس

1۔ روٹی کو نرم رکھنے کے لیے آٹا گرم پانی سے گوندھیں...... سفید آٹے میں تھوڑا چکی کا آٹا ملا کر گوندھنے سے روٹی اگلی صبح تک نرم رہے گی۔

2۔ روٹی پکا کر کھجور کے پتوں کی چنگیر میں اتاریں پھر بعد میں روٹی کے کپڑے میں لپیٹ کر رکھیں اور نرم شاپر میں یہ کپڑا رکھیں پھر روٹیاں کسی ٹوکری، ڈلیا یا روٹی کے ڈبے میں رکھیں اگلے دن تک صحیح رہیں گی۔

3۔ روٹی کے برتن اور کپڑے کو ہر روز دھو کر سکھائیں۔

4۔ صاف خاکی کاغذ روٹی کے کپڑے پر رکھ کر اس میں روٹی رکھیں تو گرم روٹی کے دھبے کپڑے پر نہیں پڑیں گے۔

5۔ اپنے کام پر روٹی لے جانا ہو یا سفر پر لے جانا ہو اسی ترکیب سے نرم اور گرم رہے گی۔

6۔ آج کل لڑکیاں وٹامن ڈی کی کمی کا شکار ہو رہی ہیں۔ اس کے لیے صبح خیزی کی عادت ڈالیں اور صبح نو بجے سے پہلے والی دھوپ میں بیٹھنا مفید ہوتا ہے یا پھر ڈھلتے ہوئے سورج کی دھوپ کو ہڈیوں میں جذب ہونے دیجیے...... فلیٹ سسٹم اور آرام طلبی نے یہ دونوں وقت ہماری زندگی سے چھین لیے ہیں۔

7۔ بریسٹ کینسر سے بچنے کے لیے وٹامن سی اور فائبر پر مشتمل غذائیں استعمال کریں...... سیاہ رنگ کے انڈر گارمنٹس سے بچیں...... دن بھر کے UGS رات میں استعمال نہ کریں۔ مائیں بچوں کو خود فیڈ کرائیں۔ اپنے جسم کی اسمارٹنس کے خیال سے پہلے بچے کی غذائی ضرورت کا خیال رکھیں جو میڈیکلی آپ کی بھی فٹنس کے لیے ضروری ہے۔

مرسلہ: نگہت زیدی، بہارہ کہو

ہو اماں یہاں سے چلی جائیں تو سن لو ملیحہ بیگم ایسا نہیں ہوگا اگر میری ماں ناراض ہو کر چلی گئی تو میں خود کو شوٹ کرلوں گا۔ خوش ہو جانا پھر تم سب......'' عثمان احمد کہتے ہوئے تیزی سے کمرے سے باہر چلے گئے۔ ملیحہ، بلال اور ذیشان حق دق رہ گئے۔

☆☆☆

''بلال میرا خیال ہے پپا بھی اپنی جگہ صحیح ہیں۔'' عائزہ نے بلال کو چائے کا کپ تھماتے ہوئے کہا۔

''کیا مطلب......؟''

''ظاہر ہے اماں چلی جاتی ہیں تو پپا کے لیے بہت بے عزتی کی بات ہے۔ اس سے بہتر ہے کہ مشی کی شادی ہی نہ کی جائے۔''

''تمہیں پتا ہے شادی سنتِ نبوی ﷺ ہے۔''

''وہ تو ٹھیک ہے کچھ عرصے کے لیے ہم مشی کی شادی کا تذکرہ نہیں کرتے...... کہتے ہیں وہ ابھی شادی نہیں کرنا چاہتی وہ ایم فل کر رہی ہے۔''

''ہاں، یہ صحیح ہے۔'' بلال جلدی سے بولا۔

''ویسے دادو کی منطق بھی عجیب ہے، کہاں مشی اور کہاں میٹرک فیل اللہ دتہ۔'' عائزہ کا لہجہ افسردہ تھا۔

''بس دادو کو اس کے کاروبار نے متاثر کیا ہے اور کوئی بات نہیں۔ ویسے شکل صورت کا برا نہیں ہے اگر وہ اپنا پہناوا بدل لے۔ چال ڈھال بدل لے تو یقین کرو عائزہ وہ بہت زبردست پرسنالٹی کا مالک ہو جائے گا۔'' بلال کی بات پر عائزہ حیرت سے اسے دیکھنے لگی۔

☆☆☆

''مزہ آ گیا واہ بھئی...... سب کے سامنے تو ذرا سا کھاؤ اور شرم کے مارے پیٹ بھر کر دو دن سے کھانا ہی نہیں کھایا۔'' اللہ دتہ ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھا فروٹ کی ٹوکری سے پھل نکال کر کھانے میں مصروف تھا اور ساتھ ساتھ بڑبڑا بھی رہا تھا۔ تبھی موجو اندر چلا آیا جہاں اللہ دتہ کھانے میں مصروف تھا وہ نہایت حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔

''یہ کیا ہو رہا ہے؟'' اس کے قریب جا کر موجو بولا

آم کاٹتے ہوئے اللہ دتہ کے ہاتھ سے چھری گر گئی۔

''ہائے ہم مر گئے۔''

''یہ کہو ہم ڈر گئے......'' موجو، اللہ دتہ کی بدحواسی کے مزے لے کر بولا۔

''بکومت...... '' اللہ دتہ تڑخ کر بولا۔ ''گستاخ، بدتمیز......''

''یہ آپ کیا کر رہے تھے چوری، چوری......''

''چوری کیسی چوری؟ کھانے پینے کی کوئی چوری نہیں ہوتی۔'' اللہ دتہ ہاتھ نچا کر بولا۔

''یہ جو آپ ٹھونس رہے ہیں یہی چوری ہے۔''

''تمیز سے بات کرو، تم نوکر ہو اور نوکر بن کر رہو...... ہم اس گھر کے ہونے والے داماد ہیں بلکہ مالک ہی ہوئے۔'' اللہ دتہ ہاتھ اٹھا کر تڑخ کر بولا۔

''اچھا...... بلے بھئی بلے......'' موجو دونوں ہاتھ اٹھا کر بولا۔

''کیا اچھا...... ہاں......؟'' اللہ دتہ نے آنکھیں نکالیں۔

''یہی کہ آپ اس گھر کے ہونے والے داماد ہیں...... مگر مشعل بی بی تو......''

''کیا ہوا مشعل کو......؟'' اللہ دتہ گھبرا کر اپنے سینے پر ہاتھ مار کر بولا۔

''یہی کہ وہ آپ کو پسند نہیں کرتیں۔'' موجو سچائی سے بولا۔

''وہ ذرا شرماتی ہیں......'' اللہ دتہ مسکرا کر بولا۔ ''دل میں مجھے پسند کرتی ہیں۔''

''خوش فہمی میں مرجاؤ گے......'' موجو بڑبڑایا ......اور اللہ دتہ بھڑک اٹھا۔

''بکواس مت کرو گستاخ نوکر...... رات کا ایک بج رہا ہے، تم یہاں کیا کر رہے ہو؟'' اللہ دتہ نے رعب جمانے کی ناکام کوشش کی۔

''پانی پینے آیا تھا......'' موجو بولا تو اللہ دتہ نے اس کی گردن پکڑ لی۔

''ہم سے جھوٹ...... ارے ہم تو اڑتی چڑیا کے پر گن لیتے ہیں۔''

''تو آپ یہاں کیا کر رہے تھے، چوری،

چوری فروٹ کھا رہے تھے...... میں بیگم صاحبہ کو بتاؤں گا۔'' موجو اپنی گردن چھڑاتے ہوئے بولا۔

''او بے وقوف نوکر...... تجھے پتا نہیں سسرال والوں کا مال داماد پر حلال ہوتا ہے۔'' اللہ دتہ اس کے گال پر چپت لگا کر مسکراتا ہوا کچن سے نکل گیا۔ موجو خاموش کھڑا رہ گیا۔

☆☆☆

اللہ دتہ ٹی وی لاؤنج میں صوفے پر بیٹھا پاؤں میز پر رکھے بڑی بے نیازی سے ٹی وی دیکھ رہا تھا تبھی اسے مشعل سامنے سے سیڑھیاں اترتی نظر آئی۔ وہ ٹی وی کا والیم کم کر کے آنکھیں بند کیے اونچی آواز میں گانے لگا۔

''ہم تمہیں چاہتے ہیں ایسے......
مرنے والا کوئی...... مرنے والا کوئی
زندگی چاہتا ہو...... جیسے''

مشعل وہیں سیڑھیوں پر ہی ٹھٹک گئی۔

اللہ دتہ نے یہ مصرعے پھر دہرائے اور ساتھ، ساتھ میز بھی بجانے لگا۔

جبھی مشعل تیزی سے سیڑھیاں اترتی اس کے قریب آئی۔

''یہ کیا میراثیوں کی طرح گا رہے ہو؟''

اللہ دتہ نے پٹ سے آنکھیں کھول دیں۔

''ارے آپ مشعل...... زہے نصیب ہمارے قریب......'' وہ بڑے بھونڈے طریقے سے بولا۔

''بکواس بند کرو اور یہاں سے چلے جاؤ۔'' مشعل ڈپٹ کر بولی۔

''کیوں نہ ہم دونوں مل کر ٹی وی دیکھیں۔'' وہ معصومیت سے بولا۔

''میں کہہ رہی ہوں کہ تم میرے گھر سے چلے جاؤ...... گیٹ لاسٹ......''

''ہم کیوں جائیں...... بس دو تین دن تک امی آ جائیں گی پھر میری آپ سے منگنی ہو جائے گی اور......''

''دیکھو مسٹر اے ڈی میں تم سے شادی نہیں کروں گی۔''

''کیوں...... کیوں......؟'' اللہ دتہ نے پریشان ہو کر کہا...... معلوم نہیں وہ ایسا ہی تھا یا مشعل کے سامنے ایکٹنگ کر رہا تھا۔

''اپنی شکل دیکھی ہے تم نے؟'' مشعل گرجی۔

''ہاں بہت مرتبہ، شیشے میں بہت دیر تک ہم اپنی صورت دیکھتے ہیں مگر آج کل ہمیں شیشے میں اپنے بجائے آپ کی صورت نظر آتی ہے۔'' وہ چہرے پر بیچارگی لیے کہہ رہا تھا اور مشعل...... وہ غصے سے کھولتے ہوئے اپنی مٹھیاں بھینچ رہی تھی۔

''سٹیں، ہمارا نام اے ڈی نہیں...... اللہ دتہ ہے کئی مرتبہ بتایا ہے......'' وہ اس کے غصے کی پروا کیے بغیر بڑے اطمینان سے بولا۔

''اے ڈی کا مطلب بھی یہی ہے بس تم اپنا بوریا بستر اٹھاؤ اور یہاں سے دفع ہو جاؤ۔'' مشعل چٹکی بجا کر بولی۔ ''میں شام تک تمہیں یہاں نہ دیکھوں سمجھے تم......''

''مگر ہم کہاں جائیں؟'' وہ روہانسا ہو کر بولا۔

''اپنے گھر جاؤ فیصل آباد......''

''ہم آپ کے بغیر گھر نہیں جائیں گے۔'' وہ اپنی انگلیاں مروڑتے ہوئے بولا۔

''میں تمہارے ساتھ کہیں نہیں جاؤں گی، سمجھے تم......'' مشعل پاؤں پٹخ کر بولی۔

''لے جائیں گے، لے جائیں گے، دل والے دلہنیا لے جائیں گے۔'' اللہ دتہ بڑی ادا سے مسکرایا اور آنکھیں مٹکاتے ہوئے مشعل کے قریب آ کر گنگنانے لگا۔

''گو ٹو ہیل......'' مشعل تنتناتی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔ اور اللہ دتہ اپنی ہی دھن میں یہی گائے چلا گیا۔

☆☆☆

اللہ دتہ باہر برآمدے کی سیڑھیوں پر بیٹھا ڈوبتے سورج کو دیکھ رہا تھا۔ جبھی پیچھے سے کھٹکے کی آواز آئی۔ وہ کن انکھیوں سے دیکھ چکا تھا کہ پیچھے مشعل ہے۔ اس نے جھٹ سے فون کان سے لگا لیا۔

''ہاں امی، ہم خیریت سے ہیں، سب ٹھیک ہے

یہاں، دادو ہمارا بہت خیال رکھتی ہیں، ہاں مشی ہمیں بہت اچھی لگتی ہے، آپ جلدی سے آ جائیں اور منگنی نہ کریں بلکہ سیدھے سادے شادی کر دیں۔ ہم اب مشی کے بغیر فیصل آباد نہیں جائیں گے۔'' وہ چند لمحے کو خاموش ہوا جیسے دوسری طرف کی بات سن رہا ہو۔

''اوہو...... امی تیاری کیسی...... ؟ بینک بھرا پڑا ہے میرے پیسوں سے...... ہاں خوب دھوم دھام سے شادی ہو۔ ارے امی پورے کراچی کو پتا تو چلے...... اور اُدھر فیصل آباد میں بھی چرچے ہوں کہ ہماری یعنی اللہ دتہ کی شادی ہے۔ پتا ہے امی، مشی ہمیں مسٹر اے ڈی کہتی ہے، سچ بہت اچھا لگتا ہے۔ اس کے ہونٹوں سے اپنا یہ نام...... جی چاہتا ہے وہ کہتی رہے ہم سنتے رہیں۔'' وہ قہقہہ لگا کر بولا۔

''نہیں امی، مشی مجھ سے بات نہیں کرتی، ہر وقت غصہ کرتی ہے، لگتا ہے ہم سے شرماتی ہے۔ پر امی ہمیں تو وہ بہت پسند ہے۔ بس اب آپ جلدی آ جائیں، یہ نہ ہو کہ اتنی خوب صورت لڑکی ہاتھ سے نکل جائے۔ اچھا چلیں، اب میں فون بند کرتا ہوں۔'' دھاڑ سے دروازہ بند ہوا اور اللہ دتہ کے لبوں پر معنی خیز مسکراہٹ آ گئی۔

☆☆☆

شام کا وقت تھا مشعل ٹیرس پر کھڑی اپنی ہی سوچوں میں گم تھی کہ اللہ دتہ گنگناتا ہوا ٹیرس پر آ گیا۔

''ایسا پیار کرنے والا میری جان
تجھے ڈھونڈے نہ ملے گا
ایسا بانکا اور سجیلا نوجوان
تجھے ڈھونڈے نہ ملے گا''

وہ آنکھیں موندے ایسے گا رہا تھا گویا اس نے مشعل کو نہیں دیکھا جبکہ وہ باہر لان سے ہی اسے دیکھ چکا تھا۔ مشعل ہونٹوں کو دانتوں سے کاٹتے ہوئے خونخوار نظروں سے اسے گھورنے لگی۔

''ایسا بانکا اور سجیلا نوجوان......'' وہ بدستور گا تا رہا۔

''تمہاری یہ بکواس بند نہیں ہو سکتی۔'' مشعل دھاڑی

''ارے، آپ یہاں...... ہمیں پتا نہیں تھا کہ......'' وہ ہکلا کر بولا۔

''لگتا ہے تمہاری نظر بالکل ہی کمزور ہے۔''

''ہاں، بالکل صحیح کہا آپ نے تبھی تو ہم نے یہ چشمہ لگوایا ہے۔'' وہ افسردہ لہجے میں اپنی عینک کو ہاتھ لگا کر بولا۔

''تم یہاں کیوں آئے؟'' مشعل جھنجلا کر بولی۔

''ہم...... ہم یہاں اوپر کوٹھیاں دیکھنے آئے ہیں۔'' اللہ دتہ معصومیت سے بولا تو مشعل زیرِ لب مسکرانے لگی۔

''وہ ہے ناں کہ ہمارے ابا نے کہا ہے کہ ہم کوئی اچھی سی کوٹھی پسند کر لیں، وہ ہمیں خرید دیں گے۔ ہماری شادی کا تحفہ......''

''یہاں کوٹھی خریدو گے؟'' وہ حیرت سے پوچھنے لگی جیسے اس کے ابا نے کوئی کپڑا پسند کرنے کو کہا ہو کہ ہم خرید دیں گے۔

''ہاں، ہم نے ابا سے کہا ہے کہ ہم شادی کے بعد کراچی میں ہی رہیں گے۔''

مشعل اسے گھورتی رہی۔

''پھر وہ کوٹھی ہم آپ کو رونمائی میں دے دیں گے۔'' بے تکے انداز میں شرماتے ہوئے اللہ دتہ بولا۔

''شٹ اپ...... جسٹ شٹ اپ......'' مارے غصے کے مشعل کی رگیں تن گئیں۔

''ہم سمجھے نہیں......'' وہ معصومیت سے بولا۔

''گو ٹو ہیل......'' مشعل پاؤں پٹخ کر...... کہتی وہاں سے چلی گئی۔

اللہ دتہ گہری سانس لے کر رہ گیا...... ''پتا نہیں مشی ہماری محبت کا جواب محبت سے کیوں نہیں دیتی......'' وہ ریلنگ پہ دونوں ہاتھ ٹکا کر سوچ میں ڈوب گیا۔

☆☆☆

مشی نیچے آئی...... جہاں عشرت جہاں، موجو کو ڈانٹ رہی تھیں۔

''کم بخت تجھ سے کوئی کام ڈھنگ کا ہوتا بھی ہے؟''

''دادو آپ سنبھالیں اپنے لاڈلے کو۔'' مشی غصے سے بولی۔

''کیا ہوا......؟ کون سا لاڈلا......؟'' عشرت جہاں حق دق رہ گئیں۔

''وہی اے ڈی...... جہاں میں جاتی ہوں منحوس وہیں چلا آتا ہے۔'' مشعل غصے سے بولی۔

''اے ہے وہ تجھ سے محبت کرتا ہے۔'' عشرت جہاں مسکرائیں۔

''لعنت بھیجتی ہوں میں اس پر اور اس کی محبت پر......''

''اے ہے باؤلی ہوئی ہے۔'' عشرت جہاں نے اپنی ناک پر انگلی رکھی۔

''اسے چلتا کریں دادو...... ورنہ میں یہ گھر چھوڑ کر چلی جاؤں گی۔''

''کیا مطلب ہے تیرا......؟'' دادو نے حیرت سے پوچھا۔

''بس یہاں اب آپ کا لاڈلا رہے گا یا میں......''

''تم بھی تو میری لاڈلی ہو......'' عشرت جہاں مزید کچھ کہنا چاہتی تھیں مگر مشعل بات کاٹ کر بولی۔

''کبھی تھی لاڈلی پر اب نہیں ہوں......'' مشعل کی آواز بھرا گئی اور وہ تیز، تیز قدم اٹھاتی اپنے کمرے میں چلی گئی۔

''کیا ہوا...... اماں، مشی کیوں غصے میں ہے؟'' ملیحہ نے ساس سے آکر پوچھا۔

''بس اللہ دتہ برا لگتا ہے، میں تو سوچ رہی ہوں فریدہ آرہی ہے تو منگنی کے بجائے فوراً نکاح کر دیتے ہیں۔''

''کیا، کیا اماں......؟ مشی مانے تو تب ناں......'' ملیحہ ہکا بکا رہ گئیں۔

''اس کا یہی علاج ہے، ارے ایسا سیدھا سادہ پیسے والا داماد تمہیں کہیں نہیں ملنے کا۔'' عشرت جہاں ہاتھ نچا کر بولیں اور ملیحہ شاک کی کیفیت میں تھیں۔

☆☆☆

''دادو آپ نے کیا سوچ کر مشی کا رشتہ اللہ دتہ سے طے کیا؟'' لان میں دادو کے ساتھ بیٹھا ذیشان مشعل کے رشتے کے سلسلے میں بات کر رہا تھا۔

''اے لو گھر کا لڑکا ہے، سیدھا سادہ معصوم سا......''

''مگر آج کل کی لڑکیاں ایسے لڑکوں کو پسند نہیں کرتیں، بھوندو کہتی ہیں، آپ انکار کر دیں اب بھی وقت ہے۔''

''تم مجھے مت سمجھاؤ، اللہ دتہ کو مشی بہت پسند ہے۔''

''مگر آپی کو تو اللہ دتہ پسند نہیں ہے ناں......''

''نہ پسند ہو، شادی کے بعد پسند آجائے گا۔''

''یہ آپ کی بھول ہے۔''

''اچھا تم اس کا دل برا نہ کرو......''

تبھی اللہ دتہ نے انٹری دی۔

''ارے دادو آپ یہاں بیٹھی ہیں، میں سارا گھر تلاشتا پھر رہا ہوں۔''

''میں صدقے...خیریت تو ہے۔''

''ہاں خیریت ہے، بس پوچھنا تھا آپ سے کہ بازار چلا جاؤں۔''

''ہاں...... ہاں کیوں نہیں ضرور جاؤ...... کچھ لینا ہے؟''

''جی جوتا لینا ہے...... مگر کس کے ساتھ جاؤں۔''

''تم شانی کے ساتھ چلے جاؤ......'' انہوں نے ذیشان کی طرف اشارہ کیا۔

''ہاں، یہ ٹھیک ہے۔''

''تم خود چلے جاؤ۔'' شانی تڑ سے بولا۔

''اگر ہم شہر میں کھو گئے تو......؟'' وہ انتہائی معصومیت سے بولا۔

''ارے ذیشان، تم بچے کو لے جاؤ ناں؟ ویسے تو سارا دن لور لور پھرتے ہو۔''

''ہم کار میں تیل ڈلوا دیں گے ٹھیک ہے ناں دادو......''

''آہم...... ہم...... ہم تو ایسے بولتے ہیں جیسے لکھنؤ کے نواب ہوں۔'' وہ دل ہی دل میں بولا۔

''چلیں پھر......'' شانی اٹھ کھڑا ہوا۔

''اچھا دادو اللہ حافظ......'' اللہ دتہ، عشرت جہاں کو خدا حافظ کہنے لگا۔

''جاؤ اللہ کی امان میں۔'' عشرت جہاں بھی

دعائیں دیتی اندر چلی گئیں۔

☆☆☆

مشعل کچن میں کھڑی چائے بنارہی تھی اور عائزہ بھی سبزی کاٹنے میں مصروف تھی۔ جبھی اللہ دتہ بھی کچن میں چلا آیا۔

''ارے آپ لوگ یہاں ہیں۔''

''خواتین کے لیے ہی کچن ہوتا ہے بھائی......'' عائزہ مسکرا کر بولی۔

''اوہو آج عربی پک رہی ہے، ہمیں بہت پسند ہے عربی......'' اللہ دتہ عائزہ کو اروی کاٹتے دیکھ کر بولا۔

''یہ عربی نہیں اروی ہے۔'' عائزہ ہنستے ہوئے بولی۔

''آپ کو بات تو سمجھ آگئی ناں یہی بہت ہے۔ اچھا یہ موجو کہاں ہے؟''

''کیوں کچھ چاہیے کیا......؟'' عائزہ پوچھنے لگی۔

''آپ تو مصروف ہیں، مشی تم ہمیں ملک شیک بنادو ناں......''

''ہمارے گھر اتنا دودھ نہیں آتا جو ہر وقت تم ملک شیک ڈکارتے رہو۔'' مشعل جل کر بولی۔

''ویسے تم آئے تھے تو ایک بھینس ہی لے آتے۔'' مشعل کپوں میں چائے ڈالتے ہوئے بولی۔

''یہ تم نے اچھا یاد دلایا۔ خیر شادی کے بعد جب تم یہاں آؤ گی تو ہم......''

''بکومت......'' اس کی بات کاٹ کر چلاتے ہوئے مشی نے کہا۔

''ویسے مشی ہم فارم ہاؤس پر رہیں گے، تم وہاں شیشم کے درخت پر جھولے ڈالنا اور یہ گانا گانا......''

اب وہ کان پر ہاتھ رکھ کر لہک، لہک کر گا رہا تھا۔

''اچیاں لمبیاں ٹہلیاں وے
وچ گجری دی پینگھ وے ماہیا''

''یہ گجری کیا ہوتی ہے؟'' عائزہ نے ہنستے ہوئے پوچھا۔ اس نے اللہ دتہ کو آج ہی گاتے سنا تھا۔

''بھائی یہ گجر کی بیوی ہوتی ہے، دودھ بیچنے والے کو اکثر گجر بھی کہتے ہیں...... جیسے ہم گجر اور مشی گجری ہوگی۔''

''اللہ دتہ میں تمہارا سر پھاڑ دوں گی۔'' مشعل زور سے چلائی اور بیلنا اٹھالیا۔

''تم تصور تو کر کے دیکھو قسم سے ہیروئن لگو گی۔'' اللہ دتہ بہ دستور اسے چڑا رہا تھا۔

''دل چاہتا ہے میں تمہارا گلا دبا دوں۔'' مشعل نے دانت کچکچائے۔

''نہ، نہ بہت درد ہوگا ہمیں۔'' اللہ دتہ نے جھٹ اپنی گردن پر ہاتھ رکھا۔

''اوہ مائی گاڈ......'' مشعل اپنے ماتھے پر مکا مارتی ہوئی پیر پٹختی وہاں سے نکل گئی۔ عائزہ پیٹ پر ہاتھ رکھے ہنسے جارہی تھی اور اللہ دتہ معصومیت سے اسے دیکھ رہا تھا۔

☆☆☆

مشعل دھاڑ سے دادو کے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی۔ عشرت جہاں ایک دم اٹھ کر بیٹھ گئیں۔

''آپ نے آخر مجھ سے کس بات کا بدلا لیا ہے؟''

''کیا ہوا میری جان......؟''

''کچھ ہوا نہیں مگر ہو ضرور جائے گا...... آپ کا مسٹر اے ڈی مسلسل میرے پیچھے لگا رہتا ہے۔ جہاں سے گزروں واہیات گانے گاتا ہے، چٹکیاں بجاتا ہے، جان عذاب کر رکھی ہے میری۔'' مشعل مٹھیاں بھینچ کر بولی۔

''منگیتر ہے تمہارا تمہیں دیکھ کر خوش ہوتا ہے۔''

''دادو پلیز، مجھے کنویں میں ڈال دیں مگر ایسے چغد کے پلے نہ باندھیں۔'' مشعل ہاتھ جوڑ کر بولی۔

''بیٹا تم سمجھو تو اللہ دتہ بہت اچھا ہے، معصوم سا محبت کرنے والا...... خیال رکھنے والا اور آمدنی بھی بہت اچھی ہے، سب سے بڑھ کر تمہیں بہت چاہتا ہے۔''

''مگر میں تو اسے نہیں چاہتی...... بہت ہوگیا، میں کچھ کھا کر سو رہی ہوں گی، میں آپ کو بتائے دیتی ہوں۔''

''میں بھی بتائے دیتی ہوں، شادی تمہاری ہوگی تو صرف اللہ دتہ سے...... میں تمہاری ماں کی سب عادتیں جانتی ہوں، وہ نہیں چاہتی کہ تمہاری شادی اللہ دتہ سے ہو...... مگر میں بھی اس کی خواہش پوری نہیں ہونے

دوں گی۔" وہ سینہ ٹھونک کر بولیں۔

"اوہ دادو، مجھے ممی نے کچھ نہیں کہا۔ مجھے خود اللہ دتہ ذرا بھی پسند نہیں ...... جب وہ اپنی بھینسوں کی باتیں کرتا ہے تواُف......" مشعل سر جھٹک کر بولی۔

"خیر تم کچھ بھی کہو میرا فیصلہ نہیں بدل سکتا اور اگر تم نہ مانیں تو میں نعمان اور زمان کے ہاں چلی جاؤں گی، کہوں گی میرے مرنے پر بھی عثمان اور اس کے بیوی بچے نہ آئیں۔" عشرت جہاں قطعیت سے بولیں۔

"ٹھیک ہے، آپ جو چاہیں کریں، پپا کو بلیک میل کریں مگر میں بلیک میل نہیں ہوں گی۔" مشعل کہہ کر کمرے سے نکل گیا۔

☆☆☆

"کل فریدہ آنٹی آرہی ہیں منگنی کرنے......" عائزہ، بلال سے بولی۔

"ہاں آتو رہی ہیں پر کیا منگنی بھی کریں گی؟"

"بلال اپنی مشی بالکل بھی راضی نہیں ہے۔"

"میں کیا کروں...... راضی تو میں بھی نہیں ہوں۔"

"آپ پپا سے بات کریں۔"

"وہ دادو کی وجہ سے مجبور ہیں۔"

"اولاد کی کوئی اہمیت نہیں؟"

"شاید نہیں......" بلال گہری سانس لے کر بولا۔

"مشی چار دن سے مسلسل اسے بے عزت کررہی ہے مگر مجال ہے وہ اس کی سنے......"

"اب کیا، کیا جائے۔" بلال بھی فکر مند تھا "مشی سے کہو اللہ دتہ کو اپنے رنگ میں رنگ لے......اور کیا......"

"ہاں بچہ ہے ناں جو اس کے رنگ میں رنگ جائے گا......" عائزہ نے سر جھکا کر کہا۔ اچانک ہی زور، زور سے بولنے آواز آنے لگی۔ عائزہ اور بلال تقریباً بھاگ کر کمرے سے باہر نکلے۔

مشعل، اللہ دتہ پر چیخ رہی تھی جو صوفے پر دبکا بیٹھا تھا۔

"کیا ہوا...؟کیا ہوا؟"

دادو بھی باہر نکل آئیں۔
''آخر ہوا کیا......؟''
''اسی سے پوچھیں، اسے جرأت کیسے ہوئی میرے بالوں میں پھول لگانے کی؟'' مشعل غصے سے لال پیلی ہو رہی تھی۔
اللہ دتہ اٹھ کر دادو کے کندھے سے لگ گیا گویا پناہ گاہ کی تلاش میں تھا۔
''دادو......وہ......وہ ہم تو......ہم تو......''
''میں تمہارا سر پھاڑ دوں گی۔'' مشعل آگے بڑھی تو وہ ایک دم دادو کے پیچھے دب گیا۔
''اے ہے، بچے نے تمہیں پھول ہی تو دیا ہے اور تم اس کا سر پھاڑ دو گی۔''
''اور کیا ہم نے کوئی گملا تو نہیں دے ڈالا......'' اللہ دتہ نے آنکھیں مٹکا کر کہا۔
''دور ہو جاؤ میری نظروں سے۔'' مشعل زور سے دہاڑی۔
''لو یہ کس طرح بات کر رہی ہو منگیتر ہے تمہارا......'' دادو مشعل کو ڈپٹ کر بولیں۔
''میں خون پی جاؤں گی تمہارا۔'' مشعل اپنے ہاتھ آگے کیے۔ اللہ دتہ کی طرف لپکی۔
''دادو یہ تو آدم خور ہے ہمیں بچالیں۔'' اللہ دتہ دادو سے لپٹ گیا۔
''کان کھول کر سن لو مشی، تمہاری شادی ہو گی تو اللہ دتہ سے ہو گی۔ میرے جیتے جی تم کسی اور کی نہیں ہو سکتیں۔'' عشرت جہاں قطعیت سے بولیں۔
''اس چغد سے شادی کرتی ہے میری جوتی......'' مشعل تیزی سے پیر پٹختی وہاں سے جانے لگی مگر جاتے، جاتے سنتی گئی کہ اللہ دتہ روہانسا ہو کر کہہ رہا تھا۔
''دادو، ہم نے مشعل سے شادی نہیں کرنی۔ کل امی آرہی ہیں، آپ منع کر دیں وہ نہ آئیں۔ ہم کل ہی فیصل آباد واپس چلے جائیں گے۔''
''تم کیوں جاؤ گے، میں دیکھتی ہوں کیسے تجھ سے شادی نہیں کرتی مشعل، کلادبادوں گی کم بخت کا۔''

دادو بھی اونچا، اونچا بولنے لگیں۔
عائزہ اور بلال خاموش کھڑے تھے۔

☆☆☆

مشعل اپنے کمرے میں لیپ ٹاپ لیے بیٹھی تھی کہ عثمان احمد چلے آئے۔
''ارے پپا آپ مجھے بلا لیتے۔'' وہ جلدی سے لیپ ٹاپ آف کرنے لگی۔
''ایک بات کہنی ہے بیٹا، تمہید نہیں باندھوں گا بس اتنا کہنا ہے کہ کل فریدہ آرہی ہے اور تم کوئی انکار نہیں کرو گی، یہ میری مجبوری ہے کہ میں تمہاری اللہ دتہ سے شادی کروں۔''
''کیسی مجبوری......؟'' مشعل حیران تھی۔
''میری مجبوری، میری ماں ہے اور میں ان کی بات نہ مان کر گناہ گار نہیں ہونا چاہتا۔ اچھی بچیوں کی طرح تم مان جاؤ۔''
''پپا آپ کو پتا ہے وہ کیسا ہے؟'' مشعل آہستہ سے بولی۔
''بس سیدھا سادہ ہے، تعلیم واجبی ہے تو کیا ہوا۔ بہت بڑا بزنس ہے ان کا......اس کے الگ فارم ہاؤس میں لگ بھگ دو تین کروڑ کی بھینسیں، گائیں ہیں۔ کاٹن فیکٹری بھی اخلاق نے اس کے نام کی لگائی ہے اور سب سے بڑھ کر اپنا ہے، تم خوش رہو گی۔'' انہوں نے اس کا سر تھپکا۔
''پپا، دولت خوشی کی ضامن نہیں ہوتی۔'' مشعل کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔
''پھر بھی اللہ دتہ برا نہیں، میں نے ان چار دنوں میں تجزیہ کیا ہے، بہت سوفٹ نیچر کا ہے، دل کا برا نہیں سچا اور کھرا ہے۔''
''یہ آپ کا آخری فیصلہ ہے؟'' مشعل پوچھنے لگی۔
''ہاں، اگر تم نہ مانیں تو پھر سمجھنا کہ باپ تمہارا مر گیا۔''
''اللہ نہ کرے......'' مشعل باپ کے گلے لگ کر رونے لگی... عثمان احمد کی آنکھیں بھی نم تھیں۔

☆☆☆

فریدہ اپنی نند آمنہ اور بیٹی انعم کے ساتھ آ گئی تھیں اور وہ سب سے مل کر بہت خوش ہو رہی تھیں۔ تبھی مشعل کو نہ پا کر انہوں نے عائزہ سے کہا۔ ''ارے بھئی مشعل کو تو بلاؤ۔ میں اپنی بہو سے تو مل لوں۔''

عائزہ مشعل کو لے کر آ گئی۔

''کیسی خوب صورت ہو گئی ہے مشی..... پورے چھ سال بعد دیکھا ہے ناں۔'' وہ مشعل کو پیار سے گلے لگاتے ہوئے بولیں۔ اللہ دتہ بھی بیٹھا دیکھ رہا تھا آج مشعل نے کوئی ہنگامہ نہیں دکھایا تھا۔

مشعل کے کمرے میں بیٹھی فریدہ اسے جوڑے اور دیگر سامان دکھا رہی تھیں جو وہ منگنی کی غرض سے فیصل آباد سے لے کر آئی تھیں۔ پانچ جوڑوں میں سے انہوں نے مشعل سے کہا کہ اپنی مرضی کا کوئی بھی پہن لینا۔ وہ بہت خوش تھیں۔

''آنٹی مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے۔'' مشعل نے وہ جوڑے ایک طرف رکھ کر ان سے کہا۔

''ہاں بولو بیٹی.....'' فریدہ اس کی طرف دیکھ کر بولیں۔

''وہ دراصل، میں آپ کے بیٹے سے شادی نہیں کر سکتی۔'' مشعل بہ مشکل اٹک، اٹک کر بولی۔

''کیا کہہ رہی ہو تم؟'' فریدہ حیرت زدہ رہ گئیں۔

''سوری آنٹی آپ کو دکھ ہوا ہو گا مگر.....؟''

''کیا تم کسی اور کو پسند کرتی ہو۔''

''نہیں..... نہیں مجھے کوئی بھی پسند نہیں.....'' مشعل جلدی سے بولی۔

''تو انکار کی وجہ.....؟'' فریدہ صدمے کی کیفیت میں تھیں۔

''مجھے اللہ دتہ پسند نہیں.....'' مشعل نے کہا۔

تبھی دروازے پر دستک ہوئی.... اور آنے والا اندر آ گیا... مشعل آنے والے کو دیکھ کر ایک لمحے کے لیے حیرت زدہ رہ جاتی ہے۔

اسکائی بلیو شلوار سوٹ میں سلیقے سے شیمپو کیے بال سنوارے بغیر سرمے کے جذبے لٹاتی آنکھیں اور نہایت شستہ لہجے میں وہ مخاطب ہوا۔

''امی آپ ذرا باہر تو جائیں...... مجھے مشعل سے کچھ بات کرنی ہے۔''

''مگر کیوں...... ؟ الطاف یہ تو راضی ہی نہیں تم سے شادی کو۔''

''آپ جائیں تو......'' فریدہ کمرے سے نکل گئیں تو وہ مشعل کے قریب آیا۔

''تم اللہ دتہ سے شادی کو راضی نہیں ناں مگر الطاف زیدی سے شادی پر تو کوئی اعتراض نہیں تمہیں......I am Altaf zaidi'' مشعل پریشان سی انگلیاں مروڑ رہی تھی۔

''دیکھو میری جانب اور تلاش کرو وہ خامی کہ تم مجھے ریجیکٹ کر سکو۔''

''تم ......تم فراڈی، دھوکے باز......'' مشعل جیسے ایک دم ہوش میں آ گئی اور اسے مارنے کو اٹھی۔ اس نے مشعل کے ہاتھ پکڑ لیے۔

''مجھے تم نے بے وقوف بنایا......'' وہ اس کی بات پر ہنس رہا تھا۔

''بنے بنائے کو کون بے وقوف بنا سکتا ہے۔'' وہ ہنسا۔

''میں بے وقوف ہوں......؟'' مشعل نے اسے گھورا۔

''کچھ کہوں گا تو شکایت ہو گی۔'' مشعل اسے وہیں چھوڑ کر کمرے سے نکل گئی۔

''میں نے تمہیں منع کیا تھا ناٹک نہ کرو مگر تم مانے نہیں۔'' فریدہ، اللہ دتہ، الطاف کو ڈانٹ رہی تھیں۔

''آپ پریشان نہ ہوں، میں اسے ابھی منا لوں گا اور آپ کل منگنی نہیں نکاح کیجیے گا ہمارا......بس آپ کوئی ٹینشن نہ لیں۔ سب مجھ پر چھوڑ دیں۔''

''ہاں تم پہ چھوڑ دوں، ذلیل کراؤ گے میں ابھی عثمان بھائی سے بات کرتی ہوں۔ وہ بہت پریشان ہیں۔''

''انہیں سب پتا ہے۔'' فریدہ حیران تھیں۔

''بھابی میں کتنی کم فہم ہوں اللہ دتہ مجھے بے وقوف بناتا رہا اور میں بنتی گئی۔'' تبھی وہ کچن میں چلا آیا۔

''آپ چلے جائیں یہاں سے...... میں آپ کو

ایک لمحہ بھی برداشت نہیں کر سکتی۔'' اللہ دتہ نے عائزہ کو کچن سے جانے کا اشارہ کیا تو وہ کچن سے چلی گئی۔
''کیا میں اتنا برا ہوں مشعل......؟'' اس کا لہجہ بڑا گمبھیر تھا۔
''آپ بہت برے ہیں، آپ نے مجھ سے ناٹک کھیلا۔''
''اپنوں کے ساتھ ناٹک کرنے کا مزہ ہی اور ہے۔'' الطاف مسکرایا۔ مشعل وہاں سے جانے لگی تو الطاف نے اس کا بازو پکڑ لیا۔
''فردِ جرم سنا دی، صفائی کا موقع نہیں دو گی۔'' نہایت گمبھیر لہجے میں وہ بولا۔
''مجھے کوئی وضاحت نہیں چاہیے۔'' مشعل نے کہا۔
''مگر میں تو وضاحت دوں گا۔''
وہ اسے گھورتی رہی۔
''جب دادو نے مجھے تمہارے لیے پسند کیا تو یہی کہا کہ تمہیں کوئی پروپوزل پسند نہیں آتا۔ میں نے کہا میں ضرور مشی کو پسند آؤں گا مگر وہ بھی مجھے پسند آئی تو اور پھر میں نے کالج میں سوہنی ماہیوال ڈرامے کی تصویر دے دی، میں نے ڈرامے میں ماہیوال کا کردار ادا کیا تھا وہ گیٹ اپ والی تصویر تمہیں بھلا کیسے پسند آتی۔''
''پر آپ تو میٹرک فیل ہیں۔'' مشعل نے کہا۔
''تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ میں نے ایگری کلچر میں ایم ایس سی اور ڈیری فارمنگ میں PHD کیا ہوا ہے۔''
مشعل حیرت سے اسے دیکھنے لگی۔
''تم نے مجھے صرف میرے حلیے کی وجہ سے ریجیکٹ کیا، میں یہاں آیا پھر سب سے میٹنگ ہوئی سب نے میرا ساتھ دیا اور مجھے پسند بھی کر لیا اور مشکل یہ تھی کہ مجھے بھی تم پہلی نظر میں بھا گئی تھیں ورنہ تو......''
''ورنہ تو کیا......؟'' مشعل نے پوچھا۔
''میں چلا جاتا...... تمہیں ریجیکٹ کر کے مگر کیا کروں کہ تم تو دل میں گھس گئی تھیں پہلی نظر میں، تبھی تو صراحی گری تھی۔''
مشعل منہ پھیر کر مسکرانے لگی ہے۔
''اِدھر میرے سامنے مسکراؤ......'' الطاف نے محبت سے اس کا چہرہ اپنی طرف کیا۔
''ایسا بانکا اور رنجیلا......'' وہ گنگنایا۔
''مجھے آپ اب بھی پسند نہیں۔'' مشعل نے کہا۔
''ایسا نہیں ہو سکتا کہ میں تمہیں پسند نہ ہوں ورنہ تم اتنے اطمینان سے میری بات نہ سنتیں...... مجھے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ تم بہت سطحی سی لڑکی ہو جو ظاہر کو پسند کرتی ہے مگر ڈیئر مشی ہر چمکتی شے سونا نہیں ہوتی...... انسان کا ظاہر تو کچھ بھی ہو سکتا ہے، اس کا پہناوا اچھا نہ ہو لب و لہجہ پسند نہیں آتا تو اسے اپنی پسند میں ڈھالا جا سکتا ہے...... مگر دل تو نہیں بدلے جا سکتے کہ دل اپنی پسند پر نہیں چلائے جا سکتے۔''
''کیا زندگی میں دل کی کوئی اہمیت نہیں ہے؟'' مشعل نے پوچھا۔
''ہے دل کی اہمیت......'' الطاف جلدی سے بولا۔ ''مگر دل تو اپنی من مانی کرتا ہے کسی کی نہیں سنتا جیسے میرا دل کہتا ہے دلہن میں لے کے جاؤں گا۔ قسم سے لے کے جاؤں گا۔'' الطاف ہنستے ہوئے بولا۔
''آپ بہت برے ہیں، مجھے اتنا رلایا ہے، بے وقوف بنایا۔''
''معافی بھی تو مانگ رہا ہوں۔'' وہ محبت سے بولا۔
''کب مانگی ہے معافی......؟'' مشعل گھورتے ہوئے بولی۔
''اتنی دیر سے وضاحتیں دے رہا ہوں یہی تو معافی ہوتی ہے۔''
''اچھا یہ معافی ہوتی ہے مسٹر اے ڈی تو جائیں ہم نے آپ کو معاف کیا......'' مشعل ہنستی ہوئی کچن سے بھاگ نکلی۔
الطاف احمد کا زندگی سے بھرپور قہقہہ اس کی سماعتوں میں گونجنے لگا۔

ناولٹ

# شناخت

ام ایمان قاضی

زندگی میں انسان کی روح کو بعض دفعہ ایسے زخم لگ جاتے ہیں جن پر دنیا کا کوئی مرہم، کوئی دوا قطعاً بے اثر ٹھہرتی ہے پھر ایسے زخموں کی پرورش وقت کرتا ہے۔ انہیں ہوا دے کر، اذیت و درد کے طویل صحرا سے گزار کر بالآخر ایسے ناسور میں تبدیل کر دیتا ہے جو لاعلاج ٹھہرتا ہے۔ عمر بھر رِستا ہے، نہ جینے دیتا ہے نہ مرنے......

سچ ہے جسم پر لگنے والے زخم تو پھر بھی بھر جاتے ہیں پر زبان کی دھار اور دھوکا و فریب کی کاٹ سے جو



زخم روح پر لگتے ہیں انہیں ناسور ہی بننا ہوتا ہے۔ کریم بخش شاہ، شاہ پور کے سجادہ نشین چہرے پر بے تحاشا تھکن اور نقاہت لیے اپنے خاص کمرے میں نیم دراز تھے۔ پاس ہی ان کی چالیس سالوں کی رفاقتوں کی ساتھی، ان کے ہر دکھ، درد سے آشنا ان کی نصف بہتر بیٹھی ان کے پاؤں دبا رہی تھیں۔ وہ ان کے چہرے پر رقم اذیت دیکھ کر رہ نہ سکیں تو تشویش سے بول اٹھیں۔

''کیا بات ہے شاہ صاحب! طبیعت تو ٹھیک ہے ناں......'' ویسے تو وہ عمروں سے رت جگوں کا شکار تھے پر رات شاہ صاحب کی حالت کچھ زیادہ خراب ہو جانے پر ان کا بڑا پوتا اذان شاہ انہیں ڈاکٹر کے پاس لے گیا تھا جہاں ان کو ڈپریشن بتایا گیا تھا ساتھ ہی تاکید کی گئی تھی کہ انہیں ہر قسم کی پریشانی سے دور رکھا جائے۔

''اللہ پاک کا کرم ہے نیک بخت! بس دعا کیا کرو کہ اس پاک ذات نے جس آزمائش میں ڈالا ہے بس اس میں سرخرو ہو کر اس دنیا سے جائیں۔'' شاہ صاحب نے تھکے ہوئے انداز میں کہا۔

''وہ مالک کسی کو کسی کی ہمت سے زیادہ نہیں آزماتا شاہ صاحب! اس پر بھروسا رکھیں۔'' صدیقہ بیگم کی اپنی آواز نمکین آنسوؤں کے بوجھ سے بھرّا گئی۔

''اذان شاہ آئے تو اسے ہمارے پاس بھیج دیجیے گا اور جب لنگر ختم ہو جائے تو الٰہی بخش کو پیغام بھجوا دیں کہ وہ مردانے میں ہمیں بلوالے گا۔'' انہوں نے صدیقہ بیگم کو کچھ ہدایات دیں تو وہ چونک گئیں۔

''آج اگر مریدین کو منع کر دیں...... آپ کی طبیعت......''

''نہیں صدیقہ! مالک نے ہمارا نصیب پتا نہیں کس، کس ضرورت مند کی ضرورت سے جوڑ رکھا ہے۔ یہ لوگ ہر ماہ آج کی تاریخ کو ایک آس اور امید لے کر آتے ہیں۔ ہمارا دل نہیں مانتا ان کو خالی لوٹانے کو...... ہو سکتا ہے ہمارے حصے کی کوئی دعا تکمیل پانے کو ان لوگوں کے توسط کا انتظار کر رہی ہو۔'' انہوں نے صدیقہ بیگم کو مزید کچھ کہنے سے روکتے ہوئے کہا۔

صدیقہ بیگم ان کے لہجے کا حتمی پن محسوس کر کے چپ کر کے باہر آ گئیں۔

یہ گاؤں اور پاس کے تین گاؤں بھی شاہ صاحب کی ملکیت تھے۔ وہی اس علاقے کے کرتا دھرتا تھے۔ زبان و عمل میں اپنے قول کے سچے کریم بخش شاہ کو یہاں کے لوگ بہت عزت و تکریم دیتے کیونکہ انہوں نے اس علاقے کی بہبود کے حوالے سے بہت سے ترقیاتی کام کیے سو کیے تھے اور بھی کئی حوالوں سے لوگوں کے لیے وہ بہت اہم تھے۔ ہر ماہ ان کے گھر کے باہر بنے مخصوص احاطے میں بے شمار ضرورت مند اپنی ضروریات کی تسکین اور مسائل کے حل کے لیے حاضر ہوتے۔ شاہ صاحب کی طرف سے لنگر کا انتظام ہوتا حتی المقدور لوگوں کے مسائل سن کر حل کیے جاتے۔ ضرورت مندوں کو حیثیت کے مطابق ان کی ضرورت سے نوازا جاتا اور آخر میں ایک چھوٹے سے درس کا اہتمام ہوتا جس میں ہر بار شاہ صاحب کسی نہ کسی دینی و مذہبی موضوع پر بحث کر کے لوگوں کے فکر و شعور کو آگاہی کی دعوت دیتے۔ لوگوں کو اپنی ذات اور اللہ کی دی ہوئی دولت سے خوشیاں دینے والے کریم بخش شاہ اپنی ذاتی زندگی میں بے حد دکھی انسان تھے۔ ان کے دو بیٹے جواں سالی میں ہی ان کو چھوڑ گئے تھے۔ بڑے بیٹے کی وفات تب ہوئی جب وہ اپنی اہلیہ کے ساتھ دوسرے گاؤں سے کسی شادی میں شرکت کے بعد گھر واپس لوٹ رہا تھا۔ ان کا بڑا پوتا اذان شاہ اس وقت بارہ سال کا تھا اور پوتی چار سال کی تھی جبکہ دوسرے بیٹے کی وفات دل کا عارضہ لاحق ہو جانے کے باعث ہوئی۔ اس کی اہلیہ گھریلو ناچاقی کے باعث اسے چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ شاہ صاحب اور صدیقہ بیگم ڈھے گئے کھوکھلے ہو گئے۔ بیٹی اپنے ہی خاندان میں بیاہی تھی۔ اس کے بچے نانا کا گھر نزدیک ہونے کی وجہ سے یہیں پائے جاتے۔ خصوصی طور پر نواسی خدیجہ، پوتی عائشہ کی ہی ہم عمر تھی۔

☆☆☆

سرِ شام ہی ستارہ منزل میں رونقیں عروج پر آنا

شروع ہو جاتی تھیں۔ ہر طرف ایک گہما گہمی اور مخصوص رونق کا منظر تھا جو ہمیشہ کی طرح اسے کڑوا گھونٹ ہی لگا۔

سترہ سال اس نگر میں گزار لینے کے باوجود خوش بخت اس طرزِ زندگی کا خود کو عادی نہ کر پائی تھی۔ ورنہ ستارہ منزل میں ہر لڑکی سولھویں سال میں قدم رکھتے ہی کام سے لگ جاتی تھی' وہ شاید ستارہ بیگم کا اپنا خون تھی ان کی سگی بہن کی بیٹی جس کی ماں کو ایک شریف زادہ اپنی محبت کے سنہرے جال میں پھنسا کر گھر کی زینت بنانے کے وعدے کی ڈور تھما کر ان کی نظروں میں دھول جھونک کر لے گیا تھا...... پر محض ڈیڑھ سال بعد وہ ننھی خوش بخت کو سینے سے لگائے لوٹ آئی تھی۔ ان لوگوں نے جو باتیں تو بڑی، بڑی کرتے ہیں..........، پر کسی طوائف کا گھر بسانا کوئی نہیں برداشت کرتا' فردوس بیگم پر زندگی اتنی تنگ کر دی تھی کہ وہ محض دو سال میں ہی تھک کر واپس اسی پناہ گاہ میں لوٹ آئی۔ فردوس بیگم کی عمر ہی مختصر تھی وہ ایک حادثے میں جاں بحق ہو گئی اور ستارہ بیگم جدید دور کے تقاضوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے وہ تنگ و تاریک گلیاں چھوڑ کر ایک پوش ایریے میں آ بسیں۔ ناز و ادا اور فن کی تربیت تو پہلے بھی دی جاتی تھی اب دورِ جدید کے بدلتے تقاضوں کے تحت لڑکیوں کو اسکول و کالج کی تعلیم بھی دی جانے لگی یہاں ستارہ بیگم کا کاروبار چمک اٹھا۔ بڑے، بڑے عہدے داروں اور سرپرستوں کی آڑ میں ستارہ بیگم کا کام اتنی صفائی سے چل رہا تھا کہ کسی قسم کے شک کی گنجائش نہ تھی۔ اگر تھی بھی تو اس قسم کے کاموں میں ٹانگ اڑانا کون پسند کرتا ہے...... ستارہ بیگم کو بہن کی نشانی سے لاکھ محبت سہی پر یہ منظور نہیں تھا کہ وہ اپنے آبائی پیشے سے ہٹ کر کچھ اور سوچے جبکہ خوش بخت گلے میں پھنسی ہڈی کی طرح ستارہ بیگم کو اٹک گئی اور اس گندے کاروبار کا حصہ بننے سے انکار کر دیا۔ ستارہ بیگم نے پیار، ڈانٹ ہر طرح سے سمجھا کے دیکھ لیا تھا۔ اب ابھی وہ خالہ کے بلا بھیجنے پر ان کے حجرے کی طرف ہی آئی تھی۔

''تمہاری ضد اور ہٹ دھرمی اور لڑکیوں میں بغاوت کا سبب بنے ایسا ہم کبھی برداشت نہیں کریں گے۔ تم کام سے نہیں لگتیں چلو مان لی تمہاری ضد...... پر آج سے ماسٹر صاحب تمہیں رقص و موسیقی کی تربیت دینے آئیں گے۔ پچھلے دنوں جمیل ستار نے تمہیں دیکھ کر مجھے ایک نیا راستہ دکھایا کہ تمہارا فیس اور فگر فلم لائن کے لیے بہت موزوں ہے۔ تھوڑا پالش ہو جاؤ تو وہ تمہیں اپنی نئی فلم میں انٹروڈیوس کرانے کو تیار ہیں۔ میں تو سمجھو خوشی سے پاگل ہو گئی ان کی بات سن کر...... ایک دنیا دیوانی ہوئی پھرتی ہے جمیل ستار کی فلم میں کام کرنے کو اور وہ تمہیں خود آفر کر رہے ہیں۔ کل سے دوبار ان کا فون آ چکا کہ کب تم سے آ کر مل لیں۔ تم بس آج سے پریکٹس شروع کر دو۔'' ستارہ بیگم نے اپنی خوشی میں اس کا فق ہوتا چہرہ دیکھنے کی زحمت نہیں کی یا جان بوجھ کر نظر انداز کر دیا۔

''آنٹی...... میں وہ......''

''بس خوشی! اس سے زیادہ رعایت تمہیں نہیں مل سکتی۔'' انہوں نے ہاتھ اٹھا کر اسے ٹوک دیا۔

''فردوس کی بیٹی سمجھ کر میں پہلے ہی بہت ڈھیل دے چکی ہوں تمہیں ورنہ تمہیں پتا ہے ستارہ بیگم کو انکار کرنے والی لڑکیوں کو صرف چوبیس گھنٹے میں رستم کیسے سیدھا کر کے رکھ دیتا ہے کہ باقی ساری زندگی جو بھی کچھ کروالو پر رستم کے نام سے کیسے کانپ جاتی ہیں۔'' ان کے لہجے نے خوش بخت کے سارے جسم میں پھریری سی دوڑا دی۔ خوفناک شکل صورت والا کیم شحیم رستم واقعی باغی لڑکیوں کا چوبیس گھنٹوں میں وہ حال کرتا کہ ضدی سے ضدی لڑکی بھی یہی سوچ کر گھٹنے ٹیک دیتی کہ دوبارہ رستم کے ہتھے نہ چڑھنا پڑے۔

''آنٹی صرف ایک بار...... صرف ایک بار مجھے میرے باپ کا نام و پتا بتا دیں۔ مجھے ایک دفعہ اپنی قسمت آزما لینے دیں' آپ کو اپنی مری بہن کی قسم...... اگر انہوں نے مجھے قبول کرنے سے انکار کر دیا تو میں وعدہ کرتی ہوں کہ یہیں لوٹ کر آؤں گی آپ کے پاس...... بے شک آپ میرے ساتھ چلیں۔

مجھے دیکھ کر وہ ضرور مجھے رکھ لیں گے۔ کوئی بھی باپ اتنا ظالم نہیں ہوتا کہ اتنے سالوں بعد بھی اپنی اولاد کو قبول نہ کرے...... آنٹی صرف ایک بار......“ یک لخت وہ آگے بڑھی اور ستارہ آنٹی کے پیروں کے پاس کارپٹ پر بیٹھ گئی اور روتے ہوئے لجاجت سے التجا کی اسے لگا کہ اگر آج وہ نہ کہہ پائی تو ہمیشہ کے لیے انہی اندھیروں کا حصہ بن جائے گی اور ایسا ہی تو وہ نہیں چاہتی تھی۔

”ہونہہ تمہارا باپ! وہ نام نہاد شریف زادہ جس نے تمہیں اپنے وجود کا حصہ ماننے سے انکار کر دیا۔ تمہیں اور تمہاری ماں کو جان سے مار دینے کے درپے وہ شخص جس نے تمہیں تب دھتکار دیا تو اب کیسے تمہیں سینے سے لگائے گا۔ تم اس دنیا کی ہو تمہیں یہیں رہنا ہے باہر کی دنیا جو اس وقت جادو نگری دِکھتی ہے درحقیقت بہت سفاک اور درندہ صفت لوگوں سے بھری ہوئی ہے۔ پتا ہے تمہاری ماں وہاں سے رات کے اندھیرے میں تمہاری اور اپنی جان بچا کر بھاگی تھی۔ ہمیں ساری دنیا طوائف کہتی ہے پر ہم جو کرتے ہیں علی الاعلان کرتے ہیں اور یہ ان جیسے لوگ......“ انہوں نے نفرت سے ہونٹ سکوڑے۔

”یہ بعض دفعہ اتنے گرے ہوئے کام کر جاتے ہیں جنہیں سوچ کر ہم بھی شرما جائیں...... ان کے دل بہت تنگ ہوتے ہیں۔ انہیں صرف لفظوں کے خوب صورت جال پھینکنے آتے ہیں...... اپنے نام نہاد شریف گھروں میں لے جا کر بسانا اور عزت دینا بہت دل گردے کا کام ہے اور باہر کی دنیا میں ایسا ظرف نہیں ہے میری بچی......“ انہوں نے اسے اٹھا کر اپنے پاس صوفے پر بٹھایا اور خود سے لگا کر زندگی کی تلخی اور حالات کے اسرار اس کی سماعتوں میں انڈیلنے لگیں، یہ دیکھے بغیر کہ اس کا دل و دماغ ایک ہی بات پر اٹک گئے تھے کہ تمہارے باپ نے تمہیں اپنا خون ماننے سے انکار کر دیا، وہ تمہیں جان سے مار دینا چاہتا تھا اس کے گھر والوں کا بہت دباؤ تھا اس پر کہ ایسی بدچلن بیوی اور اس کے بطن سے پیدا ہونے والی ناجائز اولاد جو پتا نہیں کس کے گناہ کا پھل ہے کو مار دینا ہی بہتر ہے۔ ہر بار یہ بات سن کر اسے نئے سرے سے دکھ ہوتا حالانکہ بہت بار یہ بات سن چکی تھی۔

☆☆☆

اذان شاہ ابھی، ابھی شہر سے فیکٹری کی کچھ مشینری لوڈ کروا کے لوٹا تھا۔ بہت تھکا ہوا ہونے کے باعث چائے کی شدید طلب اسے کچن میں لے آئی جہاں ملازمہ کو چائے کا کہتا وہ اپنے کمرے کی جانب آ گیا۔ صدیقہ بیگم صبح تہجد کی اٹھی ہوئی درود و اذکار سے فارغ ہو کر اس وقت کچھ آرام کرتیں، کریم بخش شاہ اس وقت کچھ لوگوں کے ساتھ باہر مردانے میں تھے سو وہ ان سے وہیں مل کر آیا تھا۔ فریش ہو کر آنے کے بعد اس نے خدیجہ کو چائے لاتے ہوئے دیکھا۔

”بہت مصروف ہو گئے ہیں آپ، آج کل نظر ہی نہیں آتے۔“ سلام کے بعد خدیجہ نے چائے رکھ کر اس سے کہا۔ اذان شاہ نے بہت حیرت سے اسے دیکھا ان کے درمیان اتنی بے تکلفی کبھی نہیں رہی تھی کہ ایک دوسرے کے معمولات کے متعلق باز پرس کی جاتی۔

”ہاں، آج کل فیکٹری کی تعمیر کا کام تکمیلی مراحل میں ہے تو اسی میں مصروف ہوں۔ ویسے عائشہ اپنے کمرے میں ہو گی اور چائے دینے کے لیے شکریہ...... بانو کہاں چلی گئی، میں اس کے ذمے لگا کے آیا تھا چائے۔“ چائے کی چسکیاں لیتے اذان شاہ نے اسے جتا دیا کہ وہ اب یہاں سے جا سکتی ہے۔ خدیجہ کی آنکھوں کا بدلا ہوا رنگ وہ کب سے محسوس کر چکا تھا لیکن ابھی تک کسی کے بارے میں بھی اس حوالے سے اس نے نہیں سوچا تھا۔ کالج اور یونیورسٹی میں بہت سی لڑکیاں اس کی رفاقت کا خواب لے کر اس کی جانب بڑھی تھیں پر دل کو کوئی بھایا ہی نہیں تھا پتا نہیں وہ گوہرِ مقصود کہاں تھا جس کی تلاش اسے تھی۔ خدیجہ خوب صورت تھی، اعلیٰ حسب نسب سے تھی، سب سے بڑھ کر اس کی کزن تھی پر اس نے اس کی آنکھوں کا پیغام پڑھ کر اس طرح نظر انداز کیا کہ پہلے جو بات چیت سلام

دعا تک محدود تھی وہ بھی ختم کردی تھی تاکہ اس کے رویّے سے اندازہ لگا کر وہ خود ہی پیچھے ہٹ جائے۔

☆☆☆

اس دن حالات سے شکست کھا کر اس نے اس راستے کی پہلی منزل کی طرف قدم بڑھایا تھا جس سے بچنے کے لیے اس نے ہر حربہ اختیار کیا تھا، ہر ترکیب آزمائی تھی پر جو چیز قسمت نے جس انسان کے لیے لکھ چھوڑی ہے وہ اسے ہر صورت مل کر رہتی ہے۔ اس کی خوب صورت آواز اور سانچے میں ڈھلا سراپا و چاند چہرہ یہ سب تو اسے ورثے میں ملا تھا۔

”کسی بھی فن کو سیکھنے کے لیے من کو دیگر آلائشوں سے پاک کر کے دھن اور لگن سے آبیاری کرنی پڑتی ہے تب ہی کامیابی قدم چومتی ہے اور گلے کا سُر اور جسم میں لوچ تو آتا ہی تب ہے جب دھیان کی ساری ڈوریں کس کر اسی طرف باندھ دی جائیں جہاں کا تقاضا ہیں۔“ وہ بے دلی سے ماسٹر صاحب سے پہلا سبق لیتی رہی۔ بچپن میں اسے کتھک کے اصول سکھائے گئے تھے۔ بے دھیانی اور ارتکاز کی کمی کے باوجود گلے کا سُر اور قدموں کی اٹھان ایسی تھی کہ دھیان، توجہ اور مشق کے بعد یہ لڑکی کیا قیامت ڈھائے گی۔ اس کے دل پر اس وقت کیا قیامت برپا تھی اس بات سے قطع نظر ماسٹر صاحب اس کا مستقبل سوچ کر اس پر رشک کیے گئے۔ اگلا دن اس کی قسمت میں ایک نیا اور انوکھا رنگ لایا تھا۔ آج کوئی بڑی شخصیت ستارہ بیگم کے ہاں مدعو تھی، سہ پہر سے ہی تیاریاں شروع تھیں۔ آج اس نے کالج سے چھٹی کی تھی۔ ستارہ بیگم نے تو گھر پر اسے دیکھ کر لگے ہاتھوں مشورہ بھی دے ڈالا تھا فلم کی ڈیٹس دیتے ہی ویسے بھی اسے کالج چھوڑنا پڑے گا تو وہ ابھی سے کالج چھوڑ دے تو زیادہ بہتر ہے۔ اس نے کوئی بھی جواب دیے بغیر خاموشی میں ہی عافیت جانی اور کمرے میں بند ہوگئی۔ رات کو ہونے والے فنکشن کے پیشِ نظر ستارہ بیگم نے ماسٹر صاحب کو اس کی کلاس وقت سے پہلے لے لینے کو کہا تھا۔ تھکے ہوئے جسم اور دُکھتے گلے کے ساتھ جب وہ اپنے کمرے کی جانب واپس آنے لگی تو ستارہ منزل میں رونقیں عروج پر تھیں۔ جی میں کیا سمائی کہ کمرے میں جانے کے بجائے لان میں آگئی کیونکہ میک اپ زدہ چہرے، ناز و ادا کے جلوے دیکھنے میں اسے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ ستارہ منزل کی ساری لڑکیاں پُرجوش تھیں کہ پتا نہیں مہمانِ خصوصی کس پر اپنی نظرِ کرم فرمادیں اور وہ آسمان پر ہی پہنچ جائے سو سبھی کی تیاریاں اور نزاکتیں عروج پر تھیں۔ لمبے، لمبے جھولے لیتے اس نے اندر کی گھٹن کو باہر نکالنا چاہا پر اندر کا موسم حبس زدہ ہو تو باہر کھلے پھولوں پر بھی خزاں اتری نظر آتی ہے۔ واپس آتے بے اختیار اس کے قدم استاد جُمن کے کوارٹر کی طرف بڑھ گئے۔ استاد جمن یہاں کی پرانی یادگاروں میں تھے بقول ان کے اس کی ماں کو انہوں نے گودوں کھلایا تھا۔ کبھی کبھار جب جوش چڑھتا تو وہ ان کے پاس آجاتی کرید، کرید کر اپنی ماں، اپنے باپ کے بارے میں سوال کرتی۔ استاد جمن کی ضعیفی اب انہیں کسی کام کی اجازت نہیں دیتی تھی، بیماریوں کا گڑھ استاد جمن کو ستارہ بیگم اپنی ماں کی نشانی سمجھ کر پرانی رہائش گاہ سے یہاں لے کر آئی تھیں ورنہ ایسی جگہوں پر محبت، مروت کی بات کرنا بھی حماقت ہی تھی۔ حسبِ عادت اسے دیکھ کر وہ خوش ہوئے، وہ ان کی طبیعت کا پوچھنے کے بعد پھر وہی ذکر لے کر بیٹھ گئی۔ اپنی ماں کا ماضی، باپ سے تنفر، ایسا کہتے، کہتے اس کی خوب صورت آنکھیں بھر آئیں۔

”بغیر سوچے، سمجھے اور بغیر دیکھے بھالے انسان کو وفا اور بے وفائی کی کسوٹی پر نہیں پرکھتے بیٹا...... تم وہ سب کچھ بھول جاؤ، بھولے بغیر یہاں رہ نہیں پاؤ گی۔“ انہوں نے ہولے سے پاس بیٹھی خوش بخت کا سر تھپتھپایا۔

”رہنا بھی کب چاہتی ہوں ماسٹر جی...... میرا یہاں دم گھٹتا ہے۔ یہ خوب صورت در و دیوار مجھے خون چوسنے والے دیو لگتے ہیں جو کسی پل موقع پا کر مجھے ماردیں گے۔ ماسٹر جی...... کیا آپ نے میرے باپ کو دیکھا تھا؟“ اس

نے آنسو صاف کر کے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔
''ہاں بیٹا! بڑا ہی بھلا مانس آدمی تھا۔ پتا نہیں کیسے راستہ بھٹک کر یہاں آ گیا ورنہ انداز و اطوار سے وہ کسی نیک گھر کا نوجوان لگتا تھا۔ تمہاری ماں بہت سے خواب لے کر اپنی ماں سے بہت جھگڑا کر کے چوری یہاں سے گئی تھی عزت اور چار دیواری کی خواہش لیے...... پھر پتا نہیں ایسا کیا ہوا کہ وہ محض ڈیڑھ سال بعد ہی تمہیں لے کر واپس آ گئی تھی۔ کاش کہ وہ واپس نہ آتی۔ بری بھلی برداشت کر لیتی تو آج تم یہاں نہ ہوتیں میری بچی...... اب اپنی قسمت سے سمجھوتا کر و کہ یہی ستارہ منزل تمہاری زندگی ہے۔'' وہ بولتے، بولتے چپ ہو گئے۔
''کیسے رہ جاتی ماسٹر جی......! وہ لوگ ان کی اور میری جان کے درپے تھے، میرا باپ جو بڑے، بڑے دعوؤں کے ساتھ اس کا ہاتھ پکڑ کر نکلا تھا...... میرے وجود کو اپنا خون ماننے سے انکار کر دیا تھا اس نے۔ کاش وہ مجھے مار ڈالتے اس وقت تو زندگی بھر کی اس سزا کو جھیلنے سے بچ جاتی جو ذلت کی صورت میرے مقدر میں میرے باپ کی وجہ سے آئی ہے۔ سنگدل سے سنگدل انسان بھی اپنی اولاد خصوصاً بیٹی کو اس بازار میں رُلنے کے لیے نہیں چھوڑتا۔'' وہ پھوٹ، پھوٹ کر رو پڑی۔
''خوش بخت......! بچے میری زندگی ایسا چراغِ سحری ہے جو کسی بھی وقت بجھ سکتا ہے۔ زندگی تو ساری گناہوں سے لتھڑی ہوئی ہے، کسی نیکی کے جھونکے کا گزر ہی نہیں اس میں پر مرتے، مرتے ایک اچھا کام کرنا چاہتا ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ یہی نیکی مرنے کے بعد زادِ راہ بن جائے۔'' جب وہ روتے، روتے خود ہی چپ ہو گئی تو ماسٹر جی کچھ دیر سوچتے رہنے کے بعد گویا ہوئے۔
''تمہاری ماں جب تمہیں لے کر آئی تھی تو اس کے فوراً بعد تمہاری نانی نے اپنا کام دھندا سمیٹ کر تمہاری ماں کے ہمراہ دوسرے شہر کی راہ لی تھی۔ ستارہ بیگم کو البتہ اپنی جانشینی کے لیے وہیں چھوڑا، میں بھی وہیں تھا جب ایک روز......'' وہ بولتے جا رہے تھے اور خوش بخت دھک، دھک کرتے دل کے ساتھ ان کو سن رہی تھی۔ ان کی بات مکمل کرنے پر بھی اس میں کوئی حرکت پیدا نہ ہوئی نہ وہ کچھ بول سکی حالانکہ وہ رونا چاہتی تھی زور، زور سے۔
''میں نے تمہاری ستارہ بیگم سے ذکر کیا اس بات کا تو اس نے فوراً کہا اس باب کو یہیں بند کر دو اور آئندہ تمہاری زبان سے یہ بات کبھی نہ نکلے اس کے بعد آناً فاناً ستارہ بیگم نے اپنا سب کچھ سمیٹا اور یہاں آن بسی۔ برسوں گزر گئے اس بات کو اس دل میں دفن کیے ہوئے پر آج تمہاری بات سن کر رہا نہیں گیا بیٹا۔'' ان کا لرزتا ہاتھ اس کے سر پر آن ٹھہرا۔
''ماسٹر جی ایک آخری احسان کر دیں مجھ پر...... مجھے ان کا نام اور پتا بتا دیں، میں پوری زندگی آپ کا احسان نہیں بھولوں گی۔ میں ایک دفعہ اپنی قسمت آزمانا چاہتی ہوں۔'' وہ اٹھ کر ان کے قدموں میں آ بیٹھی۔ ماسٹر جی پُرسوچ نظروں سے اس کی جانب دیکھ کر کچھ سوچتے چلے گئے۔

☆☆☆

کریم بخش شاہ کو صبح سویرے کسی پنچایت کے فیصلے کی وجہ سے دوسرے گاؤں روانہ ہونا پڑا تھا۔ انہوں نے اذان شاہ کو حسبِ معمول بہت سی ہدایات دیں اور خود رخصت ہو گئے۔ وہ بھی ناشتا کر کے پچھلے زمینوں کی طرف نکل آیا۔ فصل کٹائی کے لیے تیار تھی۔ اس نے بسم اللہ کر کے کٹائی شروع کروادی کافی دیر وہیں رہا پھر ایک چکر فارم ہاؤس کا لگا کر موسمی فروٹس کی ڈلیوری شہر بھیج کر خود گاؤں سے باہر جہاں وہ ایک فیکٹری تعمیر کروا رہا تھا آ گیا۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود اس نے کسی بھی ملازمت کو ترجیح دینے کے بجائے اپنے علاقے میں اپنی تعلیم کو کام میں لانے کا سوچا تھا۔ اب اس جوس بنانے والی فیکٹری کی تعمیر بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی تھی۔ دوپہر کا کھانا اس نے وہیں کھایا تھا پھر جس وقت وہ واپسی کے ارادے سے اپنی گاڑی میں آ کر بیٹھا اس نے پکی سڑک سے ذیلی

سڑک پر ایک لڑکی کو آتے ہوئے دیکھا۔ وہ بری طرح چونک گیا۔ چونکنے کی وجہ وہ لڑکی نہیں بلکہ اس کا لباس اور حلیہ تھا۔ اگرچہ وہ لڑکی شلوار قمیص اور بڑے سے دوپٹے میں ملبوس تھی پھر بھی اس کے انداز اس کے غیر مقامی ہونے کا چیخ چیخ کر اعلان کر رہے تھے۔ شہر سے جو لاری یہاں سے اس وقت گزرتی تھی غالباً وہ اسی میں سے اتری تھی۔ پاؤں میں جوگرز تھے، سادہ سے کاٹن کے لباس میں ملبوس اس لڑکی کا دوپٹا اگرچہ سر کو تو ڈھانپے ہوئے تھا پر یہاں اس گاؤں میں اس قسم کی بے پردگی کا تصور محال تھا اس کے گھر کی عورتیں تو ایک طرف پورے گاؤں کی عورتیں بڑی، بڑی چادروں سے اپنا جسم اور منہ ڈھانپ لیتیں جب کبھی باہر جانا ہوتا۔ آنکھوں پر لگے گاگلز اس نے اپنے بالوں میں اٹکا لیے ایسے کہ دوپٹا سر سے ڈھلک گیا۔ لمبا سا جھولا نما بیگ لٹکائے وہ فیکٹری کی بیرونی دیوار کی تعمیر میں کام میں مصروف ایک مزدور کے پاس گئی اور ہاتھ میں پکڑی چٹ دکھا کر اس سے کچھ پوچھا۔ اذان شاہ چونکہ کچھ فاصلے پر تھا سو اُن کی گفتگو تو نہ سن سکا لیکن اس نے مزدور کو وہ کاغذ اسے واپس تھماتے ہوئے دیکھا جواَب اسی (اذان شاہ) کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ اس لڑکی نے چونک کر اس کی جانب دیکھا پھر تیز، تیز قدموں سے چلتے ہوئے اسی کی جانب آنے لگی۔ اذان شاہ الجھے ہوئے انداز میں گاڑی سے اتر آیا کہ اس نے جان لیا تھا کہ مزدور نے اسے اس کے پاس بھیجا ہے لیکن وہ کون تھی اور چٹ پر اس نے کیا لکھا تھا یہ تو قریب آنے پر ہی پتا چلتا۔

☆☆☆

ماسٹر جی کے پاس سے آنے کے بعد اس کے دل کی حالت بدل چکی تھی۔ اس کا ذہن تیزی سے کوئی تانے بانے بن رہا تھا۔ قسمت نے اسے ایک موقع دیا تھا۔ ساری رات اس نے اسی ادھیڑ بن میں گزاری۔ ماسٹر جی کے الفاظ اگرچہ دل و دماغ پر کندہ ہو گئے تھے پھر بھی احتیاطاً اس نے ایک کاغذ پر نام و پتا لکھ کر بیگ میں رکھا۔ الماری سے اپنا ایک قدرے بڑا بیگ نکالا اس میں اپنے دو سوٹ، جتنی رقم اس کے پاس موجود تھی وہ رکھی زیور اس نے جوں کا توں رہنے دیا حالانکہ ستارہ بیگم اس حوالے سے اس پر بہت مہربان تھیں۔ گلے میں اپنی ماں کی نشانی ایک زنجیر کو رہنے دیا۔

میرے نام کی خوش بختی
میرے نصیب پہ بھی اثر کر جا
مجھے وہ مل جائے
جس کی چاہ
مجھے صدیوں سے بے چین رکھے ہوئے ہے
اِک نسب کا فخر
اِک باپ کا نام
اِک چاردیواری
اور اِک چادر

اس نے اپنی عزیز از جان ڈائری جو اس کی تنہائیوں کی ساتھی...... اس کے دکھوں کی مونس و ہمراز تھی میں ایک بار پھر اپنے احساسات منتقل کیے اور اسے بڑی عقیدت سے اپنے اسی بیگ میں رکھ دیا اور معمول کے مطابق وہ یونیفارم پہن کر کالج جانے کو تیار ہو گئی۔ پوری ستارہ منزل اس وقت خوابِ خرگوش کے مزے لے رہی تھی کہ جس وقت عام لوگ بیدار ہو کر اپنے کاروبار پر نکلتے ہیں۔ اس نے گھنٹی بجا کر اپنی ملازمہ خاص کو بلایا۔ دل ایسے دھڑک رہا تھا گویا باہر آنے کو بے تاب ہو...... سو اس نے ناشتے کا منع کرتے ہوئے ڈرائیور کو گاڑی نکلوانے کا پیغام بھیجا تاکہ اسے کالج چھوڑ آئے۔ مقررہ وقت پر وہ کالج جانے کے لیے نکلی ایک متشکرانہ نظر ماسٹر جمن کے کوارٹر پر ڈال کر وہ ڈرائیو وے پر کھڑی گاڑی میں آ بیٹھی۔ باوردی ڈرائیور اس کے بیٹھنے کا منتظر تھا سو تیزی سے گاڑی باہر نکال لایا۔ اس نے ایک نگاہِ غلط ستارہ منزل پر ڈالی۔ پتا نہیں قسمت کی بھید بھری جھولی میں اس کے لیے کیا اسرار چھپے تھے۔ اس بات کو سوچ کر آنکھیں ایک بار پھر نم ہو گئیں۔ آج سیمل کالج نہیں آئی تھی وہ اپنی اس

پیاری دوست سے ایک آخری بار ضرور ملنا چاہتی تھی۔ سو دل مسوس کر رہ گئی۔ پہلا پیریڈ بے دھیانی میں اٹینڈ کرنے کے بعد وہ واش رومز کی جانب آگئی۔ اندر جا کر بیگ میں رات کا رکھا گیا سوٹ نکال کر تبدیل کیا۔ اسی سوٹ کا دوپٹا اچھی طرح سے اوڑھ کر گیٹ کی جانب آگئی۔ کلاسز لگی ہونے کے باعث بہت کم لڑکیاں باہر تھیں۔ گیٹ تک آتے اس نے اپنا منہ دوپٹے کی اوٹ میں چھپالیا۔ گیٹ کیپر نے ایک... سرسری سی نظر ہی ڈالی تھی اس پر۔ وہ منتشر ہوتی دھڑکنوں کے ساتھ باہر آگئی۔ مین روڈ تک آکر اس نے سامنے گزرتے ایک رکشے کو ہاتھ دے کر روکا اور پھر اسے لاری اڈے جانے کا کہہ کر اس میں بیٹھ گئی۔ پندرہ منٹ بعد رکشے نے اسے لاری اڈے تک پہنچا دیا۔ اس نے بیگ میں رکھی ایڈریس والی پرچی کو نکال کر رکشا ڈرائیور سے درخواست کی کہ وہ اسے مطلوبہ لاری تک پہنچا دے۔ ڈرائیور بھلا مانس آدمی تھا۔ اس نے نہ صرف اسے مطلوبہ جگہ کی لاری تک پہنچا دیا بلکہ ٹکٹ لے کر اسے گاڑی میں بھی بٹھا آیا تھا۔ اسے چلنے میں ابھی کم از کم ایک گھنٹا تھا' خوش بخت بار، بار بے چینی سے گھڑی دیکھتی رہی۔ اسے ستارہ بیگم کا خوف کھائے جا رہا تھا ابھی تو خیر اس کا کالج ٹائم تھا وہ اسی ٹائم میں ان سب کی پہنچ سے دور نکل جانا چاہتی تھی۔ ہر اسٹاپ پر گاڑی رکتی وہ ہمہ تن گوش بیٹھ جاتی۔ پر اسے منزل مقصود تک پہنچتے پہنچتے پونے تین گھنٹے لگ گئے تھے۔

بالآخر اس کی منزل آگئی اور لاری اسے اتار کر دھول اڑاتی آگے بڑھ گئی۔ خوش بخت نے مین سڑک سے بائیں جانب جاتی ذیلی کچی پکی سڑک کو دیکھا۔ جس کے ایک کونے میں چھوٹے سے بورڈ پر شاہ پور لکھا صاف نظر آرہا تھا۔ دور دور تک کسی ذی روح کا کوئی نام و نشان نہیں تھا۔ سڑک کے دونوں جانب گندم کی سنہری فصل تیار کھڑی تھی وہ آہستہ، آہستہ چلتی گئی۔ تھوڑی دیر سڑک پر چلتے رہنے کے بعد اسے دائیں طرف ایک بلند و بالا عمارت زیر تعمیر دکھائی دی جہاں کچھ مزدور کام کرتے ہوئے نظر آرہے تھے۔ خوش بخت کے قدموں میں تیزی آگئی۔ وہ اپنے بیگ کو مضبوطی سے پکڑے وہاں پر اینٹیں ڈھو کر لاتے ایک مزدور کے پاس آگئی۔ ان کے علاقے کے سرکردہ کریم بخش شاہ اور ان کے بیٹے احمد شاہ کی بابت دریافت کیا۔ جواباً اس مزدور نے اسے سائڈ پر کھڑی گاڑی کی طرف اشارہ کر کے بتایا کہ یہ فیکٹری انہی کی زیر تعمیر ہے اور گاڑی میں بیٹھے ہوئے اذان شاہ ہیں جو کریم بخش شاہ کے پوتے ہیں۔ آپ ان سے مل لیں۔ خوش بخت نے چونک کر دیکھا کچھ فاصلے پر ایک گاڑی موجود تھی جس پر اس کی سرسری نظر تو پڑی تھی پر جلدی میں اتنا اندازہ نہیں ہو پایا تھا کہ اس میں کوئی فرد بھی ہوسکتا ہے۔ وہ اسی جانب چل پڑی۔ دفعتاً اس نے گاڑی میں سے ایک اونچے لمبے شخص کو باہر نکلتے ہوئے دیکھا جو اسے اپنی طرف آتا دیکھ کر وہیں رک گیا تھا۔

''کیا آپ مجھے کریم بخش صاحب سے ملوا سکتے ہیں؟'' سلام کے بعد اس نے بہت اعتماد سے اذان شاہ کو دیکھتے ہوئے سوال کیا جبکہ اپنی عادت کے... برخلاف اسے نہایت غور سے دیکھتا وہ چونک گیا اسے لگا وہ اس سے پہلے بھی کہیں مل چکا ہے یا دیکھ ضرور چکا ہے۔ کہاں؟ یہ یاد نہ آسکا۔

''جی ضرور...... آیئے میرے ساتھ، وہ میرے دادا ہیں۔'' اذان نے اسے تفصیل بتانا شروع کی کہ ان کی حویلی یہاں سے کچھ دور ہے، اسے گاڑی میں اس کے ساتھ چلنا پڑے گا لیکن فی الوقت بڑے شاہ صاحب سے اس کی ملاقات ممکن نہیں ہے کیونکہ وہ آج صبح ہی کسی دوسرے گاؤں ۔۔ ایک ضروری کام کے سلسلے میں روانہ ہو چکے ہیں۔

''ویسے آپ کریم بخش صاحب سے کس سلسلے میں ملنا چاہتی ہیں؟ اگر اس سلسلے میں، میں آپ کی کچھ ہیلپ کر سکا تو......'' اس سے بات کرنے کے ساتھ وہ بار، بار اس کی طرف دیکھ بھی رہا تھا کہ کون سی چیز ہے جو اسے الجھاتے ہوئے اس کی جانب مائل کر رہی ہے

حالانکہ وہ لڑکیوں سے کوسوں دور بھاگنے والا شخص تھا۔ خوش بخت ایک دم گڑبڑا گئی کہ وہ اپنے آنے اور اپنے دادا سے ملنے کی کیا توجیہہ پیش کرے یہ طے تھا کہ صحیح صورتِ حال کی جانچ کے بغیر وہ اپنی شناخت کروانا نہیں چاہتی تھی۔ سو فوری طور پر ذہن میں یہی آیا کہ وہ ایک اسٹوڈنٹ ہے اور دیہات میں ویمن لٹریسی ریٹ کے تھیسس پر کام کرنے آئی ہے۔ باقی اسٹوڈنٹ بھی اس کے ہمراہ ہیں لیکن ان سب نے اپنے، اپنے علاقے منتخب کر کے کام شروع کر دیا ہے۔ اسے نزدیک کہیں سے پتا چلا ہے کہ کریم بخش شاہ ہی اس علاقے کے کرتا دھرتا ہیں وہی اس سلسلے میں اسے ٹھیک معلومات فراہم کر سکتے ہیں۔ بر وقت بہانہ بنا لینے پر اس نے خود کو شاباش دی یہ جانے بغیر کہ اس کی یہ بات اذان شاہ کو قطعی ہضم نہیں ہو پائی تھی۔ اکیلی لڑکی ذات کا شہر سے اتنی دور کا سفر کر کے آنا پھر بابا صاحب سے ملنے پر اصرار...... اس کے الفاظ کے برعکس اس کی آنکھوں میں ایک تجسس تھا، کھوج تھی جو اذان شاہ کو چونکا رہی تھی۔

لٹریسی ریٹ یا کسی بھی قسم کی معلومات کے لیے آج کل طرح، طرح کی سہولیات دستیاب ہیں اس سلسلے میں وہ نیٹ سے ہیلپ لے سکتی تھی۔ بہر حال انہی الجھی سلجھی سوچوں میں وہ لوگ حویلی پہنچ چکے تھے۔ اذان شاہ اسے سیدھا صدیقہ بیگم کے پاس لے آیا۔ مختصراً اس کے بارے میں انہیں بتایا۔ انہوں نے مہمان کی حیثیت سے اس کا خیر مقدم کیا۔ وہ اسے ان کے حوالے کرنے کے بعد واپس اپنے کاموں سے نکل گیا۔ ذہن ہنوز الجھن کا شکار تھا۔

خوش بخت عجیب سی حسرت اور ترسی ہوئی نگاہوں سے ارد گرد کا جائزہ لیتی ہوئی صدیقہ بیگم تک آئی تھی۔ اتنے بڑے، بڑے گھر رکھنے والوں کے دل کتنے تنگ تھے اس نے حسبِ عادت سوچنا شروع کر دیا۔

''بیٹا آرام سے بیٹھو...... سفر سے تھک گئی ہو گی۔ اسے اپنا ہی گھر سمجھو...... میں ابھی اپنی پوتی اور نواسی کو بلواتی ہوں۔ تمہارے ہی جتنی ہیں۔'' نہ جانے کیوں صدیقہ بیگم بھی اسے دیکھ کر چونک گئیں۔ دل عجیب گداز سے بھر گیا۔

''کہاں سے آئی ہو بچی......؟'' انہوں نے ملازمہ کو بلا کر اس کے لیے کچھ ٹھنڈا لانے کا کہا اور خود اس کو دیکھتے ہوئے شفقت سے سوال کیا۔ اس نے وہی تفصیل دُہرادی جو اذان شاہ کو بتا کر آئی تھی۔ ماں، باپ کے سوال پر اس نے بتایا کہ ان کا انتقال ہو چکا ہے ساتھ ہی کاغذات میں اپنی ولدیت کے خانے میں لکھا وہ فرضی نام بھی بتا دیا جو وہاں درج تھا۔ وہ اپنی خالہ کے ساتھ رہتی ہے اور یہاں اپنے چند کلاس فیلوز کے ساتھ آئی ہے جو اپنے کام کے سلسلے میں اِدھر اُدھر بکھر گئے تھے۔

''بچیاں بہت قیمتی خزانہ ہوتی ہیں اپنے ماں، باپ کا بچے...... بے شک آپ اپنے ساتھیوں کے ساتھ آئی ہیں لیکن اتنی دور آپ کی خالہ کو آپ کے ساتھ کسی بڑے کو بھیجنا چاہیے تھا۔'' صدیقہ بیگم نے بہت پیار سے اسے سمجھایا تو آنسو ضبط کرتے وہ مشکل سے اثبات میں سر ہلا پائی۔ ملازمہ اس کا کھانا وہیں لے کر آ گئی تھی۔ کھانا کھا کر صدیقہ بیگم نے ملازمہ سے کہا کہ بچیوں...... کو بلا لائے۔ ملازمہ کے جانے کے بعد خوش بخت نے بھی صدیقہ بیگم سے ان کے بال بچوں کی بابت دریافت کیا تو انہوں نے گلوگیر لہجے میں بتایا کہ ان کے دونوں بیٹے وفات پا چکے ہیں۔ بڑے بیٹے کی اہلیہ بھی ان کے ساتھ ہی گزر گئیں۔ چھوٹے بیٹے کی بیوی سے اس کی علیحدگی ہوئی تھی۔ بڑے بیٹے کے دو بچے اذان اور عائشہ تھے اور چھوٹے بیٹے کی کوئی اولاد نہیں تھی یہ کہتے ہوئے ان دونوں کا دل ہی خون کے آنسو رو دیا۔ مگر وہ ایک دوسرے کی دلی کیفیات سے بے خبر تھیں۔ خوش بخت جو اپنے باپ سے حساب لینے کو بے چین تھی کی موت کا سن کر جیسے اسی پل مر گئی۔ ستارہ آنٹی ٹھیک کہتی تھیں۔

''آپ لوگوں نے مجھے گھر میں جگہ نہیں دی تو دل

میں کیا دیتے۔ جبھی تو میرے باپ کے حوالے کے ساتھ میرا کوئی ذکر ہی نہیں۔'' اس نے سوچا کچھ دیر آرام کرنے کی اجازت پر اسے۔ ملازمہ کے ساتھ مہمان خانے صدیقہ بیگم نے بھجوادیا تھا۔ کمرے میں پہنچ کر اس کے ضبط کی طنابیں ٹوٹ گئیں۔

''ابا اگر آپ زندہ ہوتے تو میں اپنے ہونے کا، اپنی ذات کی شناخت کا مقدمہ لڑ لیتی اب کس سے جا کر فریاد کروں۔ کاش آپ ہم پر ایسا ظلم نہ کرتے۔'' وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ پتا نہیں باپ کی موت کا اچانک صدمہ تھا یا اپنی ذات کی پہلے قدم پر نفی کا دکھ کہ اسے لگا عزت اور چادر کے حصول کی جس جنگ کو جیتنے کا عزم لے کر وہ نکلی تھی، اس میں پہلے قدم پر ہی وہ بری طرح ہار گئی ہے۔ بہت دیر رونے کے بعد دل کا بوجھ ذرا ہلکا ہوا تو وہ اپنے باپ کا گھر، اپنی جائے پیدائش ایک نظر دیکھنے کی غرض سے اٹھی اور مہمان خانے سے باہر آگئی۔ طویل راہداری میں اسے ایک دو ملازمائیں ملیں جنہوں نے بی بی (صدیقہ بیگم) کے کمرے تک اس کی رہنمائی کرنی چاہی اور مزید کسی ضرورت کا پوچھا اس نے سہولت سے منع کر دیا کہ وہ حویلی دیکھنا چاہتی ہے۔ ہر جگہ رک کر وہ بہت کچھ محسوس کرتی اور آگے بڑھ جاتی کہ شاید یہاں وہ پاؤں، پاؤں چلی ہو، یہاں اس نے پہلا قدم اٹھایا ہو، پوری حویلی گھوم چکنے کے بعد وہ ایک بار پھر بی بی کے کمرے میں آگئی۔ عجیب سا سحر تھا ان کی پاکیزہ شخصیت میں کہ اپنے پچھلے خیالات کے برعکس وہ اس تھوڑے سے وقت میں ہی ان سے شدید انسیت محسوس کرنے لگی تھی۔ بی بی کے کمرے میں اسے اپنی دونوں کزنز عائشہ اور خدیجہ ملیں۔ اسی سے ملتے جلتے نقوش خصوصاً آنکھیں رکھتی وہ دونوں اس سے خوشگوار انداز میں ملیں لیکن خدیجہ کو جب سے پتا چلا تھا کہ وہ اذان شاہ کے ساتھ آئی تھی وہ اسے دیکھنے کو بے چین تھی۔ اور اب اسے بہت گہری اور تنقیدی نظر سے دیکھا تھا۔ اسے جونہی یہ ادراک ہوا کہ عائشہ کی اور اس کی آنکھیں حیرت انگیز طور پہ ملتی ہیں ایک بے تحاشا خوشی کے احساس نے اسے گھیر لیا۔ عائشہ کے استفسار پر وہی گھڑا گھڑایا جواب ان کو بھی سنا دیا جو اس سے پہلے اذان شاہ اور بی بی کو بتا چکی تھی پھر مزید ان کی تشفی ہو جائے اس نے بی بی سے کہا کہ ایک ملازمہ ہمراہ کر دیں تا کہ وہ اپنے تھیسس کا کچھ کام شروع کر سکے اور گاؤں میں گھر، گھر جا کر رپورٹ تیار کرنے میں وہ اس کی مددگار ہو۔ یہ خیال بھی اسے ابھی ابھی آیا تھا کہ اس نے جو بہانہ بنایا ہے اس پر ان سب کا یقین راسخ کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اسے ایک فرضی سروے کر ہی لینا چاہیے۔ عائشہ نے اصرار کیا وہ انہیں اچھی لگی ہے سو وہ لوگ کچھ دن اسے اور مہمان بنانا چاہیں گے۔ ساتھ ہی اس نے بی بی سے بھی اس بات کی تائید کروائی جو اپنے مخصوص بردبار لہجے میں اتنا ضرور بولیں کہ وہ لوگ ضرور اسے مہمان بنانا پسند کریں گے اگر جو اس کے گھر والے بخوشی اس کے یہاں رہنے پر راضی ہو جائیں۔ خدیجہ نے البتہ کچھ نہ کہا نہ ہی اسے عائشہ اور بی بی کا اس لڑکی کے لیے اتنا التفات پسند آرہا تھا۔ جس کا اظہار اس نے اس وقت کر دیا جب خوش بخت ملازمہ کے ساتھ کمرے سے باہر چلی گئی۔

''تمہیں کیا ضرورت ہے اس لڑکی کو اتنا سر چڑھانے کی۔ جو بھی کام کرنے آئی ہے وہ کرے تو چلتا کرو اسے، یہ کیا ہر ایرے غیرے سے اتنا گھل مل جانا مجھے نہیں پسند۔'' وہ جیسے ان سب کے ساتھ خود سے بھی خفا ہو گئی۔

''اوہو بھئی تمہیں کیا کہہ دیا اس بیچاری نے۔ کتنی پیاری ہے ناں بی بی یہ خوش بخت......'' اسے جواب دے کر عائشہ نے بی بی کو مخاطب کیا۔

''ہاں بچے اللہ نصیب اچھے کرے، تم دونوں یہ بحث چھوڑو جا کر شریفاں کے ساتھ کچن میں کھانے کے لیے اور بھی کچھ اچھا بنوالو۔'' بی بی نے بات کو سمیٹا اور ان دونوں کو باہر جانے کو کہا۔

خوش بخت، ملازمہ کے ساتھ کافی سارے

گھروں میں گئی۔ وہ کریم بخش شاہ کے گھر کی مہمان ہے، یہ جان کر سب نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔اس نے بھی ایک، ایک، دو، دو سوالات کیے سب سے۔ مغرب سے ذرا پہلے ہی وہ یہ کہہ کر لوٹ آئی کہ باقی کام کل کریں گے۔ اذان شاہ انہیں گیٹ کے پاس ہی مل گیا تھا۔ ملازمہ تو سلام چھوٹے شاہ کہہ کر اندرونی حصے کی جانب بڑھ گئی جبکہ خوش بخت وہیں اس کے پاس ہی رک گئی۔ کتنی مختلف نظریں تھیں اذان شاہ کی...... عزت واحترام کی لو دیتی ہوئی۔ اور ستارہ منزل میں آنے والے ہر مرد کی نظروں سے یکسر مختلف جس میں ہر جذبہ ہوتا تھا سوائے عزت کے، احترام کے۔

''کام شروع کر دیا آپ نے خوش بخت صاحبہ! اس نے رک کر اس کے سلام کا جواب دیتے ہوئے پوچھا۔

''جی کچھ گھروں میں گئی ہوں، باقی کام کوشش کروں گی ایک دو دنوں میں مکمل کرلوں۔ ویسے ایک بات میں نے نوٹ کی ہے کہ جن گھروں میں بھی میں گئی ہوں وہاں مردوں نے کالج، کئی نے یونیورسٹی سے بھی تعلیم حاصل کی ہوئی ہے جبکہ عورتوں کو انہوں نے اَن پڑھ ہی رکھا ہوا ہے۔ اس کی کیا وجہ ہے؟'' وہ اس کے ساتھ، ساتھ اندرونی حصے کی طرف بڑھتی ہوئی بولی۔ اذان شاہ نے اس کا سلجھا مگر شائستہ انداز بطورِ خاص نوٹ کیا۔ وہ صبح والے لباس میں ہی ملبوس تھی۔

''جہاں تک ہمارے گھرانے کی بات ہے، ہم لوگ جیسے دینی تعلیم کو ضروری سمجھتے ہیں اتنی ہی اہمیت دنیاوی تعلیم کو بھی دیتے ہیں۔ بابا صاحب نے اسی مقصد کے لیے گرلز پرائمری اسکول کو بہت کوششوں کے بعد مڈل تک اپ گریڈ کرایا ہے ہمارے گھر کی لڑکیاں عائشہ، خدیجہ نے یہیں سے مڈل کیا پھر شہر میں جا کر میٹرک اور ایف اے کے پیپر زدیے۔ بابا صاحب کو بہت شوق تھا کہ وہ آگے بھی تعلیم حاصل کرنا چاہیں تو ان کی طرف سے اجازت ہو گی لیکن دونوں کو ہی شوق نہیں تھا۔ اگلے مہینے خیر سے عائشہ کی شادی متوقع ہے...... اور جہاں تک بات ہے گاؤں والوں کی تو کچھ ٹرینڈ بھی کم ہے، تعلیم کی طرف، کچھ لوگوں میں ہے بھی تو وہ مڈل تک ہی بھیج پاتے ہیں بچیوں کو...... بہت کم لوگ ہائی اسکول بھیجنا پسند کرتے ہیں اپنی بچیوں کو...... عموماً مڈل کے بعد ہی ان کی شادی کر دی جاتی ہے۔''

...وہ اسے بڑی تفصیل سے بتا رہا تھا گویا کہ اس کے چھوٹے پراجیکٹ میں مدد کرنا چاہتا تھا۔''ویسے کوئی جبری رسوم ورواج کی زنجیر تو نہیں جکڑا ہوا ان لوگوں کو بس شروع سے جو سسٹم چلا آرہا ہے اسی کی پیروی کرتے آرہے ہیں اور سب سے مین فیکٹر گرلز ایجوکیشن میں غربت کا بھی ہے۔ لڑکوں کا سب کو پتا ہوتا ہے کہ انہوں نے کچھ بن کر ایک فیملی کو سپورٹ کرنا ہے گھر چلانا ہے جبکہ لڑکیوں کے حوالے سے ابھی ان میں اتنا شعور نہیں آیا بس یہ ہی ساری بات ہے۔'' دھیمے، دھیمے بولتا وہ خوش بخت کو کسی اور ہی جہان کا مرد لگا اس کی دنیا کے مردوں سے مختلف...... شاید خون کی کشش تھی کہ اسے برا تو کوئی بھی نہیں لگا تھا سب لوگوں میں عجیب سی کشش محسوس ہوئی تھی اسے، کچن سے نکلتی خدیجہ نے بے حد ناگواری سے ان کو ایک ساتھ آتے دیکھا تو بس نہ چلا کہ اس لڑکی کو کھینچ کر اذان شاہ سے دور کر دے۔ اسے تو اذان شاہ کو چھو جانے والی ہوا بھی بری لگتی تھی کجا کہ یہ جیتی جاگتی خوب صورت اور شہری لڑکی۔

''آگئیں آپ؟ بی بی پریشان ہو رہی تھیں۔ اصل میں ہمارے یہاں مغرب کے بعد لڑکیوں کا اِدھر اُدھر پھرنا اچھی بات نہیں سمجھا جاتا۔'' کچھ بھی نہ آنے پر خدیجہ نے اپنے دل کی کھولن کو باہر نکالنا چاہا۔ وہ دونوں چونک اٹھے۔

''یہ یہاں مہمان ہیں خدیجہ اور میرے خیال میں اگر خیر اں (ملازمہ) کے ساتھ گئی تھیں تو بی بی نے ہی بھیجا ہوگا۔'' اذان شاہ نے رسان سے خدیجہ سے کہا جو تیکھی نظروں سے دونوں کو دیکھتی دوبارہ کچن میں چلی گئی۔

''آیئے میں آپ کو بی بی کے پاس چھوڑ دوں۔'' ایک نظر اس کے الجھے ہوئے چہرے پر ڈال کر اذان نے آگے قدم بڑھائے اور وہ جو خدیجہ کے

ناقابلِ فہم روتے پر کھڑی کوئی نتیجہ اخذ کر رہی تھی چونک کر اس کی معیت میں بی بی کے کمرے کی طرف چل پڑی جو اس وقت مغرب کی نماز ادا کرنے کے بعد دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے بیٹھی تھیں۔ اور بہ آواز بلند اپنے رب سے ہم کلام تھیں۔

''تیرے گناہ گار بندے ہیں مولا پر پھر بھی تیری مخلوق ہیں، تیرے پیارے نبی ﷺ کے اُمتی ہیں، میرے مالک ہم کمزور انسان ہیں، ہم پر پڑی ہوئی آزمائش کو مختصر کر دے میرے اللہ!'' ان کے آخری الفاظ کو سنتی خوش بخت کچھ دیر دروازے میں کھڑی ان کو گریہ کرتے دیکھ کر خود بھی رونے لگی۔ اور یہ خون کا اثر یا اس کی معصوم اور بھولی بھالی شکل کہ دل میں جذبوں کا جو سمندر اس کے دل میں بچھڑے ہوئے رشتوں کے لیے تلاطم مارنے لگا تھا ویسا ہی بی بی، عائشہ اور اذان بھی کچھ عجیب سا لگاؤ اور انسیت اپنے دل میں اس کے لیے محسوس کر رہے تھے۔ رشتہ تو خدیجہ سے بھی بنتا تھا اس کا لیکن رقابت ایک ایسا منفی جذبہ ہے جو باقی کے تمام جذبوں کو پس پشت ڈال دیتا ہے۔ یہ نہ ہوتا تو شاید ویسی ہی کشش خوش بخت سے وہ بھی محسوس کرتی لیکن اسے بلاوجہ غصہ آئے جا رہا تھا۔ زندگی میں پہلی بار اس کی عائشہ سے بغیر کسی وجہ کے جھڑپ بھی ہوگئی کہ عائشہ کو ملازمہ کے ساتھ کھانے کا اتنا اہتمام کرتا دیکھ کر وہ اسے کچھ سنا گئی تھی اور عائشہ کی کوئی بھی تاویل سنے بغیر غصے میں وہ اپنے گھر بھی سدھار گئی تھی اور زندگی میں پہلی بار ہی عائشہ نے اس کی پروا کیے بغیر سر جھٹک دیا تھا اور اپنے معمول کے کام سرانجام دیتی رہی۔ کھانا اذان نے مردانے میں جبکہ ان تینوں نے اکٹھے بی بی کے کمرے میں کھایا تھا۔ خوش بخت نے عائشہ سے فرمائش کی تھی کہ وہ اس کے پاس ہی سو جائے کہ وہ رشتوں کی ترسی ہوئی ہے اور اسے اس کی صورت میں ایک بہن نظر آرہی ہے ویسے بھی دن کو وہ تھوڑا آرام کر چکی تھی تو رات کو مشکل سے ہی.... نیند آتی۔ عائشہ نے خشمگیں نظروں سے بی بی کی طرف دیکھا انہوں نے اثبات میں سر ہلا کر اجازت دے دی تھی۔ عائشہ اسے اپنے کمرے میں لے کر آئی تھی خوش بخت نے کچھ سوچ کر اپنا آف پڑا ہوا موبائل سیل کھولا اس میں سیل کے ان گنت میسج موجود تھے۔

''خوشی! کہاں ہو یار؟ تمہاری آنٹی نے میرا اور کالج والوں کا جینا حرام کیا ہوا ہے۔ وہ سمجھتی ہیں کہ تم جہاں بھی گئی ہو، میں اس بارے میں علم رکھتی ہوں۔ پرنسپل سے بھی کافی جھڑپ کر کے گئی ہیں، میرے گھر دھمکی آمیز کالز کا تانتا بندھا ہوا ہے؟ تم کہاں اور کیوں گئی ہو خوشی! اپنی آنٹی سے رابطہ کرو، وہ بہت پریشان ہیں اور بہت سے لوگوں کو پریشان کیا ہوا ہے۔'' اس سے پہلے کہ سیل پر کوئی کال ریسیو ہوتی اس نے گھبرا کر موبائل دوبارہ آف کر کے بیگ میں ڈال دیا۔

''کیا بات ہے خوش بخت......! تم کچھ پریشان ہوگئی ہو، گھر میں تو سب خیریت ہے ناں......'' عائشہ جو اسے میسج پڑھتے اور چہرے کی رنگت متغیر ہوتے دیکھ کر پریشان ہوگئی تھی نے اس کا ہاتھ پکڑ کر نرمی سے استفسار کیا، خوش بخت چونک گئی اور لمحوں میں خود کو سنبھال کر پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ گویا ہوئی۔

''گھر سے میسج تھے، میں ذرا بھی اِدھر اُدھر ہو جاؤں تو فوراً پریشان ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ انہیں معلوم بھی ہے کہ میں کہاں گئی ہوں۔''

''ہاں یہ تو ہے والدین کا رشتہ ہی ایسا ہے اولاد کے لیے محبتوں، اندیشوں اور فکرات کا بحرِ بیکراں لیے ہوئے۔'' عائشہ نے اسے تسلی دی تو دونوں بھول بھال کر ایک دوسرے کے ساتھ باتوں میں جو مگن ہوئیں تو وقت گزرنے کا پتا ہی نہیں چلا۔

☆☆☆

''جانے کیوں میرا دل اس بچی کو دیکھ کر وہ بھولی بسری یادیں کریدنے کو کر رہا ہے جنہیں بھولنے کی ہم نے کوشش کی نہ ہم میں سکت تھی وہ بھی تو اتنی ہی بڑی ہوگی۔'' بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے صدیقہ بیگم تسبیح کے دانے گراتے زیرِ لب کچھ پڑھتے ہوئے وقت کو کچھ

سال پیچھے لے گئیں جب انہیں احمد کی شادی کا بے حد ارمان تھا اور وہ تھا کہ آئیں بائیں شائیں کر کے ہر بار ٹال دیتا۔ بڑے بیٹے اور بہو کے انتقال کے بعد ان دونوں میاں، بیوی کی خواہش تھی... گھر میں غم کا جو جمود طاری ہے اسے توڑنے کے لیے ضروری تھا کہ احمد کی شادی کر دی جاتی اس مقصد کے لیے انہوں نے اپنی برادری میں کئی لڑکیاں دیکھ رکھی تھیں پر وہ ہاتھ آتا تب ناں...... اپنی پڑھائی کا بہانہ بنا کر وہ ان کے منصوبوں پر پانی پھیر دیتا اور اب جب بی بی نے شاہ صاحب سے کہا کہ ذہی اس پر دباؤ ڈالیں کہ وہ اپنے باپ سے ڈرتا بھی بہت تھا۔ انہوں نے ہامی بھرلی پر ان کے اصرار سے پہلے وہ ہوگیا جس کا ان کی سات پشتوں میں بھی کسی نے تصور نہیں کیا تھا۔ کریم بخش شاہ جن کی دور، دور تک نیک نامی کی دھوم تھی ان کے بیٹے نے ایک ایسا قدم اٹھالیا کہ آج بھی سوچتے تو ان کی پیشانی عرق آلود ہوجاتی۔ پتا نہیں شہر میں کیسے، کیسے لڑکوں کی صحبت میں رہ کر وہ ان گلیوں میں رہنے والی فردوس بیگم کی زلف کا اسیر ہوا کہ جہاں دن کی روشنی میں بھی شریف لوگ گزرتے ہوئے گھبراتے ہیں۔ جس وقت بڑے شاہ صاحب کو شہر میں موجود ان کے حواریوں نے خبر دی اس وقت پانی سر سے اونچا ہو چکا تھا انہوں نے فون پر تو احمد شاہ کو خوب سنائیں اور پہلی فرصت میں سب پڑھائی وغیرہ چھوڑ چھاڑ گاؤں آنے کا حکم دے ڈالا اور جب وہ آیا تو اکیلا ہرگز نہیں تھا۔ بازار میں بیٹھی فردوس بیگم کو اپنے نام کے ساتھ باندھ کر ماں اور باپ کے سامنے لا کھڑا کیا تھا۔ دونوں میاں، بیوی حیرت و صدمے سے گنگ ہی رہ گئے۔ صدیقہ بیگم تو آنسو بھری آنکھوں کے ساتھ اپنے کمرے میں بند ہوگئیں۔ جبکہ بڑے شاہ صاحب نے احمد شاہ کو اسے واپس انہی گلیوں میں چھوڑ آنے کا حکم دے دیا اور دھمکی دی کہ دوسری صورت میں وہ اس سے کوئی تعلق نہیں رکھیں گے... پر اگلے ہی روز ان کو وہ حکم واپس لینا پڑا کہ لاڈلے بیٹے نے سلیپنگ پلز کی ایک بڑی مقدار حلق میں انڈیل لی

تھی۔ ایک بیٹے کو کھونے کے بعد ان میں دوسرے بیٹے کو کھونے کا حوصلہ ہرگز نہیں تھا۔ بعد میں احمد شاہ کو حکم دیا کہ وہ اپنی بیوی کو سختی سے تاکید کرے کہ وہ یہاں کے طور طریقے جلد از جلد سیکھ لے اور اپنے پچھلوں سے ہمیشہ کے لیے قطع تعلق کرلے۔ فردوس بیگم نے یہ بات سن تو لی تھی پر اس پر عمل کرنا شاید اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ اس گھر کی عورتیں جو باہر چادر لپیٹ کر جاتیں جن کے سروں سے دوپٹا سر کے کسی نے نہیں دیکھا تھا اس سے قطع نظر فردوس بیگم اپنے شب خوابی کے لباس میں ہی اٹھ کر ناشتے کی میز پر آجاتیں۔ بی بی شرم سے منہ نیچے کرلیتیں۔ ملازمائیں منہ میں انگلیاں دے کر ایک دوسرے کو اشارے کرتیں پر محبت کی جو پٹی احمد شاہ کی آنکھوں پر بندھی تھی وہ انہیں کچھ دیکھنے یا محسوس کرنے سے باز رکھے ہوئی تھی۔ کریم بخش زیادہ تر زمینوں کے، پنچایت کے اور دیگر گاؤں کے مسئلوں کے حوالے سے باہر ہی رہتے۔ ایک دفعہ احمد شاہ کی بہن نے انہیں ساڑی میں ملبوس دیکھا۔ وہ بھی ایسے کہ جسم چھپانے کے بجائے دکھائی زیادہ دے رہا تھا۔ وہ اپنی بھابی کو ٹوک بیٹھیں اور یہ ٹوک فردوس بیگم کو شدید ناگوار گزری انہوں نے صاف، صاف الفاظ میں کہہ دیا تھا کہ جب ان کے خاوند کو کوئی اعتراض نہیں ہے تو وہ کون ہوتی ہیں سمیعہ بیچاری کیا کہتیں چپ ہو کر بیٹھ رہیں۔ فردوس بیگم نے یہیں پر اکتفا نہیں کیا احمد شاہ جو زمینوں سے تھکے ہارے واپس آئے تھے، پتا نہیں کیا ایسا کہا کہ فوراً ہی بہن سے جواب طلبی کرنے آن موجود ہوئے۔

”آپ انتہائی تنگ نظر اور تنگ دل لوگ ہیں...... خود ہی فردوس بیگم کا پچھلا حوالہ نہیں بھول رہے تو وہ کیسے بھلا پائے گی۔ برائے مہربانی ہمیں اپنی زندگی جینے دی جائے اور آئندہ اگر فردوس بیگم کو کچھ کہا گیا تو میں اور میری بیوی یہ گھر چھوڑ کر چلے جائیں گے۔“ وہ دونوں ماں، بیٹی انتہائی دکھ اور حیرت کے عالم میں اپنے اس فرمانبردار بھائی اور بیٹے کو دیکھے چلی گئیں جو دنوں میں ہی بدل گیا تھا۔ سمیعہ نے تو اس دن کے بعد سے آنا ہی کم کردیا تھا۔ بھائی کے الفاظ اور رویے کا دکھ اتنا ہی شدید تھا۔ یہ بات البتہ بی بی نے مصلحتاً بڑے شاہ صاحب سے چھپالی تھی۔ انہی دنوں فردوس بیگم کی طرف سے ملنے والی خوش خبری نے ان سب کو یہ بات بھولنے پر مجبور کردیا کہ ان کا تعلق کہاں سے تھا۔ بی بی ان کے ناز و ادا اور طور طریقے بھلا کر ان کے چاؤ چونچلے اٹھانے میں مصروف ہوگئیں۔ دو ملازمائیں فردوس بیگم کے لیے مخصوص کردی گئی تھیں۔ احمد شاہ نے شہر میں اپنے دوست کے ساتھ مل کر ایک فوڈ فیکٹری کا آغاز کیا تھا وہ زیادہ تر وہیں رہتے۔ کوئی بھی چیز ہو تو وہ تب راس آتی ہے جب اس کی ضرورت ہو بغیر ضرورت جو چیز ملے اسے دھتکار دیا جاتا ہے بیکار اور اضافی جان کر فردوس بیگم عزت کی نہیں، دولت کی چاہ میں احمد شاہ کے پیچھے آئی تھیں عزت کی طالب ہوتیں تو وہیں رچ بس جاتیں لیکن انہیں عزت راس نہیں آئی تھی وہ بغیر ضرورت کے ملنے والی اس عزت کو دھتکارتی رہیں۔

انہی دنوں سمیعہ بیگم کے ایک دیور جو آوارہ فطرت انسان تھے بیرون ملک سے واپس آئے۔ بی بی سے ملنے کی خاطر وہ گھر آئے تو فردوس بیگم کا خیرہ کردینے والا حسن دیکھ کر ان کی آنکھیں چندھیا گئیں اوپر سے ادائے دلبرانہ...... فردوس بیگم جو مردوں کی آنکھوں کے رنگ پہچاننے میں کچھ زیادہ ہی ماہر تھیں ان کی پسندیدگی جو ان کی آنکھوں سے ہویدا تھی کو بھانپ گئیں اور اپنی اداؤں اور جلوؤں کے تیر چلا کر گویا ان کو بے بس کر چھوڑا۔ فردوس بیگم ان عورتوں میں سے تھیں جنہیں عمر کے ہر حصے میں مردوں سے تعریف و توصیف کی طلب رہتی ہے۔ احمد شاہ انہیں اپنے نام کا پابند کر کے اب نہ تو ہر وقت ان کے گھٹنے سے لگ کر بیٹھ سکتے تھے نہ ان کے حسن کے قصیدے اب صبح شام ان کے لبوں پر تھے سو کسی دوسرے مرد کی نظر میں یہ جذبہ دیکھتے ہی فردوس بیگم اپنا مقام اور مرتبہ بھول گئیں۔ اسمٰعیل شاہ کا ایک ہفتے میں تیسرا چکر بی بی کو چونکا گیا ساتھ ہی بہو کے نرالے

اطوار انہیں خبردار کر گئے۔ انہیں عورت کی اس قبیل کی آج تک سمجھ ہی نہیں آسکی تھی کہ گھر، دولت، عزت، اولاد جس عورت کو اللہ ہر نعمت سے نواز دے کیا اس کے لیے کسی اور چیز کی طلب باقی رہتی ہے؟ جس کا خاوند بھی اسے دیکھ دیکھ کر جیتا ہو لیکن وہ نہیں جانتی تھیں کہ ہر عورت ایک جیسی نہیں ہوتی۔ انہوں نے پہلی بار انہیں ٹوکا تھا۔ اسمٰعیل شاہ، صدیقہ بیگم سے سرسری سا حال احوال پوچھ کر فردوس بیگم کے کہنے پر ڈرائنگ روم میں بیٹھ جاتے۔ لمبی، لمبی نشستیں چلتیں۔ بنی سنوری، دل لبھاتی عورت کی کمپنی سے کون کافر مرد انکار کرسکتا ہے ناز و انداز سے جو کسر رہ جاتی وہ فردوس بیگم کا لباس پوری کردیتا۔ بی بی کو سمجھ نہ آتا بے حیائی کے اس طوفان کو کیسے روکیں جس میں لگتا تھا ان کی عزت و ناموس سب بہہ جائے گی۔ اس دن وہ اونچی آواز میں بولی تھیں اور بہو کو اپنے لچھن ٹھیک کرلینے کو کہا تھا اور یہ بھی کہا تھا کہ وہ اپنی حرکتوں سے باز آجائے نہیں تو وہ احمد شاہ سے شکایت کریں گی سو کریں گی بڑے شاہ صاحب کو بھی مجبوراً سب کچھ بتانا پڑے گا۔ فردوس بیگم کو نہ تو ان کی غصے سے لرزتی حالت متاثر کرپائی نہ ان کی دھمکی، الٹا وہ صوفے پر آرام دہ حالت میں بیٹھ کر ان کی اس کانپتی لرزتی حالت کا حظ اٹھاتی رہیں۔

"دیکھو بڑی اماں، مجھے اس طرح کے قید خانوں میں زندگی گزارنا ہرگز نہیں پسند، نہ ہی عادت ہے۔ اپنی ماں کے گھر مجھے جانے نہیں دیا جاتا، گاؤں میں کہیں آنے جانے کی اجازت نہیں ہے اس گھٹن اور زندان کی سی زندگی میں اگر چند پل میں کسی کے ساتھ گزار کر خوش ہو لیتی ہوں تو اس میں برا کیا ہے۔" بی بی حیرت و دکھ سے اس دیدہ دلیر عورت کی ڈھٹائی دیکھتی رہیں جسے ان کے نہ جانے کس گناہ کے عوض ان کے گھرانے پر مسلط کردیا گیا تھا۔ بہر حال ان کا پورا، پورا ارادہ تھا کہ ایک بار احمد شاہ کو بتائیں گی ضرور کہ مرد جتنا بھی اپنی بیوی سے محبت کیوں نہ کرتا ہو اپنی عزت اور غیرت کے حوالے سے بہت جذباتی اور انا پرست ہوتا ہے۔

## پُرخلوص دعا

خدا آپ کے سارے غم ریت پر لکھ دے کہ ہوا سے مٹ جائیں اور خوشیاں پتھر پر لکھ دے کہ بارش بھی نہ مٹا سکے۔
اللہ کرے کہ ہر روز کا نکلتا سورج آپ کے لیے ڈھیروں مسرتیں اور راحتیں لے کر آئے۔ الٰہی آمین۔
مرسلہ: صدف آصف، کراچی

اگلی صبح ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب حسب معمول بڑے شاہ صاحب ناشتا کر کے اپنے ڈیرے پر سدھار گئے۔ احمد شاہ شہر جانے سے پہلے ان کی قدم بوسی کرنے آیا تو انہوں نے یہی بات چھیڑ دی۔ احمد شاہ ان کی بات سن کر بھڑک ہی اٹھا۔

"بی بی میں آج تک سمجھتا رہا کہ فردوس غلط کہتی ہے، آپ کیسے اس سے اتنی نفرت کرسکتی ہیں۔ اسمٰعیل بھائی سے اس نے سلام دعا کیا کرلی آپ نے تو ایک محاذ ہی بنالیا اس کے خلاف... طعنے، طنز...... خدا کے لیے بی بی اتنا سوچ لیا کریں وہ میری بیوی ہے، میرے ہونے والے بچے کی ماں ہے اور وہ بھلی مانس مجھے ہمیشہ منع کرتی رہی کہ احمد میں اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرلیتی ہوں آپ کے سامنے لیکن آپ بی بی سے کچھ مت کہیے گا۔ ان سے آپ میرے لیے گستاخی کریں یہ مجھے منظور نہیں۔ میں محبت اور خدمت سے کبھی نہ کبھی تو ان کے دل میں جگہ حاصل کر ہی لوں گی بس...... مجھے ان کی یہی بات تو تکلیف دیتی ہے کہ وہ مجھے میری پچھلی زندگی کے حوالے سے بہت کچھ سناتی ہیں ورنہ ساس، بہو میں چپقلش کس گھر میں نہیں ہوتی۔" فردوس بیگم ایک کائیاں عورت تھی اس نے پہلے ہی سے اپنی بنیاد مضبوط کررکھی تھی۔

"یہ دیکھیں بی بی...... میرے بندھے ہاتھوں کو

ہی دیکھ لیں، میری خوشی کو ہی دیکھ کر چپ ہوجایا کریں۔'' وہ جو اسے سمجھانے کا ارادہ رکھتی تھیں نرم لفظوں میں ہی سہی، ان کی آنکھوں سے ایک آنسو ٹپکا اور ان کے سفید براق دوپٹے میں جذب ہوگیا۔ پھیکے سے مسکراتے ہوئے انہوں نے احمد شاہ کے دونوں ہاتھ کھول دیے۔ سر پر ہاتھ پھیرا، وہ ایک طویل سانس لیتے ہوئے اٹھ گیا تھا۔ اذکار سے فارغ ہوکر جس پل وہ باہر آئی تھیں فردوس بیگم باہر موجود تھیں کچھ جتاتی ہوئی اور مذاق اڑاتی ہوئی مسکراہٹ کے ساتھ، انہوں نے اس نظر کے بعد دوسری نظر نہیں ڈالی تھی اس پر......باہر کھیلتی عائشہ کو لے کر اپنے کمرے میں آگئیں۔ اذان شاہ کو شروع سے ہی بورڈنگ ہاؤس میں ڈال دیا گیا تھا۔ صدیقہ بیگم بہت چپ ہوگئی تھیں۔ بس اب تو ہر پل ان کے لبوں پر یہی دعا رہتی ہے کہ بھلے ہی بیٹی رحمت ہوتی ہے پر وہ ایسی عورت کے بطن سے جنم نہ لے...پر سبھی دعائیں اس دنیا میں کب قبول ہوتی ہیں سو فردوس بیگم نے بھی ایک خوب صورت سی بچی کو جنم دیا۔ جس کا نام کریم بخش شاہ نے سجدہ شاہ رکھا تھا۔ زندگی اسی ڈگر پر رواں دواں تھی۔ سجدہ شاہ چھ ماہ کی ہوگئی تھی۔ گول مٹول خوب صورت سی سجدہ سب کی آنکھوں کا تارہ تھی۔ اولاد دے کر فردوس بیگم کچھ زیادہ ہی پھیل گئی تھیں۔ برائی اور اچھائی کو کبھی نہیں چھپایا جاسکتا۔ اچھائی کی خوشبو اور برائی کی بدبو بلکہ سڑاند بھی نہ کبھی اپنی پہچان ضرور کرالیتی ہیں۔ ایسا ہی فردوس بیگم کے ساتھ ہوا تھا۔ اس دن خوب گرج چمک کے ساتھ بارش ہورہی تھی جب ساتھ والے گاؤں سے کسی فوتگی کی اطلاع پر بی بی اور بابا صاحب کو وہاں جانا پڑ گیا۔ عائشہ کو بی بی ساتھ ہی لے گئیں کہ وہ اسے اپنے ساتھ ہی رکھتی تھیں۔ ایک ملازمہ ان کے ہمراہ گئی تھی جبکہ باقی دو ملازمائیں گھر پر تھیں۔ خراب موسم کے پیش نظر احمد شاہ اپنے معمول سے جلدی آگیا تھا۔ عصر میں ہی مغرب کا گمان ہورہا تھا جب اس کی گاڑی نے حویلی کا پھاٹک کراس کیا۔ گاڑی کی آواز بھی بادلوں کی گھن گرج میں چھپ گئی۔ وہ دو تین فائلیں سر پر رکھے خود کو بارش کی بوچھاڑ سے بچاتا تیزی سے حویلی کے صحن سے ہوتا ہوا بڑے ہال میں آیا وہاں پر مکمل سناٹا دیکھ کر سیڑھیاں چڑھ کر اپنے کمرے کی طرف بڑھا کمرے کا دروازہ کھول کر اس نے جو منظر دیکھا کوئی بھی غیرت مند مرد اسے دیکھ کر مرجانا پسند کرتا، کاٹ میں کلکاریاں بھرتی سجدہ اس بات سے بے خبر تھی کہ اس کی ماں اس وقت ذلت کے کس گڑھے میں اتر چکی تھی۔ اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اسمٰعیل شاہ پر گھونسوں اور مکوں کی برسات کردی۔ دراز میں سے ریوالور ڈھونڈتے ہوئے اس کی بے خبری سے فائدہ اٹھاتا اسمٰعیل شاہ وہاں سے نکل بھاگا۔ احمد شاہ نے نفرت سے زمین پر تھوکتے ہوئے فردوس بیگم کو وہ تین لفظ کہے جو عورت کی زندگی کو گہنا دیتے ہیں اور اس غلیظ عورت کو فوراً سے بیشتر سجدہ کو ہاتھ لگائے بغیر وہاں سے نکل جانے کو کہا کہ طیش میں اسے اس آوارہ عورت کے خون سے ہاتھ نہ رنگنے پڑ جائیں۔ وہ اتنا طیش میں تھا کہ اسے لگا کہ وہ اگر یہیں رہا تو اس کے دماغ کی رگ پھٹ جائے گی اور وہ اس عورت کو مار ڈالے گا۔ سو اس نے روتی ہوئی سجدہ کو جھپٹ کر اٹھایا اور دروازے پر ایک پل کو رک کر اس عورت سے اتنا کہا کہ جتنی جلدی ہوسکے اپنا ناپاک وجود لے کر یہاں سے چلی جائے وہ اپنی بیٹی پر اس گھٹیا عورت کا سایہ بھی نہیں پڑنے دینا چاہتا۔ یہ کہہ کر وہ تیزی سے سجدہ کو لے کر نیچے آیا۔ پچھلی طرف کے کمرے سے باہر جاکر ملازمہ کو بلا کر سجدہ کو اس کے حوالے کر کے اس کا خیال رکھنے کو کہا اور خود تپتے دماغ کے ساتھ ڈیرے کی طرف آگیا......اس کے دماغ نے کام کرنا چھوڑ دیا تھا۔ جبھی وہ فردوس بیگم کے گھر سے چلے جانے کا یقین کیے بغیر منظر سے ہٹ گیا تھا اور یہی وہ وقت تھا جب فردوس بیگم ملازمہ سے سجدہ کو جھپٹنے میں کامیاب ہوگئی تھی۔ رہ، رہ کر وہ سارے مناظر آنکھوں کے سامنے گھومنے لگے جب بی بی نے اور اس کی بہن سمیعہ نے اسے فردوس کی بے راہ روی کی طرف دھیان دلانا چاہا تھا پر احمد شاہ نے ان کی ایک بھی نہیں سنی تھی۔ کتنی دیر بارش میں بھیگتے رہنے کے باوجود دل و

دماغ میں لگی آگ کو ٹھنڈا کرنے میں وہ ناکام رہا تھا۔ فون کر کے بابا صاحب کی اور بی بی کی واپسی کے متعلق دریافت کیا۔ ان سے پتا چلا کہ موسم کی خرابی کے باعث وہ لوگ صبح ہی آسکیں گے۔ ریوالور کی موجودگی کا یقین کر کے وہ اسمٰعیل شاہ کے ڈیرے کی طرف آ گیا۔ وہاں سے پتا چلا کہ وہ تھوڑی دیر پہلے ہی شہر کی طرف نکلا ہے اس کے دماغ میں شرارے دوڑ گئے۔

''جہاں بھی چھپ جاؤ اسمٰعیل شاہ، اپنے گھر کی عورت کی عزت پر ہاتھ ڈالنے والے کو میں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ یہ میرا خود سے وعدہ ہے۔'' صبح کے چار بجے جا کر اسے معصوم سجدہ کا خیال آیا جسے وہ ملازمہ کے سپرد کر آیا تھا۔ واپس حویلی کی طرف آنے پر اسے اپنی... زندگی کا دوسرا اور شدید صدمہ برداشت کرنا پڑا جب ہال میں اس نے ملازمہ کو اکیلے سوتے دیکھا اسے جھنجوڑ کر تیزی سے جگا کر سجدہ کی بابت استفسار کیا۔

''وہ......وہ تو چھوٹے شاہ جی...... سجدہ بی بی کی طبیعت خراب تھی ناں چھوٹی بی بی اسے ڈاکٹر کو دکھانے شہر لے گئی ہیں۔ آپ پتا نہیں کہاں چلے گئے تھے۔'' اس کے اتنے غصیلے اور شدید تیور دیکھ کر ملازمہ ہکلا کر بولی۔

''کک......کہاں؟ کس کے ساتھ گئی ہے؟''

اسے اپنے حواس جواب دیتے محسوس ہوئے۔

''پتا نہیں جی، سجدہ بی بی بہت رو رہی تھی جی...... میں نے فیڈر بھی دیا پھر بھی چپ نہیں ہوئی۔ چھوٹی بی بی اوپر سے آئیں اور مجھے کہا کہ اسے ان کے حوالے کروں وہ شہر ڈاکٹر کو دکھانے گئی ہیں، میں سمجھی آپ کے ساتھ گئی ہیں جی، گھر خالی تھا اس لیے میں یہاں ہی سو گئی۔'' گھر کی سب سے قیمتی متاع لٹ گئی تھی اور وہ گھر کی حفاظت کے خیال سے سو رہی تھی۔ انہی اُڑے حواس کے ساتھ وہ چوکیدار کے پاس آیا۔

''فردوس بی بی...... آپ کے کہنے پر ہی تو اسمٰعیل شاہ کے پاس گئی ہیں۔ اب تک تو جی انہیں واپس بھی آ جانا چاہیے تھا۔'' اس کی بات سن کر وہ اپنی ذلت کے احساس اور عزت کی پامالی کا غم مناتا رہا تھا اور وہ مکار عورت اس کی متاع کو لے اڑی تھی۔

ثبوت اسے اپنے سیل پر آنے والی کال پر مل گیا جب دوسری طرف سے ہنستے ہوئے فردوس بیگم نے کہا تھا۔

''میرا جرم اتنا بڑا نہیں تھا جتنی بڑی مجھے سزا دی گئی تھی اب جو سزا میں تمہیں دوں گی وہ تمہیں تمام عمر تڑپائے گی۔ بہت شریف اور عزت والے سمجھتے ہو ناں خود کو احمد شاہ...... کل جب تمہاری بیٹی کی رات نیلامی ہو گی تو میں دیکھوں گی کیسے اپنی نام نہاد شرافت کا ڈنکا بجاتے ہو۔'' اس کے زہر خند لہجے پر احمد شاہ

ساکت رہ گیا۔ بی بی اور بابا صاحب صبح جب واپس آئے سب کچھ ختم ہو گیا تھا بے حیائی اور بے راہ روی کے جس طوفان سے بی بی ڈرتی رہی تھیں وہ آکر سب کچھ اپنے ساتھ بہا لے گیا تھا۔ اس گھر کی عزت' ناموس، آن بان، احمد شاہ نے روتے ہوئے بابا صاحب کو سب کچھ بتایا اور اپنے درد کو نقصان کو بتاتے اسے دل کا ایسا جان لیوا دورہ پڑا کہ اسپتال تک جانے کی مہلت بھی نہیں ملی تھی۔ اسمٰعیل شاہ ایک بار پھر ملک بدر ہو گیا تھا۔ بابا صاحب اپنی عزت، مقام و مرتبہ بھلا کر ان گلیوں تک گئے تھے جہاں ایک مجہول سے حلیے والے آدمی کے سوا کچھ نہیں تھا جس نے بتایا تھا کہ ان لوگوں کا ڈیرا مستقل ایک جگہ پر نہیں ہوتا وہ جگہ، جگہ پھرتے ہیں اور ابھی دو دن پہلے ہی وہ یہاں سے چلے گئے ہیں۔ کندھوں پر غموں کی بھاری صلیب اٹھائے بڑے شاہ صاحب وہاں سے لوٹ آئے تھے۔ انہوں نے اپنے بے شمار ذرائع استعمال کرا کے فردوس بیگم کو تلاش کرنا چاہا پر اسے زمین نگل گئی تھی یا آسمان کھا گیا تھا کہ وہ دن اور آج کا دن یہ دل چیر دینے والی حقیقت ہر پل انہیں خون کے آنسو رُلاتی کہ ان کے خاندان کی عزت، ان کے احمد شاہ کی نشانی زندہ تھی اور بد نام گلیوں کی زینت تھی۔ وہ گوشہ نشین ہو گئے تھے۔ وہ مزید عاجز بن گئے تھے۔ ان کی سخاوت میں اضافہ ہو گیا، کسی بھی سوالی کو خالی ہاتھ نہ لوٹاتے کہ ہو سکتا ہے کسی ضرورت مند کے منہ سے نکلی دعا کوئی معجزہ کر دے۔ بی بی کا چہرہ آنسوؤں سے تر ہو گیا۔ ہر روز رات کو جب ساری کائنات سو جاتی، ان کے زخموں کے ٹانکے اُدھڑ جاتے ماضی اپنی پوری تلخی سمیت ان کے سامنے آ کھڑا ہوتا۔ دونوں میاں، بیوی جاگ کر راتیں تمام کرتے۔ زخم تو کبھی مندمل ہوا ہی نہیں تھا۔ کوئی یاد، کوئی بات، کوئی حوالہ، کوئی سلسلہ اسے ہرا کیے رکھتا جیسے کل اس بچی خوش بخت کی آمد، اس کی شکل، معصومیت انہیں اپنی سجدہ کی یاد دلا گئی تھی۔ وہ آنسو پونچھتی اٹھیں تہجد کا وقت ہو چلا تھا۔ انہیں ایک بار پھر اپنے رب کے حضور حاضر ہونا تھا۔

☆☆☆

صبح تک ان دونوں کی دوستی مزید پکی ہو گئی تھی اور عائشہ نے اسے منا لیا تھا کہ وہ کچھ روز مزید ان کے ہاں قیام کرے گی۔ ویسے بھی دل سے تو خوش بخت بھی یہی چاہتی تھی کہ وہ کچھ مدت یہاں رہے، اپنے ہونے کی، اپنی شناخت کی کھوج کا کوئی سرا ملنے تک۔ صبح بڑے شاہ صاحب واپس تشریف لے آئے تھے۔ خوش بخت، عائشہ کے ساتھ ان سے ملنے گئی۔ کئی ثانیے وہ اس پر سے نظر ہی نہ ہٹا سکے۔ کچھ دیر بعد ان کا کپکپاتا ہاتھ اس کے سر پر آٹھہرا جو اسے کسی گھنے سایہ دار درخت کی طرح لگا۔ اس نے آنکھیں موند کر ویسا ہی سکون محسوس کیا جیسا وہ مسافر محسوس کرتا ہے جو سفر کی کڑی صعوبتیں جھیل کر تپتی دھوپ سے اس شجر کے نیچے آن رکے۔ بلاوجہ ہی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے۔ ''کیا پھر بھی یہ ایسی ہی شفقت کا مظاہرہ کریں گے اگر جو میں ان کو اپنی حقیقت بتا دوں تو؟'' بی بی، شاہ صاحب سے پنچائیت کے فیصلے کی بابت دریافت کرنے لگیں جس کی پیچیدگی نے بڑے شاہ صاحب کو ایک دن کے بجائے دو دن کے قیام پر مجبور کر دیا تھا۔ خوش بخت جھکا ہوا سر اٹھا کر بے اختیار بابا صاحب کو دیکھنے لگی جو آہستہ سے بتا رہے تھے کہ لڑکا تو نکل گیا لیکن لڑکی کو کاری کر دیا گیا۔ اس کے ماں، باپ تو بہت شور کر رہے تھے پر موقع پر بہت سے گواہان موجود تھے۔ اس لیے مجبوراً انہیں فیصلہ قبول کرنا پڑا۔

''پتا نہیں کیوں آپ کے ایسے کسی بھی فیصلے پر جی دلوں ہولتا رہتا ہے۔'' وہ گلوگیر لہجے میں بولیں۔ جواباً شاہ صاحب نے ایک نظر اُن کی طرف دیکھا اور اپنے مخصوص لہجے میں کہا۔

''کسی بھی گناہ گار کو سزا دیے بغیر برائی کے عمل کو روکنا ناممکن ہے اور زنا جیسا جرم صدیقہ بی بی! جس کے مجرم کو سنگسار کیے جانے کا حکم ہے، ایسے لوگوں کو ایسے چھوڑ دینا برائی کو بڑھانے کے لیے مہمیز کا کام دیتا ہے۔ بہت بار ان کو سمجھانے اور باز رکھنے کی کوشش کی

گئی لیکن بے راہ روی کی جس راہ پر وہ چل پڑے تھے وہاں سے واپس پلٹنا ناممکن تھا ان کے لیے، خیر چھوڑیں آپ بتائیں کہ اس بچی کا خیال رکھا یا نہیں آپ لوگوں نے؟ کیوں عائشہ......؟'' وہ پوچھنے لگے اور خوش بخت جو اُن کے نرم رویے اور لہجے سے ہمت پکڑے بیٹھی تھی ان کے اس قدر سفاک فیصلے کا سن کر اندر سے بہت خوفزدہ ہوگئی۔

''واقعی یہ لوگ مجھے اور میری ماں کو مار دینا چاہتے ہوں گے۔'' یہاں آنے کے بعد پہلی منفی سوچ نے اس کے اندر سر اٹھایا۔

''اس کا مطلب آنٹی ستارہ ٹھیک کہتی تھیں لیکن وہ ماسٹر جی......'' وہ الجھی ہوئی سوچوں میں بیٹھی رہی۔ ناشتے کے بعد خدیجہ بھی آن وارد ہوئی تھی۔

''لگتا ہے تمہارا کام ابھی نامکمل ہے؟'' پتا نہیں واقعی اس کا لہجہ طنزیہ تھا یا خوش بخت کو ہی لگا۔

''نہیں ایک دو دن میں مکمل ہو جائے گا۔'' اس کے بعد وہ عائشہ سے معذرت کر کے اپنے عارضی قیام گاہ یعنی مہمان خانے کی طرف آ گئی۔

''ہونہہ پتا نہیں کیسے ماں، باپ ہوتے ہیں جو اپنی بیٹیوں کو ایسے شترِ بے مہار چھوڑ دیتے ہیں کہ جہاں جی چاہے پھرو، جو جی چاہے کرو، نہ کوئی اتا نہ پتا...... ایک ہمارے والدین ہیں، اپنی نانی، نانا کے گھر آنے کے لیے سو منتیں کرنی پڑتی ہیں تب کہیں جا کر آنے کی اجازت ملتی ہے۔'' خوش بخت نے جاتے، جاتے اس کے وہ سارے الفاظ سنے پھر سر جھٹک کر باہر چلی گئی۔

''پتا نہیں کیوں اے پیاری سی لڑکی تم مجھ سے اتنی خار کھاتی ہو، ارے تم جانتی ہی کہاں ہو کہ میں اس وقت کتنے محاذوں پر تنہا لڑ رہی ہوں بغیر کسی ہتھیار کے......میرے لیے نیا محاذ کھڑا مت کرو۔'' اس نے سست روی سے چلتے ہوئے سوچا۔ تھوڑی دیر بعد ملازمہ اسے عائشہ کا ایک سوٹ دے کر گئی۔

''چھوٹی بی بی کہتی ہیں، یہ استعمال کیا ہوا نہیں ہے آپ یہ تبدیل کر لیں۔ یہ بالکل نیا ہے۔'' اسے عائشہ پر بے طرح پیار آیا اس نے لباس تبدیل کر لیا اور آج ایک بار پھر گاؤں کے باقی گھروں میں سروے کی غرض سے بی بی کو بتا کر باہر آ گئی۔ ملازمہ کو ساتھ لے کر وہ خود نہ آئی کہ گاؤں کی عورتوں سے کریم بخش شاہ صاحب کے گھرانے کے بارے میں کچھ معلومات لینا چاہتی تھی۔ کچھ خاص معلومات تو نہ مل سکیں بس باتوں، باتوں میں اتنا پتا چلا کہ احمد شاہ کی شہری بیوی بہت حسین اور نخرے والی تھی اور ایک رات بچی کو چپکے سے لے کر غائب ہوگئی تھی۔ اس نے یہ محسوس کیا کہ گاؤں کے ہر گھر میں ہی تقریباً فردوس بیگم کے لیے منفی تاثرات پائے گئے تھے جبکہ شاہ صاحب کے گھرانے کے اخلاق، سخاوت اور مروت کی ہر کسی نے تعریف کی۔ واپسی پر وہ بے حد تھکی ہوئی اور پژمردہ تھی۔ کوئی سرا ایسا ہاتھ نہ آسکا تھا جس کو لے کر وہ آگے بڑھ پاتی سو وہیں ایک سایہ دار درخت دیکھ کر کچھ دیر ستانے بیٹھ گئی۔ سامنے گندم کی سنہری

## غزل

اب تو تیری آنکھوں میں بھی میری صورت نہیں ہوتی
اے کہنا! فکر کرنے کے لیے ذکر کی ضرورت نہیں ہوتی

زمانہ، روزگار نے ایسا کر دیا معروف ہم کو
ورنہ کسی روز بھول جائیں ہم، ایسی صورت نہیں ہوتی

مت یاد کر تلخ ماضی کو اے دوست
کچھ یادِ ماضی کی خوب صورت نہیں ہوتی

ہجر کی یہ شام، دن اور رات باعثِ مجبوری
ورنہ ایسا نہیں کہ ہم کو تیری ضرورت نہیں ہوتی

جو لوگ بستے ہوں دریچۂ دل میں اے خضر
دیکھیں ان چہرے کو اس کی ضرورت نہیں ہوتی

شاعر: محمد امین خضر
مرسلہ: قیصرہ شاہ، اسلام آباد

فصل لہلہارہی تھی۔ آسمان پر بادل تھے اور ہلکی ہوا بھی چل رہی تھی اس لیے گرمی کا مجموعی تاثر کم تھا۔ کچھ دیر بعد جب وہ اٹھنے کو تھی اس نے اذان شاہ کو اسی طرف آتے دیکھا۔ اس کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ اسی کو ڈھونڈتے ہوئے آرہا تھا۔

''میں حویلی سے آرہا ہوں، وہاں سے پتا چلا کہ آپ سروے کے لیے نکلی ہیں، آپ کو ڈھونڈتے ہوئے یہاں تک آیا ہوں۔'' خوش بخت سوالیہ نظروں سے اسے دیکھتی رہی جیسے اس کی تمہید کا مقصد جاننا چاہ رہی ہو۔ وہ اس سے تھوڑا دور ہو کر بیٹھ گیا کچھ دیر سامنے فصل پر نظر جمائے بیٹھے رہنے کے بعد اس نے اس کی طرف سر گھمایا کچھ دیر بغور اسے دیکھا اب کے خوش بخت گھبرا گئی۔

''آپ کون ہیں اور یہاں کیا کرنے آئی ہیں؟''

سنجیدہ لہجے میں کیا گیا سوال اس کا دماغ بھک سے اڑا گیا۔ وہ گڑبڑا کر اسے وہی تفصیل بتانے ہی لگی تھی جب اذان شاہ نے ہاتھ اٹھا کر اسے روک دیا اور سابقہ انداز میں ہی بولا۔

''کل شام کو آپ کو ڈھونڈنے کچھ لوگ آئے تھے یہاں گاؤں میں، عجیب سی شکل اور حلیوں والے...... ان لوگوں کا حلیہ چیخ، چیخ کر یہ کہہ رہا تھا کہ وہ شریف لوگ... ہرگز نہیں ہیں۔ ان کے پاس آپ کی تصویر بھی تھی انہوں نے بتایا کہ آپ گھر سے بھاگ کر یہاں آکر چھپ گئی ہیں۔ وہ بہت سراغ لگا کر اور تحقیق کر کے آئے تھے کہ آپ اپنے کالج سے کس رکشے میں بیٹھیں۔ اس نے آپ کو کہاں چھوڑا آخری بات جو بس کنڈیکٹر نے بتائی وہ یہی تھی کہ آپ یہیں اتری تھیں۔ میں نے پُرزور تردید کر کے فی الحال انہیں واپس تو بھیج دیا لیکن ان کے تاثرات سے لگ رہا تھا کہ انہیں میری بات کا یقین نہیں...... باباصاحب کی حیثیت اور مقام کا خیال کر کے وہ واپس تو چلے گئے ہیں لیکن ہو سکتا ہے کہ اس بار وہ کسی اور مضبوط منصوبہ بندی کے ساتھ آئیں...... اب آپ مجھے سچ، سچ بتائیں گی کہ آپ یہاں کیوں اور کس مقصد کے تحت آئی ہیں؟ آپ نے اپنا گھر کیوں چھوڑا؟'' خوش بخت پھیکے پڑتے چہرے اور سن ہوتے جسم کے ساتھ وہ سب کچھ سنے گئی۔ اذان شاہ چونک گیا جب اس نے خوش بخت کو ہاتھوں میں منہ چھپا کر بری طرح روتے دیکھا۔ اسے اس کو اس طرح روتے دیکھ کر شدید تکلیف ہوئی اور دل کی اس دوسری بغاوت پر وہ جھنجلا گیا۔ ضدی دل نے پہلی بغاوت اس لڑکی کو دیکھ کر اسی پر اپنے آئیڈیل کی مہر ثبت کر کے اسے حیران کر دیا تھا۔ جس لڑکی کو اس نے کبھی دیکھا نہیں تھا جس کی حیثیت، شناخت، خاندان وغیرہ کے بارے میں کچھ پتا نہیں تھا۔ اس کے بارے میں وہ کیسے انتہائی جذبات رکھ سکتا تھا پر دل کو جب اپنی منوانی ہو تو وہ کون، کیسے، کیوں کو خاطر میں نہیں لاتا۔ وہ لوگ جو بلا زم بھی حسب نسب کھنگال کر رکھتے تھے وہ کیسے اس لڑکی کو اپنانے کے بارے میں سوچ سکتا تھا سو اس نے اپنا دھیان یہاں وہاں لگانے کی کوشش کی اور سوچا ضرور تھا کہ اس سے اس کے گھر، خاندان کی معلومات ضرور لے گا، کیا پتا قسمت اس کا ساتھ دے جائے بظاہر شکل صورت اور گفتگو سے وہ اسے سلجھی ہوئی لڑکی لگی تھی۔

بی بی اور عائشہ نے بھی اس کی تعریف کی تھی لیکن کل شام اسے فیکٹری میں مشینری سیٹ کرانی تھی سو وہ لیٹ ہو گیا تھا جب ایک جیپ پر اس نے تین افراد کو وہاں اترتے دیکھا جن کے حلیے اسے چونکا گئے اور ان میں سب سے کرخت اور عجیب شکل صورت والے آدمی نے جب خوش بخت کی تصویر دکھا کر اس کی بابت اسے ساری تفصیل بتا کر دریافت کیا وہ بے حد پریشان ہو کر رہ گیا تھا۔ گھر آکر وہ خوش بخت سے اسی وقت ملنا چاہتا تھا پر کام سمیٹتے، سمیٹتے بھی اسے بہت دیر ہو گئی تھی۔ اس نے ان لوگوں کو ٹال دیا تھا لیکن وہ لوگ پورا پتا کر کے یہاں تک پہنچے تھے۔ صبح اس کا فیکٹری کا ایک اور چکر لگا تھا اور اب واپسی پر اس کی بابت دریافت کرنے پر اسے پتا چلا کہ وہ سروے کے لیے نکل چکی ہے۔ اب اس نے بے تحاشا روتے ہوئے اذان شاہ کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے اور کہا وہ صرف اسے دو دن دے دے وہ اسے سب کچھ سچ، سچ بتا دے گی پر اس وقت وہ اس سے کچھ مت پوچھے۔ اذان شاہ نے اپنے

اندر اودھم مچاتے سوالات کو بہ مشکل پیچھے دھکیلا اور اس کی درخواست پر کسی معمول کی طرح سر ہلا دیا۔ وہ اس کے پاس سے اٹھ کر تیزی سے وہاں سے چلی گئی تھی۔ وہ سارا دن اذان شاہ کسی اور کام کی طرف دھیان ہی نہیں دے سکا تھا۔ خوش بخت سائیں، سائیں کرتے ذہن کے ساتھ حویلی آئی تھی۔ شومئی قسمت بی بی اسے اپنے کمرے میں اکیلی مل گئیں۔ عائشہ، خدیجہ کے گھر اپنی پھپھو کی طبیعت دریافت کرنے گئی ہوئی تھی جو ایک مہینے سے ناساز تھی۔

''بی بی یونہی باتوں کے دوران گاؤں میں ایک آدھ جگہ آپ کی اس پوتی کا ذکر ہوا جو احمد شاہ کی بیٹی تھی کہ کبھی وہ نظر نہیں آئی۔'' اس کا سوال سن کر ان کے چہرے پر نا قابلِ بیان تاثرات درج ہو گئے۔

''بیٹی جنہوں نے اس کا ذکر کیا انہوں نے تمہیں پوری بات نہیں بتائی کہ وہ اور اس کی ماں کسی حادثے کا شکار ہو کر اس دنیا سے چل بسی تھیں۔'' اس پل جتنی اذیت بی بی نے محسوس کی تھی اس سے زیادہ خوش بخت نے اپنے اندر اذیت کے اسی سمندر کو ٹھاٹھیں مارتا محسوس کیا۔

''ستارہ آنٹی ٹھیک کہتی تھیں آپ نے کبھی میری ماں کو دل میں جگہ دی ہی نہیں تھی۔ اور ان کے حوالے سے مجھے بھی قبول نہیں کیا۔'' خود ترسی سے سوچتی کھانے سے انکار کرتی وہ اپنے کمرے کی جانب آ گئی جہاں وہ رہائش پزیر تھی۔ اسے وہ دھندلے دھندلے نقوش اور باتیں پوری جزئیات کے ساتھ یاد آنے لگیں جو کبھی فردوس بیگم، کبھی اس کی نانی اور اکثر ستارہ بیگم بتاتی تھیں، وہ باتوں کے مفہوم اور معانی و مطلب سمجھنے کی عمر میں نہیں تھی لیکن اس کی ماں کی باتیں اسے الجھن میں مبتلا ضرور کر دیتیں۔ جو پکڑ پکڑ کر اسے اپنے پاس بٹھا کر اس کی دلچسپی اور مطلب کی باتیں کرنے کے بجائے اس سے کہتی۔

''خوشی! تمہارا باپ ایک ظالم آدمی تھا، وہ تمہیں اپنی اولاد ماننے پر تیار نہیں تھا۔ اس کے گھر والے اس سے زیادہ ظالم تھے وہ بھی اسے بھڑکاتے کہ تمہیں اور مجھے جان سے مار دیا جائے۔'' وہ نافہم نظروں سے ماں اور خالہ کو دیکھ کر رہ جاتی پھر ایک حادثے میں اس کی ماں کا انتقال ہو گیا تو اس کے ذہن میں جہاں بھی باپ کے حوالے سے جتنے سوالوں نے جنم لیا اس کی نانی اور ستارہ بیگم نے اس کا ذہن پراگندہ رکھنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔

''یہ شریف لوگ صرف نام کے شرفا ہیں، خوشی، تمہارا باپ جو تمہاری ماں کو اس گندگی سے نکال کر بڑے کروفر سے لے گیا۔ اسے کیا معلوم گندگی تو ذہن میں ہوتی ہے ان لوگوں کے ذہن بھی گندے تھے۔ تمہاری ماں کو کئی، کئی دن کمرے میں بھوکا پیاسا رکھا جاتا تھا اسے کسی سے ملنے، بات چیت کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ گھر میں کئی ملازموں کے ہوتے ہوئے بھی میری بچی سے سارا کام کرایا جاتا۔ تمہاری دادی اور پھپھو نے طعنے دے، دے کر اس کی زندگی اجیرن کر دی تھی۔ ہر آئے گئے کے سامنے ذکر کرتیں کہ کیسے اس کی ماں نے اداؤں کے تیر چلا کر تمہارے باپ کو بے بس کر ڈالا تھا اب بھی جب موقع ملا وہ بھاگ جائے گی اور جب تم پیٹ میں تھیں تو کئی ایسے حربے اور ٹوٹکے استعمال کرائے کہ بچہ پیدا ہی نہیں ہو لیکن تم نے اس دنیا میں آنا تھا سو آ کر رہیں۔ تمہارے باپ کو انہوں نے اتنا بہکایا تمہاری ماں کے خلاف، اتنے الزامات لگائے کہ وہ تمہیں اپنے وجود کا حصہ ماننے سے انکاری ہو گیا۔ تمہاری ماں کی زندگی تو تنگ تھی ہی تم پر بھی کم ستم نہ ڈھائے۔ نہ تمہیں کپڑے لے کر دیے نہ دیگر ضرورت کی اشیا اور دودھ وغیرہ، ایک کپڑے میں لپیٹ کر فردوس تمہیں روتی رہتی پھر ان سب کا مسلسل بہکانا کام آ گیا تھا اور انہوں نے ایک ایسا منصوبہ ترتیب دیا کہ تمہاری ماں کو اس کے سوا کوئی اور چارہ نہ رہا تھا کہ وہ ان ظالم لوگوں کے چنگل سے تمہیں بچا لاتی ورنہ تو تمہیں مار ہی دیتے وہ لوگ۔ انہوں نے رشتے کے کسی آدمی کو پیسہ دیا یا کوئی اور لالچ کہ وہ اس پل، اس وقت وہاں آ دھمکتا جب تمہارے باپ نے گھر آنا ہوتا فردوس لاکھ دہائیاں دیتی کہ وہ اسے نہیں جانتی لیکن وہ عورتیں یہی کہتیں کہ اس کو تمہاری بیوی نے ہی بلایا ہے۔ ایک رات جب اس مرد

نے تمہاری ماں سے دست درازی کی کوشش کی اور احمد شاہ کے آجانے پر الزام فردوس کے اوپر ڈال دیا کہ اسی نے مجھے بلایا تھا نہ صرف آج بلکہ اس سے پہلے بھی وہ کئی بار فردوس کے بلانے پر آچکا تھا۔ یہ سننا تھا کہ تمہارے باپ کے سر پر خون سوار ہوگیا۔ وہ تم دونوں کو مار دینا چاہتا تھا۔ مت پوچھو کیسے جتنوں سے فردوس اسی برستی ہوئی تاریک رات میں تمہاری اور اپنی جان بچا کر نکلی۔''

یہ وہ کہانی تھی جو اُن لوگوں نے کسی کمپیوٹر ...... کی طرح اس کے دماغ میں فیڈ کردی تھی۔ نانی کے مرنے کے بعد اس کی برین واشنگ کا کلی بیڑا ستارہ بیگم نے اٹھالیا اور اب وہ جب سے کالج میں آئی تھی، کچی عمر کے تقاضے اور باپ سے نفرت کو تیز کرنے کے لیے ستارہ بیگم نے لوہا گرم دیکھ کر چوٹ لگائی اور کہا تھا کہ''بڑے ہو کر اسے اسی بازار کی رونق بننا ہے۔ ستارہ بیگم کی سیٹ سنبھالنی ہے اور ایک وقت ایسا آئے گا جب میں خود تمہیں تمہارے باپ کے پاس بھیجوں گی تمہارا حق وصول کرنے...... ابھی تم چھوٹی ہو، تمہاری حیثیت میرے حوالے کی محتاج ہے۔ اپنی جگہ اور مقام اس جگہ پر مضبوط کرنے کے بعد جانا ان شرفا کے پاس۔'' پر جب سے خوش بخت نے اس دلدل میں اترنے سے انکار کردیا تھا ستارہ بیگم نے اس کا ذہن دوسری طرف موڑنا چاہا تھا فلم لائن کی طرف اور ایک بار پھر اسے ڈراوا دینے لگی تھیں کہ جو لوگ پیدا ہوتے ہی اسے مار دینا چاہتے تھے وہ اب بھی اس کے ویسے ہی دشمن ہوں گے' ستارہ بیگم کی بات مان لینے کے سوا اس کے پاس کوئی چارہ نہیں تھا لیکن اپنی عادت اور فطرت کا کیا کرتی جو برسوں اس جگہ سے تعلق رہنے کے باوجود وہاں کے طور طریقے ہرگز اپنانے کو تیار نہ تھی۔ پھر انہی دنوں موسیقی اور رقص کی تربیت لینے کے دوران اسے ماسٹر جمن کی کچھ باتوں نے چونکا دیا جو انہوں نے اس کے دادا کے حوالے سے کی تھیں کہ وہ اپنی گمشدہ پوتی کو بہت بے قراری سے ڈھونڈتے پھر رہے تھے۔ اسی بات نے اس کے اندر ایسی ہمت پیدا کی کہ وہ وہاں سے نکل آئی تھی۔ ہوسکتا ہے کہ باپ کے دل میں چھپی محبت نے جوش مارا ہو پر یہاں آکر اسے پہلا صدمہ اپنے باپ کی موت کا برداشت کرنا پڑا تھا۔ اس کا سب سے پہلا اور مضبوط حوالہ ختم ہو چکا تھا۔ اس کے حوصلے کی دیوار میں دراڑ پڑی اور ہمت لڑکھڑا گئی تھی۔ کبھی ان سب کے محبتوں سے لبریز رویے اسے اتنا پُرجوش کردیتے کہ اسے لگتا اسے اپنی شناخت کرادینی چاہیے پر اس کے بعد فوراً ہی کوئی ایسی بات ہوجاتی وہ پھر سے گھبرا جاتی۔ اب آگے کھائی اور پیچھے کنویں والا معاملہ تھا۔ ستارہ بیگم کے بندے سراغ لگا کر اگر اس گاؤں تک پہنچ گئے تھے تو پھر یہ کسی بھی وقت ممکن تھا کہ وہ بڑے شاہ صاحب تک اس کا پوچھتے آن پہنچتے۔

اس نے بی بی سے ان کی پوتی کا جان کر پوچھا تھا کہ کچھ تو کہیں گی۔ کسی رویے کا اظہار پر انہوں نے سرے سے ان ماں، بیٹی کو مار کر بات کو ختم ہی کردی تھی۔ اسے لگا ستارہ منزل کے در و دیوار اس کی قسمت میں لکھ دیے گئے ہیں۔ بالآخر اسے وہیں جانا ہے۔

بند گلی اور اس میں کھڑی میں
کسی سہمی ہوئی ہرنی کے مانند
جس کے دونوں جانب
شکاری تاک میں ہیں
اِک جانب ہیں ذلتیں بازار کی
دوسری طرف رشتوں کی نفرت کا زہر
معجزہ کاش مقدر کردے
ذلتوں کا رخ موڑ
میرے رشتوں کو میرا کردے

اس نے اپنے جھولا سے بیگ میں سے اپنی پیاری سہیلی (ڈائری) کو کسی متاع کی طرح باہر نکالا وہ جو اس کا ہر درد سمجھتی، سنتی بھی تھی اور اس کے سینے پر اپنا درد، اپنا ہر راز اتار کر اسے عجیب سا سکون ملتا تھا۔

''اپنی ذات کی شناخت کا حق ہر انسان کو ہے بڑے شاہ صاحب...... یہ تو طے ہے کہ میں ایک بار روبرو ہو کر اپنے نام اور حوالے کی جنگ ضرور لڑوں گی پھر

چاہے قبول کر لی جاؤں یا دھتکاری جاؤں...... میری قسمت، یہ تو طے ہے کہ ستارہ منزل میں مر کر بھی واپس نہیں جاؤں گی......ذلت کی زندگی جینے سے وہ عزت والی موت قبول کروں گی جو یہ سوچ کر مجھے خوشی دے گی کہ کیا ہوا جو میرے اپنے مجھے نسب نہ دے سکے پر کچھ تو میرے حصے کا انہوں نے بچا کر رکھا تھا چاہے موت ہی سہی۔'' کتنی ہی لایعنی اور بے معنی باتیں وہ کسی بوجھ کی طرح ڈائری پر منتقل کر کے خود کو ہلکا کرتی گئی چونکی اس وقت جب ملازمہ کھانے کی ٹرے لے کر اندر آئی اور بتایا کہ بی بی پریشان ہو رہی ہیں کہ اس نے کھانا نہیں کھایا۔ اس نے بابا صاحب کے متعلق دریافت کیا تو ملازمہ نے بتایا کہ وہ مغرب کی نماز کے بعد تشریف لے آئیں گے۔ اس نے اسے تاکید کی کہ وہ ان کے آنے کا اسے ضرور بتائے اس نے ان سے ضرور ملنا ہے۔ کھانے کے ایک دو لقمے زہر مار کرنے کے بعد اس نے کپڑے جھاڑے اور باہر آگئی۔ عصر سے ذرا پہلے کا وقت تھا۔ بی بی کے پاس گاؤں کی کچھ عورتیں جمع تھیں، وہ ایک ملازمہ کو بتا کر اوپر چھت پر آگئی۔ اپنے باپ کی اور اپنی جائے پیدائش اور وہ کسی ڈر اور خوف کے بغیر الگ ہی طریقے سے محسوس کرنا چاہتی تھی۔ منڈیر سے جھانکنے پر دور پھیلے کھیتوں کا ایک سلسلہ نظر آیا۔ وہیں پر دو کمرے بھی بنے ہوئے تھے شاید اسٹور روم کے طور پر استعمال ہوتے کہ کاٹھ کباڑ پڑا تھا اس میں اس بیکار سامان کو بغیر وجہ اٹھا کر، چھو کر محسوس کرنے لگی کہ ہو سکتا ہے کبھی ان پرانی چیزوں کو اس کے باپ نے ہاتھ لگایا ہو، اتنا ہی پرانا سامان تھا وہ...... تھوڑی دیر وہاں رکنے کے بعد وہ نیچے آئی تو بی بی ہنوز مصروف تھیں۔ باتوں، باتوں میں عائشہ ذکر کر چکی تھی کہ دوسری طرف اوپر والا پورشن کبھی اس کے چچا اور ان کے خاندان کے زیر تصرف تھا اور اب خالی تھا اور بی بی گاہے بہ گاہے اپنے بیٹے کی نشانی جان کر صاف کرائی رہتی تھیں۔ وہ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آگئی۔ سیڑھیوں کی ریلنگ کو اس نے بڑے پیار سے محسوس کیا کہ کتنی ہی بار احمد شاہ اسے تھام کر نیچے اترے ہوں گے اور وہاں پر دو کمرے تھے اور

ایک لمبی سی راہ داری اس نے پہلے کمرے کا دروازہ کھولا تو وہ بے آواز کھلتا چلا گیا نفاست اور خوب صورتی کا شاہکار کمرا...... بندے کے اچھے ذوق کی منہ بولتی تصویر تھا۔ سائیڈ ٹیبل پر احمد شاہ تصویر میں ایک مغرور مسکراہٹ کے ساتھ پورے کروفر سے براجمان تھے۔ عائشہ کے پاس وہ تصویروں میں ان کی تصویریں دیکھ چکی تھی۔ تصویر کو آہستہ سے اٹھا کر اس نے اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور اپنے دوپٹے کے پلو سے اس کی نادیدہ گرد صاف کی۔ برسوں کی باتیں تھیں جو اس نے کرنی تھیں کچھ پل کو اس نے تصور کیا کہ وہ خود اس کے سامنے ہیں اسی تصور کے زیر اثر وہ جو دل میں آیا ان سے کہتی چلی گئی ارد گرد سے بیگانہ ہو کر......

☆☆☆

اذان شاہ کو الجھن میں ڈال کر وہ خود آرام سے تھی جبکہ وہ اس کے بارے میں بہت کچھ جاننا چاہتا تھا۔ فیکٹری سے جلدی اٹھ کر وہ حویلی چلا آیا۔ بابا صاحب ڈیرے پر تھے۔ بی بی عورتوں کے درمیان گھری ہوئی تھیں۔ ملازمہ نے استفسار پر بتایا کہ عائشہ پھپو کے گھر اور مہمان بی بی چھت پر گئی ہیں۔ وہ کچھ سوچ کر مہمان خانے کی جانب آگیا۔ اسے ڈھونڈنے آنے عجیب حلیوں والے لوگوں اور خود اس کے ہراساں روتے نے اس کے تجسس کو ہوا دی تھی۔ کبھی تو غیر اخلاقی بات کہ کسی مہمان کی غیر موجودگی میں اس کی ذاتی چیزوں کی کھوج کی جائے پر اس پل اسے اپنا رد عمل وقت کا تقاضا لگا۔ اس کی متاع اس کا جھولا سا بیگ سائیڈ ٹیبل پر دھرا اسے نظر آیا۔ اسے کھولنے پر اس میں آف پڑے ایک قیمتی سیل فون کی موجودگی اسے حیران کر گئی۔ آن کرنے پر اس کی کسی سہیلی کے لاتعداد میسجز ملے جسے اس کی غیر موجودگی میں ہراساں کیا جا رہا تھا، وہ اور اس کے گھر والے بے حد پریشان تھے، ماتھے پر لاتعداد شکنیں لیے اس نے کچھ دیر ناقابل فہم نظروں سے سیل فون کو گھورا جو کم و بیش وہی کہانی سنا رہا تھا جیسی اسے ڈھونڈنے آنے والے لوگ سنا رہے تھے۔ اس نے سیل فون آف کر کے پھر بیگ میں ڈالا، بیگ میں اچھی خاصی رقم موجود تھی۔

اسٹوڈنٹ اتنی رقم ساتھ لے کر نہیں گھوما کرتے۔ ایک یونیفارم اور ایک ڈائری کے سوا کچھ ایسا نہیں تھا جس سے اس کے سوالوں کا جواب مل پاتا۔ وہ بیگ دوبارہ وہیں رکھ کر باہر آنے کو تھا جب اسے بیگ میں رکھی ڈائری کا خیال آیا اس نے دروازے سے باہر جھانک کر کسی کے بھی نہ ہونے کا یقین کیا اور ایک بار پھر واپس پلٹ کر بیگ میں سے وہ ڈائری نکالی۔ پہلے پہل اس میں بے ربط الفاظ، ٹوٹے پھوٹے خیالات جیسے خود کلامی کا سا الفاظ کا سمندر تھا پھر کچھ صفحات پلٹنے پر جو کچھ اس کی نظروں نے پڑھا اسے لگا کائنات کی گردش وہیں رک گئی ہو۔ اگرچہ وہ ڈائری مسلسل اور تاریخ بہ تاریخ نہیں تھی پر جتنا کچھ بھی اس میں درج تھا باقی کے سیاق وسباق کو واضح کر رہا تھا۔ جوں، جوں بے تابی سے ورق پر ورق پلٹتا گیا توں، توں اس کی رنگت سرخ ہو کر تمتمانے لگی تھی۔ اس کی ماں کی غلط بیانیاں، اس کے خیالات اس کی ستارہ آنٹی اور اس کی نانی نے جو کچھ اسے بتایا تھا وہ سب پھر اس کے اپنے خیالات سب کچھ روزِ روشن کی طرح عیاں تھا۔ اذان شاہ خوشی اور جوش سے ڈائری ہاتھ میں لے کر تیزی سے باہر آ گیا، بی بی باہر نہیں تھیں۔ وہ تیزی سے بابا صاحب کے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔ وہ اسی وقت نماز پڑھ کر واپس آئے تھے اور اس وقت اپنے بستر پر نیم دراز تھے۔ آج کل ویسے بھی طبیعت کی ناسازی کے باعث جلدی تھک جایا کرتے تھے۔

''بابا صاحب! اللہ نے آپ کی دعائیں سن لیں...... اللہ کا کرم ہو گیا آپ کی، ہماری سجدہ مل گئی بابا صاحب......'' وہ والہانہ پن سے ان کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔

بابا صاحب تیزی سے اٹھ بیٹھے جبکہ دروازے پر نماز سے فارغ ہو کر اندر آتی بی بی وہیں ساکت ہو گئی تھیں۔

☆☆☆

''تیرا یہ کہنا کہ اے بندے تو اک قدم بڑھا
میں دس قدم بڑھا کر
تجھے اپنی رحمتوں میں سمیٹ لوں گا
اس بات کو کسی پاک وحی کی صورت
تو نے دل میں اتارا
تب انسانوں کے وسیلے کو ڈھونڈنا چھوڑ
تیری رسی کو تھام کر میں نے
وہ سب پالیا
جو میرے حصے کا تھا بھی، نہیں بھی
جو مانگا تھا، نہیں بھی
پھر تو یوں ہے کہ
مرتے دم تک مجھ پر
شکر گزاری کے
کروڑوں سجدے واجب ہوئے''

اس نے سرشاری اور عاجزی کے انوکھے احساسات کے ساتھ اپنے جذبات اپنی پیاری ڈائری میں اتارے جو اسے .... اپنوں سے ملانے کا سبب بنی تھی۔ ایک تشکر بھری آسودہ سانس کو ہوا کے سپرد کیا۔ اس روز اپنے باپ کی تصویر سے باتیں کرتے، وہ کب سوگئی تھی پتا ہی نہیں چلا تھا، آنکھ کھلنے پر منظر تبدیل تھا۔ معجزہ ہو چکا تھا۔ اس کے بے حد پیارے اس کے ارد گرد تھے وہ حیران نظروں سے بابا صاحب اور بی بی کو دیکھتی رہ گئی جو بار، بار اسے لپٹا کر رو پڑتے۔ ستارہ بیگم نے بابا صاحب کو فون کر کے ہراساں کرنے کی کوشش کی تھی پر اس بار بابا صاحب نے اس کی بازی اسی پر الٹ دی تھی کہ آئندہ اگر اس نے انہیں فون کیا تو وہ اپنی پوتی کے اغوا کا کیس کروا کے اسے اندر کرا دیں گے اور گواہان میں پہلی گواہ ان کی اپنی پوتی سجدہ شاہ ہو گی۔

ٹھیک ایک ماہ بعد اسے سب کی رضامندی سے اذان شاہ کی دلہن بنا دیا گیا تھا کہ وہ رب کی اس کرم فرمائی پر اس کا بے حد مشکور تھا جو دلوں کے بھید جان کر خواہشات کو ایسے پوری کر دیتا ہے۔ جس کی انسان توقع ہی نہیں کر سکتا۔ بے شک وہ انسانوں سے ستر ماؤں سے بڑھ کر محبت کرتا ہے۔





# اک کہانی محبت کی

**فاطمہ حنان**

جمال سے میری پہلی ملاقات روز گارڈن کی جھیل کے کنارے نصب اس اکلوتی بینچ پر ہوئی تھی۔ گہری آنکھوں اور گھنگرالے بالوں والا جمال جھیل کنارے بیٹھا، جھیل کے ہی کسی منظر کا حصہ معلوم ہوتا تھا۔ میری حساس طبیعت نے اس اداس شخص کے دکھوں کا حصہ بننے کی خواہش کا اظہار کیا اور یوں میری

اور اس کی دوستی ہوگئی۔

وہ ایک آرٹسٹ تھا۔ رنگوں، پھولوں اور تتلیوں سے محبت کرنے والا، ان کے منظر کشید کرنے والا اور ان کے اندر چھپے دکھوں کو عیاں کرنے والا...... روز گارڈن کی جھیل اس کی بہت اچھی دوست تھی، اس جھیل سے وابستہ سارے قصے اسے زبانی یاد تھے۔ اس نے جھیل کے دکھوں کو بھی کینوس پر اتارا تھا۔ وہ بہت خوب صورت تصویریں بناتا تھا مگر اس سے بھی زیادہ وہ ایک خوب صورت انسان تھا۔ میں روزانہ تقریباً ایک گھنٹے کے لیے اس گارڈن میں آتی تھی اور جمال کے ساتھ گزارے جانے والا یہ ایک گھنٹا مجھے اپنی زندگی میں سب سے اچھا لگتا تھا۔ مجھے لگتا تھا کہ میں اپنا بہترین وقت اس کے ساتھ گزار رہی ہوں۔ اس ایک گھنٹے میں جمال میری بے رنگ زندگی میں بہت خوب صورت رنگ بھر دیتا تھا گویا میری زندگی کے کینوس پر بنی میری خالی تصویر کے اندر سارے رنگ بھرنے کا اختیار میں نے اس ایک شخص کو دے دیا تھا جو اس وقت مایوسی کے سارے رنگ میرے اندر سے نکال کر کہیں باہر پھینک دیتا تھا اور میں خوب صورت ہو جاتی تھی اور اس لمحے مجھے یہ بھی لگتا تھا کہ مجھ سے زیادہ خوب صورت لڑکی اس دنیا میں نہیں ہے۔

شہر کی ایک معروف یونیورسٹی سے ماسٹرز کیے ہوئے مجھے ایک سال ہو چکا تھا...... ماں، باپ کے آپس کے لڑائی جھگڑوں سے تنگ آکر میں نے اس چھوٹے سے شہر میں جاب کے لیے اپلائی کیا اور خوش قسمتی سے میرا اسلیکشن ایک لیکچرار کی حیثیت سے یہاں کے مقامی کالج میں ہوگیا تھا۔ کالج کی روٹین لائف سے تنگ آکر میں نے شام کے وقت روز گارڈن جانا شروع کردیا۔ یہ ایک وسیع وعریض رقبے پر پھیلا نہایت صاف ستھرا پارک تھا۔ اس پارک کی خاص بات یہاں کی جھیل تھی جو ہر آنے والے کی توجہ اپنی جانب کھینچ لیتی تھی...... مگر میری توجہ اس جھیل نے نہیں بلکہ جھیل کنارے بیٹھنے والے ایک آرٹسٹ نے کھینچ لی تھی اور میری ذات محض چند ہی ملاقاتوں کے بعد اس کی اسیر ہوگئی تھی۔

ہماری ان ملاقاتوں کو ایک مہینہ ہو چلا تھا۔ اس دوران جمال کے بارے میں مجھے بہت سی باتیں پتا چلی تھیں، مثلاً وہ اپنے ماں باپ کا اکلوتا بیٹا تھا۔ اس کی زندگی کا واحد مقصد...... ایک بہت بڑا اور مشہور آرٹسٹ بنا تھا۔ اس کے ہاتھ بہت خوب صورت تھے پر اس کی آنکھوں میں ایک عجیب طرح کی اداسی تھی جس کو کوئی نام نہیں دیا جاسکتا تھا اور بہت سی باتیں جن کی رفتہ، رفتہ میں عادی ہوتی جارہی تھی۔

اور پھر ایک دن اسی طرح اس نے مجھ سے اظہار محبت کردیا۔ جمال نے اتنی خوب صورتی سے اپنے دل کا مدعا بیان کیا کہ میں انکار نہیں کرسکی۔ روز گارڈن کی جھیل بھی اس دن مسکرا رہی تھی اور اس کی مسکراہٹ کو صرف جمال نے نہیں بلکہ میں نے بھی محسوس کیا تھا۔ اس روز ہم نے کئی عہد و پیماں کیے مگر شاید جس وقت ہم یہ عہد و پیماں کررہے تھے قدرت ہم دونوں کی بے بسی پر مسکرا رہی تھی۔

جمال کے خیالوں میں گم جب میں گھر پہنچی تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ میری ماں اور بابا دونوں میرے گھر میں موجود تھے۔ ایک عرصے کے بعد دونوں کو اکھٹے اس طرح مسکراتے دیکھ کر میری خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں رہا اور پچھلے تمام لمحات بھول کر ہم تینوں نے مل کر اکھٹے کھانا کھایا...... میری زندگی کے یہ خوب صورت لمحات بہت جلد اداسی میں بدل گئے جب انہوں نے مجھے بتایا کہ انہوں نے میرے لیے ایک ملٹی نیشنل کمپنی کے ایگزیکٹو کا رشتہ دیکھا ہے۔ میں ماما کو جمال کے بارے میں بتانا چاہتی تھی مگر ماما نے سالار کے اتنے قصیدے پڑھے کہ میرے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ اس سے ضرور ملا جائے۔ ماما نے اگلے ہی دن میری اور سالار کی ملاقات کا انتظام کروادیا۔ سالار جیسے اسمارٹ لڑکے کو کوئی لڑکی کیسے ناپسند کرسکتی تھی پھر اس کی قابلیت اور امارت نے مجھے مزید متاثر کیا تھا۔ محض

چند ہی ملاقاتوں نے میرے اس فیصلے کو مزید پختہ کر دیا اور میرے دل نے سالار کے حق میں فیصلہ دے دیا۔ میں اس دن کے بعد کبھی روز گارڈن نہیں گئی۔ میں نے اپنی زندگی کے کینوس پر جمال کی تصویر مٹا کر سالار کی تصویر بنا دی اور اس میں اپنی پسند کے رنگ بھی بھر دیے اور یوں کچھ عرصے بعد میری سالار سے شادی ہو گئی۔

شادی کے بعد ہم نے اسی شہر میں اپنا گھر بنایا...... سالار نے اب اپنا بزنس شروع کر دیا تھا اور بہت جلد ان کا شمار شہر کے معروف کاروباری حضرات میں ہونے لگا۔ میں ان کے ساتھ ایک خوشگوار زندگی گزار رہی تھی۔ ہاں کبھی، کبھی رنگوں، پھولوں اور تتلیوں کو دیکھتی تو ایک آوارہ آرٹسٹ کا خیال آ جاتا...... انہی خیالات میں گم ایک دن نہ چاہتے ہوئے بھی میں روز گارڈن کی طرف چل دی، میرے قدم بے اختیار ہی روز گارڈن کی اس جھیل کی طرف بڑھ گئے۔ جھیل کے سامنے والی بینچ خالی تھی...... وہاں پر کوئی نہیں بیٹھا تھا۔ نہ جانے کتنی دیر کھڑی میں خالی آنکھوں کے ساتھ اس بینچ کی طرف دیکھتی رہی کہ اچانک میرے کندھے پر کسی نے ہاتھ رکھا۔ میں نے بے اختیار پیچھے مڑ کر دیکھا تو ایک بوڑھا آدمی میرے عقب میں کھڑا تھا۔

"میں جمال کا باپ ہوں، جمال اب اس دنیا میں نہیں ہے۔ تمہاری شادی کی خبر سن کر اس کا ہارٹ فیل ہو گیا تھا۔" میں حیرت سے ان کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"ہاں، اخبار میں تمہاری تصویر اس نے دیکھ لی تھی۔"

اس بوڑھے آدمی کے یہ فقرے سن کر مجھے یوں لگا جیسے میرے منہ پر کسی نے زور سے تھپڑ مارا ہو۔ مجھ میں اب مزید سننے کی تاب نہیں تھی۔ میں بھاگتی ہوئی پارک سے باہر نکل گئی۔ مجھے لگا کہ اب میں کبھی مسکرا نہیں سکوں گی۔ اب روز گارڈن کی جھیل کنارے بچھی یہ بینچ صرف جمال کی نہیں بلکہ میرے دکھوں کی کہانی بھی سنائے گی۔





مکمل ناول

# حقیقت

سحر ساجد

یہ خزاں رُت کا عام سا دن تھا..... فضا میں دھند برف کی سی صورت لگ رہی تھی..... درخت ٹنڈ منڈ ننگے کھڑے تھے۔ خزاں منہ کھول کر ہڑپ کر گئی تھی ان کی ہریالی کو..... یوں لگتے تھے جیسے کوئی بڈھے بابے ہیں جو تنوں پر ہزار ہا جھریاں لیے کھڑے تھے۔ زرد، نارنجی سے سوکھے پتے جب پیروں کے نیچے آ کر... چُرچُراتے تو... صوفیہ کو عجیب سا مزہ آتا۔ اسے لگتا تھا کہ یہ موسیقی ہے۔ اداسی کا کوئی سُر ہے..... وہ دونوں ہاتھوں میں فائل پکڑے..... اسے سینے سے لگائے ان پتوں پر پیر رکھتی..... اداسی کے سُر کو محسوس کرتی ہوئی سر جھکا کر ٹھوڑی فائل پر ٹکائے چل رہی تھی۔ کچھ دیر بعد شوں کی آواز نے ماحول کی خاموشی کو توڑا..... اس کا دایاں ہاتھ فائل سے آزاد ہوا..... وہ ٹشو سے ناک رگڑتی اور پھر نرمی سے سوکھے پتوں پر پیر رکھتی ہوئی اداسی کے سُر کو سنتی چلی جاتی۔ اس کے لیے اس شغل میں ایسا مزہ تھا جیسے کسی بچے کو چاکلیٹ کھانے میں آتا ہے۔



''شوں.....'' اس نے ناک سکیڑی..... ایک دفعہ پھر سکوت ٹوٹا۔

معیز اب کی بار اس کی حرکت پر مسکرایا۔ وہ اس کے ساتھ اتنی خموشی سے چل رہا تھا جیسے پہلے وہ بھی کوئی ساکت کھڑا درخت ہو اور بس یوں ہی بے اختیار ہی اس کے ساتھ، ساتھ چلنے لگا تھا۔

اور وہ مجبور تھا اسی سست رفتار سے چلنے پر کہ جس رفتار سے صوفیہ چل رہی تھی۔ وہ تو اپنے مزے میں دُھت ہو کر چلتی تھی اور ارد گرد سے مکمل بے پروا ہو کر مگر معیز اس کے مزے کے لیے اس کے ساتھ چلتا تھا اور باوجود اپنی پوری کوشش کے وہ اس اداسی کے سُر کو سننے سے قاصر تھا۔

یہ زمیندار کالج کے ایم اے بلاک کی بیرونی روش تھی جہاں پر درخت آسمان کی بلندیوں کو چھونے کی ناکام کوشش میں مصروف نظر آتے۔ وہ دونوں اپنا topology کا پیریڈ بنک کر کے آرہے تھے۔

''صوفی پلیز.....''

اور صوفی کے پیر اس التجائیہ پکار پر یکلخت رک گئے۔ اس نے برا سا منہ بنا کر معیز کو دیکھا۔

''کردیا ناں مزہ خراب.....'' وہ بدمزہ ہو کر بولی تھی اور پھر ایک اور ''شوں.....''

''میرا خیال ہے ہم نے ٹپالوجی کا پیریڈ محض تمہارے مزے کے لیے بنک نہیں کیا۔''

''تو.....؟'' صوفی نے ناک رگڑتے ہوئے کہا۔

''ماشاءاللہ کیا تجاہلِ عارفانہ ہے جناب کا.....''

''ہی ہی ہی.....'' وہ اسے چڑانے کو کھی کھی کرنے لگی۔ اس کی بچوں جیسی ہنسی پر معیز کی آنکھوں میں مسکراہٹ چمکی مگر وہ چھپا گیا..... انتہائی صفائی سے۔

''تم نے تیمور مرزا سمجھنے ہیں کہ نہیں.....؟'' معیز نے دھمکی سے کام لینا چاہا۔

''اب کیا گن پوائنٹ پر سمجھاؤ گے۔'' اس نے خفگی سے کہتے ہوئے پیروں کو حرکت دی۔ وہ اب معمول کی رفتار سے چل رہی تھی۔

''جتنی تمہیں ٹپالوجی سے محبت ہے..... آثار تو ایسے ہی نظر آرہے ہیں..... ورنہ سمجھ لو ایک ''سپلی'' تو پکی.....'' وہ اس کے ہم قدم ہوتے ہوئے بولا۔

''فِنّے منہ تمہارا معیز.....'' وہ بری طرح سے تپی۔

''ہاہاہا.....'' معیز نے کھل کر قہقہہ لگایا۔ وہ اس کے قہقہے پر اور تپی..... اور تیز، تیز قدم اٹھاتے ہوئے جانے لگی۔

''ارے سنو اُدھر کہاں جارہی ہو..... اِدھر سے چلتے ہیں ناں..... کالج کے گیٹ سے۔'' معیز نے پیچھے سے آواز دی۔

دراصل اس کا گھر زمیندار کالج کے قریب تھا۔ کالج کے گیٹ سے نکلو تو سڑک پار کر کے یہ سامنے والی گلی میں اور پیریڈ بھی اسی لیے بنک کیا گیا تھا کہ وہ پھپھو کے گھر جا کر معیز سے تیمور مرزا سمجھے گی۔

''صوفی.....!'' معیز نے پہلی پکار بے اثر ہوتے دیکھ کر دوبارہ پکارا۔

وہ رکی..... مگر مڑی نہیں تھی۔

معیز نے تھک کر گہری سانس خارج کی..... دونوں بازو فضا میں بلند کیے اور سر کو نفی میں ہلاتے ہوئے جاگنگ کرنے کے سے انداز میں بھاگتا ہوا اس تک گیا تھا۔

''کدھر جارہی ہو؟''

''گھر.....''

''ہائیں..... اب کیا ہوا؟'' وہ حیران ہوا۔

''موڈ خراب کردیا تم نے.....'' وہ برے موڈ کے ساتھ ہی بولی تھی۔

''اور وہ تیمور مرزا.....؟'' اس نے تیوری چڑھا کر پوچھا۔

''پھر سہی.....'' صوفی نے ذرا محظوظ نظروں سے اسے دیکھا۔ پھر نظریں چراتے ہوئے بھی بولی اور اس کے ساتھ ہی ''شوں.....''

''میری attendance شارٹ ہوئی ناں تو.....!'' معیز نے آنکھیں دکھائیں۔

''کہہ تو رہی ہوں ناں اتنی طبیعت خراب ہو رہی ہے۔''

ناک رگڑتے ہوئے وہ بولی۔
''تو اتنے مزے لے، لے کر نہیں چلنا تھا ناں ٹھنڈ میں۔'' ذرا سا نرم پڑتے ہوئے اس نے کہا۔
''تم میرے ساتھ گھر چلو...... اُدھر جا کر سمجھا دینا۔'' صوفی کے لہجے میں درخواست تھی۔ ''وہاں کون جائے اتنی سردی میں...... اپنے گھر میں تو......'' معیز نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا مگر پھر وہ چپ ہی رہا۔ وہ جانتا تھا کہ صوفی کے گھر میں سلنڈر پر ہیٹر چلتے تھے...... اور اس کے اپنے گھر تو......
''چلو......'' سنجیدگی سے کہہ کر وہ اس کے ساتھ ہولیا تھا۔

☆☆☆

یہ گھر صوفیہ کے دادا کے زمانے کا بنا ہوا تھا۔ گو کہ وقت کے ساتھ، ساتھ اس میں کافی جدت لائی گئی تھی مگر اب بھی دادا کے زمانے کا بنا ہوا آتش دان ڈرائنگ روم میں موجود تھا اور جدت سے ابھی تک بچا ہوا تھا۔
اسی آتش دان میں اس وقت لکڑیوں کے بجائے ایک جدید طرز کا ہیٹر پوری آب و تاب کے ساتھ چل رہا تھا اور یقیناً سلنڈر پر ہی چل رہا تھا گیس تو آنے سے رہی...... حفاظت کے پیش نظر آتش دان کے ساتھ ہی کھڑکی کی جالی میں سوراخ کر کے پائپ اندر لایا گیا تھا...... سلنڈر کھڑکی کے باہر ہی پڑا ہوا تھا۔
اسی ہیٹر کی گرمائش کے سامنے وہ دونوں آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ معیز ٹپالوجی کے تھیورمز سمجھانے میں اور صوفی سمجھنے میں مصروف تھی۔
''بس کرو اب تم دونوں......'' حنا نے لفظ تم دونوں پر دانت کچکچائے اور پھر بولی۔
''روز پیریڈ بنک کر کے آجاتے ہو اور مت میری ماری جاتی ہے...... کبھی کافی تو کبھی چائے...... کبھی چپس تو کبھی...... شرم نہیں آتی، تم دونوں سے چھوٹی ہوں......'' اس نے ٹرے ٹیبل پر رکھی اور پھر آخری جملہ بھرائی ہوئی آواز میں کہہ کر وہ دھپ سے فلور کشن پر گرنے والے انداز میں بیٹھ گئی۔ اس کے دائیں رخ پر صوفی بھی فلور کشن پر ہی بیٹھی ہوئی تھی۔ صوفی کے سامنے ایک چوکور ٹیبل دھری تھی جس کے دوسری طرف معیز بھی فلور کشن لیے بیٹھا تھا۔ ٹیبل پر نوٹس اور کچھ بکھرے صفحات تھے۔ معیز نے بے ساختہ مسکرا کر کافی کا مگ اٹھایا اور لاتعلق سا نظر آنے لگا کیونکہ یہ ان دونوں بہنوں کی جنگ تھی۔
''یار حنا...... تم تو ایسے بی ہیو کررہی ہو جیسے ہمارے لیے دیگیں پکا، پکا کر تھک چکی ہو۔'' صوفی نے بھی اپنا مگ اٹھا کر اسے چھیڑا۔
''چائے، کافی بنانا بھی بھلا کوئی کام ہے۔'' ہونٹوں سے لگانے سے پہلے اس نے حنا کو تھوڑا اور چھیڑا۔
''تو خود اٹھ کر بنالیا کرو ناں...... مجھے آرڈر کیوں کرتی ہو؟'' حنا کو سخت تپ چڑھی۔ اس نے ابھی تک اپنا کافی کا مگ بھی نہیں اٹھایا تھا۔
''میتھ، میتھ، میتھ ہوا بنایا ہوا ہے میتھ کو...... میڈیسن اور انجینئرنگ سے زیادہ مشکل تو نہیں ہے یہ میتھ......'' وہ تو جلی بھنی بیٹھی ہوئی تھی۔
''بندر کیا جانے ادرک کا سواد......'' صوفی نے پہلے شرارتی نظروں سے معیز کو دیکھا اور پھر جملہ داغا۔ دراصل یہ اس کے آرٹس پڑھنے پر چوٹ تھی۔
''ہاہاہا......'' معیز کا قہقہہ بے ساختہ تھا۔
''معیز بھائی......'' حنا نے پوری طاقت لگا کر آنکھیں پھیلائی اور پھر حلق کے بل چلائی تھی۔ یوں جیسے کہتی ہو'' آپ بھی......'' اتنا دکھ تو صوفی کے جملے سے نہیں ہوا...... جتنا معیز کے قہقہے سے ہوا تھا۔
''آپ مجھے بندر سمجھتے ہیں۔'' اسی تپے ہوئے چہرے کے ساتھ پوچھا گیا۔
''نہیں، نہیں...... میں تو تمہیں ادرک کے سواد سے نابلد سمجھتا ہوں۔'' معیز نے گڑبڑا کر کہا۔
حنا ذرا ریلیکس نظر آئی مگر یہ صوفی...... ہی ہی ہی...... پہلے وہ اپنی مشہور زمانہ ہنسی ہنسی...... اور پھر بولی۔
''اور جو ادرک کے سواد سے نابلد ہوتا ہے اسے کیا کہتے ہیں معیز......؟'' ہونٹ دانتوں تلے دبا کر

دونوں ابرو اچکا کر بے حد شرارتی انداز میں پوچھا گیا۔

''بندر......''معیز کے منہ سے پھسلا۔

''اور......!''

''ہاہاہا......''صوفی اور معیز نے فلک شگاف قہقہہ لگایا تھا۔

''آپ دونوں بھی ناں......'' حنا نے کچا چبا جانے والے انداز میں کہا اور غصے سے واک آؤٹ کرنے لگی تھی کہ......

''کم آن حنا سیریس نہ ہوا کرو...... جسٹ چل یار......''اس نے حنا کو کلائی سے پکڑ کر کھینچتے ہوئے نیچے دوبارہ فلور کشن پر بٹھا دیا تھا۔

''چلو اپنی کافی ختم کرو۔'' اب وہ بے حد پیار سے کہہ رہا تھا۔

سر جھکا کر اس نے کافی کا مگ اٹھا کر ہونٹوں سے لگا لیا۔ معیز ایک دفعہ پھر سے صوفی کو تھیورمز سمجھانے لگا تھا۔ لیفٹ ہینڈ سے فولڈر میں لگے صفحات پر لکھ رہا تھا اور سیدھے ہاتھ سے کافی پی رہا تھا سردی تھی مگر حسبِ عادت کف فولڈ کر رکھے تھے۔ صوفی دونوں ہاتھوں سے مگ پکڑے مسلسل سر ہلا رہی تھی اور حنا نے سر اٹھا کر معیز کو دیکھا......اور پھر نظریں جھکا کر کافی پینے لگی تھی۔

☆☆☆

اتنی گہری وسیع کائنات میں،
میں ہوں اِک نقطہ ذرا سا
لیکن یہ کہ......
میں ہوں......
اور میں اپنے ہونے سے
آگاہ ہوں......

اور وہ تھا...... وہ واقعی اپنے ہونے سے آگاہ تھا۔ وہ گدڑی میں چھپا لعل تھا۔ وہ...... وہ کوئلہ تھا جسے ہیرا بننے میں سو سال لگنے تھے لیکن بننا اسے ہیرا ہی تھا...... وہ جانتا تھا ایک دن آئے گا کہ وہ اپنی زندگی کو اسی مقام پر دیکھے گا جہاں پر وہ اسے دیکھنا چاہتا ہے...... وہ جانتا تھا کہ کامیابیاں اس کی راہ تکتی ہیں، وہ منتظر ہیں اس کے قدموں کی اور اس کے قدموں کو چومنے کے لیے وہ بے تاب ہیں...... وہ جانتا تھا کہ خوش قسمتی کا تاج اس کے سر پر سجے گا اور ضرور سجے گا وہ محنت کرنے والوں کے قبیلے سے تھا۔

وہ ان پرندوں میں سے تھا جو کہ صحیح وقت پر صحیح اڑان بھرتے ہیں اور شکار کو دبوچ لیتے ہیں۔ اسے اندازہ تھا بلکہ یقین تھا کہ اس کی طاقت اس کا ذہن ہے۔ اس کی صلاحیت، ذہانت ہے اور ذہانت کے آگے سب کچھ مات ہے......

وہ تھا معیز بھٹی جو ایک عام سے اسکول ٹیچر کا بیٹا تھا۔ زمیندار کالج کے لیے اس کا نام نیا نہیں تھا۔ اس نے بی ایس سی میں دوسری پوزیشن حاصل کی تھی۔ وہ میتھ کا ماہر جانا جاتا تھا۔ میتھ اس کا رومینس تھا۔ بی ایس سی میں کلاس کے تمام طلبا نے calculus کی وہ کتاب پڑھی تھی جو کہ s.m. yousuf نے لکھی تھی مگر اس نے وہ بھی پڑھی تھی جو thomas finney نے لکھی تھی۔ اس کے لیے ٹیچرز کا دماغ الگ سے کھایا اور اپنا الگ سے خراب کیا۔ وہ واحد اسٹوڈنٹ تھا کلاس کا جس نے نہ صرف وہ کتاب نیٹ سے ڈاؤن لوڈ کی بلکہ اس کے (حسابی سوالات) sums کے solutions (حل) بھی ڈاؤن لوڈ کیے تھے۔ وہ لاہور جا کر پنجاب یونیورسٹی سے نوٹس لایا کرتا تھا۔ اور پھر اپنا اور ٹیچر کا دماغ کھپایا کرتا تھا۔ اس کا خواب پی ایچ ڈی کرنے کا تھا۔ اسے اگرچہ اپنے باپ کی طرح ہی تعلیم کے شعبے سے وابستہ ہونے کا شوق تھا لیکن فرق تھا تو یہ کہ اسے کوئی عام سا اسکول ٹیچر نہیں بننا تھا...... وہ کسی اعلیٰ یونیورسٹی کا پروفیسر بن کر ریٹائرڈ ہونا چاہتا تھا۔

اور یہ کڑی محنت کا کام تھا اور جب محنت جمع ذہانت تو قسمت کو کوئی عذر نہیں کہ وہ آکر گلے نہ ملے...... اس کا مستقبل شاندار تھا، وہ جانتا تھا کیونکہ وہ اپنے ہونے سے آگاہ تھا۔

☆☆☆

شام کی چائے کا وقت تھا..... صوفی ابھی تک اپنی جگہ پہ اسی طرح بیٹھی تھی اور اب وہ معیز کے سمجھائے ہوئے تھیورمز کو دُہرا رہی تھی۔ معیز جا چکا تھا۔ اس کا سیدھا ہاتھ مسلسل اور تیزی سے چل رہا تھا۔ جسے وہ روک کر چائے کے کپ سے ایک گھونٹ بھرتی اور پھر سے لکھنے میں مشغول ہو جاتی۔

''بابا..... کسی دن پھپو کے گھر چلیں۔'' چائے پیتے ہوئے ایک دم حنا نے باپ سے کہا جو وہیں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔

''رہنے دو..... وہاں گیس تو ہوگی نہیں..... ایسے ہی ٹھٹرتے رہیں گے وہاں جا کر.....'' صوفی نے مصروف سے انداز میں کہا تھا۔

''اب اس کا کیا مطلب..... کہ سردی میں کہیں جایا ہی نہیں جائے..... یونیورسٹی بھی ہیٹر ساتھ لے جایا کرو.....'' حنا برا مان کر بولی۔

''جانے کو دل تو بہت کرتا ہے مگر ساجدہ خاطر داری میں اتنا اہتمام کر لیتی ہے کہ بندہ خود شرمندہ ہو جائے۔ ان کے حالات کا تو تمہیں معلوم ہی ہے۔'' حنا جانتی تھی کہ اماں بالکل صحیح بات کہہ رہی ہیں۔ وہ چپ سی ہو گئی۔

''کسی بہانے سے ساجدہ کو کچھ دینا بھی چاہو تو نہیں لیتی..... بڑی ہی غیرت مند ہے اور بیٹا اس سے بھی دو ہاتھ آگے..... کبھی جو اِدھر سے کھانا کھا کر گیا ہو۔ دیکھو اب بھی کیسے چلا گیا۔'' ریحانہ قدرے ملال سے بول رہی تھیں۔

''ایک ہی گھر میں پلے بڑھے..... ایک ہی پلیٹ میں کھایا..... مگر نصیب ہے ناں لکیر کھینچ کر رکھ دی ہے اس نے بہن بھائیوں میں، وہ غریب اور ہم اللہ کا فضل ہے۔ کس کا کب زور چلا نصیبوں کے آگے..... بچہ بھی دیکھو اتنی محنت کر رہا ہے، دکھ ہوتا ہے دیکھ کر.....'' شجاع صاحب نے مغموم ہو کر کہا۔

صوفی نے نظریں اٹھا کر حنا کو دیکھا اور پھر ایک دم اس کا دل اچاٹ ہو گیا تھا۔ وہ رخ بدل کر جلتے ہیٹر کو دیکھنے لگی۔ چلتا ہاتھ رک گیا تھا۔ معیز کی سر توڑ محنت کا گواہ اس سے بڑھ کر کون تھا۔ اس کی زندگی اس طرح تھی جیسے پانی اپنی پوری طاقت سے ایک طرف کو بہتا ہو اور اسے بہاؤ کے الٹ چلنا ہو..... مکمل مزاحمت کے ساتھ..... زندگی..... زندگی نہ تھی یہ مکمل مزاحمت کا نام تھی..... حالات کے خلاف کی جانی والی سر توڑ مزاحمت..... صوفی نے اپنا دل دکھ سے بھرتے دیکھا۔

''ایسا کیوں ہوا بابا..... دادا اپنے وقت میں اٹلی گئے تھے۔ ہم خوشحال ہیں تو پھپو کیوں نہیں..... ان کی شادی بھی کسی اچھے گھر میں کی ہوتی.....'' حنا نے دل گرفتگی سے کہا۔

''دادا تو باہر گئے تھے، کمایا بھی بہت تھا مگر یہ کہ دادا سب سے بڑے تھے اور پیچھے آٹھ بہن، بھائی جب اللہ بخشے تمہارے دادا باہر گئے تھے تو اماں بہشتن بتاتی تھیں کہ میں پانچ سال کا تھا اور ساجدہ تین سال کی۔ تب وہ لوگ گاؤں میں ہی رہائش پزیر تھے۔ زمین کا ایک بڑا حصہ بیچ کر اللہ بخشے ابا جی باہر گئے تھے۔ کما، کما کر گھر بھیجتے رہے..... بہن بھائیوں کی ذمے داریاں ادا کرتے رہے..... والدان کے حیات نہیں تھے۔ سو ذمے داری کا احساس بھی خوب تھا۔ وہ محنت کر، کر کے درمیانی عمر میں ہی بوڑھے ہو گئے تھے اور پیچھے والے دیسی گھی میں پکوڑے تل، تل کر کھاتے رہے اور ذمے داریوں کی گردان سناتے رہے۔ اماں بہشتن کو سب نظر آتا تھا مگر مجبور تھیں۔ پھر دس سال بعد اللہ بخشے ابا جی واپس گھر آئے تو دیکھا باقی سب بہن بھائی تو خوشحال بھی ہیں اور سیٹل بھی اور اگر کوئی خوشحال نہیں تھا تو ان کے اپنے بیوی، بچے..... حقیقت نے آنکھیں کھولیں تو احساس پوری شدت سے جاگا۔ پھر تو اللہ بخشے ابا جی نے اپنے گھر والوں کی مخالفت کے باوجود ہمیں ہماری ننھیال میں یہاں گجرات چھوڑا اور خود پھر سے واپس چلے گئے لیکن اماں بہشتن کو سختی سے تاکید کر کے گئے کہ اب ساجدہ کی شادی کرنی ہے اور جلدی کرنی ہے۔ وہ الگ سے خرچ بھجوائیں گے ابھی پندرہ سال کی بھی

نہیں ہوئی تھی کہ اماں نے اس کی شادی اپنے چچا کے بیٹے سے کر دی جو خاندان کا واحد پڑھا لکھا فرد تھا۔ اور وہ اکیلا مرد تھا جو ملازمت کرتا تھا سرکاری اسکول ٹیچر تھا۔ بعد میں ابا جی نے مجھے اٹلی بلالیا اور خود واپس آگئے۔ تو بس حالات وہیں سے بدلنا شروع ہوئے جب میں باہر چلا گیا تھا۔ معیز دو ماہ کا تھا جب ابا جی فوت ہوئے..... وہ جیسے اپنا نواسا دیکھنے کو ہی زندہ تھے بس.....'' شجاع بھٹی نے اِک آہ بھر کر بات ختم کی تھی۔

''بابا پھر تو اس گھر میں پھپو کا بھی حصہ ہوا ناں.....'' صوفی یک دم بولی تھی۔

انہوں نے آہستگی سے نفی میں سر ہلایا۔

''اللہ بخشے ابا جی اپنی زندگی میں ہی حصے کے برابر رقم ساجدہ کو دے گئے تھے۔ اس رقم سے ہی تو ساجدہ نے ابھی والا مکان خریدا ہے جس میں وہ لوگ رہتے ہیں۔'' صوفی نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا مگر یک دم اذانوں کی آواز بلند ہوگئی تھی۔ اس نے ہونٹ بھینچ کر شانوں پر پھیلے دوپٹے کا ایک پلو سر پر ڈال لیا۔

☆☆☆

آج اس کا دل یک دم یونیورسٹی سے چھٹی کرنے کو چاہا مگر آج سر عنایت کا لیکچر تھا جو وہ مس کرنا افورڈ نہیں کر سکتی تھی۔

سارے لیکچرز میں سے ایک سر عنایت کی ہی تو سمجھ آتی تھی اسے اسی بنا پر groups اس کا فیورٹ سبجیکٹ تھا۔

''کیا مصیبت ہے یار..... صرف ایک لیکچر کے لیے اتنی سردی میں یونیورسٹی جاؤ۔'' بے ساختہ جھنجلا کر وہ واش روم کی طرف بڑھی۔

گھٹنوں تک آتی براؤن رنگ کی قمیص کے اوپر اس نے اونی سوئٹر پہنا..... پھر فروالا کالے رنگ کا کوٹ چڑھایا۔ سر پر ٹوپی پہنی اور اس اونی ٹوپی کے اوپر اس نے کالے رنگ کا اسٹول لپیٹ لیا تھا کہ ٹوپی چھپ گئی تھی پیروں پہ دو، دو موزے چڑھانے کے بعد جاگرز پہنے اور آخر میں پھر بلیک کلر کے گلوز کی باری آئی تھی۔ اور اب وہ بھالو، بھالو سی دکھ رہی تھی۔ اسی دوران باہر سے گاڑی کا ہارن سنائی دیا تو اس نے جلدی، جلدی اپنا بیگ اور فولڈر اٹھایا اس طرح کی سردی میں کمرے سے باہر نکلنا ایسا ہی تھا جیسا کہ محاذِ جنگ پر جانا ہو..... اور صوفی کی تیاری کو دیکھ کر لگتا تھا کہ تعیناتی سیاچن پر ہوئی ہے اور آج ہی ہوئی ہے۔

صحن میں نکلنے کے بعد اس نے چند لمحے کھلے آسمان کے نیچے کھڑے ہو کر دیکھا کہ بھلا سردی لگتی ہے یا نہیں اور بالفرض سردی لگے تو مزید کچھ پہنا جا سکتا ہے یا نہیں.....

''کمبخت ابھی نہیں لگ رہی اور یونیورسٹی میں جاتے ہی بچھڑی سہیلی کی طرح آگلے ملتی ہے۔'' یقیناً سردی کو ہی کوسا گیا تھا۔

''پاں..... پاں.....'' زوردار ہارن کی آواز تھی۔

''آئی بابا.....'' وہ پہلے چلائی اور پھر باہر کو بھاگی۔ بابا پہلے ہی گاڑی گیٹ سے باہر نکال کر اس کا انتظار کر رہے تھے۔

☆☆☆

مصروفیت کی وجہ سے آج بابا اسے بیرونی گیٹ پر ہی اتار گئے تھے ورنہ تو اندر داخلی پوائنٹ تک چھوڑ کر آتے تھے۔ وہ فائل کو سینے سے لگائے، دونوں ہاتھ بغلوں میں دابے درمیانی رفتار..... سے چل رہی تھی۔ سامنے ہی اسکول کی عمارت تھی جہاں پر اس وقت ہو کا عالم تھا۔ اسکول جلدی اسٹارٹ ہوتا تھا جبکہ یونیورسٹی کی ٹائمنگ سیٹ تھی۔ اس کے دائیں رخ پر روش سے ذرا نیچے کھیل کا میدان تھا۔ جہاں پہ اتنی دھند کے باوجود کالج کے لڑکے کھیل رہے تھے۔

اس نے ایک اچٹتی سی نظر ان پر ڈالی اور پھر سر جھکا کر چلنے لگی۔ جیسے ہی وہ مڑ کر ایم، اے بلاک والی روش کی طرف چلنے لگی تو اسے سامنے سے معیز آتا دکھائی دیا تھا۔ وہ چند منٹ کے فاصلے پر تھا۔ وہ اسے آتا دیکھ کر رک گئی۔

وہ بھی اسی کی طرح فولڈر کو سینے سے لگائے اپنا سر گرائے دونوں ہاتھ بغلوں میں دبائے چلا

آ رہا تھا۔

''السلام علیکم......'' اسے دیکھتے ہی معیز نے سلام کیا تھا۔

''وعلیکم السلام......''

''آج بڑی ٹھنڈ ہے یار......'' وہ رکے بنا بولا۔ صوفی بھی اب ساتھ، ساتھ چل رہی تھی۔ معیز نے بغلوں میں سے ہاتھ نکالے فولڈر کو بغل میں دبایا اور دونوں ہاتھوں کو آپس میں رگڑ کر منہ کی گرم بھاپ سے گرمانے کی کوشش کرنے لگا۔ صوفی نے گردن موڑ کر اسے دیکھا۔

''ٹیوشن پڑھا کر آئے ہو؟''

''نہیں، آج نہیں گیا۔''

''کیوں......؟''

''امی کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔''

''کیا......؟ کیا ہوا پھپھو کو......؟'' صوفی کے قدم یکلخت رکے تھے۔

معیز کو بھی رکنا پڑا۔

''ٹھنڈ لگ گئی ...... جس کی وجہ سے رات میں وامٹنگ ہوتی رہی۔''

''اور تم چھوڑ کر آگئے۔'' اس نے افسوس کے سے انداز میں کہا۔ ایسا افسوس کا انداز جس سے اگلے بندے کو شرمندگی دلائی گئی ہو۔

''سر عنایت کا لیکچر......'' معیز نے مجبوری بیان کی۔

اور صوفی ٹھنڈ میں کچھ اور ٹھنڈی پڑی تھی۔ ایک گہری سانس بھر کر پھر سے چلنے لگی۔

''تو پھر تم ناشتا تو نہیں کر کے آئے ہو گے؟'' اس نے پوچھا۔

''نہیں، چائے رسک کھا کر آیا ہوں۔'' معیز بولا۔

صوفی نے اس جواب پر سر جھٹکا تھا۔ بڑا اعلیٰ ناشتا تھا۔

''اب کیسی ہیں پھپھو......؟''

''بس ٹھیک ہی ہیں۔'' یہ ہی باتیں کرتے ہوئے وہ مطلوبہ بلاک تک پہنچ گئے تھے۔

☆☆☆

ڈیپارٹمنٹ میں داخل ہوتے ہی وہ دونوں میں کون اور تو کون کی تفسیر ہو جایا کرتے تھے۔ اب بھی یہی ہوا تھا۔ صوفی اور وہ آگے پیچھے کلاس میں داخل ہوئے تھے۔

دروازے سے داخل ہوتے ہی لڑکوں کے لیے مخصوص کرسیوں کی لائن تھی درمیان میں گزرنے کا راستہ اور دوسری طرف لڑکیوں کے لیے کرسیوں کی لائن...... معیز تو داخل ہوتے ہی پہلی کرسی پر جا بیٹھا تھا۔ صوفی بھی خوشی سے لڑکیوں والی لائن میں چلی گئی تھی۔

ابھی لیکچر شروع ہونے میں کچھ وقت تھا۔ سر ابھی تک نہیں آئے تھے۔ لڑکوں کی فلک شگاف آوازیں اور لڑکیوں کی بھنبھناہٹ کلاس میں پھیلی ہوئی تھی۔

صوفی نے جگہ سنبھالنے کے بعد فائل کو کرسی کے ہتھے پر رکھا۔ بیگ کندھے سے اتار کر گود میں رکھا اور اس میں سے سیل فون نکال کر معیز کو میسج کرنے لگی تھی۔

''سر عنایت کا لیکچر ختم ہوتے ہی اٹھ جانا۔''

معیز نے سوالیہ نشان بھیجا۔ جواباً غصے والی اسمائل گئی تھی اور آگے سے جواب آیا۔ او کے...... ایک عدد اسمائل کے ساتھ۔

☆☆☆

''معیز...... دو قسم کی سبزی لے لو...... میں سالن بنا کر رکھ جاؤں گی۔'' لیکچر ختم ہوتے ہی وہ دونوں باہر نکل آئے تھے اور اب صوفی پھپھو کا پتا کرنے جا رہی تھی۔

''سبزیاں تو لے لوں...... مگر بناؤ گی کس پر...... گیس تو ہو گی نہیں......'' فولڈر بغل میں دبا کر وہ والٹ نکالنے لگا تھا کہ اچانک رک کر بولا۔

''اسی پر بناؤں گی جس پر پھپھو بناتی ہیں۔'' وہ کچھ تنک کر بولی تھی۔

''یو مین لکڑیاں......؟'' وہ بیک پاکٹ سے والٹ نکالتے نکالتے اسے رک کر دیکھنے لگا۔

جواباً وہ اسے گھوری ڈال کر آگے بڑھ گئی تھی۔

''تم چلو...... میں سبزی لے کر آتا ہوں۔'' پیچھے

سے آواز دے کر معیز نے کہا تھا۔

پھر صوفی تو کالج گیٹ سے نکل کر سڑک کراس کر کے سامنے گلی میں چلی گئی تھی جبکہ معیز سبزی والے کو دیکھنے لگا تھا۔

☆☆☆

''پھپھو کی طبیعت خراب ہے، میں ان کے پاس جا رہی ہوں آپ لوگ بھی آجائیں۔'' میسج پڑھتے ہی حنا یک دم پریشان ہوگئی تھی۔

''امی..... صوفی کا میسج آیا ہے کہ پھپھو ٹھیک نہیں ہیں۔'' حنا کچن میں سے بولتی ہوئی نکلی تھی۔

''یا اللہ خیر..... کیا زیادہ طبیعت خراب ہے؟''

''اب یہ تو جا کر ہی معلوم ہوگا۔'' حنا نے لاعلمی سے کندھے اچکائے۔

''اپنے ابو کو فون کرو اور کہو کہ گاڑی بھیج دیں۔ اتنے میں تم بھی تیاری کرلو۔'' وہ اٹھتے ہوئے بولی تھیں۔

☆☆☆

یہ ایک چار منزلہ مکان تھا جس میں داخل ہوتے ہی صحن تھا۔ صحن عبور کرکے برآمدہ اور برآمدے کے پار بنے دو کمرے..... ایک طرف چھوٹا سا کچن بنا ہوا تھا جو امریکن اسٹائل کا نہیں تھا۔ پھپھو چوکی پر بیٹھ کر کھانا پکاتی تھیں۔

صوفی کو ایک تو بیٹھ کر پکانے میں مشکل پیش آرہی تھی اور دوسرا بڑا مسئلہ لکڑیاں..... پھپھو کے پاس لکڑیوں پر کھانا بنانے والا لوہے کا چولہا تھا جس نے آج کل گیس والے چولھے کی جگہ سنبھالی ہوئی تھی۔

معیز اور وہ دونوں ہی اپنی پوری کوشش کر چکے تھے..... لکڑیاں سلگتیں، دھواں چھوڑتیں..... صوفی کی آنکھوں کو پانی سے بھرتیں لیکن آگ نہیں بھڑک رہی تھی۔

''اللہ..... پھپھو کیسے جلالیتی ہیں؟'' صوفی نے شوں کرتے ہوئے ہاتھ کی پشت سے گالوں پر بہنے والا پانی صاف کیا..... اور ایک دفعہ پھر سے جھک کر سلگتی لکڑیوں کو پھونک مارنے لگی تھی۔

وہ اب صاف زچ نظر آرہی تھی۔

''چھوڑو رہنے دو، میں باہر سے لے آتا ہوں کچھ.....''

اس کی اس بات پر صوفی نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا مگر معیز دھندلا سا گیا تھا۔

اس نے آنکھیں میچ کر سارا پانی آنکھوں سے باہر نکالا پھر ہاتھوں کی پشت سے گالوں کو صاف کیا۔ معیز کی شکل اب واضح ہوگئی تھی۔

''تم دیکھنا میں آگ بھڑکا کر ہی چھوڑوں گی۔'' اک عزم سے دانت پیس کر کہتے ہوئے وہ پھر سے پھونک مارنے کو جھکی۔

جبکہ معیز..... وہ اس جملے کا جواب دینا چاہتا تھا..... بھرپور طریقے سے دینا چاہتا تھا مگر..... ہا..... یہ مصلحتیں۔

اس نے سر جھکا کر اپنی شدید مسکراہٹ چھپائی۔

اسی دوران یک دم ڈوربیل گونجی تھی۔

''امی آگئیں۔'' صوفی پرجوش ہوکر اٹھی تھی۔

جوش اس لیے کہ اب امی آگ جلائیں گی اور وہ ہی کھانا بنائیں گی۔ اس سے تو یہ کام ہونے سے رہا۔

''تم نے ان لوگوں کو ڈسٹرب کیا؟'' معیز ازحد شاک سے بولا تھا۔

صوفی نے ہاتھ کے اشارے سے اس کی بات اڑائی تھی اور باہر دروازہ کھولنے کو بھاگی تھی۔

☆☆☆

وہ ایک پرانی طرز کا نواڑی پلنگ تھا جس پر پھپھو تکیے کے سہارے لحاف اوڑھے نیم دراز تھیں۔ اب حالت کافی سنبھل چکی تھی۔ بخار تھا مگر شدت کم تھی۔

کمرے کا دروازہ شدید سردی کی بنا پر بند تھا۔ صوفی پھپھو کے پیروں کی طرف لحاف میں دبکی ہوئی تھی۔ البتہ ریحانہ اور حنا کرسیوں پر ہی بیٹھی ہوئی تھیں۔ ابا اور ظفر پھوپا دوسرے کمرے میں موجود تھے۔ ریحانہ نے آکر نہ صرف کھانا بنایا تھا بلکہ اب انہی کی بدولت وہ اس ٹھنڈ میں چائے کی عیاشی بھی اڑا رہے تھے۔

معیز نے پاؤں کی ٹھوکر سے دروازہ کھولا کیونکہ اس کے دونوں ہاتھوں میں دہکتے ہوئے کوئلوں کی انگیٹھی تھی جو اس نے لا کر کمرے کے وسط میں رکھی تھی۔

وہ صوفی تھی جو سب سے پہلے چھلانگ مار کر بستر

سے نکلی تھی اس سے پہلے احتیاطاً خالی کپ سر کے عین اوپر بنی شیلف پر رکھا تھا۔

ویسی ہی شیلف یا کارنیس جو پرانے زمانے میں کمروں میں ضرور بنایا جاتا تھا۔

''جیتے رہو معیز......'' گٹھڑی بن کر انگیٹھی کے پاس بیٹھتے ہوئے وہ بولی تھی۔

معیز ہنس پڑا اور اس کے سامنے اکڑوں بیٹھ کر ہاتھ تاپنے لگا۔ صوفی کی آنکھوں میں ابھی تک پانی آرہا تھا۔

''ابھی کیسے جلیں... یہ لکڑیاں......؟'' اس نے پوچھا۔

''ابا نے جلا کر دی ہیں۔'' اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''صبح یونیورسٹی آؤ گی؟''

''نہیں......'' اس نے ٹشو سے ناک رگڑتے ہوئے نفی میں سر ہلایا۔ ''بہت سردی ہے۔'' اور پھر بھیگی آنکھیں صاف کی تھیں۔ فلو زور پکڑ رہا تھا۔

''یہ دہکتے ہوئے کتنے خوب صورت لگ رہے ہیں ناں......''

اس نے اچانک معیز سے کہا تھا۔

وہ جو ہاتھ گرم کر کے اٹھ رہا تھا اس کی اس بات پر ٹھہر گیا۔

''نری پاگل ہو تم...... اللہ جانے کیسی، کیسی چیزوں میں خوب صورتی تلاش کر کے لے آتی ہو...... اداسی کا سُر...... دہکتے انگارے...... خوب صورت ...... بے وقوف......'' وہ بولتے، بولتے اٹھ کر اماں کی پائنتی کی طرف جا بیٹھا تھا۔

اماں کے پاؤں دبانے کی خاطر وہ اپنے ٹھنڈے ...... ہاتھ گرم کر رہا تھا۔

صوفی نے رخ بدل کر اسے منہ چڑایا تھا۔

وہ سر جھٹک کر مسکرایا تھا بولا۔

''مامی، آپ کی بڑی والی بیٹی پاگل ہے۔'' اس نے اب امی کے پیروں کو اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے ریحانہ کو مخاطب کیا تھا جو کہ اس کی امی سے باتیں کر رہی تھیں۔

''کوئی نئی اطلاع دو بیٹا...... یہ تو خبر پرانی ہو چکی۔'' ریحانہ نے شگفتگی سے جواب دیا۔

''امم...... بی بی......'' صوفی نے بے حد برا مانا۔

ریحانہ اور معیز کھل کر ہنسے تھے...... جبکہ حنا...... کتنی شعوری کوشش کی تھی اس نے کہ وہ معیز کی طرف نہ دیکھے...... تب بھی جب وہ دونوں آمنے سامنے بیٹھ کر بول رہے تھے اور اب بھی جبکہ وہ عین اس کے سامنے آکر بیٹھا تھا مگر یہ کہ محبت میں شعوری کوشش کا کیا کام...... محبت کو لاشعوری کام ہی جچتے ہیں۔

جیسے ابھی ابھی ہوا تھا...... اس نے بے ساختہ چائے کے کپ پر مرکوز آنکھیں اٹھا کر اسے دیکھا اور پھر فوراً نظریں چائے پر جمی گہرے براؤن رنگ کی تہ پر جما دی تھیں۔

جس راہ نہیں جانا...... اس کے کوس گننے کا بھلا کیا فائدہ...... چھوڑو...... دفع کرو...... مٹی ڈالو...... کیا فائدہ ہاں...... بھلا کیا فائدہ......

☆☆☆

صبح تک صوفی کا فلو زور پکڑ چکا تھا اس لیے وہ ابھی تک سوئی ہوئی تھی۔ کچھ رات کو پھپھو کے گھر سے واپسی بھی کافی دیر سے ہوئی تھی۔

امی نے صبح حنا اور اپنی کام والی بوا کو ابا کے ساتھ پھپھو کے گھر بھیج دیا تھا۔ انہوں نے پھپھو کے گھر کی ابتر حالت کل دیکھ لی تھی سو ان کی مدد کی غرض سے انہیں بھیج دیا تھا۔

آج سورج زمین والوں کو منہ دکھانے پر راضی ہو ہی گیا تھا گو کہ اس کی شعاعیں اب بھی دھندلی سی تھیں۔ مگر درجۂ حرارت میں نمایاں بہتری آگئی تھی۔

حنا نے آکر سارا گھر صاف کروایا تھا۔ بوا نے کھانا پکانے میں بھی مدد کی تھی۔ اور اب حنا چائے کا کپ پکڑے پھپھو سے باتیں کرنے میں مصروف تھی۔

مغرب سے کچھ دیر پہلے ہی معیز آیا۔ بیرونی دروازہ کھلنے اور پھر بند ہونے سے اس نے جانا تھا...... آنے والا وہ ہی تھا کیونکہ پھوپا تو اپنے کمرے میں ہی تھے جنہیں وہ ابھی ابھی چائے دے کر آئی تھی۔

لاشعوری طور پر کپ پہ اس کی گرفت سخت ہوئی تھی۔ جیسے، جیسے قدموں کی چاپ دروازے کے قریب سے قریب تر ہو رہی تھی ویسے، ویسے اس کا دل دھڑ دھڑ کر رہا تھا۔

دروازہ کھلا...... ''السلام علیکم......''معیز کے اندر قدم رکھنے سے پہلے اس کی آواز آئی اور پھر وہ بھی آگیا۔ وہ ٹیوشن پڑھا کر آرہا تھا۔

حنا نے زیر لب سلام کا جواب دیا مگر مڑ کر نہ دیکھا...... وہ اس کے بائیں رخ پر موجود تھا۔

''اوئے تم......''معیز کو خوشگوار حیرت ہوئی۔ اس نے مڑ کر معیز کو دیکھا اور ایک خیر سگالی مسکراہٹ اچھالی اور پھر فوراً رخ بدل کر سر جھکا لیا۔

''تم کب آئیں؟''

وہ اماں سے سر پہ پیار لینے کی خاطر اس سے چند فٹ کے فاصلے پر آکر جھکا اور پھر سیدھا ہوتے ہوئے بولا۔

''صبح سے آئی ہوئی ہے بچی......'' اس کے بجائے پھپھو نے تفصیلات بتائیں۔

''کھانا؟'' اس نے ہموار لہجے میں پوچھا۔

اور یہ ہموار لہجہ کتنی دقتوں سے ہموار ہوا تھا...... یہ حنا کا اللہ ہی جانتا تھا۔

معیز نے سر کے اشارے سے ہاں میں جواب دیا تھا۔

وہ اپنے جوگرز اتارنے میں مصروف تھا اور وہ تیز، تیز قدموں سے چلتی باہر نکل آئی۔

باہر آکر اس نے گہری سانس لی...... حلق سے کچھ نیچے اتارا اور کچن کی طرف مڑ گئی۔

لیکن کچن میں جانے سے پہلے ایک اور کام کیا تھا...... بابا کو کال کرنے کا۔

''بابا...... آکے مجھے لیں جائیں۔''اس نے اپنی آواز کو دھیما رکھا تھا مگر اسے اپنا لہجہ بھیگا، بھیگا سا لگا۔

محبت کے مندر جات میں دکھ سب سے پہلے درج ہوتا ہے۔ بچ کر رہنا...... اس سے کہ یہ سب سے پہلے دکھ کے مفہوم سے ہی آگاہی بخشتی ہے۔

☆☆☆

دن اس تیزی سے گزر رہے تھے گویا چوبیس نہیں چار گھنٹے ہوں ابھی کل کی ہی تو بات تھی کہ اس کا پارٹ ون کا رزلٹ آؤٹ ہوا تھا۔ اسے کسی اور چیز کا ڈر نہیں تھا بس ٹپالوجی کی فکر تھی۔ کہیں ٹپالوجی اسے شرمندہ نہ کروادے۔

یا پھر کہیں پورے رزلٹ کو ہی خراب نہ کر دے مگر یہ کہ وہ پاس ہوگئی تھی وہ بھی ستر فیصد اسکور کے ساتھ اور آج پارٹ ٹو کا بھی رزلٹ آؤٹ ہو چکا تھا۔

اس کی ہائی فرسٹ ڈویژن تھی جبکہ معیز...... میتھس اس کا رومینس تھا ناں تو یہ رومینس کے ساتھ ناانصافی ہوتی اگر وہ ٹاپ نہ کرتا۔

اسی خوشی میں پھپھو اور پھوپا مٹھائی لے کر ان کے گھر آئے ہوئے تھے۔

گرمی کے دن تھے اور وہ سب چار پائیاں چھت پر ڈالے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ موسم خوشگوار تھا۔ تھوڑی دیر پہلے ہی آندھی چلی تھی سو اب ہوا فراٹے بھرتی چل رہی تھی۔

آمنے سامنے بچھی چار پائیوں کے درمیان رکھی میز پر چائے مع لوازمات کے موجود تھی۔ صوفی سب کو چائے سرو کر رہی تھی۔

اس نے چائے کا کپ لاکر معیز کو دیا جو کہ منڈیر پہ چڑھ کر بیٹھ ہوا تھا۔ پھر وہ واپس مڑی اور اب سموسے، بسکٹ، گلاب جامن سے بھری پلیٹ اور اپنے لیے چائے کا کپ بھی ہاتھ میں تھا۔ پلیٹ لاکر اس نے معیز کے پاس منڈیر پر ہی رکھی تھی۔

''حنا...... تم بھی ادھر آجاؤ......''اس نے آواز دے کر حنا کو بھی بلایا۔

''آتی ہوں......'' مصروف سے انداز میں جواب آیا مگر درحقیقت ٹالا گیا تھا۔

''اب کیا کروگے؟''اس نے پلیٹ اس کی طرف بڑھائی کہ چائے کے ساتھ کچھ وائے بھی کھائے۔

''ظاہر ہے کہیں جاب کے لیے اپلائی کروں گا۔ hec اسکالرشپ آنے والا ہے۔ ایم فل کے لیے

اس کے لیے بھی اپلائی کروں گا۔''

''حنا...... ! کیا کر رہی ہو یار...... اِدھر آجاؤ۔''

صوفی نے پھر سے آواز دی۔

اب کی بار حنا نے ہاتھ کے اشارے سے جواب دیا مگر آئی نہیں...... پھوپا گاؤں کا کوئی واقعہ سنا رہے تھے اور حنا کی دلچسپی تھی کہ ختم ہی نہیں ہو رہی تھی۔

''کل کے نیوز پیپر میں PCS کی لیکچرر شپ کی ویکینسز آئی تھیں۔تم نے نہیں دیکھیں؟''

''نہیں......''

''میں تو اپلائے کرنے لگا ہوں...... کیا تم کرو گی؟''

''توبہ کرو...... میں نے ابھی کچھ دن ایم ایس سی کی تھکن اتارنی ہے...... انجوائے کرنا ہے...... دو سالوں کے سارے رسالے پڑھنے ہیں اور سارے ڈرامے دیکھنے ہیں۔''

وہ اپنے پلان سے اسے آگاہ کر رہی تھی اور وہ مسکرا کر اس کے پلانز سن رہا تھا۔

''شادی نہیں کرنی؟''معیز نے اچانک پوچھا۔

اور صوفی کا پہلا تاثر حیرت کا تھا۔ وہ رک کر اسے دیکھنے لگی۔ حیرت بنتی بھی تھی۔ معیز اور اس کے درمیان ایسی کبھی کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ اشاروں سے بھی نہیں اور نگاہوں سے بھی نہیں...... اور دوسرا تاثر...... اس کا چہرہ بری طرح سے سرخ پڑا۔

''بکومت......''وہ اس سے نظریں پھیر کر سر جھکا کر کھڑی ہو گئی تھی۔

''ہاہاہا......''معیز اپنے قہقہے کا گلا گھونٹ کر ہنسا۔

صوفی نے اسے گھورتے ہوئے اس کا خالی چائے کا کپ اٹھایا اور میز پر رکھنے چلی گئی۔

یکا یک پھوپا کے قصے میں اسے اتنی دلچسپی محسوس ہوئی کہ وہ وہیں حنا کے پاس بیٹھ کر انہیں سننے لگی۔

معیز نے سر جھٹکا اور پاس رکھی پلیٹ میں موجود ایک گلاب جامن کو چمچ سے آدھا کیا اور پھر ایک حصہ اٹھا کر منہ میں ڈالا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ جب صوفی دیکھے گی تو دوسرا حصہ اٹھا لے گی۔ اس سے پہلے بھی وہ یہ ہی کر چکی تھی۔ سموسہ بھی دونوں نے مل کر آدھا، آدھا کھایا تھا۔

☆☆☆

''شادی نہیں کرنی۔''

اور اس نے زور سے آنکھیں بند کر کے معیز کی آنکھوں کے تاثر کو جھٹکنا چاہا تھا مگر اس کی آنکھوں کی شوخیاں...... وہ صوفی کو کھائے جا رہی تھیں۔ وہ منڈیر سے لگ کر کھڑی تھی...... مگر منظر اب بدل چکا۔ وہ لوگ واپس جا چکے تھے۔ چار پائیاں بھی اٹھا دی گئی تھیں۔ حنا خالی برتن نیچے لے جا چکی تھی اور جب وہ منڈیر پر رکھی پلیٹ اٹھانے آئی تو......

''یہ رہنے دو......'' صوفی نے منع کر دیا تھا۔ پلیٹ میں ابھی تک آدھا گلاب جامن جوں کا توں پڑا تھا۔ صوفی اٹھانے کی ہمت ہی نہیں کر پائی تھی۔ معیز اگرچہ اس کا بچپن کا دوست تھا اور کزن تھا پرائمری تک وہ دونوں ساتھ، ساتھ پڑھے تھے اور اب یونیورسٹی میں پھر سے اکٹھے ہو گئے تھے۔ ایسا کبھی نہیں ہوا تھا جیسا آج ہوا...... اس کی آنکھوں کا تاثر...... وہ بھونچکا رہ گئی تھی۔ اس نے کبھی ایسے...... اس طرح سے اس حوالے سے معیز کے لیے نہیں سوچا تھا۔ وہ دوست تھا، بے تکلفی تھی...... مگر محبت...... یہ نہیں تھی۔ معیز اسے بہت عزیز تھا وہ اسے کامیاب دیکھنا چاہتی تھی مگر اس کے ساتھ زندگی گزارنا...... یہ نہیں ہو سکتا تھا۔

جیسے ہی معیز کی جاب لگتی تھی پھوپو نے ان کے گھر آجانا تھا۔ وہ جان گئی تھی اور بہت ہی اچھی طرح سے جان گئی تھی۔ اسی لیے تو معیز کی نظروں کی شوخیاں اسے کھائے جا رہی تھیں۔

لیکن پھر یوں ہوا کہ معاملات صوفی کے حق میں ہوتے چلے گئے تھے۔

☆☆☆

''یہ کیا ہے صوفی......؟''وہ بے طرح سے الجھا ہوا تھا۔

''کیا ہے معیز......؟''وہ حد سے بڑھ کر انجان بنی۔

''تم نے بلال کے پروپوزل کے لیے ہاں کہہ

دی؟'' وہ رکا۔ ''کیا تم انجان تھیں...... کیا تم جانتی نہیں تھیں؟ چلو ٹھیک ہے مان لیا کہ تم نہیں جانتی تھیں تو میں اب تمہیں......''

''میں جانتی نہیں تھی مگر پھر جان گئی تھی معیز......'' اس نے یک دم اس کی بات کاٹی تھی۔

''پھر بھی......؟'' وہ ترنت بولا۔

''ہاں پھر بھی......'' صوفیہ نے اب وقفہ دے کر کہا تھا۔

وہ اسے دیکھتے ہوئے نفی میں سر ہلاتا رہا۔

''دنیا کا بلکہ اس پوری دنیا کا کوئی دوسرا شخص کوئی بھی دوسرا شخص معیز نہیں ہو سکتا...... کسی بھی دوسرے شخص کے پاس معیز جیسا دل نہیں ہو سکتا...... معیز جیسی نظر نہیں ہو سکتی...... وہ نظر کہ جس سے وہ صوفی کو دیکھتا ہے۔ لفظ محبت کم ہے۔ لفظ پیار جھوٹا ہے۔''

''میں سمجھ سکتی ہوں مگر......''

''تو پھر تم کیسے بلال کو فوقیت دے سکتی ہو مجھ پر...... کیوں، کیسے......؟'' صوفی نے بے اختیار اپنی کنپٹی مسلی تھی۔

''معیز ضروری تو نہیں جو جذبہ تمہارے دل میں ہے وہ ہی جذبہ ویسی ہی شدت کے ساتھ میرے دل میں بھی موجود ہو؟''

''اچھا ٹھیک ہے...... نہیں تو نہ سہی مگر ہم اچھی زندگی پھر بھی گزار ہی لیں گے...... بلکہ اس الو کے...... کے ساتھ جیسی گزارو گی ناں اس سے کہیں اچھی گزار لیں گے۔''

''نہیں......'' صوفی نے آہستگی سے سر جھکا کر نفی میں سر ہلایا۔

اور معیز اتنا خاموش ہوا کہ ساکت لگتا تھا...... جیسے بے جان...... بے حس و حرکت......

''تم بلال کو پسند کرتی ہو؟'' اس نے اپنا سب سے پہلا خدشہ سب سے آخر میں بیان کیا۔

''نہیں......'' صوفی نے اب طنزیہ مسکراہٹ سے کہا تھا۔

''تو...... تو پھر......؟'' وہ ایسا معما...... ایسا حساس سوال بن کر کھڑی تھی جس کے سلجھاؤ کا کوئی سرا نہ ملتا ہو...... جو کسی طریقے سے حل نہ ہوتا ہو...... کسی طرح سے سمجھ نہ آتا ہو۔

مکمل طور پر undefined ہو جیسے...... اس نے سوال کیا تھا...... جواب دینا تھا مگر وہ چپ کھڑی تھی۔

''میری مرضی کافی نہیں معیز......'' پھر کافی دیر بعد وہ نرمی سے بولی۔

''او کم آن صوفی...... یہ مت کہو کہ تمہاری مرضی میرے ساتھ نہیں......'' اس کی بات اڑا دی گئی یوں چٹکیوں میں۔

''کیوں......؟ یہ تمہارے ساتھ ہی کیوں ہو سکتی ہے؟'' صوفی چڑی اور چڑ کر پوچھا۔

''ہم بچپن سے ساتھ رہے ہیں صوفی......'' وہ حیران ہوا......

اور صوفی خاموش ہو گئی تھی...... تھک سی گئی تھی۔

''صوفی اب بھی اگر تم نے مجھے کوئی سولڈ ریزن نہیں بتایا تو میں تمہیں تھپڑ دے ماروں گا۔'' وہ اس کی خموشی سے چڑا۔

اور اس کے لہجے سے لگتا تھا کہ ہاں...... آج وہ ایسا ہی کرے گا اور ضرور کرے گا۔ صوفی نے شاکڈ ہو کر اسے دیکھا۔

''مجھے مجبور مت کرو کہ تمہیں دکھی کروں۔ مان جاؤ...... اور چلے جاؤ...... جو ہو رہا ہے ہونے دو۔ سمجھ لو کہ وہی میری مرضی ہے۔ کوئی بہت ہی اچھی لڑکی......''

''شٹ اپ......'' اور وہ بری طرح سے دہاڑا۔

صوفی نے بے ساختہ آنکھیں بند کر کے اس لرزش کو اپنے اندر روکا جو اس دہاڑ سے اس کے اندر اٹھی تھی۔ اس نے گہری سانس بھر کر خود کو پُرسکون کرنا چاہا۔

معیز کا چہرہ دیکھا...... اور خود کو وہ بات کہنے کے لیے تیار کیا اور...... اور پھر معیز نے دنیا کی تلخ ترین بات سنی...... زندگی کا بدترین جھٹکا کھایا۔ سچی مگر زہر

جیسی کڑوی اور تلخ حقیقت کا سامنا کیا تھا۔

''کیا یہ سب کہنے والی صوفی ہوگی؟ کیا یہ سب صوفی نے کہا تھا؟ کیا واقعی..... ہیں..... واقعی ہی میں؟''

☆☆☆

سخت گرمی تھی اتنی کہ نہا، نہا کر بھی کچھ نہیں بنتا تھا۔ جس کروٹ لیٹو وہ ہی پسینے میں شرابور..... ایسے میں اگر بجلی بھی بند ہو تو..... وہ تنگ آ کر اٹھی..... ایک نظر وحشت سوئے معیز پر ڈالی۔

''یا اللہ..... یہ کیسے سو رہا ہے۔'' اسے واقعی شدید حیرت ہوئی تھی۔ کمرے سے باہر نکل کر برآمدے میں چلی آئی۔ یہ تو طے تھا جب تک لائٹ نہیں آئی..... نیند بھی نہیں آنی..... وہ برآمدے میں رکھی کرسی پر دونوں پاؤں اوپر کر کے بیٹھ گئی۔ پورے چاند کی رات تھی۔ چاندنی سارے صحن میں کھل کر پھیلی ہوئی تھی۔ وہ ضرور اس چاندنی کو انجوائے کرتی اگر مچھر نہ ہوتے تو.....

''سی.....'' مچھروں نے با جماعت ہو کر اس کے پیروں پر حملہ کیا تھا اور اس نے سی کر کے ہاتھ میں پکڑا پنکھا اپنے پیروں پر دے مارا۔ اور تو کوئی طریقہ علاج اس وقت میسر نہیں تھا۔ وہ چند لمحے ہاتھ سے پنکھا جھلتی..... جہاں پہ مچھر اٹیک کرتے ہاتھ روک کر وہیں یہ پنکھا دے مارتی اور پھر سے پنکھا جھلنے لگتی..... اس مشق سے ایک بازو تھک جاتا تو دوسرے ہاتھ میں پکڑ لیتی۔ لائٹ کو گئے گھنٹا ہو گیا تھا۔

''اللہ.....'' اس نے زچ ہو کر ایک دفعہ پھر سے پنکھا پیروں پر دے مارا۔

پسینے سے شرابور..... نیند سے چور آنکھیں..... دکھتا سر اور اوپر سے گرمی..... مچھروں کی بھن بھن اسے خواہ مخواہ میں ہی رونا آیا اور پھر ساتھ میں اپنا اے سی والا کمرا بھی یاد آیا۔

معیز کی نیند بھی شدید گرمی سے ٹوٹی تھی۔ وہ بیڈ پر نہیں تھی..... اسے حیرت تھی کہ کہاں گئی؟ جب تھوڑی دیر بعد بھی وہ نہ آئی تو وہ خود اٹھا اور اٹھ کر باہر آ گیا۔

وہ برآمدے میں پڑی کرسی پر جھول رہی تھی۔ ساتھ ساتھ پنکھے والا ہاتھ بھی چل رہا تھا۔ نیند کی شدت سے ہاتھ رک کر ڈھلکتا اور ڈھلک کر نیچے گرنے لگتا تو وہ فوراً الرٹ ہو کر پھر سے جھلنے لگتی..... معیز کی نیند بھک سے اڑی۔

''زیادہ گرمی لگ رہی ہے؟'' ساتھ والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے وہ بولا۔ اور وہ چونکی کم ڈری زیادہ.....

''اُف..... بندہ بتا کر تو آتا ہے..... جان ہی نکال دی۔'' وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر بولی۔

معیز نے نرمی سے اسے دیکھا، اسے اس پر ترس آیا اور وہ اب مشترکہ طور پر خود کو اور معیز کو پنکھا جھل رہی تھی۔

''لاؤ میں جھلتا ہوں۔'' معیز نے اس کے ہاتھ سے پنکھا لیا۔

''رہنے دیں.....'' اس نے احتجاج کیا مگر معیز نے سنی ان سنی کر دی۔

وہ اب اسے اور خود کو پنکھا جھل رہا تھا۔ چند لمحوں بعد معیز نے اسے اپنے کندھے سے سر ٹکاتے دیکھا اور اس کے تھوڑی دیر بعد وہ وہیں پر سو گئی تھی۔ اس کی سانس کی ہموار رفتار بتا رہی تھی کہ وہ سو چکی ہے۔ معیز نے ایک گہری سانس بھری اور جسم کو ذرا سی بھی حرکت دینے سے روکا۔ وہ کب سے بے آرام تھی، وہ نہیں جانتا تھا۔ کچھ دیر کے لیے ہی سہی..... وہ یوں ہی آرام کر لیتی تو اچھا تھا۔ وہ اب بھی اسے پنکھا جھل رہا تھا لیکن وہ صرف پنکھا ہی نہیں جھل رہا تھا۔

سامنے پھیلی چاندنی میں دیکھتے ہوئے اس کا ذہن بہت کچھ سوچنے کے قابل ہو چکا تھا۔

ایک حقیقت ابھی ابھی اس پر کھلی تھی اور کیا ہی برے طریقے سے کھلی تھی۔

☆☆☆

''میرا بہت دل تھا صوفی کے لیے..... معیز اور اس کی بنتی بھی بہت ہے مگر جو اللہ کو منظور..... اللہ اس کے نصیب اچھے کرے بس..... معیز کی پچیس، تیس ہزار کی بھی نوکری لگتی ناں تو میں بھابی سے مانگ لیتی صوفی کو..... چلو جو اللہ کرے..... جیسے اس کی

مرضی.....'' اماں کی آواز کمرے سے باہر آرہی تھی اور آواز افسوس کے شدید تاثر میں ڈوبی ہوئی تھی۔

معیز بے دھیانی میں ان کے کمرے کے سامنے صوفی کا نام سن کر رکا تھا۔ اور یہ نام..... جب سے صوفی کی بات سن کر آیا تھا یہ نام جیسے ہر طرف، ہر طرف تھا..... ذہن میں تکرار کی صورت تو دیواروں پر حرف کی شکل میں موجود تھا..... وہ دیکھ سکتا تھا چہار جانب یہی ایک نام لکھے ہوئے۔ صوفی، صوفی، صوفی۔

وہ سن سکتا تھا اسی ایک نام کی بازگشت..... صوفی..... صوفی..... ذہن سے لے کر دل کی دھڑکن تک..... ہر طرف ہر جانب..... پر صوفی نے تو کیا کہہ ڈالا تھا۔ تو صوفی ایسے سوچتی تھی.....؟ پر صوفی ایسے کیسے؟ تو وہ سب کچھ خود ہی فرض کیے بیٹھا تھا..... اور حیرانی اتنی شدید تھی کہ دکھ کو ڈھانپ چکی تھی اور جب یہ نام اس نے اماں کے کمرے کے سامنے سنا تو رک گیا۔ بے اختیار اس نے اپنی کنپٹی کو مسلا۔

اماں ایک دم کمرے سے باہر نکلیں اسے یوں کنپٹی مسلتے ہوئے دیکھ کر چونکی تھیں۔

''کیا ہوا معیز.....؟ سر میں درد ہے کیا؟'' انہوں نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا جس سے وہ کنپٹی مسل رہا تھا۔ معیز کے ہاتھ کی حرکت فوراً رکی۔

''اماں آپ کب باہر آئیں؟'' اس نے حیرانی سے پیچھے کھلے دروازے کو دیکھا۔

''معیز.....؟'' وہ چونکا۔

''جی، سر میں درد ہے..... ایک کپ چائے تو بنا دیں۔'' ناہموار لہجہ..... پریشان چہرہ..... وہ کہہ کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔

اماں نے پہلے کبھی معیز کو سر درد سے اتنا بے حال ہوتے نہیں دیکھا تھا۔ وہ فکر مند ہوئیں..... کاش کہ وہ سر درد ہی ہوتا..... کاش کہ.....

☆☆☆

''میں تو سمجھا تھا کہ تم انکار کردو گی۔''

''کیوں.....؟''

''معیز کی وجہ سے..... بہت اچھی دوستی ہے تم دونوں کی۔''

''میری آپ سے بھی بہت اچھی دوستی ہوتی اگر آپ میرے ساتھ پڑھے ہوتے، میرے ساتھ بچپن میں کھیلے ہوتے.....'' وہ اس کے ترنت جواب دینے پر مسکرایا۔ وہ چھت کو جانے والی سیڑھیوں پر چائے کا کپ لیے بیٹھی تھی جبکہ وہ گرل کے پاس اپنا کپ پکڑے کھڑا تھا۔

''یعنی کہ میں گھاٹے میں رہا.....'' ایک گھونٹ بھر کر اس کے دوپٹے سے ڈھکے سر کو دیکھ کر اس نے کہا۔ صوفی نے مسکراہٹ روکنے کے لیے ہونٹوں پر زبان پھیری اور سر اٹھا کر سامنے دیکھتے ہوئے کندھے اچکائے تھے۔ جیسے کہتی ہو مجھے کیا معلوم..... وہ اب دونوں ہاتھوں میں کپ تھامے چائے کے گھونٹ بھر رہی تھی۔

اس انداز پہ بلال کی مسکراہٹ اور گہری ہوئی۔

''بہت سے لوگوں کے دل ٹوٹے ہوں گے تمہاری اور میری منگنی سے۔''

وہ صاف اسے چھیڑ رہا تھا۔ صوفی کے کئی امیدوار تھے خاندان بھر میں..... سبھی اس کے اخلاق کے متاثرین میں سے تھے۔ البتہ بلال سے رسمی سی بات چیت ہوتی تھی..... اور وجہ وہ شہر سے باہر زیر تعلیم رہا تھا۔

وہ یک دم اٹھی۔ کپڑے جھاڑ کر درست کیے۔ بلال کے ہاتھ سے خالی کپ لینے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو اس نے کچھ حیران ہوتے ہوئے کپ دیا۔

اسی لمحے صوفی نے اچانک بلال کی آنکھوں میں دیکھا۔

''شکر کریں کہ آپ کا دل ٹوٹنے سے بچ گیا۔'' اور پھر مزے سے کہہ کر وہ بڑے آرام سے وہاں سے ہٹ گئی تھی۔

وہ حیران ہوا اور پھر ہنس دیا۔

ایسا صوفیہ شجاع ہی کہہ سکتی تھی۔ اسے اس کا یہی انداز تو بھایا تھا۔ پورے خاندان کی واحد لڑکی..... جس نے نہ صرف ایم ایس سی کیا بلکہ کو ایجوکیشن میں رہ کر کیا۔ پورے خاندان میں صرف وہ تھی جس نے اسٹینڈ

لیا تھا۔ جبکہ باقی ساری لڑکیوں کو ایف اے یا زیادہ سے زیادہ بی اے سے آگے ... پڑھنے کی اجازت نہ تھی۔ کجا کہ وہ کو ایجوکیشن جوائن کرتیں وہ یوں کہ صوفی نے ارادہ کیا اور ڈٹ گئی...... اور جب آپ ڈٹ جائیں...... کوشش کرنے پر مصر رہیں تو قدرت بھی ایک، ایک کر کے سارے راستوں کے بند دروا کر دیتی ہے اور صوفیہ شجاع کے لیے بھلا کون بنا راستہ...... ہاں معیز...... معیز بھٹی......

☆☆☆

وہ گجرات کا ایک راجپوت بھٹی گھرانا تھا جس کی پچھلی نسل کے تقریباً سارے مرد باہر کے ممالک میں جا کر روزی کما رہے تھے۔ تعلیم کی اتنی اہمیت نہ تھی اس خاندان میں...... اس زمانے میں صرف ظفر (صوفی کے پھوپا) واحد پڑھے لکھے مرد تھے لیکن جیسے، جیسے پیسہ آتا گیا۔ چند فیملیز شہر میں شفٹ ہوتی گئیں اور شہر میں آ کر بچوں کو اچھے اسکولز میں ایڈمیشن لے کر دیتے رہے۔ انہی گھرانوں میں ایک صوفی کے ماموں کا گھرانا بھی تھا۔ بلال پانچ بہن بھائی تھے اور پانچوں کے پانچوں تعلیمی میدان میں ایک سے بڑھ کر ایک ثابت ہوئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کمپیوٹر سائنس کا بہت چرچا تھا۔ بلال اپنا mcs کرنے کے لیے لاہور ہاسٹل میں رہائش پزیر تھا۔ اس نے میٹرک کے بعد ساری تعلیم لاہور ہی سے حاصل کی تھی۔ انہی دنوں اڑتی، اڑتی خبر اس تک پہنچی تھی کہ اس کی پھپو کی بڑی بیٹی (صوفی) نے کو ایجوکیشن میں پڑھنے کی ضد کی ہے گو کہ وہ خود ایک ایسے ہی مخلوط ادارے میں تعلیم حاصل کر رہا تھا مگر وہ اپنے خاندان کی لڑکیوں کے لیے یہ بات ہرگز، ہرگز پسند نہیں کرتا، یہ خبر سن کر اسے برا لگا۔ صوفی سے اس کی اتنی بات چیت نہیں تھی لیکن بلال کے بہن بھائیوں سے صوفی کی بہت اچھی سلام دعا تھی اور آنا جانا بھی ظاہر ہے ہوتا ہی رہتا تھا۔ اسے صوفی کچھ اکھڑ مزاج اور روڈ سی محسوس ہوئی۔ جب پتا تھا کہ ان کے خاندان میں اکثر بے جوڑ شادیاں ہوتی ہیں مگر ہوتی بھی خاندان میں ہی ہیں تو اتنی اعلیٰ تعلیم کا مقصد......؟ کل کو پھر مسئلہ کھڑا ہوگا کہ جی اب پڑھے لکھے مرد سے شادی کرنی ہے...... اسے یہ بات بہت دور تک جاتی دکھائی دے رہی تھی۔ پورے خاندان کے چند گھرانے شہر میں آباد تھے باقی تو سب آج بھی کٹیالہ میں ہی سکونت اختیار کیے ہوئے تھے۔ اسی طرح تعلیم بھی صرف چند انہی شہری گھرانوں میں ہی محدود تھی۔ کل کلاں کو کھپنا اس نے خاندان میں ہی تھا تو ایسے میں؟ اور ان کا خاندان ایک سخت روایت پسند خاندان تھا۔ جس میں شادیاں اپنوں میں ہی کی جاتی تھیں۔ وہ خاندان کسی (بھول بھلیاں) maze کی طرح تھا...... سرنگ در سرنگ مگر آپس میں جڑے ہوئے۔

''خیر...... میری بلا سے؟'' تب بلال نے یہ سوچ کر اپنی جان چھڑائی تھی مگر نہیں جانتا تھا کہ یہ بلا اسی کے حصے میں آئی تھی اور اس کی اپنی مرضی سے ہی آئی تھی۔

☆☆☆

آج بلال سے بڑی بہن کی منگنی تھی ساری کزنز جمع تھیں۔ وہ کچن میں پانی پینے آیا تھا جبکہ صوفی ٹرے اٹھائے کچن میں داخل ہوئی تھی۔ تب وہ تھرڈ ائیر میں تھی اور نیا، نیا شوشا چھوڑا تھا ایم ایس سی کرنے کا...... عمر کے لحاظ سے وہ معیز اور صوفی سے بڑا تھا مگر پھر بھی یہ ایج ڈیفرنس باقی کزنز کے مقابلے میں کم ترین سطح پر تھا۔ باقی سب صوفی سے اتنے بڑے تھے کہ صوفی کسی کو باجی اور کسی کو بھابی کہہ کر بلاتی تھی۔ معیز تو خیر منتوں مرادوں کے بعد ملنے والا بچہ تھا جبکہ (صوفی کے ابا) شجاع کی شادی دیر سے ہوئی تھی...... انہیں اسٹیبلش ہونے میں کافی وقت لگا تھا۔

ایسی سلام دعا تو بلال کی صوفی سے کبھی، کبھی ہوتی ہی رہتی تھی مگر آج اس نے اس سلام دعا میں بطور خاص صوفی کو غور سے ملاحظہ کیا تھا۔

اور پھر اس شام...... اس شام ہونے والی گفتگو......

☆☆☆

یہ اسی خراب دماغی حالت کا نتیجہ تھا کہ وہ pcs

کا امتحان کلیئر نہیں کر پایا تھا۔

''میں...... میں معیز بھٹی...... میں...... میں pcs کا ایگزام......'' اسے لگا کہ اس کا پوزیشن ہولڈر ہونا ایک گالی تھا...... ایک طعنہ تھا...... منہ پر الٹے ہاتھ سے پڑنے والا طمانچہ تھا۔

یہ اس کی زندگی کی دوسری بڑی بے یقین صورت حال تھی جس کا وہ شکار ہوا تھا...... کہنے کی بات نہیں تھی وہ اچھی طرح سے جانتا تھا کہ وہ اپنے ماں، باپ کے لیے کیا تھا...... وہ ان کے لیے پارس تھا ایسا پارس جو غریبی کو چھوتا تو وہ امیری بن جاتی...... بدحالی کی طرف نظر کرتا تو وہ خوشحالی میں بدل جاتی...... اور اس نے اس نے کیا کیا......

کیا محبت اس قابل تھی کہ اس کے لیے وہ اپنے گھر والوں کو برباد کر دیتا؟

ٹھیک ہے اس کا وجود محبت کھا جاتی لیکن اس سے جڑے رشتے...... وہ کسی طرح سے کسی طور سے بھی اس بات کے مستحق نہیں تھے کہ وہ اس کی محبت سے متاثر ہوتے۔ وہ ہرگز، ہرگز بھی مستحق نہ تھے۔ اور پھر اس نے وہ راز پا لیا کہ جسے توازن کہتے ہیں۔ اس نے اپنے دل کو محبت کے لیے کھلا چھوڑ دیا مگر ذہن کو متاثر نہ ہونے دیا۔

کوئی حق حاصل نہیں تھا محبت کو کہ وہ اسے اس طرح سے ناکارہ کر دیتی کہ اس کے ماں، باپ کو زک پہنچتی۔

☆☆☆

اس کے سونے جاگنے کے اوقات لائٹ سے مشروط ہو چکے تھے۔ رات کی نیند بھی دن میں پوری کرنے کی کوشش کرتی مگر ناکام ہوتی۔

اسے معلوم تھا کہ ایک گھنٹے بعد بجلی نے چلے جانا ہے تو وہ سونے کے لیے لیٹ گئی تھی۔ گہری نیند میں تھی کہ کسی نامانوس سے شور سے آنکھ کھلی تھی۔ وہ چند لمحے آوازوں سے صورت حال کا اندازہ لگانے کی کوشش کرتی رہی، آوازیں کچھ شور سا بننے لگی تھی۔ وہ جلدی سے دوپٹا اوڑھ کر پیروں میں چپل اڑس کر باہر آئی تو......

''با...... '' اپنی انگلیاں کھلے منہ پر رکھ کر اس نے بے یقینی سے معیز کو دیکھا...... پھپھو اور پھوپا کو دیکھا...... وہ بہت خوش نظر آ رہے تھے۔

اور پھر معیز نے اسے اپنی طرف آتا دیکھا تھا۔ انتہائی بے یقینی سے اس نے جنریٹر کی سطح پر ہاتھ پھیرا تھا۔

''تم نے بتایا نہیں......'' اس نے چمکتی آنکھوں سے پوچھا۔

''سرپرائز......'' معیز نے مسکرا کر کندھے اچکائے۔

''پیسے کہاں سے آئے؟'' وہ اب اس کے پاس کھڑی پوچھ رہی تھی۔

''انسٹالمنٹ پہ لیا ہے۔'' معیز اب جنریٹر کو گھسیٹ کر صحن کے ایک طرف رکھ رہا تھا۔

اس نے بے ساختہ آسمان کو دیکھ کر شکر کی سانس بھری۔ یہ کسی نعمت سے کم ہرگز نہیں تھا...... گجرات میں گرمی...... گرمی نہیں آگ برستی ہے اور ایسے میں لوڈشیڈنگ......

''اوہ میرے اللہ...... شکر ہے تیرا...... لاکھ، لاکھ شکر ہے۔'' بار، بار وہ زیر لب یہ جملہ دہراتی رہی۔

وہ اس ماحول میں رہنے کی عادی نہیں تھی اور عادی بنتے، بنتے...... مشکلات سے لڑتے، لڑتے اس کے بال سفید ہو جانے تھے۔ ہڈیاں گھس جاتیں اور کھنچا ہوا ماس ڈھلک جاتا تھا۔

''اوہ میرے اللہ...... شکر ہے...... شکر ہے مولا...... احسان ہے تیرا۔'' جتنا شکر کرتی کم تھا۔ وہ جانتی تھی۔

☆☆☆

وہ 12 بائی 12 کا ایک کمرا تھا۔ دروازے سے اندر داخل ہوتے ہی سامنے والی دیوار کے ساتھ ڈبل بیڈ تھا۔ ساتھ میں سائڈ ٹیبل...... ایک طرف ڈریسنگ اور بیڈ کے دوسری طرف ایک الماری اور لیس جی...... کمرا پُر ہو گیا تھا...... ایسے میں معیز نے بڑی مشکل سے گھسیٹ گھساٹ کر اپنی کمپیوٹر ٹیبل کمرے میں فٹ کر لی تھی۔ عین الماری کے ساتھ اور اسی کمپیوٹر ٹیبل کے آگے بیٹھا وہ بار، بار گردن موڑ کر کھڑکی سے باہر اسے

چھوٹے تخت پر نماز پڑھتا دیکھ رہا تھا۔
آج نماز معمول سے زیادہ ہی لمبی ہوگئی تھی۔ پورا گھر جنریٹر کی عنایت کردہ بجلی کی وجہ سے جگمگا رہا تھا۔ اس نے سارے گھر کی لائٹیں جلائی ہوئی تھیں کہ جنریٹر کی بجلی مفت کی بجلی لگتی تھی...... اور پھر یہ بجلی سردیوں میں تو ہوتی نہیں تھی کہ گیس ہوگی تو جنریٹر چلے گا ناں......
معیز نے سر جھٹک کر پھر سے کمپیوٹر پر نظریں جمائیں...... اسی دوران وہ چہرے کے گرد سے دوپٹا کھولتی ہوئی کمرے میں آئی تھی۔
''کتنا اچھا لگ رہا ہے ناں معیز......'' بیڈ پر اس کی طرف آ کر بیٹھتے ہوئے وہ بچوں کے سے اشتیاق سے بولی تھی۔
معیز نے مڑ کر اسے دیکھا...... چند لمحے اس کی چمکتی آنکھوں کو دیکھتا رہا......
''ہوں......'' اور پھر رخ واپس موڑ لیا۔
''نماز آج لمبی نہیں ہوگئی تمہاری؟''
''ہاں...... شکرانے کے نفل پڑھ رہی تھی۔'' سادگی سے کہہ کر وہ دونوں ٹانگیں اوپر کر کے بیڈ پر بیٹھ گئی۔
''اور ابھی تو اور لمبی ہونی ہے۔''
''اچھا...... وہ کیسے......؟'' وہ اپنے کام میں مصروف بولا تھا۔
''جب اے سی آئے گا...... جب گاڑی آئے گی، جب ہم اس گھر کو رینوویٹ کروائیں گے۔ جب امریکن اسٹائل میں کچن بنوائیں گے۔ تو ہر ایک چیز کے لیے نفل پڑھا کروں گی ناں......''
وہ ایک کے بعد ایک خواہش گنواتی چلی گئی تھی۔ وہ کوئی طعنہ تھا نہ طنز...... بس اپنی خواہشات کا اظہار تھا اور معیز......
اس کا ماؤس پر چلتا ہاتھ رکا...... نظریں کمپیوٹر اسکرین پر ساکت ہو کر رہ گئیں۔
وہ ان سب سہولیات کی عادی تھی...... وہ ان سہولیات میں پل کر بڑی ہوئی تھی۔ نصیب نے اس کی شادی معیز سے کرا تو دی اور وہ ایڈجسٹ بھی ہو ہی گئی تھی مگر پھر بھی...... ساری عمر وہ ان سہولیات کو حاصل کرنے کی خواہش میں مبتلا رہے گی۔ اپنے دل کو مارتی رہے گی۔
گن، گن کر پیسے بچایا کرے گی تاکہ وہ مختلف انسٹالمنٹ پر لی ہوئی چیزوں کی قسطیں ادا کر سکیں۔
''اچھا کھا نہیں سکے گی، اچھا پہن نہیں سکے گی۔''
معیز نے دفعتاً آنکھیں بند کر کے اپنے حلق سے کچھ نیچے اتارا تھا۔
''کیا یہ ناانصافی نہیں تھی؟''
کیا یہ اس کا حق نہیں تھا کہ وہ اپنے لیے اپنے برابر کا جوڑ دیکھتی؟
''زندگی میں مادی چیزوں کی اہمیت ہوتی ہے اور اگر نہیں ہوتی تو وہ مادی رویہ ہوتا ہے۔'' اس نے کبھی معیز سے کچھ نہیں مانگا تھا۔ جیسے حالات تھے جتنی مالی استطاعت تھی وہ اسی میں ایڈجسٹ کرنے کی کوشش کرتی تھی...... کبھی طعنہ نہیں دیا تھا۔
یہ تھا اس کا غیر مادی رویہ...... مگر ضرورتیں...... وہ تو مادی چیزوں سے ہی پوری ہوتی ہیں۔
پیٹ کا تین وقت کا کھانا محبت نہیں بھرتی۔ معیز کو آج وہ خلیج جتنا فرق بڑا واضح ہو کر نظر آیا تھا...... وہ ہی فرق جو کچھ عرصے پہلے تک اسے نظر ہی نہیں آتا تھا اور یہ اتنا بڑا فرق تھا کہ منہ کھولے اس کو نگل جانے کو...... بے تاب تھا۔
مامی نے بڑی اچھی تربیت کی تھی دونوں بیٹیوں کی...... وہ دونوں کھانا بنانے اور گھر سنبھالنے میں طاق تھیں مگر یہ کہ ہمیشہ سے گھر کی صفائی ستھرائی کا کام ہمیشہ سے ان کے ہاں کام والیاں کرتی تھیں ان دونوں نے تو کبھی جھاڑو تک نہیں پکڑا تھا مگر کام والی سے بڑے اچھے طریقے سے گھر صاف کروا لیا کرتی تھیں اور یہاں آ کر...... شادی کے بعد معیز نے خود اسے بنا کسی حجت کے...... بنا کسی عذر کے گھر کی صفائی کرتے دیکھا تھا۔
اسے یک دم احساس ہوا تھا کہ وہ کہاں......

کہاں اور کیسے، کیسے کمپرومائز کیے ہوئے تھی۔
ساری عمر...... ساری عمر وہ ویسی ہی زندگی حاصل کرنے کی تگ و دو میں مصروف رہے گی جیسی کہ وہ اپنے باپ کے گھر گزار کر آئی تھی اور پتا نہیں کہاں...... کہاں صبر کرے گی اور کیسے، کیسے جبر کرے گی۔ کیا یہ زیادتی نہیں تھی؟

''کیا ایک امیر گھر کی لڑکی کو حق نہیں ہے کہ وہ اپنے لیے اپنے جیسا ہی مالدار جوڑ حاصل کرسکے؟''

اور یہ ہی پہلے معمولی سا نظر آنے والا فرق بعد میں خلیج جتنا بڑا اور گہرا ہو کر لو میرجز میں سے لو کو کھا جاتا ہے اور انجام طلاق کی یا مسلسل ازدواجی چپقلشوں کی صورت میں نکلتا ہے۔

معاشرہ گواہ ہے ایسا ہی ہوتا ہے ناں......

☆☆☆

مغیرہ باجی کی منگنی کی تقریب ختم ہوئی تو سب لڑکیوں نے اِدھر ہی بلال کے گھر ڈیرا ڈال لیا تھا...... آج اتنے عرصے بعد سب اکٹھے ہوئے تھے رت جگے کا پروگرام بن چکا تھا۔ صوفی سب کے لیے چائے بنا کر لائی تھی۔
''آپ کو نہیں لگتا کہ آپ کا کو ایجوکیشن میں پڑھنے کا فیصلہ غلط ہے؟'' وہ اپنا چائے کا کپ لے کر بیٹھی ہی تھی کہ اس نے بلال کو کہتے سنا...... وہ بری طرح سے چونکی...... حاضرین نے بھی گردن گھما کر بلال کو دیکھا۔
''نہیں......'' بڑے اعتماد سے جواب آیا تھا۔
''آپ اپنی پوزیشن خراب کر رہی ہیں۔''
''وہ کیسے......؟''
''آپ اچھی طرح سے جانتی ہیں...... اپنی روایات کو بھی اور اپنے خاندان کو بھی......''
''تو......؟'' وہ جیسے اسے زچ کرنے کے موڈ میں تھی۔
''اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا فائدہ جبکہ یہ بھی پتا ہو کہ کسی نے جاب تو کرنے دینی نہیں......'' وہ چبھتے ہوئے لہجے میں بولا۔
''اور بس......''
صوفی اطمینان سے مسکرائی یوں جیسے وہ اسے اسی پوائنٹ تک لانا چاہتی ہو۔
''آپ کے لیے تعلیم جاب حاصل کرنے کا ذریعہ ہوگی...... جبکہ میں ایسا نہیں سوچتی......''
اس نے بلال کی ٹھنڈی سی بے عزتی کی۔
''میرے لیے تعلیم شعور کا نام ہے...... میں گھر بیٹھ کر رشتے کا انتظار نہیں کرسکتی...... خاندانی سیاستوں پر سیر حاصل بحث نہیں کرسکتی...... فضول قسم کی لڑائیوں کا حصہ نہیں بن سکتی ...... کسی نے کیا پہنا...... کیوں پہنا...... کیسا پہنا یا یہ کہ کیا لیا نہیں لیا...... آئی ایم سوری...... مجھے یہ سب نہیں کرنا۔ زندگی بڑی اہم شے ہے...... میں اسے سمجھنا چاہتی ہوں اور سمجھنے کے لیے شعور کا ہونا بہت ضروری ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ میں سیکھوں کہ جب کوئی میرے ساتھ برے طریقے سے پیش آئے تو میں اس کے ساتھ اچھا رویہ رکھ سکوں...... چلو اچھا نہ سہی کم از کم خاموش رہنا ہی سیکھ لوں...... یہ سب وسعت القلبی سے آتا ہے مگر قلب کو وسیع ہونا کون سکھاتا ہے بلال بھائی...... یہ ذہن ہی ہوتا ہے۔ کیا جاننے والے اور نہ جاننے والے برابر ہیں؟''
وہ کچھ دیر رکی تو بلال حیرت سے اسے دیکھتا رہا۔ وہ اس سے اتنے تفصیلی جواب کی توقع نہیں کر رہا تھا۔
''اور کیا...... جاننے کی کوئی حد ہے۔'' وہ پھر شروع ہوگئی تھی۔ ''میرے لیے تعلیم جاننے کا ایک ذریعہ ہے...... جاب حاصل کرنے کا نہیں...... میں نے میتھ کو بھی اسی لیے چنا کہ یہ ہمیں سمجھنا سکھاتا ہے۔ رٹا لگانا نہیں...... سوال سمجھے بنا حل نہیں ہوتے اور سوال سمجھنے کا ایک طریقہ ہوتا ہے...... اسٹیپ بائے اسٹیپ سوال کو کھولا جاتا ہے، حل کی طرف لے جایا جاتا ہے اور پھر آخری اسٹیپ پر سوال حل ہو جاتا ہے۔ ایک منطقی دلیل کے ساتھ...... ایک ایسی منطقی دلیل کہ جس کو

کوئی چیلنج نہیں کر سکتا...... زندگی کے مسائل بھی سمجھ سے حاصل ہوتے ہیں اور میں وہ سمجھ سیکھ لینا چاہتی ہوں۔ آپ کو لگتا ہے کہ یہ گھر بیٹھے ہو سکتا ہے؟''

''اور آپ کو لگتا ہے کہ ہمارے تعلیمی ادارے شعور سکھا رہے ہیں؟'' بلال نے ترنت کہا تھا۔

''نہیں، وہ ڈگری لینا سکھا رہے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ اسکور کیسے کیا جائے یہ سکھا رہے ہیں...... مگر پھر بھی ان سب چیزوں کے مابین کہیں نہ کہیں تعلیم ڈیلیور ہو ہی رہی ہوتی ہے اور وہ فرق قائم کر دیتی ہے جس سے ہم کسی کو ان پڑھ اور پڑھا لکھا کہتے ہیں۔ کتابوں میں اخلاقیات کا درس ہوتا ہے یہ اب طالب پہ منحصر ہوتا ہے وہ کتنا سیکھتا ہے اور پھر اس سیکھے ہوئے کو معاشرے میں کیسے اپلائی کرتا ہے۔ بلال بھائی میں ذرا چیزوں کو عمومی زاویے سے دیکھنے سے پرہیز کرتی ہوں۔ تعلیم کا سب سے پہلا مقصد behavioural change ہوتا ہے اور مجھے اعتراف ہے کہ آج کل کی تعلیم اپنے پہلے مقصد کو ہی پورا کرنے میں ناکام ہے۔'' وہ کسی مباحثے کی شریک لگ رہی تھی۔

''مثلاً......؟'' بلال نے پوچھا۔

''بھئی تعلیم سکھاتی ہے جھوٹ مت بولو اور ہم بولتے ہیں، کھلم کھلا...... علانیہ اور یہ ہی تو ناکامی ہے۔''

وہ یوں بات کر رہی تھی جیسے زیادہ دلائل دینے پر اسے ٹرافی ملنی ہو۔

''آپ کیا سمجھتی ہیں، خاندان والے کبھی اس کی پروا نہیں کریں گے۔ آپ جانتی ہیں کہ وہ آپ پر انگلیاں اٹھائیں گے۔''

بلال نے جان بوجھ کر کردار کا لفظ استعمال نہیں کیا تھا۔ اس کا انداز اب دھیما تھا۔

''ارے واہ...... ایسے کیسے انگلیاں اٹھائیں گے...... یہ معیز...... یہ بھی تو ہو گا ناں وہاں...... یہ میرا خون نہ پی جائے۔ اگر میں کوئی ٹینگی ٹینگی کروں تو...... وہیں یہ شوٹ نہ کر دے مجھے...... گارڈ کے نہ رکھ دے۔'' اب وہ مزہ لیتے ہوئے بولی تھی۔ اور وہ سب ان دونوں کی طرف متوجہ ہو کر ان کی بحث سن رہے تھے۔ ہنس پڑے تھے۔

اور یوں معیز بھٹی...... صوفیہ شجاع کے لیے ایک راستہ بن گیا...... ہر طرح کے اعتراضات کا منہ یہ ہی کہہ کر بند کیا گیا تھا۔

''ارے......! معیز بھی تو ہو گا ناں صوفی کے ساتھ...... اکیلی تھوڑی ہے وہ......''

☆☆☆

محبت ہمیشہ سے ہمارے اندر موجود ہوتی ہے۔ لیکن آشکار ہونے کے لیے یہ کسی نہ کسی شے کی محتاج ضرور ہوتی ہے۔ چاہے وہ لمحہ ہو، کسی کی حسین ادا، بات کرنے کا انداز یا پھر کوئی خوب صورت عادت......

اور پھر پتا لگتا ہے کہ ہا...... ہم بھی تو اسیرِ محبت تھے۔ ارے یہ کب ہوا...... اچھا تو یہ ایسا تھا۔

کیا ہم بھی......؟

کیا واقعی ہم بھی......

یقین نہیں آتا مگر حالات و واقعات کبھی، کبھی... مددگار ثابت ہوتے ہیں۔

اور پھر محبت یوں سامنے آتی ہے کہ جیسے یہ تو کبھی اوجھل تھی ہی نہیں۔ یہ تھی اور بس یہ ہی تھی۔

☆☆☆

وہ سال معیز کے لیے بڑا سخت ثابت ہوا تھا۔ pcs اس کی بہت بڑی امید تھا اور وہ ناکام ہو گیا تھا۔ انہی دنوں گجرات میں ایک نیا کامرس کالج کھلا تھا۔ جس کے پرنسپل معیز کے ابو کے اچھے دوستوں میں سے تھے۔ وہ اچھی طرح معیز کی قابلیت سے آگاہ تھے۔ انہوں نے اسے وہاں جاب آفر کی تھی جسے معیز نے ہنسی خوشی قبول کر لیا تھا۔ اب صورت حال یہ تھی کہ ہفتے کے دو دنوں میں اسے ایم فل شام کی کلاسز لینے اسلام آباد آنا پڑتا تھا۔

کالج کی جاب بھی تھی اور اپنی پڑھائی الگ...... پہلے اس کا مقصد کامیاب ہونا تھا اور اب یہ

پیسہ کمانا بن چکا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ پیسہ ہی تھا جو کہ اس کے حالات بدل سکتا تھا۔

یہاں تک تو ٹھیک تھا مگر خرابی تب پیدا ہوئی جب ماں، باپ اس کی شکل دیکھنے کو بھی ترسنے لگے۔ صبح ناشتا کر کے گھر سے نکلتا تھا...... ایک جگہ سے دوسری جگہ دوسری جگہ سے تیسری اور تیسری سے...... یہ ایک لمبا سلسلہ تھا جو پورے دن پر محیط تھا...... اور اس کے پاس تو اپنی ٹرانسپورٹ تک نہیں تھی۔ سارا دن لوکل ٹرانسپورٹ پر دھکے کھاتا یا پھر کسی کولیگ سے لفٹ لے لیا کرتا...... پانچ بجے کھانا کھانے گھر آتا تھا اور اکثر یہ کھانا skip ہو جایا کرتا تھا...... کڑی محنت کا دور تھا...... اور وہ کر رہا تھا...... کڑی محنت...... مگر اب یہ محنت...... محنت نہیں لگتی تھی یوں لگتا تھا کہ وہ خود کو ضائع کر رہا ہے...... یا پھر شاید یہ کہ اس نے اپنے غم و غصے کو انرجی کا نام دے کر محنت میں جھونک دیا تھا۔ یوں جیسے کوئی ریت سے بھرے بیگ پہ دھڑا دھڑ مکے برساتا ہے اور جتنے وہ مکے برساتا ہے اتنا ہی غصہ اور بڑھتا ہے پورا زور لگا کر چڑھتا ہے۔ وہ اپنے ہاتھوں کو تکلیف میں مبتلا کر کے اس ریت سے بھرے بیگ کو نیست و نابود کر دینا چاہتا ہے۔ معیز بھی تو یہی کر رہا تھا مگر سوال یہ تھا کہ وہ کس کو نیست و نابود کرنا چاہتا تھا...... خود کو یا پھر محبت کو خود کو یا پھر...... یا پھر محبت کو......

کچھ اور وقت گزرا معیز نے اپنا دوسرا چانس avail کیا تھا اور آج اسے pcs کا ایگزام دینے لاہور جانا تھا۔ ایم فل بھی اب بس مکمل ہونے کو تھا۔

''امی میرے لیے دعا کیجیے گا بہت زیادہ......!''

اسے یک دم یاد آیا کہ اس نے سیل فون امی کے پاس نہیں رکھا اور وہ دروازے سے پلٹ کر وہاں تک آیا تھا اور موبائل اٹھا کر ان کے پاس جائے نماز پر رکھا۔ انہیں جوڑوں کا مسئلہ تھا اٹھنا بیٹھنا چلنا پھرنا مشکل تھا۔

''جب تک تمہارا پیپر ہوتا رہے گا میں یہاں بیٹھی تسبیح پڑھتی رہوں گی۔ فکر نہ کرو معیز بیٹا...... اللہ محنت کرنے والوں کو ضرور نوازتا ہے۔'' وہ اس کے سر پر دونوں ہاتھوں سے پیار دیتے ہوئے بولی تھیں۔

اور وہ واقعی وہیں بیٹھ کر سارا دن تسبیح پڑھ پڑھ کر اس کے لیے دعا مانگنا چاہتی تھیں مگر کچھ بشری تقاضے بھی ہوتے ہیں۔ کافی دیر بعد وہ کھانا بنانے کے لیے اٹھی تھیں۔

مگر یہ کیا...... باوجود اپنی پوری کوشش کے ان کے لیے اٹھنا مشکل ہو گیا تھا۔ انہیں جوڑوں کے درد کی شکایت ضرور تھی مگر آج تو لگتا تھا کہ جوڑ فریز ہو کر رہ گئے ہیں۔ اور اسی اٹھنے کی کوشش میں وہ لڑکھڑائیں اور بے توازن ہو کر تخت سے نیچے جا گری تھیں۔ انہوں نے بے ساختہ چیخ ماری مگر گھر میں کوئی ہوتا تو سنتا ناں...... ظفر صاحب بھی گھر سے باہر تھے۔ عجب بے بسی کا عالم تھا وہ رو پڑیں...... گو کہ وہ ادھیڑ عمر عورتوں کی طرح بھاری بھر کم نہیں تھیں مگر پھر بھی یوں بے توازن ہو کر گرنے سے بری طرح سے چوٹ کھائی تھی۔ دائیں بازو میں درد کی شدید لہریں اٹھ رہی تھیں۔ انہوں نے اٹھنا چاہا مگر اٹھ نہ پائیں...... بس بہ مشکل خود گھسیٹ کر بیٹھنے کے قابل ہو سکی تھیں۔ نماز کی چوکی سے ٹیک لگائے فرش پر بیٹھے اب وہ بری طرح سے ہانپ رہی تھیں...... دائیں بازو کو اٹھا کر گود میں رکھا۔ تکلیف بے حد تھی اتنی کہ کراہیں ابل رہی تھیں۔ آنسو بچوں کی طرح گالوں پر بہہ رہے تھے۔

تکلیف سے زیادہ بے بسی کا احساس رُلا رہا تھا۔ اور پھر پہلی بار...... پہلی بار...... کسی مصیبت میں انہوں نے خود کال کر کے بھائی کو بلایا کیونکہ ظفر صاحب کے پاس سیل فون نہیں تھا...... ایک معیز کے پاس ہوتا اور ایک گھر میں......

شجاع دوڑے، دوڑے آئے تھے...... نہ صرف وہ بلکہ ان کی پوری فیملی...... اور تب تک ساجدہ سر جائے نماز پر رکھے بے دم سی ہو کر وہیں بیٹھی رہیں۔ اتنی بھی ہمت نہ تھی کہ کسی ہمسائے کو ہی آواز دے ڈالتیں۔

☆☆☆

اور پھر جیسے صوفی اور حنا کی ڈیوٹی لگ گئی تھی ایک جاتی

تو دوسری آجاتی تھی..... ساجدہ کا بازو فریکچر ہوگیا تھا اور کون تھا ان کا جو ساتھ دیتا..... بھائی تھا اور اس کی بیٹیاں۔

حنا کو تو ویسے بھی چپ کسی بیماری کی طرح لگی ہوئی تھی۔ ایک صوفی تھی جب آتی تھی تو یوں لگتا تھا جیسے بہار آگئی ہو۔

جیسے زندگی کھل کر مسکرائی ہو۔ پھپو صوفی کی کمپنی میں زیادہ خوش رہتی تھیں۔ حنا..... جی پھپو..... جی اچھا پھپو..... ٹھیک ہے پھپو اور بس لفظ ختم..... زبان گونگی..... جبکہ صوفی..... اُف.....

''پھپو آج آپ کی آنکھوں کے اوپر سرمہ لگاؤں؟ پھپو آج آپ کی چٹیا نہ بنادوں، چلیں جوڑا بنادوں..... پھپو آپ لپ اسٹک کیوں نہیں لگاتیں..... میں لگاؤں؟'' اور کچھ نہ سوجھتا تو ''پھپو آپ کو ظفر پھوپا سے کتنا پیار ہے؟ آپ کی لومیرج تھی یا ارینج..... ظفر پھوپا ویسے پیار سے آپ کو کیا کہتے ہیں..... جان..... یا پھر جانو..... آئے ہائے جانو بڑا ہی چیپ ہے بتائیے ناں پھپو.....'' ایسے ہی تو وہ خوش مزاج و خوش اخلاق مشہور نہیں تھی۔ وہ کبھی ہنستیں کبھی زچ ہوجاتیں اور کبھی ایک عدد پیار سے سر پر چپت لگادیتیں۔

مگر یہی پٹر پٹر بولتی صوفی اس وقت یک دم خاموش ہوجاتی تھی جب معیز آتا تھا۔ پھپو نے نہ چاہتے ہوئے بھی ان کے درمیان موجود کشیدگی کو محسوس کرلیا تھا گو کہ وہ ایک کمرے تک محدود ہو کر رہ گئی تھیں۔

معیز آتا..... خود ہی کھانا نکالتا اور پھر اپنے کمرے میں غڑاپ..... اور صبح بنا ناشتے کے گھر سے باہر..... اور وہ بھی جلدی جان بوجھ کر بہانہ..... اکیڈمی..... حالانکہ اس وقت کوئی اس کا پیچھا کرتا تو وہ سیدھا طلحہ نان سینٹر پر پایا جاتا۔

''تمہارے اور معیز کے درمیان کوئی لڑائی ہوئی ہے؟'' اور پھر بالآخر پھپو نے پوچھ ہی لیا تھا۔

صوفی نے سانس روک کر پھپو کو دیکھا۔

''جی پھپو!'' کہہ کر ایک گہری سانس لی۔

چہرے کو دیکھ کر سنجیدگی کا لیول ناپا۔ فائدہ تو کچھ تھا نہیں ناراضی چھپانے کا..... بہتر تھا کہ جھگڑا کہہ کر اصل بات چھپالیتی۔ وہ ''نہ'' کہتی..... معیز کی حرکتیں ''ہاں'' ہوتیں..... تو فائدہ جھوٹ بولنے کا۔

''آنے دو آج اسے تو میں.....'' پھپو نے دانت کچکچائے۔

''نہیں پھپو..... آپ بیچ میں مت آئیں، میں خود ہی نپٹوں گی۔'' صوفی نے صاف ''دیکھ بہن سائڈ پر ہوجا تیرا معاملہ نہیں.....'' والے انداز میں کہا تھا۔

پھپو چپ ہوگئیں۔

☆☆☆

اس دن سنڈے تھا معیز نے کالج واکیڈمی سے چھٹیاں لے رکھی تھیں کہ اس کے فائنل ایگزامز تھے۔ ایم فل بھی وہ hec کی طرف سے ملنے والے اسکالر شپ کی بدولت کررہا تھا۔ تبھی اس قابل ہوسکا تھا کہ ماں کا علاج کروانے میں مشکل پیش نہ آئی تھی حالانکہ ارادہ بائیک لینے کا تھا مگر..... ارادوں کا کیا ہے تو وہ بنتے ہی ٹوٹنے کے لیے ہیں۔ صوفی کے لیے اچھا موقع تھا وہ چھت پر میز کرسی لگائے..... پڑھنے میں بری طرح سے غرق تھا..... اس کے پیروں میں صفحات اور بال پوائنٹس مردہ حالت میں پڑے ہوئے تھے۔ مردہ یوں کہ وہ استعمال شدہ تھے۔ صوفی نے ایک نظر اسے دیکھا..... ماتھے پر بے اختیار ابھر آنے والی تیوریوں کو ہاتھ سے پکڑ کر دور کیا اور پھر چائے کا مگ عین اس کے سامنے لاکر رکھا۔

معیز نے ایک دم ہاتھ روک کر مگ کو گھورا..... مگر نظریں اٹھا کر صوفی کو نہیں دیکھا تھا۔

پھر اس نے اشتعال سے مگ اٹھایا، چائے کو اپنے پیچھے موجود دیوار پر گرایا اور ٹھاکر کے کپ ٹیبل پر رکھا..... یوں جیسے کہتا ہو.....

''لو پی لی چائے اب.....؟'' اور پھر ویسے ہی لکھنے میں مصروف ہوگیا۔ صوفی نے حق دق ہو کر اسے دیکھا وہ بھی تو اسی خاندان کی تھی ناں..... اس نے کب

اٹھایا اور وہیں دیوار پر دے مارا...... ایک زور دار چھناکے کی آواز گونجی...... معیز نے ششدر ہو کر اسے دیکھا۔ وہ غصے سے سرخ چہرہ لیے اسے گھور رہی تھی۔

''کیا بے ہودگی ہے؟'' وہ بھنا اٹھا۔

''کون سی...... چائے والی یا مگ والی...... میں نے تو تمہیں بس یہ بتایا ہے کہ غصہ محض چائے کو گرانے سے ٹھنڈا نہیں ہوگا۔ تمہیں مگ بھی چائے کے ساتھ دیوار پر دے مارنا چاہیے تھا........'' سرخ چہرے کے برعکس وہ ٹھنڈے انداز میں بولی۔

''شٹ اپ صوفی اور دفع ہو جاؤ۔'' صوفی کا چہرہ کچھ اور سرخ ہوا...... دل تو چاہا تھا کہ ایک ٹھوکر مار کر اس کی میز الٹ دے مگر وہ جانتی تھی کہ کم از کم اسے تو تحمل سے مظاہرہ کرنا ہی تھا۔

''میں بھی اسی ٹون میں...... انہی الفاظ میں تمہیں جواب دے سکتی ہوں...... بلکہ اس سے بھی کڑا جواب دے سکتی ہوں مگر نہیں...... میں ہر حال میں پابند ہوں کہ میں ''تحمل'' کا مظاہرہ کروں۔'' مگر لفظ تحمل...... بے حد سخت انداز میں چبا کر کہا گیا تھا۔

''تمہیں تکلیف کیا ہے؟'' ٹھنڈی بے عزتی نے معیز کو اور سیخ پا کیا۔

''یہ ہی...... یہ ہی تو میں پوچھنے آئی تھی۔ پھوپو کل مجھ سے پوچھ رہی تھیں کہ معیز سے جھگڑا ہوا ہے، میں نے کہا...... ہاں ہوا ہے اب تم مجھے یہ بتا دو ان کو کیا اصل بات بھی بتا دوں؟ اور پھر جن خاندان والوں نے میرے لڑکوں کے ساتھ پڑھنے پر باتیں نہیں بنائی تھیں اور بالفرض کیں بھی تو وہ سامنے نہیں آئیں، وہ آج یہ کہتے ہوئے پائے جائیں...... ہاں جی دو سال اکٹھے پڑھتے رہے...... یہ تو ہونا ہی تھا...... یہ چن تو چڑھنا ہی تھا۔ کسی اور کے ساتھ نہ سہی...... تمہارے ساتھ ہی گندا کر دیں لوگ مجھے...... ہیں معیز...... ٹھیک ہے؟'' پہلی بار وہ غصے اور طنز سے بولی تھی۔

اور معیز وہ...... وہ بری طرح چونکا تھا۔

وہ چند لمحے اس کے سرخ اور برہم چہرے کو دیکھتا رہا۔

''تو تم نے محض اس لیے میری محبت کو دھتکارا صرف اس لیے کہ لوگ تمہیں میرے ساتھ گندا کریں گے، یہ زیادتی ہے۔'' یک دم اس کا لہجہ اس کا انداز بدلا تھا۔ وہ جیسے بات کی تہہ تک پہنچا تھا ورنہ تو اسے یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ صوفی ایسی ہو سکتی ہے۔ وہ...... وہ بات بھی کہہ سکتی تھی۔

''دفع کرو لوگوں کو...... وہ تو باتیں بناتے ہی ہیں...... صوفی اپنے اور میرے درمیان سے لوگوں کو نکال دو...... میں نے پہلے بھی کہا تھا۔ میں اب بھی کہتا ہوں کہ کوئی تمہیں معیز کی نظر سے نہیں دیکھ سکتا...... بلال بھی نہیں......''

''تو بلال کو چھوڑ دوں؟ منگنی کا کیا کروں...... توڑ دوں؟'' اس نے ترنت پوچھا مگر اس کی نظروں میں کھا جانے والا تاثر تھا۔

''تو تم ایک منگنی کے پیچھے اپنی زندگی برباد کرو گی؟''

سوال برائے سوال...... جواب ندارد۔

''معیز تم کیوں نہیں قبول کر رہے کہ میں نے اپنی صرف اپنی مرضی سے یہ فیصلہ کیا ہے...... تم کیوں اپنی محبت مجھ پر تھوپ رہے ہو...... مجھے نہیں ہے تم سے محبت......'' وہ جیسے زچ ہوئی اور پھر ذرا اونچی آواز سے پھٹ پڑنے والے انداز میں بولی تھی۔ معیز کی غیرت پر جوتا پڑا تھا۔ ہر دفعہ کوئی ضروری تھا کہ وہ یوں ہی بے عزت ہوتا۔ ہر دفعہ ہی......

''صوفی چلی جاؤ ورنہ اللہ کی قسم میں تمہیں مار دوں گا......'' اس نے بیٹھے بیٹھے ہاتھ سے سیڑھیوں کی طرف اشارہ کر کے سختی سے کہا۔ اس کے چہرے سے ہی اس کے جذبات ضبط کرنے کا اندازہ ہو رہا تھا اور بہت اچھی طرح سے ہو رہا تھا...... وہ چپ رہی مگر ہٹی نہیں۔

''معیز تم ایک پڑھے لکھے انسان ہو...... میری بات کو سمجھو...... مجھے اسپیس دو، انا کا مسئلہ مت بناؤ...... یہ کہاں لکھا ہے کہ محبت برابر ہے محبت کے اور یہ کہاں

درج ہے کہ تمہیں مجھ سے محبت ہے تو مجھ پر بھی لازم ہے کہ میں بھی تم سے محبت کروں...... تم مجھ پہ محبت ٹھونس رہے ہو اور دل با اختیار نہیں...... کبھی جو تم سے پوچھا جائے ناں کہ ایک لڑکی کی شادی اس کی مرضی سے ہونی چاہیے تو تم ترنت کہو ہاں...... ہاں ہونی چاہیے، ضرور ہونی چاہیے اس کا قانونی اور مذہبی حق ہے کیونکہ تمہیں معلوم ہے کہ تم تعلیم یافتہ ہو اور نہ کا لفظ تمہارے تعلیم یافتہ ہونے سے میل نہیں کھاتا مگر معیز...... عمل......؟ عمل کہاں ہے؟ میں نے یہ ہی حق استعمال کیا...... یا مجھے یہ حق حاصل نہیں اس لیے کہ معیز بھٹی مجھ سے محبت کرتا ہے۔ جواب دو۔''

''صوفی تمہاری باتیں صرف میرا دماغ خراب کررہی ہیں اور کچھ بھی نہیں......'' وہ اسی بگڑے انداز میں بولا تھا۔

صوفی نے بے بسی سے ایک گہری سانس بھری سیڑھیاں چڑھتے ہی ذرا فاصلے پر معیز کی ٹیبل تھی اور وہ سیڑھیوں والی سائڈ پر معیز کے بائیں رخ پر کھڑی تھی۔

''عورت کی مرضی سے مراد ہمیشہ محبت یا محبت کی شادی ہی نہیں ہوتی معیز...... مرضی میں اور بھی بہت سی چیزیں آتی ہیں...... مثلاً یہ کہ میں دیکھوں کہ تم مجھے کیسا لائف اسٹائل دے سکتے ہو اور جیسا تم مجھے دے سکتے ہو وہ میرے لیے قابلِ قبول ہے بھی کہ نہیں۔ یہ میرا حق ہے اور تم محبت کے نام پر اسے مجھ سے چھین نہیں سکتے۔ اسے ڈی گریڈ نہیں کرسکتے۔ میری مرضی...... میرا جائز حق ہے اور عورت کی مرضی ہمیشہ محبت ہی نہیں ہوتی۔ یہ بات تمہیں مجھے اپنی زندگی دے کر سمجھانی پڑے گی۔'' وہ بولنے سے باز نہیں آرہی تھی۔

''تم......'' وہ غرایا...... اور ایک جھٹکے سے کرسی سے اٹھا اور اس کی طرف رخ موڑا تھا۔

''دفع ہوجاؤ صوفی ورنہ......'' اشتعال شدید تھا۔ چہرہ سرخ اور رگیں ابھری ہوئی تھیں...... صوفی پہلی بار سہم کر پیچھے ہٹی اور آنکھوں میں یک دم آنسو بھر آئے۔ اس کی آنکھوں میں کچھ اور بھی ابھرا تھا کہ



## صرف ہونٹ لرزے تھے

میں آج بھی تپتے صحرا میں
تنہا ننگے پاؤں
اس کے انتظار میں کھڑی ہوں
جس نے جاتے ہوئے
عجلت میں
کوئی عہد و پیماں بھی نہ کیا
صرف پلٹ کر
اک لمحے کے لیے اتنا پوچھا تھا
تمہیں مجھ سے محبت ہے؟
مرے ہونٹوں پہ آکر لفظ
جم سے گئے تھے
صرف ہونٹ لرزے تھے
یہ کہہ کر وہ چلا گیا
تم لڑکی نہیں برف ہو
جب سے اب تک
جلتے صحرا میں
ہونٹوں پہ ٹھہرے ہوئے منجمد
لفظوں کے
پگھلنے کا انتظار کررہی ہوں

کلام: سیما سراج، پرنسپل عثمانیہ گرلز کالج کراچی

کھو دینے کا احساس...... اس نے ہونٹ بھینچ کر اسے دیکھا...... نفی میں سر ہلایا اور مڑ کر تیزی سے سیڑھیاں نیچے اتر گئی تھی۔

صوفی اور معیز کی کہانی اِدھر ہی ختم......

ٹھیک اسی جگہ پر جہاں معیز کے دل پر اِک اور زخم لگا اور جہاں صوفی کی آنکھ نم ہوئی تھی...... بس ختم...... وہیں پہ ختم...... وہ دونوں ایک دوسرے کے دل سے اتر گئے تھے۔

☆☆☆

پھپو کے کمرے سے باہر رک کر اپنے آنسو صاف کیے گلا کھنکھار کر صاف کیا...... اور پھر اندر چلی گئی۔

''بہت بڑا بدتمیز ہے آپ کا بیٹا......'' ناراض لہجے میں بولتی ہوئی وہ پھپو کے پاس جا بیٹھی تھی۔

وہ بیڈ پر نیم دراز تھیں۔

''ہائے اتنے زوروں کا غصہ آیا ہوا ہے معیز کو۔ ارے کیا اس نے مگ توڑ ڈالا؟''

''جی......'' صوفی نے مسکرا کر کہا مگر آنکھیں بھر آئیں اور اس نے آنسو پی لیے اس طرح کہ پھپو کو نظر نہ آئے۔

''وہ پچھلے دنوں ہی تمہارے پھوپا لائے تھے وہ شیشے کے براؤن مگ...... چھ سو کے چھ مگ...... توڑ کر رکھ دیا۔'' پھپو کا انداز سخت ملال زدہ تھا۔

''بدتمیز سو روپے کا نقصان کر دیا...... چلو خیر مانا کہ نہیں......؟''

''نہیں مانا...... پر مان جائے گا۔'' وہ اچانک پھپو کی گود میں سر رکھ کر لیٹ گئی تھی۔ آنسو بہہ گئے...... آرام سے...... نرمی سے...... آسانی ہو گئی تھی۔

''لو! نقصان بھی کر دیا اور مانا بھی نہیں......'' ان کا ملال کچھ اور بڑھا اور صوفی نے سوچا۔

''امی کہتی تھیں میرے ہاتھ میں سوراخ ہیں...... جب تک روز کے دو تین برتن توڑ نہ لوں...... چین نہیں آتا......''

وہ چھت پر جانے سے پہلے...... ہاتھ میں ٹرے پکڑے پھپو کے پاس آئی تھی۔

''پھپو...... معرکہ ہونے والا ہے...... یہ مگ ٹوٹنے کی آواز بھی آئی ناں تو آپ نے کمرے سے باہر نہیں نکلنا...... معیز اگر زور، زور سے بولے تب بھی نہیں......'' اس نے سختی سے تاکید کی تھی۔ وہ جانتی جو تھی کہ مگ ٹوٹنے کی نوبت آ ہی جانی ہے۔

''چلو معیز کے ہاتھوں سے نہ سہی...... اس کے اپنے ہاتھوں سے ہی سہی...... ٹوٹ تو گیا تھا ناں مگ...... کیا مگ...... اور کیا دل......'' ایک ہی جیسے تھے کانچ کے......



☆☆☆

''معیز یہ دیکھیں۔'' اس نے بے حد پُرجوش سے انداز میں شاپنگ بیگ میں سے ایک جوڑا نکالا اور اس کے سامنے پھیلا دیا تھا۔

گو کہ وہ ایسی چیزوں سے بالکل نابلد تھا مگر پھر بھی معیاری اور خوب صورت چیز کی پہچان ہر ایک کو ہوتی ہے۔

''زبردست......'' وہ مسکرا کر بولا۔

''کہاں سے لیا ہے......؟'' وہ روانی میں برانڈ کا نام بتا گئی۔ معیز کو جھٹکا لگا...... برانڈ کا نام ہی کافی تھا۔

''اتنے پیسے تھے تمہارے پاس؟'' وہ حیران ہوا۔

''نہیں...... آدھے تھے...... آدھے امی نے دے دیے۔'' وہ کندھے اچکا کر بولی تھی۔ جیسے کوئی مسئلہ ہی نہیں تھا...... معیز کے ماتھے پر تیوریاں پڑ گئیں۔

''تمہیں میرے دیے ہوئے پیسوں سے ہی شاپنگ کرنی چاہیے تھی۔ مامی کیا سوچتی ہوں گی؟''

''اتنے کانشس کیوں ہو رہے ہیں؟ امی نے ویسے بھی مجھے سوٹ لے کر دینا تھا دو کے بجائے ایک اچھا سوٹ لے لیا میں نے۔'' معیز پریشان تھا اور وہ حیران......

''اب کی بار جو ہو گیا سو ہو گیا لیکن آئندہ ایسی کوئی حرکت کی تو یقین کرو میں اسے آگ لگا دوں گا مگر یہ گوارا نہیں کروں گا کہ میری بیوی میرے بجائے، اپنے ماں، باپ کے پیسے استعمال کرے...... ٹھیک ہے

میرے پاس اتنے پیسے نہیں جتنے تمہارے ماں، باپ کے پاس ہیں مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ تم ان سے پیسے مانگتی پھرو...... تم کیوں اپنے اور ان کے اسٹیٹس کے فرق......''

اور بس...... وہ یک دم گونگا ہو گیا تھا۔ یادوں کو لے کر انسان افسوس، دکھ، پچھتاوے یا خوشی کو ہی محسوس نہیں کرتا کبھی، کبھی یادیں چابک بھی مارتی ہیں...... اور بے حد بری طرح سے مارتی ہیں۔ معیز نے آنکھیں بند کر کے...... ہونٹوں کو بھینچا اور ذرا سی دیر کو بے حس و حرکت ہو گیا...... یوں...... یوں جیسے اسی لمحے میں جا پہنچا ہو...... زور کا وار تھا...... اور پھر منہ کھول کر ایک گہری سانس لے کر اسے دیکھا جو صدمے کی سی کیفیت میں بہہ پڑنے والے آنسو لیے گیلی آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

''آئی ایم سوری......'' وہ اس کے قریب ہوا۔ ''سوری، سوری۔'' رک، رک کر لفظ ادا کیے اور وہ رخ موڑ کر رو پڑی۔ معیز نے بے اختیار ماتھا مسلا۔ پھر اسے کندھوں سے پکڑ کر بیڈ پر بٹھا دیا اور خود کمپیوٹر ٹیبل کی کرسی گھسیٹ کر بالکل اس کے سامنے بیٹھ گیا تھا۔

''میں لاؤڈ ہو گیا تھا...... سوری فار دیٹ......''

''میرے ماں باپ ہیں وہ معیز اور......''

''ششش...... بس......'' معیز نے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ کر اسے مزید بولنے سے روکا۔ وہ سسکتی رہی مگر بولی نہیں۔

''زندگی میں بہت سی چیزیں سمجھانے سے سمجھ نہیں آتیں، یہ صرف تجربے سے ہی سمجھ میں آتی ہیں...... تو سمجھ لو کہ مجھے بھی ابھی ابھی ایک تجربہ ہوا......'' اس کے ہاتھوں کو تھپتھپاتے ہوئے معیز نے کہا۔

''امی کو یہ سوٹ مت دکھانا اور اگر دکھاؤ بھی تو یہ مت بتانا کہ خود خریدا ہے...... کہنا کہ تمہیں مامی نے لے کر دیا ہے...... ساری عمر انہوں نے گن، گن کر پیسے کو خرچ کیا...... پائی، پائی کر کے جمع کیا...... وہ کبھی کوالٹی کے فرق کو نہیں سمجھیں گی۔ ان کے لیے ہمیشہ کوانٹٹی ہی معتبر رہے گی چاہے کتنی چیپ ہی کیوں نہ ہو...... وہ یہ بھی نہیں سمجھیں گی کہ آدھے پیسے مامی نے دیے...... انہیں لگے گا کہ یہ فضول خرچی تم نے ہی کی ہے، ان کے بیٹے کی کمائی فضول میں اڑائی ہے۔ او کے...... سمجھ آیا یا نہیں آیا......''

''او کے۔'' وہ اس نے سر ہلا کر اس کو...... جواب دے دیا۔

وہ بار، بار نم آنکھوں کو صاف کرتی ہوئی اس کا بیگ پیک کر رہی تھی...... کل فلائٹ تھی اس کی...... ساری پیکنگ کرنے کے بعد اس نے بھاری بھرکم بیگ کو گھسیٹ کر ایک کونے میں رکھ دیا...... اور خود تھک کر بیڈ پر بیٹھ گئی تھی۔

معیز کے ساتھ بڑا کچھ جھیلا تھا اس نے مگر جدائی...... آہ...... یہ کہاں سے آ گئی تھی۔

کل وہ لندن جا رہا تھا...... پی ایچ ڈی کرنے...... hec کے اوور سیز اسکالر شپ کے تحت...... اور وہ اس سے کہنا چاہتی تھی نہ جائے...... اس کی لیکچرر شپ تھی ناں...... گزارہ ہو رہا تھا...... آگے بھی ہوتا رہے گا...... مگر...... کہہ نہیں پائی تھی۔ وہ کب تک ایسی زندگی جیتے...... اور خوشحالی کی لائن پر کھڑے ہونے کے لیے جدائی تو برداشت کرنی ہی پڑے گی ناں...... ہر کوئی...... ہر کوئی حالات کو بدلنے کے لیے کوشش کرتا ہے...... معیز نے بھی کی تھی۔

''اس کا ارادہ محنت تھا جو کئی بار ٹوٹ پڑنے کو بے تاب ہوا مگر وہ ڈٹا رہا...... مصر رہا...... اڑ گیا......'' معیز اپنے دوستوں سے مل کر آیا تو کمرے میں داخل ہوتے ہی اس کی روتی شکل ملاحظہ کی تھی۔

''کیا ہو گیا ہے یار...... اسکائپ ہے ناں...... گھنٹوں باتیں کیا کریں گے۔'' اس کے پاس بیٹھتے ہوئے اس کا سر اپنے کندھے سے لگاتے ہوئے معیز نے کہا تھا۔ وہ حسب توقع آنسو بہانے لگی...... کچھ لمحوں کے لیے خاموشی چھا گئی۔

''تمہارا بڑا مشکور ہوں میں...... تم نے تنگی میں میرا

ساتھ دیا حالانکہ ایسی زندگی گزارنا تم جیسی لڑکی کے لیے بڑا سخت کڑا امتحان تھا...... بڑا ہی سخت...... مگر...... اُف تک نہ کی تم نے...... مجھے حیرت ہوتی ہے تمہارے صبر پہ...... تمہارے حوصلے پر...... کتنا کمپرومائز کیا ناں تم نے......'' وہ کندھے سے الگ ہوئی...... دونوں ہاتھوں سے گالوں کو صاف کیا اور اسے دیکھا۔

''عورت کو حق ہے کہ اگر وہ چاہے تو معیز! حق مہر میں پہاڑ کے برابر سونا بھی مانگ سکتی ہے اور اگر چاہے تو لوہے کے زنگ آلود چھلے کے بدلے بھی نکاح کر سکتی ہے...... ساری بات چاہت کی ہے...... مرضی کی ہے...... اپنی خوشی کی ہے۔ تمہارے ساتھ زندگی سخت ہوگی...... میں جانتی تھی مگر میرا جذبہ بہت طاقتور تھا معیز...... اتنا کہ اس نے مشکل کو مات دے دی...... میرے لیے چیزوں کو آسان کر دیا۔'' وہ شگفتگی سے بولی تھی۔

''چائے لاؤں......؟''

''ہاں......'' معیز نے اثبات میں سر ہلایا۔

وہ چائے بنانے کے لیے اٹھ کر کچن میں چلی گئی اور معیز نے سوچا کتنا سچ کہا اس نے......

''ساری بات چاہت کی ہے...... مرضی کی ہے...... چاہت...... مرضی...... خوشی؟ طاقتور جذبہ......'' وہ بری طرح سے چونکا۔

''تو کیا...... کیا یہ......'' وہ اتنا بے یقین تھا جیسے یہ دنیا کے ناممکنات میں سے سب سے آخری ممکن ہو جانے والی چیز ہو...... وہ اٹھا اور تیزی سے کچن کی طرف گیا۔

''بات سنو......'' اس کے ہاتھ سے کپ لے کر ایک طرف رکھا اور ہاتھ پکڑ کر کچن سے باہر لے آیا۔

''ارے کیا ہوا...... چائے تو...... اوہو...... معیز......'' وہ بولتی ہوئی اس کے ساتھ تقریباً گھسٹتی ہوئی کمرے تک آئی۔ کمرے میں لا کر اس نے ہاتھ چھوڑ کر اسے اپنے سامنے کھڑا کیا۔

''کیا ہے؟'' وہ ذرا سا چڑ کر بولی۔

''تو تمہیں مجھ سے محبت تھی؟'' وہ اس کے اس سوال پر حیران ہوئی اور پھر کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

''کیسی بے تکی بات ہے......'' وہ جیسے اس کی...... بے وقوفی پر ہنسی۔

''نہیں...... مجھے بتاؤ، کیا ایسا تھا؟'' معیز نے اصرار کیا۔

''ہاں...... تھا......'' اور اس نے شرارت سے بڑے آرام سے اعتراف کیا۔

''مجھے بتایا کیوں نہیں...... نہیں...... بلکہ مجھے پتا کیوں نہیں چلا...... کیوں...... کیوں آخر...... کیوں نہ چلا......؟'' وہ ایک بار پھر حیران ہوا۔

''پتا تب چلتا ناں اگر میں پتا لگنے دیتی تو......'' وہ ناز سے بولی۔

اور یک دم...... بالکل ہی اچانک...... معیز کی سمجھ میں ایک بات آئی تھی۔

صوفی بھی تو اس وقت ایسے ہی حیران ہوئی تھی ناں جب اس نے اظہار کیا تھا...... وہ بھی لاعلم تھی۔ بالکل اسی طرح سے جیسے کہ وہ لاعلم رہا تھا اور اس نے لگا دی اپنی ساری قوت...... اور چڑھ آیا آج کا دن...... وہ پارس ہونے سے صرف دو قدم دور تھا۔

''کیوں روتی ہو...... چند سالوں کی ہی تو بات ہے...... پھر دیکھنا تم گاڑی پر سیریں کرو گی...... نوکرانیوں سے کام کرواؤ گی...... اچھے، اچھے کپڑے پہنو گی......'' اسے ساتھ لگائے امی اپنے تئیں اسے پچکار رہی تھیں۔ کیونکہ وہ رو رہی تھی...... لیکن حقیقت میں یہ ان سب کی خواہشات تھیں۔ معیز نے سر جھٹک کر آخری بار پاکستان کے آسمان کو دیکھا...... وہ آسمان جہاں پہ اسے تارہ بن کر چمکنا ہی تھا...... ہاں...... اسے چمکنا ہی تھا...... اسی چمک دمک کے ساتھ کہ وہ سب سے نمایاں ہوتا...... سب تاروں میں سے زیادہ چمکدار اور واضح...... آگہی اچھی چیز ہے مگر شرط یہ کہ عمل مثبت ہو۔

☆☆☆

محبت کو ہمیشہ اپنے ہونے کا ثبوت چاہیے ہوتا ہے اور وہ یوں ملتا ہے، کبھی کسی لمحے سے اِک نظر سے...... کسی

واقعے سے یا پھر...... یا پھر شاید کسی گفتگو سے بھی......

اور اس شام کی گفتگو کے بعد ہاں معیزہ باجی کی منگنی والی شام یادگار ہوگئی تھی اور یوں صوفی جیسے اس کی نظر میں آگئی تھی۔ کیسی شفاف سوچ کی مالک لڑکی ہے...... ڈرتی ہے نہ جھجکتی ہے...... بولتی جاتی ہے، ہنسے جاتی ہے...... وہ اس کی نظر میں آئی تھی...... پھر عادات کیسے مخفی رہ پاتیں۔ بلال اس پر فریفتہ ہوگیا تھا۔ اپنے دل، جگر، معدے، گردے سب سمیت......

اس کی نظریں صوفی کو کچھ بتاتی تھیں۔ کوئی سبق پڑھاتی تھیں...... ایک راہ گزر پر چلنے کا اشارہ کرتی تھیں...... مگر صوفی...... وہ ایک کائیاں چیز تھی...... پکڑ میں ہی نہیں آتی تھی، جانتی سب تھی۔ جب کسی کی نظریں کچھ سمجھانے پر تل جائیں تو ہو ہی نہیں سکتا کہ صورت لاعلم رہے۔ بلال نے کچھ کہا اور نہ صوفی نے کوئی جواب دیا۔ وہ منتظر تھا کہ اس کی تعلیم مکمل ہو جائے...... اس نے سارے خاندان سے بھڑ کر داخلہ لے لیا تھا...... محبت چاہے ٹھاٹھیں مارتی رہ جاتی لیکن اتنا تو اس کا حق تھا کہ اسے تعلیم مکمل کرنے دی جائے اور پھر جیسے ہی تعلیم مکمل ہوئی تو بس...... انکار کرنے کی وجہ کوئی نہیں تھی۔ بلال ہر لحاظ سے اس کے لیے اچھا تھا...... حسب نسب، مال و دولت، شکل صورت، دین اور دنیا...... سب میں وہ اس کے برابر کا ہی تو تھا...... تو انکار کیسے ہوتا......

☆☆☆

وہ دونوں پرائمری تک ساتھ پڑھے تھے پھر اسکول الگ، الگ ہوگئے۔ لڑکوں کا علیحدہ اور لڑکیوں کا الگ...... معیز بچپن کا دوست تھا، اکٹھے کھیلے تھے۔ تھپڑ کھائے بھی تھے اور مارے بھی تھے۔ اکٹھے روئے تھے تو ہنسے بھی تھے۔ خاندان بھر میں وہ دو ہی تھے جو کہ بچے تھے باقی تو کوئی لڑکپن میں تھا تو کوئی جوانی کو چھو رہا تھا۔

یہ دوستی اور بھی پروان چڑھی جب وہ دونوں یونیورسٹی میں اکٹھے ہوئے تھے۔ صوفی کو اعتراف تھا کہ ان دو سالوں میں وہ معیز کے بے حد قریب ہوگئی تھی۔ ہوسکتا تھا کہ اسے بھی محبت ہو جاتی مگر...... مگر یہ کہ اس کی احتیاط نے اسے بھی معیز کے بارے میں اس طرح سے سوچنے ہی نہیں دیا تھا۔ اور کچھ ذہن پر صرف میتھس میں ایم ایس سی کرنے کا بھوت سوار تھا۔ سب کہتے تھے کہ یہ لڑکوں کا مضمون ہے صوفی نہ پاس ہوگی...... اور صوفی کو جیسے ضد ہوگئی...... اس نے کر کے ہی دکھانا ہے...... اور ضرور دکھانا ہے...... یہ کیا بات ہوئی اب مضمون میں بھی تخصیص ہونے لگی لڑکے عموماً میتھس میں تیز ہوتے ہیں...... معیز بھی تھا...... جبکہ اسے دماغ خرچ کرنا پڑتا تھا...... اس کا سارا دھیان...... ساری قوت وہیں پر صرف ہوتی رہی...... یوں کہ میتھس نے اسے کہیں اور دیکھنے ہی نہیں دیا اور سوچنے ہی نہیں دیا مگر اسے تو کرنا تھا ہر حال میں ہر طرح سے...... وہ حساب کتاب کی اس قدر عادی ہوگئی کہ پھر دنیا کو بھی اسی نظر سے دیکھنے لگی...... دو جمع دو، چار...... چار ہی ہوتا ہے تو پھر اس کا پانچ کیسے ہوجاتا...... وہ کچھ حقیقتوں کی سختی سے قائل تھی۔

☆☆☆

صوفی اگلے دن گھر واپس چلی گئی تھی اور حنا کو بھیج دیا۔ اللہ، اللہ کر کے پھپو کا پلستر کھلا تو دونوں بہنوں کی ڈیوٹی ختم ہوئی۔ ساجدہ زیر بار تھیں...... ممنون تھیں، بیٹیوں کی طرح خیال رکھا دونوں بہنوں نے۔ چار پانچ ماہ گزرے...... موسم بدلا اور پھر سردی آگئی۔

ان کے بازو میں درد رہنے لگا...... کچھ بڑھاپے کی چوٹ تھی اور کچھ سردی کی...... وہ گھر کے کام کاج سے بھی رہ گئیں...... درد بعض اوقات ایسا اٹھتا کہ انہیں بے حال کر کے چھوڑتا...... ایسے میں کبھی کبھار بھتیجیوں کو بھی بلانا پڑ جاتا تھا۔ انہیں اچھا نہیں لگتا تھا...... مجبوری تھی۔ وہ شرمندہ ہوتیں...... کچھ خاندان والوں نے بھی کہنا شروع کردیا کہ بہو لے آئیں...... اب آپ سے گھر نہیں سنبھالا جائے گا۔ اسی دوران معیز pcs کا امتحان پاس کر کے لیکچرار اپائنٹ ہوگیا تھا۔ دن پھرنے کا عمل شروع ہو چکا تھا۔ معیز نے اسی پر بس نہیں کیا تھا۔

پھر سے اسکالرشپ کے لیے اپلائی کر دیا تھا۔ اسے پی ایچ ڈی جو کرنی تھی۔ اماں کی حالت کو دیکھتے ہوئے معیز نے انہیں کام والی رکھنے کا مشورہ دیا اور...... اور انہوں نے اسے شادی کا مشورہ دے ڈالا۔ اور بس......

حالات ایسے تھے کہ معیز کو ماننا ہی پڑا...... وہ...... وہ حنا کے لیے بضد تھیں۔ اپنا خون...... اپنی بھتیجی...... اور سب سے بڑھ کر جو اس نے خدمت کی...... اوپر سے بڑھاپے کا ایسا نقشہ کھینچا کہ معیز کو ہتھیار ڈالنے ہی پڑے تھے۔ ویسے بھی جب نصیب سامنے تن کر کھڑا ہو تو مفر کسے ملتا ہے؟

☆☆☆

صوفی کی شادی کی تیاریاں زور شور سے جاری تھیں۔ گو کہ ابھی دن طے نہیں ہوئے تھے مگر تیاریاں زور شور سے جاری تھیں۔ بلال کے ابا بیرونِ ملک میں تھے تو بس ان کا ہی انتظار تھا۔ سال سے اوپر ہو چلا تھا مگر ان کے آنے کا بندوبست نہیں ہو رہا تھا۔ کچھ کاغذات کا مسئلہ تھا۔

وہ جیسے ہی آتے...... شادی کے دن طے ہو جانے تھے۔ ایسے میں ایک دن ساجدہ خاتون آ گئیں...... حنا کا ہاتھ مانگنے...... ریحانہ اور شجاع ہکا بکا رہ گئے تھے۔

ساجدہ سوچنے کے لیے وقت دینے کو بھی تیار نہیں تھیں۔ ان کا اصرار تھا کہ شادی جلد کر دیں کیونکہ معیز نے اسکالرشپ کے لیے اپلائی کر رکھا ہے جیسے ہی لگا وہ باہر چلا جائے گا۔ کچھ اپنی طبیعت کا رونا...... تو بس...... حنا کو جب پتا چلا کہ پھپو کس لیے آئی ہیں تو وہ ساکت ہو کر مرنے والی ہو گئی تھی۔

''صوفی ...... صوفی ...... پھپو...... میرے لیے......'' وہ گرتی پڑتی لڑکھڑاتی ہانپتی ہوئی آئی تھی۔

''پھپو معیز کا رشتہ مانگنے آئی ہیں...... میرے لیے......؟'' اس کا ''میرے لیے......'' کہنا اس طرح سے تھا جیسے شدید بے یقینی لاحق ہو چکی ہو...... صوفی بھی دم بخود تھی۔

''صوفی......'' اور پھر وہ ایک دم بہن کے گلے لگ کر رو پڑی تھی۔

''میں سمجھتی رہی معیز تم سے۔'' وہ روتی جاتی تھی اور کہتی جاتی تھی۔

''آہ...... میں کتنی پاگل تھی۔''

''صوفی...... میرے ساتھ یہ بھی ہونا تھا...... محبت یوں بھی مل جایا کرتی ہے...... ہیں صوفی......؟'' اور صوفی کیا کہتی...... وہ تو خود حیرت زدہ تھی۔

حیرت یہ نہیں تھی کہ حنا اور معیز...... حیرت یہ تھی کہ حنا، معیز کو چاہتی تھی اور اسے پتا بھی نہیں چلا۔

اس نے روتی ہوئی گلے کا ہار بنی بہن کو کھینچ کر اتارا اور شانوں سے پکڑ کر سامنے کیا......

''دل پیا کروا اے کہ رکھ کے چپیڑ مارا تیری بوتھی تے......''

صوفی کا غصہ ہمیشہ اپنی مادری زبان میں ہی ٹھنڈا ہوتا تھا۔ اردو میں غصہ کرنے کا مزہ ہی نہیں آتا تھا۔

''دسیا کیوں نئیں......'' (بتایا کیوں نہیں) اس نے آنکھیں نکالیں۔

''وہ میں سمجھی تم اور معیز......'' حنا منمنائی۔

''ورفٹے منہ حنا...... مجھے پتا تھا کہ بلال نے مجھ پر نظر رکھی ہوئی ہے تو پھر میں معیز کی طرف کیسے دیکھتی......؟'' پہلے غصے سے اور پھر آنکھ مارتے ہوئے بے حد شرارت سے کہا تھا۔

اور حنا تر گالوں کے ساتھ کھلکھلا کر ہنس پڑی تھی۔

صوفی نے اس کی طمانیت کو محسوس کیا اور خود بھی مطمئن ہو گئی۔ محبت ایک طاقتور جذبہ ہے۔ اتنا کہ ہر چیز کو تہس نہس کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

زندگی ہنس پڑنے کو بے تاب تھی مگر ایک شخص تھا جس نے اب بھی ہونٹوں کو پابند کر چھوڑا تھا۔ وہ اب بھی اڑا ہوا تھا۔

☆☆☆

اور یوں حنا کی شادی معیز سے ہو گئی حالانکہ تیاری تو صوفی کے لیے تھی لیکن جب نصیب تن کر کھڑا

ہو جائے تو مفر کہیں نہیں۔

پہلے امریکن اسٹائل میں کچن بنا...... پھر سارے گھر میں ٹائلز لگیں، اے سی لگا...... اس کے بعد کام والی آئی...... گھر کی ساری پرانی چیزیں ایک کے بعد ایک کر کے بدلنے لگیں۔ فریج سے لے کر بوسیدہ پردوں تک سب ...... اور پھر گاڑی بھی آگئی۔ اور اب وہ گھر...... پھپو کا گھر تو لگتا ہی نہیں تھا۔ یہ حنا کا گھر تھا۔

وہ اب برانڈڈ کپڑے پہنتی...... کریڈٹ کارڈز سے شاپنگ کرتی تھی۔ اس کی بیٹی روٹس میں پڑھتی تھی۔ جادو کی چھڑی گھومی تھی...... نہیں...... معیز پارس بن گیا تھا۔

وہ آج Nust کا پروفیسر تھا۔ ایکس گریڈ کا پروفیسر...... سب سے نوجوان پروفیسر کہ جس کا گریڈ ایکس تھا۔ زندگی کو بدلنا ہی تھا اور وہ بدل ہی گئی تھی۔

لیکن معیز کو مسکراہٹ کا راز دے گئی تھی۔ کچھ حقیقتیں بے حد اچھی طرح سے سمجھا جاتی ہیں۔

☆☆☆

موسم ابر آلود تھا اور یہ اس کی امی کا ہی گھر تھا۔ وہ دونوں بہنیں بڑے عرصے بعد یوں اکٹھی ہوئی تھیں وہ برآمدے میں بیٹھ کر چائے پی رہی تھیں اور ان کے بچے سامنے لان میں کھیل رہے تھے۔

صوفی کا بیٹا اور حنا کی بیٹی...... اچانک بارش کے قطرے گرنے لگے تو حنا بھاگ کر بچوں کو بلانے گئی تھی۔

وہ انہیں لے کر اندر چلی گئی۔ دونوں نے ہی کپڑے خراب کر لیے تھے۔

صوفی نے مسکرا کر حنا کو دونوں بچوں کو لے جاتے دیکھا اور پھر گردن موڑ کر برستی بارش کو دیکھنے لگی۔

''کیسی ہو صوفی......؟'' کوئی بے حد آہستگی سے آکر اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھا اور نرمی سے پوچھا۔

وہ ساکت ہوئی...... کتنا عرصہ ہو گیا تھا ناں......

اس نے بارش سے نظریں ہٹائیں۔ اسے دیکھنے سے گریز کیا...... کپ سامنے ٹیبل پر موجود ساسر میں رکھا اور بولی۔

''ٹھیک ہوں......'' وہ گود میں رکھے اپنے ہاتھوں کو دیکھ رہی تھی۔

اور پھر خاموشی......

''میں...... میں بچوں کو دیکھتی ہوں۔''

''بیٹھ جاؤ صوفی...... مجھے تم سے بات کرنی ہے۔'' اس نے نرمی سے ٹوک دیا۔ اور صوفی...... اس کی تو جیسے سانس رک گئی تھی۔ وہ اب...... اب کیا کہنے والا تھا۔

صوفی نے وحشت سے اسے دیکھا اور پھر گردن موڑ کر اندر دیکھا۔ حنا کی بچوں کو ڈانٹنے کی آواز باہر تک آرہی تھی۔

''جہاں اتنے سال گزر گئے وہاں ساری عمر بھی گزار لیتے...... راز...... راز ہی رہتا گر یہ معیز......'' اس نے پھر سے گھبرا کر معیز کو دیکھا اور کچھ کہنا چاہا۔

''میں تم سے سوری کرنے آیا ہوں۔'' اس کی آنکھوں کی گھبراہٹ یک دم حیرانی میں بدلی۔

''سوری......؟''

''اس دن کی بدتمیزی کے لیے جس دن میں نے تمہاری چائے گرائی تھی۔''

وہ شاکڈ ہوئی اور پھر ہنس دی۔

''تم معیز...... تم اب اتنے عرصے بعد......'' وہ یک دم پرسکون ہوئی تھی۔

''ہاں اب...... اتنے عرصے بعد...... کیونکہ اتنے عرصے بعد جا کر ہی تو سمجھ آئی ہے کہ تم ٹھیک تھیں...... اور تم نے اس دن ایک، ایک بات بالکل ٹھیک کہی تھی کہ صوفی...... میں تم پر محبت ٹھونس رہا تھا، وہ چیز جو ٹھونسنے کی ہرگز نہیں تھی۔ آئی ایم سوری فار ایوری تھنگ۔'' اس نے شفاف سی مسکراہٹ سے ہلکی سی شرمندگی سے کہا۔

اور صوفی کو لگا دل میں کھبا کانٹا بس اب نکل گیا تھا۔ وہ بھی مسکرا دی تھی۔

''تم اس دن روئی کیوں تھیں؟''

''کس دن......؟'' صوفی نے چونک کر پوچھا۔

''اسی دن جس دن مگ تم نے توڑا اور الزام مجھ پر

ڈال دیا، تمہیں معلوم ہے تمہارے جانے کے بعد امی نے مجھے کتنی سنائی تھیں۔'' وہ یوں بولا جیسے اسے ابھی تک ان صلواتوں کا غم ہو...... وہ سر جھٹک کر ہنس پڑی۔

''میں نے اس دن تمہیں کھو دیا تھا معیز...... ایک اچھے کزن اور دوست کو...... اس کے بعد اسے مجھے نہیں ملنا تھا...... وہ نہیں ملا...... اور نہ ملے گا۔''

چند لمحوں کے بعد سنجیدگی سے اس نے کہا تھا۔ معیز کے دل عین دل میں کچھ چبھا اور پھر چبھتا ہی گیا...... وہ ٹھیک کہتی تھی۔ سب کچھ ٹھیک تو ہو گیا تھا مگر وہ بے تکلفی نہیں ہو سکی تھی۔ صوفی ایک گہری سانس بھر کر اٹھی۔ میز سے برتن سمیٹے۔

''چائے لاتی ہوں۔'' اور پھر کہہ کر چل گئی تھی۔

اور معیز برستی بارش کو دیکھتے ہوئے اسی دہکتے دن میں جا پہنچا۔

☆☆☆

''مجھے مجبور مت کرو معیز کہ میں تمہیں دکھی کرو...... مان جاؤ اور چلے جاؤ...... جو ہو رہا ہے ہونے دو...... سمجھ لو کہ یہ ہی میری مرضی ہے...... کوئی اچھی لڑکی......''

''شٹ اپ......'' اور وہ دہاڑا۔

صوفی نے آنکھیں بند کر کے اس دہاڑ سے اٹھنے والی لرزش کو اپنے اندر ہی اندر روکا، ایک گہری سانس بھر کر خود کو پرسکون کیا اور معیز کا چہرہ دیکھا۔ پھر اس نے خود کو وہ بات کہنے کے لیے تیار کیا۔ اس نے کہا۔

''معیز میں تمہارے ساتھ ایڈجسٹ نہیں ہو سکتی......''

''کیا مطلب ہے نہیں ہو سکتی...... بودے بہانے مت بناؤ صوفی...... تمہاری اور میری بہت اچھی انڈر اسٹینڈنگ ہے۔''

''انڈر اسٹینڈنگ اس وقت بھک سے اڑ جاتی ہے جب سوشل اسٹیٹس میں زمین آسمان کا فرق ہو...... تب میں کبھی تمہاری بات نہیں سمجھوں گی...... اور نہ تم میری...... میرے لیے اسٹینڈرڈ اہم ہوگا اور تمہارے لیے یہ سب سے زیادہ غیر اہم چیز...... میں quantity نہیں quality دیکھوں گی اور نہ تم quantity پر زور دو گے۔ تم اس فرق کو کیوں نہیں سمجھتے معیز......'' اس نے بے حد زچ ہو کر یہ بات کہی تھی۔ اور وہ بے حد بے یقین ہو کر اس کی بات سن رہا تھا۔ اس نے کیا، کیا گنوا دیا تھا...... وہ اس کا دل نہیں دکھانا چاہتی مگر......

''صوفی...... تم...... تم اپنے اور میرے بیچ پیسے کی لائن کھینچ رہی ہو؟ تم...... تم اتنی مادہ پرست ہو؟ محبت کوئی معنی نہیں رکھتی تمہارے لیے...... تم...... مادہ پرست عورت......'' آخر میں اس کا بے یقین انداز تنفر سے بھر گیا تھا۔

''تم معیز...... تم اتنی محنت کیوں کر رہے ہو؟ ہاں...... کیوں؟ انہی مادی چیزوں کے لیے ناں...... زندگی میں مادی چیزوں کی اہمیت ہوتی ہے...... گر نہیں ہوتی تو وہ مادی رویہ ہوتا ہے...... اور مجھے بتاؤ...... انگلیوں پر گن کر بتاؤ کہ کب میرا رویہ ایسا ہوا...... کیا میں نے تمہارے ساتھ اسی پلیٹ میں نہیں کھایا جس میں تم نے کھایا؟ کیا میں اسی جگہ پر نہیں بیٹھی جہاں تم بیٹھے ہو......؟ کب میرے خلوص میں تم نے کمی دیکھی؟ میں نے کب غرور، تکبر کیا؟ کب میں نے تم سے تمہاری مالی حالت کی وجہ سے قطع تعلق کرنا چاہا...... معیز میرا حق ہے کہ میں اپنے لیے...... اپنے ہی جیسے اسٹینڈرڈ کا جوڑ حاصل کروں...... مجھے حق ہے کہ میں اپنی مرضی سے شادی کروں۔'' دکھ اور غصہ صوفی کی آواز کی لرزش کا باعث بنا تھا۔

''تم...... تم صوفی...... تم لکھوا لو مجھ سے...... تم پچھتاؤ گی...... ساری عمر پچھتاؤ گی...... تم نے محبت کو دھتکارا...... تم اس کو ترسو گی...... ساری عمر ترسو گی...... یاد رکھنا...... تم ترسو گی......'' بے حد سخت نفرت سے کہہ کر اس نے چلے جانا چاہا مگر صوفی یک دم آگے آ گئی تھی۔

''کیوں...... کیوں ترسوں گی میں محبت کو...... کیوں......؟ میں نے کوئی گناہ نہیں کیا......؟ ہرگز بھی گناہ نہیں کیا...... میں نے تم یا تمہاری محبت کو دھتکارا

بھی نہیں...... میں نے نرمی سے انکار کیا ہے اور بس...... میں ضرور تمہارے ساتھ تمہارے ہی جیسی زندگی گزار لیتی اگر مجھ میں بھی محبت کی طاقت ہوتی تو...... مجھ میں نہیں ہے اتنی طاقت اور تم...... تم یاد رکھنا معیز بھئی...... یاد رکھنا اور دیکھنا...... میں تمہارے سامنے...... انہی آنکھوں کے سامنے ایک اچھی اور خوشحال زندگی گزاروں گی اور لکھوالو مجھ سے محبت مجھے مل کر رہے گی۔ مجھے ترسنا نہیں پڑے گا کیونکہ میں نے گناہ نہیں کیا...... اپنے حق کو استعمال کیا ہے اور بس......'' اور معیز ایک غصے بھری...... نفرت بھری نظر اس پر ڈال کر وہاں سے چلا آیا تھا۔

☆☆☆

''چائے......'' معیز ایک دم چونکا...... صوفی اس کے سامنے ٹیبل پر چائے کا کپ رکھ رہی تھی۔ اس نے ٹھیک کہا تھا...... صوفی اس کے سامنے تھی اور ایک خوشحال زندگی کا چلتا پھرتا اشتہار نظر آتی تھی۔ بلال کی محبت بھی کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں تھی۔ وہ آج بھی اس پر فریفتہ تھا۔

وہ سمجھ سکتا...... اب وہ سمجھ سکتا تھا کہ صوفی اور اس کی شادی ہوتی تو پھر محبت کہیں نہ ہوتی۔ ان کے درمیان موجود فرق محبت کو کھا جاتا۔

وہ سمجھ سکتا تھا اور اب تو بہت ہی اچھی طرح سے سمجھ سکتا تھا...... صوفی کے سر پر اپنی ذات، اپنی عزت کے گٹھڑ کا بار تھا۔ جسے وہ سر پر اٹھائے، ایک پتلی ڈوری پر ننگے پاؤں چلتی تھی اور لوگ...... ان کی نظریں...... اس کے پیروں پہ...... کب پھسلے...... کیوں پھسلے...... کیسے پھسلے اور کس کے لیے پھسلے۔ تو صوفی احتیاط کرتی تھی اور اتنی کرتی تھی کہ محبت کے وجود سے خالی ہوگئی۔ وہ سمجھ سکتا تھا سو سال جتنا عرصہ نہ سہی...... ''ہیرا'' بننے میں کئی سال کا عرصہ لگ ہی گیا تھا۔ اور اگر یہ عرصہ صوفی کے ساتھ گزرتا تو ہوتا کیا......؟ لڑائیاں، جھگڑے، ناچاقیاں...... صوفی کو سمجھ ہی نہیں آتا کہ کمپرومائز کیسے کرنا ہے جبکہ محبت خود بخود یہ گر سکھا دیتی ہے۔

حنا نے کیسے اچھے طریقے سے ہر چیز کو سہہ کر وقت گزارا تھا۔

معیز کو بھی محبت نامی چیز بھول جاتی اور وہ مصر رہتا کہ صوفی اسی لائف اسٹائل کو اپنائے جو کہ معیز کا تھا۔

مگر وہ کیسے اپناتی...... پچیس سال جس لائف اسٹائل کے ساتھ اس نے زندگی گزاری تھی...... پچیس دنوں میں کیسے بھول جاتی...... کیسے ترک کر کے معیز کے رنگ میں رنگ جاتی...... اور کتنے ہی لمحات آئے معیز کی زندگی میں جہاں صوفی کی کہی باتوں نے کسی روشنی کا سا کام کیا تھا۔ اور اسے حنا کو سمجھنے میں آسانی ہوگئی تھی اور حنا...... محبت ایک باکمال چیز ہے...... کمال کرنا اور کمال دکھانا یہ ہمیشہ اس کے لیے اپنے بائیں ہاتھ کا کھیل رہا ہے۔ حنا کے لیے معیز کے حالات مسئلہ ضرور تھے مگر اس میں وہ محبت نامی ہمت تھی جس کی بدولت اس نے وہ سو سال کے جیسے لمبا عرصہ گزار لیا تھا۔ معیز خوش تھا، مطمئن تھا، ایک اچھی زندگی گزار رہا تھا۔

صوفی سے محبت ہوئی تھی اب وہ محبت تھی یا نہیں تھی...... اس سوال کا جواب ڈھونڈنا بے مقصد تھا۔ اور وہ یہ بات جانچنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ اس سے حنا کی عزت پہ حرف آتا...... اور ایسا تو وہ نہیں چاہتا تھا وہ ایسا کبھی نہ گوارا کرتا......

مگر یہ کم بخت دل...... سب کچھ سمجھنے، جاننے، پرکھنے اور معترف ہونے کے باوجود نہ جانے کیوں خالی پن کا شکار رہتا تھا۔

اس کو جو کسی زمانے میں محبت نامی گھن لگا تھا ناں اس گھن نے دل کے ایک حصے کو کھا لیا تھا...... اک کسک سی تو اب رہنی ہی تھی۔ اور ادھوری...... نامکمل چیزیں...... بعض اوقات مکمل ہو کر بھی مکمل نہیں ہوتیں۔

اور اس بات کا احساس دلاتی رہتی ہیں کہ ہاں...... کچھ نامکمل ہے اور کچھ ادھورا ہے ہاں ایسا تھا ہے اور ایسا ہی ہے۔





# شمع ہدایت

اختر شجاعت

## دعا...... مددِ الٰہی

تمام تعریف اور تمام تر حمد وثنا صرف اور صرف اللہ عزوجل کے لیے ہے جو اس کائنات کا مالک اور خالق ہے جس نے رات کو پردہ بنایا اور نیند کو آرام و راحت کا ذریعہ اور دن کو حرکت وعمل کے لیے قرار دیا۔ جس نے ہمیں ہماری خواب گاہ سے زندہ اور سلامت اٹھایا اگر وہ چاہتا تو اسے دائمی خواب گاہ بنا دیتا۔"

ایسی حمد اس رب کی...... جو ہمیشہ، ہمیشہ رہے اور جس کا سلسلہ قطع نہ ہو اور مخلوق اس کی گنتی کا شمار نہ کر سکے...... اے میرے رب! تو نے ہمیں پیدا کیا اور ہر لحاظ سے درست پیدا کیا۔ موت دی اور زندہ کیا۔ بیمار ڈالا اور شفا بھی بخشی...... سب سے زیادہ اے رحم کرنے والے مالک ہماری حاجتیں پوری فرما دے۔ ہماری دعاؤں کو اپنی بارگاہ میں شرفِ قبولیت عطا فرما...... کہ اطمینان ہو تو تیری فرمانبرداری میں...... سرور ہو تو تیری عبادت میں...... خواہش ہو تیرے ثواب کی تیری رضا کی...... اور کنارا کشی ہو تو ان چیزوں سے جو تیرے دردناک عذاب کا باعث ہیں...... بے شک تو بڑی قدرت والا ہے۔ درود وسلام ہو ہمارے پیارے نبی سرور کائنات ﷺ پر ان کی آل پر اور ان کے اصحاب پر...... (آمین)

☆☆☆

آج تمام دنیا میں جس کثرت سے مسلمان ہیں مگر اسی قدر پریشانیوں میں گھرے ہوئے ہیں اور سخت مصائب میں پھنسے ہوئے ہیں۔ جب کردار اور اعمال میں بگاڑ پیدا ہوتا ہے تو یہ تمام پریشانیاں، تکالیف اور ذلتیں مقدر بن جاتی ہیں...... اور ان کا علاج تو صرف یہ ہے کہ اپنے برے اعمال کو ترک کریں اور انتہائی سچے دل اور انتہائی عاجزی وانکساری سے اپنے رب کے حضور استغفار اور دعا کریں یہ نسخۂ علاج خود اس رب کریم کا بتایا ہوا ہے۔ آج وقت کی سب سے اہم ضرورت دعا ہے۔ دعا کے لغوی معنی ہیں خدا سے مانگنا...... التجا، مناجات......

جن اعمال سے اللہ تعالیٰ کی مدد زمین پر اترتی ہے ان میں دعا بھی شامل ہے۔ دعا ایک ایسی عظیم الشان عبادت ہے جو ہر حال میں نفع لے کر آتی ہے۔ ایک ایسی عبادت ہے جو طوفانوں کا رخ موڑ سکتی ہے۔ دعا عاجزی کا نہایت خوب صورت اظہار ہے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے...... "اے میرے رسول ﷺ جب آپ سے میرے بندے میرے متعلق دریافت کریں تو آپ کہہ دیں کہ میں بہت ہی قریب ہوں، ہر پکارنے والے کی پکار کو جب کہیں وہ مجھے پکارے قبول کرتا ہوں۔" (سورۂ بقرہ: ۱۸۶)

دوسری جگہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ "تم لوگ اپنے پروردگار سے دعا کیا کرو۔ گڑگڑا کر کے بھی اور چپکے، چپکے بھی...... واقعی اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو ناپسند کرتا ہے جو حد سے نکل جائیں۔" (سورۂ اعراف، ۵۵)

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا...... "تم میں سے جس شخص کے لیے دعا کا دروازہ کھول دیا گیا۔ (یعنی دعا مانگنے کی توفیق دے دی گئی) اس کے لیے رحمت کے دروازے کھول دیے گئے۔

اللہ تعالیٰ سے جو دعا مانگی جاتی ہے ان میں سے اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ یہ پسند ہے کہ اس سے (دنیا و آخرت میں) عافیت کی دعا مانگی جائے۔

ایک روایت میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ میں اپنے بندے کے گمان کے قریب ہوں' میرے متعلق جیسا چاہے وہ گمان کرے۔ جب وہ مجھے یاد کرتا ہے تو میں اس کے ساتھ، ساتھ ہوتا ہوں جو شخص مجھے دل میں یاد کرتا ہے' اس کو اپنے جی میں یاد کرتا ہوں اور جو اجتماع میں میری یاد کرتا ہے' میں اجتماع میں اس کی یاد کرتا ہوں۔ میری جمعیت اس کی جمعیت سے بہتر ہے جو مجھ سے بالشت بھر قریب ہوتا ہے میں اس سے ہاتھ بھر قریب ہوتا ہوں جو میری طرف چند قدم چلتا ہے میں اس کی طرف دوڑ کر آتا ہوں۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ روایت کرتے ہیں کہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ ''دعا مومن کا ہتھیار ہے..... دین کا ستون ہے اور زمین و آسمان کا نور ہے۔''

سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ ''دعا عبادت کا مغز ہے۔''

''اللہ کے نزدیک دعا سے زیادہ عظیم چیز کوئی نہیں ہے۔''

''بندہ دعا کے ذریعے تین چیزوں میں سے ایک جانے نہیں دیتا یا تو اس کا گناہ بخش دیا جاتا ہے یا اسے کوئی اچھی چیز فوراً عطا کر دی جاتی ہے..... یا آئندہ کے لیے خیر کر لی جاتی ہے۔''

''اللہ تعالیٰ سے اس کے فضل و کرم کی درخواست کرو..... اللہ کو یہ اچھا لگتا ہے کہ کوئی اس سے مانگے.....''

حضرت ابوذرؓ فرماتے ہیں کہ۔ ''نیکی کے ساتھ دعا کی اتنی ضرورت ہے جتنی کھانے میں نمک کی.....'' حضرت سلمان فارسیؓ نے فرمایا..... ''بندہ جب خوشی میں اللہ کو پکارتا ہے (اور اللہ کو عیش میں یاد رکھتا ہے) پھر اس پر مصیبت پڑتی ہے تو فرشتے عرض کرتے ہیں پروردگار! تیرے بندے پر مصیبت پڑ گئی ہے اس کا دکھ دور کر غرضیکہ فرشتے عرض کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ان کی سفارش قبول فرمالیتا ہے اور اس کے برعکس جب بندہ سکھ میں اللہ کو نہیں پکارتا، دکھ پڑنے پر پکارتا ہے تو فرشتے کہتے ہیں اب اللہ کو پکارا..... غرض یہ کہ فرشتے اس کی سفارش نہیں کرتے..... تو جو اللہ پر اعتماد کرتا ہے اللہ اس کے لیے کافی ہوتا ہے۔

ایک قول ہے کہ تم مجھے توبہ کے ساتھ یاد کرو..... میں مغفرت کے ساتھ تم کو یاد کروں گا۔ تم دعا سے مجھے یاد کرو، میں عطا کے ساتھ تم کو یاد کروں گا..... تم گناہوں پر پشیمانی کے ساتھ میری یاد کرو' میں کرم کے ساتھ تمہاری یاد کروں گا..... تم دلوں سے میری یاد کرو میں بے چینیاں دور کر کے تمہاری یاد کروں گا۔ تم ایمان کے ساتھ میری یاد کرو، میں جنت دے کر تمہاری یاد کروں گا۔ تم اظہارِ عجز کر کے میری یاد کرو..... میں لغزشیں معاف کر کے تمہاری یاد کروں گا..... تم میری یاد وہیں کرو جہاں تم ہو..... میں تمہاری یاد وہیں کروں گا جہاں میں ہوں..... بلاشبہ جو اللہ کا ذکر کرتا ہے اللہ اس کو یاد رکھتا ہے..... جو اللہ کا شکر ادا کرتا ہے اللہ اس کو زیادہ دیتا ہے۔

☆☆☆

حضرت ابراہیم ادھمؒ سے کسی نے سوال کیا کہ کیا وجہ ہے کہ ہم اللہ سے دعا کرتے ہیں مگر وہ دعا قبول نہیں کرتا.....؟ آپؒ نے جواب دیا..... ''تم رسولؐ کو پہچانتے ہو مگر ان کے طریقے پر نہیں چلتے..... قرآن کو جانتے ہو مگر اس پر عمل نہیں کرتے..... اللہ کی دی ہوئی نعمت کھاتے ہو مگر اس کا شکر ادا نہیں کرتے۔ جنت کو جانتے ہو مگر اس کو طلب نہیں کرتے۔ دوزخ کا اقرار کرتے ہو مگر اس سے خوف نہیں کھاتے۔ شیطان کو پہچانتے ہو مگر اس سے مقابلہ نہیں کرتے بلکہ اس کی موافقت کرتے ہو، موت کو جانتے ہو مگر اس کے لیے تیاری نہیں کرتے مردوں کو دفن کرتے ہو مگر عبرت حاصل نہیں کرتے تم نے اپنے عیبوں کا خیال چھوڑ دیا

اور لوگوں کی عیب جوئی میں لگے ہوئے ہو۔''

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ ...''دعا مومن کا ہتھیار اور دین کا ستون ہے۔''

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا ارشاد ہے کہ ...''دعا مومن کی سپر ہے جب تم بار بار دروازہ کھٹکھٹاؤ گے تو وہ تمہارے لیے کھول دیا جائے گا۔''

حضرت امام زین العابدینؒ کا ارشاد ہے کہ ...''دعا بلا و مصیبت کو ٹال دیتی ہے۔'' حضرت امام جعفر صادقؒ کا ارشاد ہے کہ ...''دعا تیز دھار والی انی سے بھی زیادہ مؤثر و کارگر ہوتی ہے۔'' اسلام میں دعا کی اتنی زیادہ اہمیت ہے کہ اس کے ترک پر جہنم کی وعید تک وارد ہوتی ہے...... چنانچہ ارشادِ الٰہی ہے کہ ...''مجھ سے دعا مانگو میں قبول کروں گا وہ لوگ جو غرور و تکبر کی وجہ سے میری عبادت سے منہ موڑ لیتے ہیں، وہ ذلیل ہو کر جہنم واصل ہوں گے۔''

دعا سے عبد و معبود کا رشتہ استوار اور عبودیت اور الوہیت کا رابطہ مضبوط و مستحکم ہوتا ہے۔

دعا کے چند آداب ہیں اگر ان کا خیال کرلیا جائے تو بہت بہتر ہوگا......

دعا کے لیے افضل اوقات کا خیال رہے...... جیسے سال میں عرفے کا دن ہے...... مہینوں میں رمضان ہے۔ دنوں میں جمعہ ہے اور اوقات میں سحر کا وقت ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ...''اور سحر کے وقت وہ استغفار کرتے ہیں۔''

آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے۔ ''جب رات کا آخری تہائی حصہ باقی رہ جاتا ہے، اللہ تعالیٰ دنیا پر جلوہ افروز ہوتا ہے (بے شک وہ لامکاں و لازماں ہے) اور فرماتا ہے کہ کوئی ہے جو مجھ سے دعا مانگے اور میں قبول کروں، کوئی ہے جو مجھ سے درخواست کرے اور میں عطا کروں، کوئی ہے جو مجھ سے مغفرت چاہے اور میں اس کی مغفرت کروں......''

سرکار دو عالم ﷺ کا ارشاد ہے کہ ...''اذان اور تکبیر کے درمیان دعا نہیں ہوتی۔''

''رونے دار کی دعا رد نہیں ہوتی۔''

''سجدے کی حالت میں دعائیں زیادہ قبول ہوتی ہیں۔''

نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ہے کہ ...''بندہ سجدے کی حالت میں اپنے رب سے زیادہ قریب ہوتا ہے، سجدے میں بکثرت دعائیں کیا کرو......'' دوسری جگہ ارشاد فرمایا......

''مجھے رکوع اور سجدے میں قرآن پڑھنے سے منع کیا گیا ہے، اس لیے رکوع میں اللہ تعالیٰ کی عظمت بیان کیا کرو اور سجدے میں دعا کے لیے کوشش کیا کرو...... سجدے اس لیے متعین کیے گئے ہیں کہ تمہاری دعائیں قبول ہوں۔'' سرکار ﷺ نے فرمایا۔

''تمہارا رب حیا والا ہے، کریم ہے۔ اسے اس بات سے شرم آتی ہے کہ اس کا بندہ دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے اور وہ انہیں خالی لوٹا دے۔''

حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ دعا کے لیے اس قدر اٹھایا کرتے تھے کہ بغلوں کی سفیدی ظاہر ہو جاتی تھی۔

آنحضرتؐ کا یہ معمول تھا کہ جب آپ دعا کے لیے ہاتھ پھیلاتے تو اپنے چہرے پر پھیرے بغیر نہ ہٹاتے......

دعا میں قافیہ بندی کا تکلف نہ کرے...... اس لیے کہ دعا مانگنے والے کی حالت آہ وزاری کرنے والے کے مشابہ ہے...... ایسے شخص کو تکلف زیب نہیں دیتا...... بہتر ہے کہ صرف وہی دعائیں مانگے جو ماثورہ منقول ہیں، ہر شخص دعا کے صحیح طریقے سے واقف نہیں...... ایک بزرگ کسی واعظ کے پاس سے گزرے، وہ دعا میں قافیہ بندی کررہا تھا...... بزرگ نے فرمایا...... تم اللہ کے سامنے فصاحت و بلاغت کا مظاہرہ کررہے ہو، میں نے حبیب عجمیؒ کی دعا سنی ہے...... وہ اس سے زیادہ کچھ نہیں کہا کرتے تھے۔

''اے اللہ! ہمیں خالص بنا...... اے اللہ ہمیں قیامت کے روز رسوا مت کرنا...... اے اللہ ہمیں خیر کی

توفیق عطا کر۔"

حضرت حبیب عجمیؒ کی دعاؤں کی برکات مشہور ہے۔ کہتے ہیں جب وہ دعا کرتے تھے تو ایک بڑی تعداد دعا میں شریک ہوتی تھی۔

جو دعائیں سرکار دو عالم ﷺ سے مروی ہیں، ان دعاؤں میں بے ساختگی ہے تکلف اور بناوٹ نہیں...... مثال کے طور پر یہ دعا ہے کہ "میں امن و امان کی درخواست کرتا ہوں وعید کے دن! اور جنت کی درخواست کرتا ہوں ہمیشگی کے دن مقرب بندوں کے ساتھ...... شاہدین کے ساتھ، رکوع کرنے والوں اور سجدہ کرنے والوں کے ساتھ...... اور ان لوگوں کے ساتھ جو عہد پورا کرتے ہیں...... بے شک تو رحیم ہے محبوب ہے تو کرتا ہے جو چاہتا ہے......" اس طرح کی بہت سی دعائیں آنحضرت ﷺ سے منقول ہیں...... اگر کوئی شخص منقول دعائیں نہ پڑھنا چاہتا ہو تو تضرع (رونا، گڑگڑانا) اور انکساری کے ساتھ دعا کرے...... کہ اللہ تعالیٰ کو عبارت آرائی کے بجائے تضرع اور انکساری پسند ہے۔

☆☆☆

"جب اللہ تعالیٰ کسی بندے کو چاہتا ہے تو اسے آزمائش میں مبتلا کر دیتا ہے تاکہ اس کی گریہ وزاری سنے......"

"قبولیت کے یقین کے ساتھ دعا مانگو اور یہ جان لو کہ اللہ تعالیٰ غافل دل کو قبول نہیں کرتا۔"

"جب تم دعا کرو تو رغبت زیادہ رکھو اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کے لیے کوئی چیز بڑی نہیں ہے۔" دعا کے الفاظ تین بار کہے...... آنحضرت ﷺ تین مرتبہ دعا فرماتے اور تین مرتبہ سوال کرتے، اگر دعا کی قبولیت میں تاخیر ہو تو مایوس ہونے کی ضرورت نہیں ہے، آنحضرت ﷺ ارشاد فرماتے ہیں کہ تمہاری دعا اس وقت قبول ہوگی جب تم جلدی نہ کرو گے اور یہ نہ کہو گے کہ میں نے دعا کی تھی مگر قبول نہیں ہوئی۔ جب دعا کرو تو بار، بار سوال کرو اس لیے کہ تم رب کریم سے دعا کر رہے ہو۔" اللہ کی حمد وثنا سے دعا کی ابتدا کرو۔

حضرت ابو سلیمان دارانیؒ فرماتے ہیں کہ جو شخص اللہ سے کچھ مانگنا چاہے اسے اپنی دعا کے اول و آخر درود شریف ضرور پڑھنا چاہیے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ دونوں درود قبول کرلے گا تو رب کی شان سے یہ ممکن ہی نہیں کہ دونوں درودوں کے درمیان کی دعائیں رد فرمادے۔

☆☆☆

دعا کا تعلق باطن سے ہے۔ قبولیت کا اصل اور قریب ترین سبب یہ ہے کہ بارگاہِ خداوندی میں صدقِ دل سے توبہ کرے اور حقداروں کے حقوق ادا کرے۔

بنی اسرائیل میں ایک مرتبہ زبردست قحط پڑا۔ حضرت موسیٰؑ اپنی قوم کے ساتھ تین بار شہر سے باہر تشریف لے گئے اور بارش کے لیے دعا کی لیکن دعا قبول نہیں ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو بذریعۂ وحی مطلع فرمایا...... کہ میں تمہاری قوم کی دعا قبول نہیں کروں گا کیونکہ تم لوگوں میں ایک چغل خوری کی عادت میں مبتلا ہے۔" حضرت موسیٰؑ نے عرض کیا۔ "یا اللہ ہمیں بتلا دیجیے کہ وہ کون شخص ہے تاکہ ہم اسے الگ کردیں۔" حکم ہوا...... "اے موسیٰؑ چغلی سے میں تم کو منع کرتا ہوں اور میں ہی چغلی کھاؤں......" آپ نے بنی اسرائیل کو کہا کہ تم سب چغلی سے توبہ کرو سب نے توبہ کی...... اس وقت مینہ برسنے لگا۔

☆☆☆

حضرت مالک بن دینارؒ فرماتے ہیں کہ بنی اسرائیل پر قحط پڑا۔ وہ کئی بار بارش کے لیے نکلے لیکن بارش نہیں برسی ان کے پیغمبر پر وحی ہوئی کہ ان سے کہہ دو کہ تم میری طرف ناپاک بدنوں سے نکلتے ہو اور وہی ہاتھ میرے سامنے پھیلاتے ہو، جن سے بہت سے خون کیے اور تم نے اپنے پیٹوں کو حرام سے بھر رکھا ہے، اب میرا غصہ تم پر زیادہ ہوگیا ہے...... اور دوری کے سوا تم کو مجھ سے ہرگز کچھ نہیں ملے گا۔

حضرت عطا سلمیؒ کہتے ہیں کہ ایک سال

زبردست قحط پڑا، ہم سب بارش کی دعا کے لیے آبادی سے باہر پہنچے...... قبرستان میں اچانک حضرت سعدون مجنون سے ملاقات ہوگئی انہوں نے مجھ سے دریافت کیا...... ''عطا! کیا قیامت کا دن ہے یا قبروں سے لوگ نکل کھڑے ہوئے ہیں؟'' میں نے عرض کیا...... ''نہ قیامت کا دن ہے اور نہ لوگ قبروں سے نکلے ہیں...... یہ تو شہر کے لوگ ہیں جو بارش کی دعا کے لیے آئے ہیں۔'' سعدون نے پوچھا...... ''کون سے دلوں سے دعا مانگنے آئے ہو، آسمانی دلوں سے یا زمینی دلوں سے؟'' میں نے جواب دیا۔ ''آسمانی دلوں سے۔'' انہوں نے کہا...... ''اے عطا! لوگوں سے کہہ دو کہ وہ کھوٹے سکے نہ چلائیں، پرکھنے والا بڑا بینا ہے، وہ تمہارے دامِ فریب میں گرفتار نہیں ہوگا۔'' پھر انہوں نے آسمان کی طرف دیکھا اور ربِ کائنات کے حضور یہ دعا کی ''اے اللہ! تو اپنے بندوں کے گناہوں کی وجہ سے اپنے شہروں کو برباد مت کر...... بلکہ اپنے اسمائے مکنون کے صدقے میں اور ان نعمتوں کے طفیل میں جو پردۂ غیب سے ظاہر نہیں ہوتیں، بکثرت میٹھا پانی عطا فرما...... تاکہ اس پانی کے ذریعے تیزی زمین سیراب ہو اور تیرے بندے اپنی پیاس بجھائیں تو ہر چیز پر قادر ہے۔'' راوی کہتے ہیں کہ سعدون مجنون ابھی دعا ختم بھی نہیں کر پائے تھے کہ آسمان پر بادل چھا گئے اور موسلا دھار بارش شروع ہوگئی۔

سعدون یہ کہتے ہوئے چل دیے......

ترجمہ...... ''زاہد و عابد لوگ فلاح یاب ہوئے کیونکہ انہوں نے اپنے رب کے لیے فاقہ کشی کی ہے، وہ اپنی بیمار آنکھوں کو حق کی محبت کے لیے نیند سے دور رکھتے ہیں، رات گزر جاتی ہے اور وہ جاگتے رہتے ہیں، اللہ کی عبادت میں اس قدر مشغول ہیں کہ لوگ ان کو پاگل سمجھتے ہیں۔''

☆☆☆

ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں طواف کر رہا تھا میری نگاہ ایک عورت پر پڑی جس کے کندھے پر ایک چھوٹا سا بچہ تھا اور وہ بار، بار کہہ رہی تھی کہ یا کریم یا کریم عہدک القدیم...... میں نے اس عورت سے دریافت کیا...... کہ تیرے اور اللہ کے درمیان کیا عہد ہے..... تب اس عورت نے بتایا کہ ایک بار میں کشتی میں سوار ہوئی، تاجروں کی جماعت بھی ہمارے ساتھ تھی۔ اتفاقاً بہت زور کا طوفان آیا اور کشتی غرق ہوگئی۔ صرف ایک تختے پر میں میرا بچہ اور ایک حبشی مرد جو دوسرے تختے پر تھا سلامت رہے...... جب صبح ہوئی تو وہ حبشی مرد پانی کو ہٹاتے، ہٹاتے میرے قریب آیا اور ہمارے تختے پر سوار ہوگیا...... اس کے ناپاک ارادے کو دیکھ کر میں نے اس کو کہا۔ اے بندۂ خدا، ہم اس مصیبت میں گرفتار ہیں اور تو اپنی شیطانی ہوس کو پورا کرنا چاہ رہا ہے...... میرے انکار پر اس حبشی مرد نے ہاتھ لمبا کر کے میرے بچے کو جو میری گود میں تھا اٹھا کر دریا میں ڈال دیا...... میں نے آسمان کی جانب نگاہ کی...... اور اپنے مہربان رب کو پکارا...... ''اے اللہ...... !تو اس آدمی کے قلبی ارادوں کے درمیان حائل ہونے والا ہے۔ اپنی طاقت اور قدرت سے میرے اور اس کے درمیان دوری کردے کہ تو سب چیزوں پر قادر ہے۔'' قسم ہے اللہ کی میں ابھی ان کلمات کو پورا ابھی نہ کر پائی تھی کہ ایک جانور منہ کھولے ہوئے دریا سے نکلا اور اس حبشی کو نگل گیا...... اور غوطہ لگا کر پانی کی تہ میں چلا گیا...... اور اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے اپنی قوت سے مجھے اس شخص سے بچالیا کہ وہ ہر چیز پر قادر ہے...... پھر موجیں مجھے دھکیلتی ہوئی ایک جزیرے پر لے گئیں۔ میں نے سوچا کہ یہاں کی سبزی اور پانی پر گزارہ کروں گی جب تک اللہ میری نجات کی کوئی صورت پیدا نہ کردے...... کہ وہی نجات دینے والا ہے، اس طرح چار روز اور گزر گئے۔ پانچویں دن دور سے ایک کشتی نظر آئی میں نے ٹیلے پر چڑھ کر ان کی طرف اشارہ کیا...... ان میں سے تین آدمی ایک ناؤ پر سوار ہو کر میری طرف آئے اور مجھے لے کر کشتی میں داخل ہوئے...... میں جب کشتی میں داخل ہوئی تو کیا

دیکھتی ہوں کہ میرا بچہ جس کو اس حبشی نے دریا میں ڈال دیا تھا ایک شخص کے پاس ہے۔ یہ دیکھ کر مجھ سے رہا نہ گیا۔ اور بے ساختہ آگے بڑھ کر اس شخص سے بچہ لے کر چومنے لگی۔ اور کہا یہ میرا بچہ ہے میرے جگر کا ٹکڑا ہے، کشتی والے کہنے لگے تم پاگل ہو دیوانی ہو یا تمہاری عقل ماری گئی ہے، تب میں نے کہا کہ میں پاگل نہیں ہوں پھر سارا ماجرا ان کو سنایا...... میرا واقعہ سن کر ان لوگوں نے سر جھکا لیا پھر بولے اے لڑکی...... تو نے عجیب قصہ سنایا ہم بھی تجھے اپنی بات سناتے ہیں۔ جو تمہارے لیے بھی تعجب کا باعث ہوگا...... ہم کشتی میں سوار چل رہے تھے کہ ایک بڑا دریائی جانور ہمارے سامنے آ کھڑا ہوا...... یہ بچہ اس کی پشت پر تھا اور ایک منادی آواز دے رہا تھا کہ اگر تم لوگ اس بچے کو لے کر نہ چلو گے تو تم ہلاک ہو جاؤ گے...... چنانچہ ہم میں سے ایک آدمی آگے بڑھا اور اس دریائی جانور کی پشت سے اس بچے کو لے آیا۔ اس کے کشتی پر آتے ہی وہ جانور غوطہ مار کر غائب ہو گیا...... ہمیں اس سے بھی اور تیرے بیان کیے ہوئے قصے بھی بہت تعجب ہوا...... چنانچہ ان سب نے اللہ کی بارگاہ میں توبہ کی...... اور اس عظیم رب کا شکر ادا کیا...... جو اپنے مظلوم بندوں کی دعاؤں کو سنتا ہے اور مصیبت زدہ کی مدد کرتا ہے...... بے شک پاک ہے وہ اپنے بندوں پر لطف کرنے والا...... سبحان اللہ......

☆☆☆

ایک بار بغداد کا ایک مشہور تاجر ابو غالب فضل اللہ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی مجلس میں حاضر ہوا۔ اور آپ کو دعوت دی...... ''سیدی! دعوت قبول کرنا مسنون ہے، اس لیے آپ مجھ گناہ گار کی دعوت بھی قبول فرمائیں۔''

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کچھ دیر سر جھکائے سوچتے رہے۔ اہلِ مجلس کو خیال گزرا کہ آپؒ انکار فرما دیں گے کیونکہ آپؒ دولت مندوں کے مکان پر تشریف نہیں لے جاتے تھے اور نہ کسی امیر کبیر شخص کی دعوت قبول فرماتے تھے۔ تاجر امید و ناامیدی کی حالت میں بیٹھا رہا...... تب شیخ نے تاجر کی دعوت قبول فرمالی۔

تاجر نے نہایت پُرتکلف دعوت کا اہتمام کیا......
جب حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ ابو غالب کے مکان پر تشریف لے گئے تو وہاں پہلے ہی شہر کی معزز ترین ہستیاں موجود تھیں۔ دسترخوان بچھایا گیا۔ انواع و اقسام کے لذیذ کھانے چنے گئے۔ آخر میں ابو غالب کے دو ملازم ایک بہت بڑا مٹکا اٹھا کر لائے۔ اور اسے کمرے کے ایک گوشے میں رکھ دیا۔ حاضرین کی نظریں سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے چہرۂ مبارک پر مرکوز تھیں مگر آپ سر جھکائے استغراق کے عالم میں تشریف فرما تھے۔

کچھ دیر بعد حضرت شیخ نے حکم دیا کہ مٹکا اٹھا کر آپؒ کے پاس لایا جائے۔ خادم نے وہ مٹکا اٹھا کر شیخ کے سامنے رکھ دیا۔

''اسے کھول دو......'' آپ نے حکم دیا...... جب مٹکے کا منہ کھولا...... تو اس کے اندر ایک جذامی، اپاہج اور نابینا لڑکا تھا......

''ابو غالب......! تم نے اس بچے کو مٹکے میں کیوں قید کر رکھا ہے؟'' حضرت شیخ نے اپنے میزبان سے پوچھا۔

''حضور! میرا بچہ جذام کے مرض میں مبتلا ہے اندھا اور اپاہج ہے، اسے کہاں لے جاؤں؟'' ابو غالب زار و قطار رو رہا تھا۔

سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کھڑے ہوئے اور بیمار لڑکے کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے فرمایا۔ ''بچے! اللہ کے حکم سے باہر آجا اور پروردگار کی اس خوب صورت دنیا کو اپنی آنکھوں سے دیکھ۔'' جیسے ہی حضرت شیخ کی زبان مبارک سے یہ الفاظ ادا ہوئے۔ اپاہج اور جذامی لڑکا اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کی آنکھیں روشن تھیں۔ پھر وہ خوشی کے عالم میں چیختا ہوا ادھر اُدھر دوڑنے لگا۔

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی دعا کا اثر دیکھ کر

تمام حاضرین دم بخود تھے۔ ابو غالب کے مکان میں ایک ہلچل سی مچی ہوئی تھی۔ میزبان اور مہمانوں کی اس بے خبری کے عالم میں سیدنا شیخ کھانا کھائے بغیر وہاں سے چلے آئے۔

☆☆☆

حضرت بابا فرید الدین مسعود گنج شکرؒ اجودھن میں قیام پزیر تھے۔ ایک دن ایک غریب بوڑھی عورت آپ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کرنے لگی......

''میں بیوہ ہوں، اور میری تین جوان بیٹیاں ہیں، آپ دعا فرمادیں کہ ان کی شادی کا بندوبست ہوجائے۔'' بوڑھی عورت کا سوال سن کر حضرت بابا فریدؒ نے اپنے خادم سے فرمایا''آج جس قدر نذریں آئی ہیں وہ ان خاتون کے حوالے کردو۔''

خادم نے شرمندہ ہو کر سر جھکالیا...... ''سیدی آج تو کوئی بھی نذر لے کر حاضر نہیں ہوا'' حضرت بابا فرید کچھ دیر سوچتے رہے اس دوران بوڑھی عورت رونے لگی۔

''میں نے تو آپ کی سخاوت کے بڑے چرچے سنے ہیں، اب میں کہاں جاؤں؟ آپ کے سوا میرا کوئی سہارا نہیں۔''

''سہارا تو صرف اللہ کا ہوتا ہے، اس فقیر کو بھی اسی کا سہارا ہے......'' حضرت بابا فریدؒ نے عورت کو سمجھاتے ہوئے فرمایا۔

عورت اپنی ضرورتوں کی اسیر تھی بابا سے ضد کرتی رہی...... آخر بابا فریدؒ نے کہا۔

''بی بی......! مٹی کا ایک ڈھیلا اٹھالاؤ......'' عورت پہلے تو حیران ہوئی پھر خانقاہ سے باہر جا کر مٹی کا ڈھیلا اٹھالائی۔

حضرت بابا فریدؒ نے بہ آواز بلند تین مرتبہ سورۂ اخلاص پڑھی اور مٹی کے ڈھیلے پر دم کیا...... اہلِ مجلس حیران رہ گئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے مٹی کا وہ حقیر ٹکڑا سونے کی ڈلی میں تبدیل ہوگیا۔

''تمہاری بیٹیوں کی شادی کے لیے یہ کافی رہے گا۔'' حضرت بابا فریدؒ نے سونے کا وہ ٹکڑا عورت کی طرف بڑھاتے ہوئے فرمایا۔

''ہاں یہ بہت ہے۔'' عورت نے سونے کا وہ ٹکڑا لیا اور خانقاہ سے باہر نکل گئی۔ گھر پہنچ کر عورت کی نیت بدل گئی ... سونا بنانے کا نسخہ اس کے ہاتھ آگیا تھا۔ حریص عورت نے غسل کیا صاف کپڑے پہنے اور خوشبو لگائی۔ پھر بڑے، بڑے پتھر سامنے رکھ کر سورۂ اخلاص کا ورد کرنے لگی...... حضرت بابا فریدؒ نے سورۂ اخلاص صرف تین بار پڑھی تھی مگر اس عورت نے اپنے عمل میں شدت پیدا کرنے کے لیے تین سو بار پڑھی اور پتھروں پر دم کردیا...... عورت کا خیال تھا کہ یہ سارے پتھر آن کی آن میں سونے کے بن جائیں گے مگر بار، بار دم کرنے کے باوجود پتھروں میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔

وہ حریص عورت تین دن تک یہی عمل کرتی رہی مگر جب کچھ نہ ہوسکا تو مجبوراً حضرت بابا فریدؒ کی خدمت میں حاضر ہوکر کہنے لگی۔

''آپ نے غسل کیا اور نہ خوشبو لگائی بس تین بار سورۂ اخلاص پڑھی اور مٹی سونا بن گئی...... میں نے پورے گھر کو خوشبو سے مہکا دیا۔ کلام الٰہی کا ورد کرتے، کرتے اپنی زبان گھس ڈالی مگر پتھر، پتھر ہی رہے۔ آخر کیوں......؟''

بوڑھی عورت کی بات سن کر بابا فرید'' مسکرادیے...... ''اللہ نے تمہاری بیٹیوں کی شادی کا بندوبست کردیا...... اس کا شکرادا کرو، اور اپنے ذہن کو دوسرے معاملات میں مت الجھاؤ۔''

مگر نادان عورت پر بابا فریدؒ کی نصیحت کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ ایک ہی ضد کرتی رہی...... ''آخر میرے عمل میں کیا کمی رہ گئی پتھر سونا نہ بن سکا۔''

''تیرے عمل میں کوئی کمی نہیں تھی۔ غسل کا اہتمام تھا، خوشبو کی کثرت تھی محنت تھی...... غرضیکہ تیرے پاس سب کچھ تھا بس تیرے منہ میں فرید کی زبان نہ تھی۔'' یہ کہتے، کہتے حضرت بابا فریدؒ کی آنکھوں میں آنسو آگئے یہ اظہارِ تشکر کے آنسو تھے کہ ربِ عظیم نے اپنے ایک

بندے کی زبان میں (دعا) کیمیائی تاثیر پیدا کر دی تھی۔

☆☆☆

ہمیں روشنی چاہیے تو ہمارے لیے بہترین مینارۂ نور اولیائے کرامؒ صحابہ کرامؓ، آل رسولؐ اور سب سے بڑھ کر آپ ﷺ کی حیات طیبہ ہے..... اگر ہم ذرا سا غور کریں تو پتا چلتا ہے کہ آپ ﷺ نے ساری رات رو، رو کر بہت عاجزی سے گڑ گڑا کر اللہ سے دعائیں مانگیں لیکن کیا کسی بھی موقع پر آپ ﷺ نے کوئی دنیاوی چیز یا آسائش مانگی.....؟ کیا زندگی کے مسائل سے نجات کی دعا مانگی؟ یقیناً نہیں.....تو پھر ہماری دعائیں دنیا تک محدود کیوں رہتی ہیں۔

آپ ضرور دعا مانگیں اور گڑ گڑا کر مانگیں اور وہ مانگیں جو آپ ﷺ مانگا کرتے تھے.....ہم اللہ سے اور اس کے رسول ﷺ کی سنت کے مطابق مانگیں، ہم اللہ سے اپنے گناہوں کی معافی مانگ سکتے ہیں.....اس کی پناہ مانگ سکتے ہیں، شیطان کے خلاف، اللہ سے اس کا رحم مانگ سکتے ہیں اور اگر کہیں اللہ ہمیں توفیق دے تو ہم اللہ سے خود اس کی ذات مانگ سکتے ہیں..... یہ مانگنا ہی تو ہے کہ ہم اس سے اس کی ذات مانگ لیا کریں۔

تو دعا صرف اپنے رب سے مانگیں..... کیونکہ وہی ہماری دعائیں سننے والا ہے۔ دعا گہرے اخلاص اور پاکیزہ نیت سے مانگیں اور اس یقین کے ساتھ مانگیں کہ جس رب سے آپ مانگ رہے ہیں وہ آپ کے حالات کا پورا، پورا علم بھی رکھتا ہے اور آپ پر انتہائی مہربان بھی ہے۔ دعا پوری توجہ، یک سوئی..... اور حضورِ قلب سے مانگیں.....اپنے گناہوں کے انبار پر نگاہ رکھنے کے بجائے اپنے رب کے بے پایاں عفو و کرم اور بے حد و حساب جود و سخا پر نظر رکھیں..... دعا انتہائی عاجزی اور خشوع و خضوع کے ساتھ مانگیں.....اس طرح کہ آپ کا دل اللہ تعالیٰ کی عظمت و جلال سے لرز رہا ہو۔ سر اور نگاہیں جھکی ہوئی ہوں آواز پست ہو اور اعضا ڈھیلے پڑے ہوئے ہوں، آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہوں اور تمام انداز و اطوار سے مسکینی اور بے بسی ظاہر ہو رہی ہو کہ عبدیت کی یہی شان ہے کہ بندہ اپنے پروردگار کو نہایت عاجزی کے ساتھ گڑ گڑا کر پکارے..... دعا کرنے سے پہلے کوئی نیک عمل ضرور کیجیے..... مثلاً صدقہ و خیرات کیجیے..... کسی بھوکے کو کھانا کھلا دیجیے یا نفلی نماز کا اہتمام کیجیے..... اپنے رب کی بار گاہ میں اپنی ضرورت و حاجت رکھنے سے پہلے دو رکعت نماز پڑھیے پھر اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کیجیے اور نبی اکرم ﷺ پر درود بھیجیں۔ اس کے بعد اپنی ضرورت اس کی بارگاہ میں بیان کیجیے..... دعا کی قبولیت کے معاملے میں اپنے رب پر پورا بھروسا رکھیے اگر دعا کے اثرات جلد ظاہر نہ ہوں تو مایوس ہو کر دعا چھوڑ دینے کی غلطی کبھی نہ کیجیے..... قبولیت دعا کی فکر میں پریشان ہونے کے بجائے صرف دعا مانگنے کی فکر کیجیے..... برابر دعا کرتے رہیے..... اللہ کے حضور اپنی عاجزی، احتیاج اور عبدیت کا اظہار خود ایک عبادت ہے۔ مومن کی شان ہی یہ ہے کہ وہ رنج و راحت، دکھ، سکھ، تنگی و خوشحالی، مصیبت و آرام بہرحال میں اپنے اللہ کو ہی پکارتا ہے۔ اس کے حضور اپنی حاجتیں رکھتا ہے اور مستقل اس سے خیر کی دعائیں کرتا رہتا ہے۔ اور سب سے اہم بات یہ کہ دعا کا خاتمہ آخر میں (آمین) کہہ کر کرے..... اگر اس نے ایسا کیا تو بس اللہ تعالیٰ سے طے کرا لیا۔

☆☆☆

اے اللہ.....! اس مضمون کو تحریر کرتے ہوئے مجھ سے دانستہ یا نادانستہ کوئی غلطی کوئی کوتاہی یا کوئی کمی ہو گئی ہو تو میرے رب اپنی اس حقیر بندی کو معاف فرما دے کہ تو بہت معاف کرنے والا رب ہے..... آمین۔

اس مضمون کی تیاری میں سات مستند کتب سے مدد لی گئی ہے۔

# سندھ میں شادی کی رسمیں

رفعت شبانہ

ہمارا معاشرہ رسومات سے عبارت ہے ہم کتنے بھی جدت پسند ہو جائیں لیکن ہماری جڑیں اسی معاشرے سے جڑی ہوئی ہیں، کوئی بھی تہوار یا شادی ان رسومات کے بغیر ادھوری ہوتی ہے۔ حالانکہ ان تمام رسومات کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

ہمارے ملک پاکستان میں مختلف زبانوں کے لوگ رہتے ہیں۔ یعنی پاکستان مختلف پھولوں کا گلدستہ ہے۔ ہر ایک کے رسم و رواج، طور طریقے ملبوسات اور رہن سہن تھوڑے بہت فرق کے ساتھ بہت حد تک ملتے جلتے ہیں۔

میرا تعلق کراچی سے ہے، میں اسی شہر میں پیدا ہوئی، تعلیم اسی شہر میں حاصل کی لیکن شادی سندھ کی ایک فیملی میں ہوئی۔ جن کا تعلق لاڑکانہ سے ہے۔

میری شادی میں ویسے تو کوئی خاص رسم نہیں ادا کی گئی لیکن شادی کے بعد میں سسرالی رشتے داروں، بھانجوں، بھتیجوں کی شادیوں میں شرکت کرتی رہی ہوں اس لیے وہاں کی رسومات کا مجھے اندازہ ہے۔ ویسے تو مجھے عام طور پر رسومات پسند نہیں ہیں لیکن ناپسندیدگی کے باوجود میں نے ان میں شرکت کی ہے۔

سب سے پہلے وہاں مایوں کی رسم ہوتی ہے جس میں دلہن کے منہ پر ایک پیلے رنگ کا ماسک سی کر باندھ دیا جاتا ہے جس میں آنکھیں کھلی ہوتی ہیں اور دلہن اپنی اسی ایک جگہ رخصتی تک رہتی ہے۔ ابٹن بھی وہیں لگایا جاتا ہے اور وہ پیلے کپڑوں میں ہی پورا وقت رہتی ہے۔ ابٹن لگانے کے لیے باہر سے کسی ماہر عورت کو بلایا جاتا ہے۔ دو تین دن کے بعد مہندی کی رسم ہوتی ہے جن کو وہ ''بکی'' کہتے ہیں۔ اس میں تمام برادری والے شرکت کرتے ہیں۔ باہر سے ناچنے والی میراثنوں کو بلایا جاتا ہے تین چار گھنٹے وہ ناچتی ہیں اور جتنے بھی مہمان ہوتے



رفعت شبانہ اور ان کے شوہر تاج محمد انصاری

ہیں اور گھر والے سب ایک دوسرے کے سروں پر رکھ کر پیسے دیتے ہیں۔ جسے ''گھور'' (ghor) کہتے ہیں پھر کھانا ہوتا ہے زیادہ تر پلاؤ بنتا ہے۔

پھر دلہن کے گھر سب جاتے ہیں اور اس کی رسم کرتے ہیں۔

دلہن کے سر پر تیل لگاتے ہیں، منہ میٹھا کرتے ہیں اور اس کے ہاتھ پر پیسے رکھتے ہیں۔ جسے وہ خرچی کہتے ہیں اور دلہن کی چوٹی کا ایک بل کھول دیتے ہیں

اس طرح سات سہاگنیں دلہن کی چوٹی کے سات بل کھولتی ہیں۔

یہ سب ان کی مہندی والے دن ہوتا ہے اور رات بھر سب جاگتے ہیں۔ اور خوب ہلا گلا کرتے ہیں۔

مہندی کے اگلے دن رخصتی ہوتی ہے، سب لوگ مختلف تیاریاں کررہے ہوتے ہیں، اگر سردیاں ہوتی ہیں تو دولھا کے لیے بصری (busri) بنائی جاتی ہے یہ اس طرح ہوتی ہے جیسے کہ ہمارے گھروں میں دال بھری یا آلو بھری روٹی ہوتی ہے بصری میں گڑ چل کر باریک کرلیا جاتا ہے اور اس کو روٹی میں بھر کر اصلی گھی کے ساتھ پکایا جاتا ہے۔ پھر دوپہر تک گھر کے سارے مرد جمع ہوتے ہیں اور پھر دولھا کے بازو پر امام ضامن باندھا جاتا ہے جس کو کھانا کہتے ہیں۔ دعا کرائی جاتی ہے اور پھر لنچ بکس بٹتے ہیں اور پھر دو تین بجے تک تمام خواتین اور مرد ایک جگہ جمع ہوجاتے ہیں وہاں دولھا کو ایک صوفے پر بٹھایا جاتا ہے اور پھر سب رشتے دار خاص طور پر نوٹوں کے ہار اس کے گلے میں ڈالتے ہیں۔ دولھا کے علاوہ اس کے ماں اور باپ کو بھی ہار پہنائے جاتے ہیں۔ ان ہاروں کے پیچھے دینے والوں کے نام بھی لکھے ہوتے ہیں پھر دوپہر کا کھانا ہوتا ہے۔ جو پانچ بجے تک جاری رہتا ہے اس دوران خوب ڈانس ہوتا ہے رات گئے تک یہ سلسلہ جاری رہتا ہے پھر تقریباً نو دس بجے دلہن کو پارلر لے جایا جاتا ہے وہاں دلہن تیار ہوتی ہے ادھر دوبارہ رات کا کھانا ہوتا ہے۔ سارے لوگ دوبارہ تیار ہوتے ہیں پھر تقریباً گیارہ بجے نکاح ہوتا ہے پھر دلہن بھی پارلر سے تیار ہوکر آجاتی ہے پھر زمین پر ایک بڑا قالین بچھایا جاتا ہے۔ خاندان کے سارے لوگ جمع ہوتے ہیں وہاں پر دلہن اور دولھا کو آمنے سامنے بٹھاتے ہیں۔ ان کے ساتھ بہت ساری خواتین بھی بیٹھتی ہیں اور ایک قریبی رشتے دار خاتون قریب بیٹھ کر تمام رسومات کرتی ہے۔ اس میں دلہن قالین پر لال کپڑے پر بیٹھتی ہے پھر وہاں دولھا کو لایا جاتا ہے وہ آکر ایک گھڑے (مٹی کا) پر پاؤں رکھ کر اس کو توڑتا ہے یعنی طاقت کا مظاہرہ کرتا ہے اور پھر دلہن کے سامنے بیٹھتا ہے۔

آرسی مصحف ہوتا ہے۔ یہ قریبی رشتے دار آکر دلہن اور دولھا کے ٹکریں مارتے ہیں یعنی دلہن کے سر کو دولھا کے سر سے ٹکراتے ہیں اور پھر خرچی دیتے ہیں (مردیوں کی صورت) دولھا کو گلاس سے دودھ پلایا جاتا ہے دونوں ایک دوسرے کا جھوٹا دودھ پیتے ہیں۔ دولھا، دلہن کے ہاتھ میں چاول دیتا ہے، دلہن، دولھا کے ہاتھ میں دیتی ہے تاکہ آپس میں محبت اور برکت رہے۔

روئی یا کپاس توڑ کر ایک دوسرے کو دیتے ہیں، ان تمام رسومات کے بارے میں اگر پوچھو کہ یہ کیوں کرتے ہیں تو معلوم نہیں، ہمارے آباؤ اجداد کرتے رہے ہیں اس لیے ہم بھی کرتے ہیں۔

ان تمام رسومات کو کرتے، کرتے رات کے دو تین بج جاتے ہیں اور پھر تاروں کی چھاؤں میں دلہن رخصت کردی جاتی ہے۔ دوسرے دن ولیمہ ہوتا ہے۔

یہاں کی شادیوں کی سب سے خاص بات یہ ہے کہ سارا خرچہ دولھا والے کرتے ہیں۔ (زیادہ تر معاشروں میں یہی .... ہوتا ہے سوائے انڈو پاک کے) دولھا والے (جتنے دن بھی فنکشن ہوتا ہے) پورا کھانا وہی بنواتے ہیں اگر چار دن شادی ہوگی تو چاروں دنوں کا کھانا دولھا پکوائے گا۔ شادی والے دن بھی دلہن والوں کو کھانا دے گا جو وہ اپنے مہمانوں کو کھلائیں گے۔

دلہن والے صرف جہیز اور زیور دلہن کو دیتے ہیں، دولھا والے دلہن کو شادی کا جوڑا دیتے ہیں اور دلہن والے دولھا کو۔

دولھا والے ساری برادری کے بڑے لوگوں کو جوڑے دیتے ہیں یعنی ہر گھر میں ماں، باپ کو یا گھر کے بڑے کو۔

صبح دلہن کی ماں کے گھر سے بھرپور ناشتا آتا ہے۔ پھر صبح دولھا گھر کے بڑوں کو سلام کرنے جاتا ہے وہاں دولھا کو سب پیسے دیتے ہیں جس کو خرچی کہتے ہیں۔ غرضیکہ ہر جگہ کی الگ، الگ رسمیں اور رواج ہیں اور یہ سب خوشی سے کی جاتی ہیں۔



# پاکیزہ کے مہمان

شائستہ زریں

## ابھرتی ہوئی گلوکارہ

## شیریں نوا سارہ رضا خان سے تفصیلی ملاقات

قارئین کرام! السلام علیکم! آپ کے لیے ایک اور نیا دلچسپ اور بھرپور سلسلہ لیے حاضر ہیں جس میں فنونِ لطیفہ سے تعلق رکھنے والی شخصیات سے تفصیلی ملاقات کروائی جائے گی اس سلسلے میں نوجوان نسل کی نمائندہ مغنیہ سارہ رضا خان آج ہمارے ساتھ ہیں۔

اس غیرتِ ناہید کی ہر تان ہے دیپک
شعلہ سا لپک جائے ہے آواز تو دیکھو

وہ شیریں سخن ہے جو نہایت کمسنی میں منظرِ عام

پر آئی اور چھا گئی گویا ''وہ آئی، گنگنائی اور فتح کر لیا''
اپنی میٹھی آواز سے سماعتیں معطر اور دلوں کو تسخیر کرنے والی سارہ رضا خان نے موسیقی کی دنیا میں قدم رکھا اور پھر قدم بڑھاتی چلی گئیں۔ سارہ یہ سفر..... نہایت محبت، عقیدت اور مشقت سے طے کر رہی ہیں جب ہی ہر گام پر کامیابی ان کی منتظر رہتی ہے۔ عوام کی جانب سے ملنے والے بے حساب ریوارڈ سارہ رضا کا قیمتی اثاثہ ہیں۔ سارہ کو اگر اس بات پر فخر ہے کہ موسیقی کے حوالے سے ہمارے یہاں صلاحیتوں کی کمی نہیں تو بہت ملال ہی نہیں بلکہ گلہ بھی ہے اس بات کا کہ ان کی قدر نہیں بالخصوص نو آموز فنکاروں کی موسیقی کی تربیت کے لیے حکومتی سطح پر کوئی اقدامات نہیں کیے گئے، کوئی ایسا مستند سرکاری ادارہ نہیں۔ جو موسیقی کو فروغ دے سکے۔ سارہ کو اردو، پنجابی، سرائیکی، سندھی، انگریزی اور چینی زبانوں میں گانے پر عبور حاصل ہے۔ مدھر آواز کی مالک سارہ رضا خان اور کیا کہتی اور کیا چاہتی ہیں۔ آپ بھی پڑھیے۔

پاکیزہ ✧......سارہ! ماشاء اللہ آپ کا نام بہت پیارا ہے۔ کس نے نام تجویز کیا؟

سارہ رضا خان ❖......بہت شکریہ، آپ نے میرے نام کی تعریف کی مجھے خود بھی اپنا نام بہت پسند ہے مجھ سے سات سال بڑے میرے بھائی کو مجھے دیکھتے ہی..... اپنی انگریزی کی کتاب کی سارہ یاد آ گئی انہوں نے کہا یہ بھی اسی کی طرح good girl ہے اس کا نام سارہ رکھیے۔ یوں میرا نام سارہ رکھ دیا۔

پاکیزہ ✧......سارہ یعنی ''خوشی دینے والی'' کہا جاتا ہے کہ نام کا اثر شخصیت پر پڑتا ہے آپ کا تجربہ کیا کہتا ہے؟

سارہ رضا خان ❖......وہی جو عام خیال ہے۔ الحمدللہ اکثر لوگوں کو میری ذات سے خوشیاں ملتی ہیں، میری دعا ہے کہ یونہی میں لوگوں میں خوشیاں بانٹتی رہوں (آمین)

پاکیزہ ✧......اپنے خوش لحن ہونے کا احساس کب اور کیسے ہوا؟

سارہ رضا خان ❖......میں نے بہت کم عمری میں بولنا شروع کر دیا تھا اللہ کے فضل سے حافظہ بھی بہت اچھا ہے۔ میرے پاپا مرحوم قاری قدیر احمد خان بہت عمدہ نعت خواں تھے۔ ان سے نعتیں سن، سن کر میں بھی نعتیں پڑھنے لگی۔ اس وقت میں دو، ڈھائی سال کی تھی۔ سب میری آواز کی تعریف کرتے تو میرا حوصلہ بڑھتا۔

پاکیزہ ✧......رضا آپ کے پاپا کے نام کا جز نہیں ہے پھر آپ اپنے نام کے ساتھ رضا کیوں لگاتی ہیں؟

سارہ رضا خان ❖......اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خان بریلوی رحمتہ اللہ علیہ سے پاپا کو والہانہ عقیدت و محبت تھی اس لیے آپؒ کے اسمِ گرامی کی نسبت سے پاپا نے ہم سب بہن بھائیوں کے نام کے ساتھ رضا لگایا ہے۔ اور یہ اسی نسبت کا اعجاز ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے بہت نوازا ہے۔

پاکیزہ ✧......پہلی مرتبہ اپنے فن کا مظاہرہ کب اور کہاں کیا؟

سارہ رضا خان ❖......نو برس کی عمر میں کیو ٹی وی کے کُل پاکستان مقابلہ نعت خوانی میں صوبہ پنجاب سے شرکت کی۔ فائنل کے لیے منتخب ہوئی اور فائنل میں دوسرا انعام حاصل کیا۔

پاکیزہ ✧......کون سا نعتیہ کلام پڑھا تھا؟

سارہ رضا خان ❖......علامہ اقبال کا نعتیہ کلام پڑھا تھا۔

لوح بھی تو قلم بھی تو تیرا وجود الکتاب

کمپوزیشن بھی میری تھی۔

پاکیزہ ✧......ماشاء اللہ اتنی کم عمری میں آپ نے مشکل کلام کا انتخاب کیا۔ اس حوالے سے کوئی ایسا تعریفی فقرہ جس نے آپ کے اعتماد کو مزید جلا بخشی؟

سارہ رضا خان ❖......ماما میرے ساتھ تھیں۔ پروگرام کے پروڈیوسر نے میری نعت خوانی کو بہت سراہا اور ماما سے کہا کہ اسے باقاعدہ موسیقی کی تربیت دلوائیں۔

پاکیزہ ✧......ماما نے اس پر عمل کیا؟

سکھاؤں گا لیکن اس کو درمیان سے نہیں چھوڑنا ہے، مکمل کرنا ہے اگر آپ راضی ہیں تو آجایئے گا۔



پاکیزہ ✧......ان کے دل میں یہ خیال کیوں آیا کہ آپ درمیان سے چھوڑ دیں گی؟

سارہ رضا خان ❖......اکثر یہ کہہ کر کہ موسیقی گناہ ہے چھوڑ کر چلے جاتے ہیں، ماما نے کئی کتابوں کا مطالعہ کیا، مطمئن ہونے کے بعد سر رؤف کی شاگردی میں مجھے دے دیا۔ میں نے بہت محنت اور لگن سے کم عرصے میں سیکھ لیا۔

پاکیزہ ✧......موسیقی کا مطلب کیا ہے؟

سارہ رضا خان ❖......ہوا میں گرہ لگانا۔

پاکیزہ ✧......ارے یہ تو کارِ محال ہے، کیسے کرلیا؟

سارہ رضا خان ❖......یقیناً مشکل بلکہ مشکل ترین کام ہے۔ اللہ کی رضا کے بغیر میں یہ کام کر ہی نہیں سکتی۔ اللہ نے کروالیا اور میں نے کرلیا۔

پاکیزہ ✧......موسیقی کی تربیت کے ابتدائی دور میں کسی تقریب میں ہنر آزمایا؟

سارہ رضا خان ❖......الحمرا آرٹس کونسل لاہور کی جانب سے گورنر ہاؤس پنجاب میں محفلِ موسیقی کا اہتمام کیا گیا اس وقت کے صدرِ پاکستان جناب پرویز مشرف بھی تقریب میں موجود تھے۔

پاکیزہ ✧......آپ نے کیا سنایا تھا؟

سارہ رضا خان ❖......چندا توری چاندنی میں جیا

سارہ رضا خان ❖......ماما نے میرے شوق کو پروان چڑھانے میں اہم کردار ادا کیا۔ انہوں نے فوری اس جانب توجہ دی۔ ان دنوں ماما ایوانِ اقبال میں علامہ اقبال کا فارسی کلام سیکھنے جاتی تھیں ایوانِ اقبال کے ساتھ ہی الحمرا آرٹس کونسل لاہور ہے۔ وہاں ماما نے سر رؤف سے ملاقات کر کے میری موسیقی کی تربیت کے لیے بات کی تو انہوں نے مجھ سے کچھ سنانے کو کہا تب میں نے انہیں نیرہ نور جی کی مشہور غزل ؎ ہر چند سہارا ہے تیرے پیار کا دل کو۔ سنائی سر رؤف سن کر حیران ہوئے اور بہت خوش بھی انہوں نے ماما سے کہا کہ اس کی آواز میں ''مُرکیاں'' ہیں۔ میں اسے

جلا جائے رے اور اکھیاں چھم چھم وسیاں...

پاکیزہ ✧......آپ کی عمر کے لحاظ سے مشکل انتخاب تھا حاضرین کو پسند آیا؟

سارہ رضا خان ❖......جی ہاں بہت زیادہ، جب میں سنا کر جانے لگی تو سب نے کھڑے ہو کر مجھے داد دی۔ جناب پرویز مشرف نے حیرت و مسرت سے کہا تم نے گالیا۔ میں نے ہنس کر کہا جی میں نے گا لیا۔ الحمرا آرٹس کونسل کی جانب سے مجھے ۲۵ ہزار کیش کا انعام دیا گیا۔ اس کے بعد ۱۱، اگست کو اپنی سالگرہ کے موقع پر صدر مشرف نے اسلام آباد بلایا۔ نیرہ نور جی مدعو تھیں ان کی موجودگی میں گانا میرے لیے بہت فخر کی بات تھی۔ اس وقت تک مجھے صرف نو گانے یاد تھے، میں نے وہی سنا دیے۔ صدر مشرف نے بھی میرے ساتھ گایا۔ ۵۰ ہزار روپے نقد انعام میں دیے مجھے بہت خوشی ہوئی اپنی مرضی کے گانے گائے اور انعام میں اتنے سارے پیسے۔ اس کے بعد آرمی آفیسرز اور کور کمانڈرز نے اپنی تقریبات میں بلانا شروع کر دیا۔

پاکیزہ ✧......موسیقی کے کون سے ٹی وی شو میں پہلی مرتبہ حصہ لیا؟

سارہ رضا خان ❖...... A TV کا شو تھا ''مستی ہی مستی'' گئی تو میں وہاں گانے کے لیے تھی اور آڈیشن کے بعد میرا گانا منتخب بھی ہو گیا اور میں نے گایا بھی لیکن میں بہت زیادہ بول رہی تھی۔ پروڈیوسر نے میری پوشیدہ صلاحیت کو بھانپ لیا تھا انہوں نے میرا کمپیئرنگ کا آڈیشن لیا۔ اور مجھے بطور معاون کمپیئر رکھ لیا اور کچھ عرصے بعد مجھے اس پروگرام کی ہوسٹ بنا دیا گیا۔

پاکیزہ ✧......گویا ہوسٹ سنگر پر حاوی ہو گئی؟

سارہ رضا خان ❖......(ہنستے ہوئے) بالکل بھی نہیں۔ ہر پروگرام میں گانا گاتی تھی میں۔

پاکیزہ ✧......تجربہ کیسا رہا؟ آئندہ کامیابیوں کے لیے راہ ہموار ہو گئی؟

سارہ رضا خان ❖...... بلاشبہ یہ ایک کامیاب تجربہ تھا۔ مجھے بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملا خاص طور پر یہ کہ کیمرا اور لائٹس کیا ہے؟ پروگرام کیسے کرتے ہیں؟ اور پھر میری کامیابی کے لیے دروازے کھلتے چلے گئے۔ ناظرین کی کثیر تعداد نے مجھے سراہا تھا۔

پاکیزہ ✧......کون سا ٹی وی شو وجہ شہرت بنا؟

سارہ رضا خان ❖......انڈین شو: ''سارے گاما پا'' سے عالمی سطح پر مقبولیت اور شہرت ملی۔

پاکیزہ ✧......''سارے گاما پا'' میں آپ کا انتخاب کس بنیاد پر کیا گیا؟

سارہ رضا خان ❖......استاد غلام علی خان صاحب نے ''مستی ہی مستی'' میں میری پرفارمنس سے متاثر ہو کر مجھے فون کیا تھا کہ آپ کو انڈیا مقابلے کے لیے بھیج رہے ہیں۔ میرے اور امی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ موسیقی کی دنیا کی اتنی بڑی ہستی مجھے فون کرے گی۔ سارے گاما پا کے کوآرڈینیٹر نے میرا ٹکٹ بھیجا تو میں نے انکار کر دیا کہ اپنی ماما کے بغیر میں کہیں نہیں جاتی پھر انورادھا کا فون آیا کہ ہم نے آپ کی ماما کا ٹکٹ بھی کرا دیا ہے یوں ہم سارے گاما پا کے لیے انڈیا چلے گئے۔

پاکیزہ ✧......اتنے بڑے شو میں پاکستان کی نمائندگی کرنا کیسا لگ رہا تھا؟

سارہ رضا خان ❖...... بہت اچھا، بہت لطف آیا۔ سب نے میری بہت حوصلہ افزائی کی۔

پاکیزہ ✧......ایسا مرحلہ آیا کہ خود کو پاکستان کا سفیر ثابت کیا؟

سارہ رضا خان ❖......یقیناً...... چونکہ مقابلۂ موسیقی پاک بھارت کے درمیان تھا اس لیے چودہ اور پندرہ اگست مل کر منائی تھی۔ تب انہوں نے مجھ سے سوال کیا کہ آزادی سے پہلے ہم ساتھ تھے، دکھ نہیں ہوتا کہ اس دھرتی کے دو حصے ہو گئے؟ جواباً میں نے کہا کہ ''جب دو بھائیوں کی شادی ہوتی ہے اور وہ الگ، الگ گھر میں رہنے لگتے ہیں لیکن کھڑکیاں اور دروازے کھلے رکھتے ہیں۔ ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں شریک ہوتے ہیں ہم الگ ملک ضرور ہیں لیکن ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں شریک ہیں۔'' میرے جواب پر سب نے



کھڑے ہو کر خوشی کا اظہار کیا۔

پاکیزہ ✧......سارے گاماپا کا کوئی اعزاز؟

سارہ رضا خان ❖...... ہر راؤنڈ میں منتخب ہوئی۔ ہاں ایک راؤنڈ میں گولڈ کی چین ملی، آشا بھوسلے جی نے بہت پیار دیا اور حوصلہ افزائی کی اور سب سے بڑا اعزاز تو یہ ہے کہ مجھے ''دخترِ پاکستان'' کا خطاب ملا۔

پاکیزہ ✧......سارے گاماپا کتنے عرصے چلا؟

سارہ رضا خان ❖...... چھ مہینے چلا پھر بمبئی بلاسٹ کی وجہ سے انجام تک نہ پہنچ سکا اور ہم پاکستان واپس آگئے۔

پاکیزہ ✧......دخترِ پاکستان کے خطاب کے ساتھ واپس آئیں تو کیسے پزیرائی ہوئی؟

سارہ رضا خان ❖......وہاں میری عمدہ کارکردگی کو بہت سراہا گیا۔ یہاں آئی تو ہمارے میڈیا نے وہ پزیرائی اور حوصلہ افزائی نہیں کی جس کی میں توقع کر رہی تھی۔ ہاں عوام سے ضرور داد ملی۔

پاکیزہ ✧......میڈیا کے اس رویّے کا سبب کیا تھا؟

سارہ رضا خان ❖...... آپ نے دیکھا نہیں ہمارا میڈیا منفی کاموں کا ہمیشہ چرچا کرتا ہے۔ وینا ملک انڈیا سے آئی تو ہر چینل نے فخریہ اس کا انٹرویو نشر کیا، گویا اس نے وطن کا خوب نام روشن کیا ہو۔

پاکیزہ ✧......''جنگ سُر کی، جیت سنگیت کی'' میں حصہ لینے کا خیال کیسے آیا؟

سارہ رضا خان ❖......سارے گاماپا اور سُر شیترا کے پروڈیوسر نے مجھے فون کیا کہ پاکستان سے گانے والی اچھی بچیاں بتائیں، میں نے کئی لڑکیوں کا بتادیا انہوں نے آڈیشن دیا لیکن کوئی بھی منتخب نہ ہوسکی، انہوں نے مجھ سے کہا تو میں نے اپنے کانسرٹس کی مصروفیت کی وجہ سے انکار کردیا پھر یہ کہ ہالینڈ کا ٹرپ بھی ان ہی دنوں تھا۔ لیکن میرے انکار پر انہوں نے کہا کہ ہمارے لیے نہ سہی اپنے دیس کے لیے آجایئے' دو دن میں نے سوچا اور پھر فیصلہ کرلیا کہ پاکستان کے لیے کچھ کرسکتی ہوں تو ضرور کروں گی اور تمام شوز اور ہالینڈ کا ٹرپ بھی کینسل کردیے۔

پاکیزہ ✧......آپ کی کارکردگی کیسی رہی؟

سارہ رضا خان ❖......بہت اچھی رہی پہلے شو میں ڈھولنا سنا کر ٹرافی لی۔

پاکیزہ ✧......اس شو کی خاص بات کیا تھی؟

سارہ رضا خان ❖......سب سے زیادہ خاص بات تو یہی تھی کہ انڈیا اور پاکستان سے واحد لڑکی تھی جو فائنل تک پہنچی۔

پاکیزہ ✧......آپ کی ٹیم کی کامیابی میں آپ کا کتنا حصہ رہا؟

سارہ رضا خان ❖...... الحمدللہ کافی کیونکہ جب ہمارے پاکستانی بھائی کسی وجہ سے کوئی گانا نہیں گاسکتے تھے تو کیپٹن مجھ سے کہتے کہ تم گاؤ ہمارا پلڑا بھاری ہوگیا۔

پاکیزہ ✧......کامیابی کے بالکل قریب آکر سُر شیترا کیوں چھوڑ دیا؟

سارہ رضا خان ❖...... فائنل میں مجھ پر ذاتی حملے

شروع ہو گئے تھے۔ ہوا یوں کہ میں نے ہیر گائی ہیر کی دھن میں ایک نعتیہ شعر پڑھا، میرے سر پر دوپٹا تھا۔ مہیش بھٹ کا اعتراض یہ تھا کہ آپ شو میں دوپٹا لے کر کیوں آئیں؟ اس پر دوپٹا میں نے سر پر لے لیا تو مہیش بھٹ نے کہا آپ دکھاوا کر رہی ہیں۔ رونا لیلیٰ نے کہا آپ بولتی بہت ہیں سیاستدان بن جائیں۔ اتنی بڑی گلوکارہ کے منہ سے یہ باتیں سن کر میں حیران رہ گئی۔ غصہ تو بہت آرہا تھا پر میں نے صرف اتنا کہا کہ سیاستدان تو جھوٹ بولتے ہیں میں جھوٹ کیوں بولوں؟ جہاں تک دوپٹے کی بات تھی تو یہ پاکستانی خواتین کی پہچان ہے، میں نے گانوں کے انتخاب سے لے کر لباس تک میں محتاط رویہ رکھا تھا۔ مجھے بہت زیادہ افسوس اور دکھ اس بات کا تھا کہ اس موقع پر موجود میرے پاکستانی بھائیوں نے چپ سادھ لی میرا دفاع تک نہ کیا۔ تب میں نے شو چھوڑنے کا اصولی فیصلہ کرلیا پھر بھی میری پاکستانی ٹیم کو کوئی فرق نہیں پڑا۔ انہوں نے کہہ دیا شو چھوڑنا ہے تو چھوڑ دو۔ جگجیت نے روکا کہ شو چھوڑ کر نہ جاؤ لیکن میں نے انکار کر دیا کیونکہ یہ میرے وطن کی عزت و وقار کا سوال تھا۔ انڈین آرٹسٹ اپنے ملک کی نمائندگی کرتے ہوئے ساڑی باندھتی ہیں اگر میں نے پاکستان کی ثقافت کو عزیز رکھا تو کیا برا کیا!

پاکیزہ ❖...... پاکستان میں آپ کے اس اقدام کو کس نظر سے دیکھا گیا؟

سارہ رضا خان ❖...... بہت اچھی نظر سے، سب نے میرے اس فیصلے کو بہت سراہا۔

پاکیزہ ❖...... پاکستان میں کبھی آپ کا دوپٹا اور روایتی انداز مسئلہ بنا؟

سارہ رضا خان ❖...... جی ہاں اور یہ نہایت حیرت اور افسوس کی بات ہے۔ میں سمجھتی ہوں کہ گانا گانے کے لیے خوش گلو اور موسیقی کے رموز کو سمجھنا ضروری ہے نہ کہ ماڈرن لباس زیب تن کرنا۔ الحمدللہ میں خوش لباس ہوں، دوپٹا ہمارے لباس کا لازمی جز ہے میں بھی وہ لباس پہننا پسند کرتی ہوں جو ہماری ۸۰ فیصد خواتین پہنتی ہیں۔ کہ میں بھی ان کی طرح متوسط طبقے سے تعلق رکھتی ہوں۔ ہمارا میڈیا یہی چاہتا ہے کہ میں بھی اوروں کی طرح میڈیا پر نظر آؤں لیکن عوام مجھے اسی دوپٹے اور سادگی میں پسند کرتے ہیں۔ آپ لوگ بھی دعا کریں کہ تمام عمر اسی دوپٹے کے ساتھ اعلیٰ کارکردگی کا مظاہرہ کرتی رہوں۔ آمین

پاکیزہ ❖...... پاکستان سے باہر کون سے ملکوں میں اپنے فن کا مظاہرہ کیا؟

سارہ رضا خان ❖...... چائنا، ہالینڈ، انڈیا، جرمنی، ساؤتھ کوریا۔

پاکیزہ ❖...... موسیقی کے پیشے کی مشکلات کیا ہیں؟

سارہ رضا خان ❖...... گلوکاروں کو وہ اہمیت نہیں دی جاتی جو فنونِ لطیفہ کے دیگر شعبوں سے متعلق فنکاروں کو دی جاتی ہے رومانیہ میں ۱۳۲ ملکوں کے بچوں کے درمیان موسیقی کا مقابلہ تھا پاکستان نے مجھے جج کی حیثیت سے منتخب کیا وہاں پاکستان سے پہلی مرتبہ کسی کو بلایا تھا لیکن میرا رومانیہ کا ویزا کینسل ہو گیا۔

پاکیزہ ❖...... پہلے بھی تو ثقافتی طائفے جاتے تھے اب یہ مسئلہ کیوں ہو گیا؟

سارہ رضا خان ❖...... سارا قصور حکومت کا بھی نہیں، ہمارے پاکستانی فنکاروں نے بھی بہت خرابیاں پیدا کی ہیں وہ باہر جاتے ہیں تو میوزیشن ساتھ لے جاتے ہیں اور پھر وہیں چھوڑ کے آجاتے ہیں اور وہ وہاں کمائی کرتے ہیں اس وجہ سے اب سنگرز کو آسانی سے ویزے نہیں ملتے۔

پاکیزہ ❖...... آپ کے خیال میں وہ کون سے حکومتی اقدامات ہیں جو موسیقی کے پیشے کی مشکلات دور کرنے میں معاون ثابت ہوں گے؟

سارہ رضا خان ❖...... سب سے پہلے تو اپنے گلوکاروں کی اہمیت کو تسلیم کریں۔ تمام اچھے سنگرز کو گڈ لسٹ میں رکھیں۔ سنگرز ایسوسی ایشن قائم کریں۔ اچھے گلوکاروں کے لیے پیکج رکھیں۔ وزارتِ ثقافت کو چاہیے کہ نامور اور اچھے گلوکاروں کے بیرونِ ممالک



سارہ رضا خان اپنی والدہ کے ساتھ

بھنگڑا کی فرمائش بھی ہوتی ہے۔ مجھے اچھا لگتا ہے کہ ورسٹائل گلوکارہ بنوں۔ میں نے دونوں پر محنت کی ہے۔ میرے موڈ پر منحصر ہے۔ کبھی کلاسیکل میں سکون ملتا ہے تو کبھی پاپ میوزک بھلی لگتی ہے۔

پاکیزہ ✧......پسِ پردہ گائیکی کا تجربہ کیسا رہا؟

سارہ رضا خان ✧......بہت اچھا، ایک ہی مووی میں متضاد اور مختلف موڈ کے کئی گانے گائے جاتے ہیں مجھے شروع ہی سے شوق تھا، انڈیا جا کر اور بڑھ گیا۔

پاکیزہ ✧......ماضی اور حال کی موسیقی میں واضح فرق کیا ہے؟

سارہ رضا خان ✧......بنیادی بات محنت اور لگن کی ہے۔ پہلے ایک گانا بیس، پچیس دن میں تیار ہوتا تھا۔ اب دو گھنٹے میں تیار ہو جاتا ہے۔ عجلت کی وجہ سے پائیدار نہیں ہوتا۔

پاکیزہ ✧......اگر ۶۰، ۷۰ کی دہائی کی فلمی موسیقی کا زمانہ لوٹ آئے تو ہماری نئی نسل اسے بہ آسانی قبول کرلے گی؟

سارہ رضا خان ✧......کیوں نہیں؟ میں نے لائیو شوز میں ۵۰، ۶۰ سال پرانے گانے سنائے تو نوجوان نسل نے بہت شوق سے سنے۔

پاکیزہ ✧......سب سے زیادہ کس کے گانوں کی فرمائش ہوتی ہے؟

سارہ رضا خان ✧......میڈم نور جہاں کے گانوں کی۔ میڈم کے گانے گانا اور انہیں پسندیدگی کی سند ملنا دونوں ہی میرے لیے اعزاز کی بات ہے۔ میڈم سے ملاقات نہ کرنے کا قلق ہمیشہ رہے گا۔

پاکیزہ ✧......کیا وجہ ہے کہ موسیقی کا شوق تو نظر ...... ذوق نہیں؟

کے لیے شوز کروائیں۔ پاکستان کی تمام آرٹس کونسلز میں شوز ہونے چاہئیں۔ ڈراما آرٹسٹ کی طرح سنگر کی بھی قدر ہونی چاہیے۔ حال ہی میں لکس اسٹائل ایوارڈ میں عائشہ عمر کو بیسٹ سنگر ایوارڈ دیا گیا ہے۔ جو میری نظر میں غلط ہے۔ عائشہ عمر اداکارہ بہت اچھی ہے عائشہ کو خوب صورت کے کردار کے لیے ایوارڈ دیتے تو یقیناً یہ ان کا حق بنتا ہے۔ آرٹسٹ کے لیے ریلیزنگ کمپنی اور کاپی رائٹس کے قانون بنائے جائیں تاکہ موسیقی کے البم ریلیز ہوں۔

پاکیزہ ✧......کلاسیکل اور پوپ موسیقی دو متضاد بلکہ حریف شعبے ہیں ماشاء اللہ آپ کو دونوں پر عبور حاصل ہے عوام کی جانب سے کس میں زیادہ پزیرائی ملی اور آپ کی اپنی تسکین کس میں ہے؟

سارہ رضا خان ✧......بلاشبہ کلاسیکل بنیاد ہے موسیقی کی۔ وہ اصل چیز ہے اور موسیقی کی روح بھی۔ وہ میرے اندر اتر جاتی ہے۔ لیکن اگر میں پاپ گاؤں تب بھی سُر تو وہی ساتوں ہی رہیں گے۔ جہاں تک عوام کی بات ہے تو موسیقی کے شو میں اگر ــ مجھ سے پہلی سی محبت میرے محبوب نہ مانگ ــ کی فرمائش ہوتی ہے تو اسی زور شور سے ......

سارہ رضا خان ❖......شوق کا تو کوئی مول ہی نہیں لیکن ذوق آہستہ، آہستہ پروان چڑھتا ہے۔اگر میڈیا اچھی موسیقی کو پلیٹ فارم دے تو سنی بھی جائے گی اور ذوق دکھائی بھی دے گا۔اچھی موسیقی کو پروموٹ نہ کر کے ہمارے میڈیا نے موسیقی کا ذوق ختم کر دیا۔

پاکیزہ ❖......آپ کے گائے ہوئے ٹی وی ڈراموں کے ٹائٹل گیت عوام میں بہت مقبول ہیں۔''میرے قاتل میرے دلدار'' کے ٹائٹل سونگ کا ایوارڈ پا کر کیا احساسات تھے؟

سارہ رضا خان ❖......ہم ٹی وی نے ''میرے قاتل میرے دلدار'' کے ٹائٹل سونگ ایوارڈ کا اعلان ضرور کیا تھا مگر مضحکہ خیز المیہ یہ ہے کہ ایوارڈ ڈراما پروڈیوسر کو دیا گیا۔

پاکیزہ ❖......رمضان ٹرانسمیشن کا تجربہ کیسا رہا؟

سارہ رضا خان ❖...... بہت عمدہ۔ بہت لطف آیا۔دینی و علمی معلومات اور گفتگو سننے اور سیکھنے کا موقع ملا۔میں نعت بھی پڑھتی تھی اور نعت پڑھنا تو ہمیشہ ہی سے میری روحانی تسکین کا باعث رہا ہے۔

پاکیزہ ❖......نعت خوانی میں کن باتوں کا خاص خیال رکھتی ہیں؟

سارہ رضا خان ❖......ایسی نعتوں کا انتخاب کروں جو نعت کے بنیادی مقصد یعنی حضور انور ﷺ کی تعریف پر پوری اترتی ہو۔جہاں لفظ سے زیادہ دل یعنی عشق مصطفیٰ ﷺ نظر آئے۔زیادہ تر اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خان بریلوی حضرت بہزاد لکھنوی اور علامہ اقبال کا نعتیہ کلام پڑھتی ہوں۔

پاکیزہ ❖......فنی زندگی کے حوالے سے تو بہت باتیں ہو گئیں اب گفتگو کا رخ آپ کی نجی زندگی کی جانب موڑتے ہیں۔اچھا یہ بتائیں موسیقی کے علاوہ اور کیا مصروفیات ہیں؟

سارہ رضا خان ❖......میری اپنی این جی او ہے۔ خاتون ویلفیئر سوسائٹی کے نام سے۔

پاکیزہ ❖......این جی او کھولنے کا خیال کیسے آیا؟

سارہ رضا خان ❖......میری بڑی بہن کو بہت کم عمری میں طلاق مل گئی تھی۔اس صدمے سے وہ سائیکی ہو گئی تھیں۔گو میں اس وقت بہت چھوٹی تھی لیکن ان کی تکلیف کا میں نے بہت اثر لیا۔اس وقت تو اپنی کمسنی کے سبب کچھ نہیں کر سکی لیکن جب میں نے محسوس کیا کہ مصروفیت ان کے لیے بہت ضروری ہے بلکہ مطلقہ خواتین کے لیے مصروفیت کے ساتھ ساتھ ذہنی اور معاشی مضبوطی بہت ضروری ہے۔میں نے سوچا جب میری بہن دیگر مطلقہ خواتین کے مسائل اور پریشانیاں دیکھیں گی تو انہیں اپنا دکھ چھوٹا لگے گا اور حوصلہ بھی بڑھے گا تب وہ اعتماد سے سر اٹھا کر جینا سیکھ جائیں گی۔تب ماما کے مشورے سے میں نے این جی او کھولنے کا فیصلہ کیا۔

پاکیزہ ❖......آپ کی این جی او کی نوعیت کیا ہے؟

سارہ رضا خان ❖......طلاق یافتہ خواتین کو تین ماہ کا سلائی کڑھائی اور بیوٹیشن کورس کرایا جاتا ہے۔ ایک سہ ماہی میں صرف ٦، ٧ خواتین ہوتی ہیں۔کیونکہ ہم ابھی زیادہ افورڈ نہیں کر سکتے۔اس کے علاوہ وہ خواتین جو مشکلات کے باوجود عزم و حوصلے سے زندگی کا سفر ثابت قدمی سے طے کر رہی ہیں۔گاہے گاہے ان کے لیکچر کا اہتمام بھی ہوتا ہے جس سے خواتین ہمت پکڑتی ہیں اور یہ این جی او میں ماما کی نگرانی میں چلا رہی ہوں۔

پاکیزہ ❖......عموماً این جی اوز بہت بدنام ہیں۔ آپ اپنی این جی او کا دفاع کیسے کریں گی؟

سارہ رضا خان ❖......ہم نے پہلے ہی یہ طے کر لیا تھا کہ این جی او اپنی مدد آپ کے اصول کے تحت چلائیں گے، کسی سے ڈونیشن نہیں مانگیں گے۔کیونکہ ڈونیشن دینے والوں کا محتاج بننا پڑتا ہے۔اپنے اصولوں کے منافی کام کرنا پڑتا ہے۔اس لیے ہم نے اپنی این جی او کو ان تمام برائیوں سے دور رکھا جن کی وجہ سے این جی اوز بدنام ہیں۔

پاکیزہ ❖......آزادیٔ نسواں کی کس حد تک قائل ہیں؟

سارہ رضا خان ✧......ہمارے مذہب اور معاشرے نے جو حدود قائم کر دی ہیں۔ اسی تک رہنا ہی پسند کرتی ہوں۔ خواتین کی غیر ضروری آزادی کی قائل نہیں۔

پاکیزہ ✧......فیشن کرتے وقت کن باتوں کا خیال رکھتی ہیں؟

سارہ رضا خان ✧......فیشن خواہ مغربی طرز کا ہو یا مشرقی، وہ کرنا چاہیے جو بھلا لگے۔ جس میں آپ دلکش نظر آئیں اور باوقار بھی۔ ولگر نہیں لگنا چاہیے۔

پاکیزہ ✧......کیسے کھانے شوق سے کھاتی ہیں؟ اور کن چیزوں سے پرہیز کرتی ہیں؟

سارہ رضا خان ✧......پلاؤ بے حد پسند ہے۔ دال چاول شوق سے کھاتی ہوں۔ کھانا بہت چٹپٹا نہ ہو لیکن خوش ذائقہ ضرور ہونا چاہیے۔ کھٹے کھانے نہیں کھاتی اور ٹھنڈا پانی نہیں پیتی۔

پاکیزہ ✧......کیسے لوگ اچھے لگتے ہیں؟

سارہ رضا خان ✧......محبت کرنے والے صاف دل لوگ۔

پاکیزہ ✧......آپ میں سب سے اچھی اور بری عادت کون سی ہے؟

سارہ رضا خان ✧......جھوٹ نہیں بولتی، اگر کبھی غلطی سے بول بھی دوں تو ضمیر ملامت کرتا رہتا ہے۔ بہت پریشان ہو جاتی ہوں اور اللہ سے بہت معافی مانگتی ہوں۔ بری عادت یہ ہے کہ کبھی، کبھی بہت غصہ آجاتا ہے۔ حالانکہ جتنی تیزی سے آتا ہے اتنی ہی تیزی سے چلا بھی جاتا ہے لیکن جاتے، جاتے ندامت دے جاتا ہے تب میں جس پر غصہ کروں اس سے اور اللہ سے بھی معافی مانگتی ہوں۔

پاکیزہ ✧......بُرج کون سا ہے؟ آپ پر اس کے اثرات ہیں؟

سارہ رضا خان ✧......عقرب ہے اثرات پر تو کبھی غور نہیں کیا ہاں ہمیشہ اس پر خوشی اور فخر محسوس کیا ہے کہ علامہ اقبال اور میرا یوم پیدائش ایک ہی ہے۔ اسی لیے علامہ اقبال کی بہت سی خوبیاں مجھ میں بھی ہیں۔ (واہ بھئی)

پاکیزہ ✧......فرصت کے اوقات میں کیا کرتی ہیں؟

سارہ رضا خان ✧......چھوٹے بھائی سے کھیلتی ہوں دنیا بھر کی میوزک نیٹ سے سرچ کرتی ہوں اور جب یہ نہیں کرتی تو مزے سے بھرپور نیند لے لیتی ہوں۔

پاکیزہ ✧......مطالعہ سے دلچسپی ہے؟

سارہ رضا خان ✧......بہت زیادہ اور یہ شوق ماما سے وراثت میں ملا ہے۔ مختلف موضوعات پر اردو اور انگریزی کی کتابیں پڑھتی ہوں۔

پاکیزہ ✧......پاکیزہ ڈائجسٹ پڑھنے کا کبھی اتفاق ہوا؟

سارہ رضا خان ✧......کبھی؟ (ہنستے ہوئے) ہر ماہ ہوتا ہے لیکن پہلے میں افسانوں اور ناولوں کے علاوہ سب کچھ پڑھتی تھی پر اب افسانے بھی پڑھنے شروع کر دیے ہیں۔ مجھے جلترنگ پڑھ کر بڑا مزہ آتا ہے۔ ہلکے پھلکے انداز میں سماجی برائیوں کی نشاندہی کر دی جاتی ہے۔ ماما سارا رسالہ پڑھتی ہیں۔ انشاء اللہ عنقریب ماما پاکیزہ کے لیے افسانے بھی لکھیں گی۔ (جی ضرور)

پاکیزہ ✧......پاکیزہ کی قارئین بہنوں سے کچھ کہیں گی؟

سارہ رضا خان ✧......جو بھی اچھی باتیں پڑھیں انہیں اپنی زندگی کا حصہ بنالیں۔ اسلامی اور پاکستانی کلچر کو بحال کریں اور اپنی خداداد صلاحیتوں کا استعمال ضرور کریں اور دوسروں کو بھی اس سے فائدہ پہنچائیں کہ یہ اللہ کی شکر گزاری کا بہترین طریقہ ہے۔

☆☆☆

جی قارئین! آپ کو پاکیزہ کی یہ مہمان اور ان کی گفتگو یقیناً پسند آئی ہوگی۔ انشاء اللہ اسی طرح آپ کی فرمائشوں کو مدِنظر رکھتے ہوئے ہم میزبانی کے فرائض انجام دیتے رہیں گے۔ بہت سی دعاؤں اور نیک تمناؤں کے ساتھ اجازت طلب کرتے ہیں اللہ نگہبان!

☆☆☆

# بہنوں کی محفل

مدیرہ

✖ عزیز از جان بہنو! السلام علیکم رحمتہ اللہ و برکاتہ!

✖ حمد و ستائش اس ذات کے لیے جس نے کارخانۂ عالم کو وجود بخشا اور درود و سلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر جنہوں نے دنیا میں حق کا بول بالا کیا۔ پیاری بہنو...... اللہ پاک آپ کو ہمیشہ خوش رکھے اور اپنے خزانۂ غیب سے وہ سب کچھ عطا فرمائے جو آپ کے حق میں بہتر ہو۔ یا الٰہی دونوں جہان میں ہم سب کی خیر ہو اور تو ہم سے ہمیشہ راضی رہے۔ آمین ثم آمین۔

✖ قارئین کرام! آپ سب کو عیدالاضحیٰ مبارک ہو۔ مجھے اپنے ہر قاری سے یہ پوری، پوری امید ہے کہ گوشت بانٹتے ہوئے غریب، غربا اور مساکین کا خیال ضرور رکھیں گے۔ اس لیے قربانی کا گوشت یہ سوچ کر ڈیپ فریزر کے خانوں میں نہ رکھیں کہ بعد میں کام آجائے گا بلکہ یہ سوچ کر مستحقین میں بانٹیں...... کہ ہماری قربانی کا اصل مقصد بھی یہی ہے۔

✖ پیاری بہنو...... آج میں قصور کے ان بچوں کے بارے میں لکھنا چاہ رہی تھی جن سے درندہ صفت انسانوں نے ان کا بچپن چھین لیا اور جن کے والدین کے دلوں میں وہ دکھ بھر دیے جو تا زندگی وہ نکال نہیں پائیں گے۔ میں ان بھیڑیا صفت انسانوں کے بارے میں بھی لکھنا چاہ رہی تھی...... جو گدھے، سور اور مرے ہوئے جانوروں کا گوشت سپلائی کر کے سمجھ رہے ہیں کہ وہ فائدہ اٹھانے والوں میں سے ہیں...... میں ان طرم خان لوگوں کے بارے میں بھی لکھنا چاہ رہی تھی جو جان بچانے والی جعلی ادویات فروخت کر کے بدی کا کاروبار کرنے والوں میں شامل ہو گئے۔ یہ سب لوگ جو یہ سمجھتے ہیں کہ ان کے ساتھ کچھ نہیں ہو سکتا...... تو شاید وہ صحیح ہی سمجھتے ہوں گے...... کہ ان موضوعات پر اخبارات بھرے ہوتے ہیں۔ اب ہوتا کیا ہے...... اور کب ہوتا ہے......؟ اس بارے میں تو کچھ نہیں کہہ سکتے اس لیے آج میں اپنی ایک مستقل تبصرہ نگار بہن کے خط کے کچھ حصے شامل کر رہی ہوں۔ خط پڑھ کر آپ کو وہ عام سی باتیں لگیں گی مگر اس لڑکی کے لیے وہ ایک اہم مسئلہ ہے۔ میں چاہتی ہوں اس خط کا جواب آپ دیں، جس میں بھرپور انداز میں اس کے مسئلے کا حل بتایا جائے۔

تو آیئے پڑھتے ہیں اپنی ایک مستقل تبصرہ نگار بہن کا خط...... انجم باجی، پلیز میرے مسئلے کا کوئی حل بتا دیں۔ شادی کو چھ سال ہوئے ہیں، شادی کے دوسرے دن سے میں نے یہ طریقہ دیکھا کہ میرے میاں صبح کے دس بجے اپنے دوستوں کے پاس چلے جاتے اور دو بجے آتے پھر شام کو پانچ بجے سے آٹھ بجے تک، اس دوران ان دوستوں کے فون بھی آتے رہتے، اگر جلدی گھر آجاتے، شروع میں مارے جھجک کے میں نے کچھ پوچھا نہیں، ایک عزیزہ نے انہیں اسٹور گاؤں میں کھول کر دیا۔ وہاں ہفتے میں ایک بار جاتے اور آجاتے۔ بعد میں پتا چلا کہ دو دوست ہیں جو گورنمنٹ جاب کرتے ہیں اگر ہم کہیں باہر جائیں تو بھی فون کر، کر کے پوچھتے رہتے ہیں۔ دن میں دو بار ان دوستوں کے پاس جانا ضروری ہے۔ بھلے آندھی آجائے یا طوفان...... اگر کسی دن میاں کی طبیعت خراب ہو اور وہ نہ جائیں تو دوست گھر پر آکر ان کو لے جاتے ہیں۔ میرے ماں، باپ حیات نہیں...... ایک بھائی ہے جو شادی کے بعد ہمیں پوچھتا نہیں...... میرے میاں میں لحاظ بالکل نہیں، کمانے کا کہوں تو طلاق کی دھمکی دیتے ہیں، جانتے ہیں مجھے پوچھنے والا کوئی نہیں۔ آج تک سمجھ میں نہیں آیا کہ روز تین، تین گھنٹے دوستوں کے پاس جا کر یہ کیا کرتے ہیں۔ اللہ بہتر جانتا ہے۔ مجھے نہیں پتا...... ان کی فیملی میں ماشاء اللہ سب ڈاکٹر، انجینئر ہیں، ان کے خاندان والوں کو کئی بار بتایا انہوں نے بھی سمجھایا مگر کوئی اثر نہیں۔ مرد کی کمائی سے گھر چلتا ہے مجھے جاب، ٹیوشن بھی نہیں کرنے دیتے۔ میرے سارے زیور بک گئے ہیں، کہتے ہیں اللہ پالے گا نوکری کی بات مت کرو، اب خود بھی نوکری نہیں کریں گے، مجھے بھی نہیں کرنے دیں گے تو گھر کیسے چلے گا۔ ان کی کزن نے جب سے ناراض ہو کر اپنا اسٹور واپس لے لیا ہے۔ تب سے حالات برے ہو گئے ہیں۔ دن رات ان دوستوں کو بددعا دیتی ہوں کہ کہیں چلے جائیں، میرا میاں کمانا تو شروع کرے۔ مگر وہ صبح دیر تک سوتے ہیں اور پھر مجھے

منحوس کہتے ہیں۔ کہتے ہیں نوکری کی بات مت کرو، عمر گزر گئی اب نوکری کون دے گا، حالانکہ عمر ابھی چالیس سال ہے، میں کہتی ہوں ریٹائرڈ لوگ بھی بچے پالنے کے لیے پارٹ ٹائم کررہے ہیں تو پھر طلاق کی دھمکی ...... اولاد سے زیادہ ان کو وہ دوست پیارے ہیں۔ اب تو بہتری کی امید میں میرا حوصلہ بھی ختم ہونے لگا ہے۔ تہجد پڑھ، پڑھ کران کے لیے بہت دعائیں مانگتی ہوں مگر یہ نہیں سدھرتے۔ کئی بار مجھے مارتے بھی ہیں۔ آپ بتائیں میں کروں تو کیا کروں......؟

★ میرا اپنی بہنوں سے رابطہ خطوط کے بعد فونز کے ذریعے زیادہ رہتا ہے اور دنیا بھر سے فون آتے ہیں...... اور کبھی، کبھی تو ایسی شخصیات کے بھی فون آجاتے ہیں...... جن سے بات کرنا بھی سعادت کے زمرے میں آتا ہے...... کچھ دن قبل میرے پاس فریدہ کادوانی کا نیو یارک (امریکا) سے فون آیا۔ وہ وہاں قرآن پاک کی تفسیر کی کلاسز لیتی ہیں اور درس دیا کرتی ہیں۔ اور وہاں کی جانی پہچانی شخصیت ہیں...... انہوں نے ہمیں روحانی مشوروں کے سلسلے میں کئی مشورے دیے۔ اس سلسلے کو بے حد پسند کیا...... اس کے بعد انہوں نے عذرا رسول کو ذیشان کی شادی کی مبارک باد دی۔ ڈاکٹر فاطمہ کی تعریف کی...... اور عظمیٰ آفاق کے طرزِ تحریر کو بے حد سراہا...... فریدہ کادوانی پاکستان کی معروف شخصیت عبد اللہ کادوانی کی عزیزہ ہوتی ہیں...... اور عبد اللہ کادوانی سے میری ایک ہی ملاقات ہوئی ہے مگر ان جیسے لوگ کم، کم ہی دیکھے ہیں کہ بات کریں تو منہ سے پھول جھڑیں...... المختصر یہ کہ فریدہ کادوانی جب بھی پاکستان آئیں گی...... ادارہ پاکیزہ سے ضرور رابطہ کریں گی۔

★ ★ ★

★ اور اب آیئے پہلے ایک بار درود ابراہیمی پڑھتے ہیں جو ہر نماز میں پڑھا جاتا ہے ابھی پڑھ لیں اس کے بعد صرف تین بار آیتِ کریمہ پڑھ کر اپنے لیے، اپنے ملک کے لیے اور عالمِ اسلام کی پریشانیوں کو رفع کرنے کے لیے ضرور دعا مانگیں۔

★ 7 ستمبر بروز پیر کی شام سن سیٹ کلب ڈیفنس میں محترمہ عذرا رسول کی جانب سے اپنی رائٹرز کے اعزاز میں ایک عید ملن پارٹی دی گئی جس میں ہماری بہت سی مصنفات، تبصرہ نگار بہنوں نے شرکت کی...... آئندہ ماہ اس تقریب کی تصاویر کے ساتھ رپورٹ آپ پاکیزہ میں پڑھیں گی...... اور یہ بھی آپ جان ہی گئی ہوں گی کہ اس کی رپورٹ کون لکھ رہا ہے...... اب مجھے نام بتانے کی ضرورت تو نہیں ہے ناں......

اس سے پہلے کہ آپ مصنفات کی سرگرمیوں اور خطوط کی شیرینی میں گم ہوجائیں میں آپ سب کا بے حد شکریہ ادا کرتی ہوں کہ آپ کو ذیشان کی شادی کی تصاویر بے حد پسند آئیں اور اس کے ساتھ شادی کا احوال بھی...... بہت سی بہنوں نے تصاویر کی کمی کی شکایت کی ہے، تو یہ شکایت انشاء اللہ آئندہ کسی موقع پر دور کردی جائے گی...... آپ یہ سوچیں کہ بہت سے لوگوں کی تصاویر لگنے سے رہ گئیں...... حتیٰ کہ عذرا رسول کی چھوٹی بہن کی تو ایک تصویر بھی نہیں ہے۔ ابھی عید ملن کی تقریب میں، میں نے شادی کا البم دیکھا...... تو اندازہ ہوا...... کہ دولہا، دلہن کے خوب صورت ترین پوز تو لگنے سے ہی رہ گئے...... بہرحال آپ کی پُرخلوص محبتوں کے لیے صرف جزاک اللہ ہی کہا جاسکتا ہے۔

★ ★ ★

## مصنفات، شاعرات اور قارئینِ پاکیزہ بہنوں کی تازہ بہ تازہ سرگرمیاں

★ اس سال الحمدللہ پاکیزہ کی مصنفات اور تبصرہ نگار بہنوں کی ایک بڑی تعداد نے حج کی سعادت حاصل کی۔ آپ سب کو بے حد مبارک باد۔

★ مصنفہ فرحت احمد، گلشن حدید، کراچی۔
★ مستقل تبصرہ نگار، مسز نزہت اشفاق کی بیٹی عینی اور داماد ثروت، کراچی۔
★ پاکیزہ کی مستقل قاری امبر اور ان کے شوہر مسرت، دبئی۔
★ پاکیزہ کی مستقل قاری، مسز روحی شارق، کراچی
★ پاکیزہ کی مستقل تبصرہ نگار مسرت رانی تکمیل کی بیٹی اور داماد، کراچی۔
★ پاکیزہ کی مستقل قاری فرزانہ احمد، راول پنڈی۔
★ روبینہ فرید ایک بہت اچھی مصنفہ ہیں، ان کی تحریر میں سادگی کے ساتھ روانی بھی ہے...... اور ایک منظر کشی

بھی...... روشن آبگینے...... معروف خواتین کے انٹرویو پر مبنی کتاب ہے۔ جس میں تعارف کا قرینہ خوب صورتی اور محبت کے ساتھ انجام دیا گیا ہے۔ مذکورہ کتاب میں بائیس خواتین کے بارے میں تفصیلی معلومات درج ہیں۔ اس کتاب کی قیمت صرف چار سو روپے ہے۔ کتاب حاصل کرنے کا پتا یہ ہے۔ اکیڈمی بک سنٹر (ABC) ڈی۔35۔ بلاک۔5 فیڈرل بی ایریا کراچی، فون نمبر...... 021.36809201

★ عظمیٰ آفاق سعید کے سفرناموں پر مشتمل کتاب ذرا سا گھوم لوں میں کی کمپوزنگ مکمل ہوگئی ہے۔ یہ کتاب انشاءاللہ بہت جلد آپ القریش پبلی کیشنز لاہور سے حاصل کر سکیں گے۔

★ پاکیزہ کی مستقل قاری صبا سید کی شادی شکاگو میں ہوگئی ہے (مبارک باد)

★ پاکیزہ کی مستقل قاری ثنا اپنی فیملی کے ساتھ ان دنوں امریکا سے کراچی آئی ہوئی ہیں۔ (خوش آمدید)

★ پاکیزہ کی مستقل تبصرہ نگار صوفیہ نے اپنا بوتیک کھول لیا ہے۔ (مبارک باد)

★ پاکیزہ کی مستقل قاری تبسم حفیظ الرحمن بمبئی نے انڈیا سے فون کر کے ذیشان کی شادی کی مبارک باد دی۔ (ماشاءاللہ)

★ پاکیزہ کی مستقل قاری، زنیرا مبارک، کوہاٹ کا نکاح ہوگیا ہے۔ (مبارک باد)

## دعائے صحت کے لیے

☆ مصنفہ عطیہ عمر، کراچی بے حد علیل ہیں۔

☆ مصنفہ سعدیہ رئیس موسمی تبدیلیوں کے باعث علیل ہیں۔

☆ پاکیزہ کی مستقل قاری فرزانہ شعیب، سوات بیمار ہیں۔

☆ پاکیزہ کی مستقل قاری ڈاکٹر میمونہ غوری، کراچی بستر علالت پر ہیں۔

☆ پاکیزہ کی مستقل تبصرہ نگار اور شاعرہ نگینہ ضیا بخش، کراچی کی بیٹی مریم بیمار ہے اور کوہاٹ میں عظیم، نگینہ کے ماموں بھی علیل ہیں۔

☆ پاکیزہ کی مستقل قاری روبینہ اسلم، پیاری اسپتال سے گھر آگئی ہیں مگر ہنوز بستر علالت پر ہیں۔

☆ پاکیزہ کی مستقل تبصرہ نگار شگفتہ ناصر، فیصل آباد علیل ہیں۔

☆ پاکیزہ کی مستقل قاری تبسم حفیظ الرحمن، بمبئی، انڈیا کا بیٹا بیمار ہے۔ اس کی جسمانی اور ذہنی صحت کے لیے دعا کریں۔

☆ پاکیزہ کی قاری ستارہ، کراچی بیمار ہیں۔

## انتقالِ پُرملال

☆ اس ماہ ہماری بہت پیاری مصنفہ فرحانہ ناز ملک، ان کی والدہ، بہن اور بھائی کی پہلی برسی ہے۔

☆ پاکیزہ کی قاری ڈاکٹر نسرین، کراچی اپنے ابدی سفر پر روانہ ہوگئیں۔

نوٹ: تمام مرحومین کی مغفرت کی دعا کے ساتھ صرف تین مرتبہ سورۂ اخلاص پڑھ کر ان کے درجات کی بلندی کے لیے دعا کریں۔

☆☆☆

ﷺ اقبال بانو کی رائے، بورے والا سے۔ ''اس ماہ صرف ذیشان کی شادی کا احوال پڑھا اور بار، بار پڑھا...... اور ہر دفعہ پڑھ کر یوں لگا جیسے پہلی بار پڑھ رہی ہوں...... ماشاءاللہ عظمیٰ نے بہت خوب صورت انداز میں لکھا ہے۔ تقریب، مہندی کا وہ لمحہ جب وہ پلیٹ میں کھانا لے کر جا رہی تھیں اور کسی نے ذیشان کی ساس صاحبہ سے ان کا تعارف کروا دیا تھا...... ایسے لمحات اکثر شادیوں میں بہت سے لوگوں نے جھیلے ہوں گے...... اور پھر شادی میں ویٹرس کا بار، بار آنا...... اور اس کی مزاحیہ سوچ...... یہ سب باتیں اور چیزیں عام سی ہیں مگر ان کو کوئی لکھا نہیں کرتا...... اور عظمیٰ تو کوئی لگی لپٹی رکھتی ہی نہیں ہے...... اس کی تحریر کا یہ کھرا پن بہت اچھا لگتا ہے...... سب کی تصویریں غضب کی ہیں، عذرا رسول بہت پیاری لگ رہی ہیں، مصنفات نے بھی خوب پوز بنائے ہوئے ہیں...... مگر تصویریں مزید ہونی چاہیے تھیں۔'' (بانو اتنی ڈھیر ساری تصویریں دیکھ کر بھی تمہاری تسلی نہیں ہو رہی ہے، تم کیا چاہ رہی تھیں ہم اپنی مصنفات کی

ڈبل تصاویر لگاتے...... کہ کھانا کھانے سے پہلے...... اور پھر کھانا کھانے کے بعد)

٭ غزالہ نگار اور گزنی، نیویارک سے۔ ”اس مرتبہ پاکیزہ ذیشان کی شادی کے احوال کے ساتھ مزید پُرلطف لگا۔ عذرا رسول کو بیٹے کی شادی بہت، بہت مبارک ہو، ماشاء اللہ بہو بھی بڑی پیاری ہے۔ اللہ معراج صاحب اور عذرا کو ان کی خوشیاں دیکھنی نصیب ہوں (آمین) میں نے کئی مرتبہ فون پر رابطہ کرنے کی کوشش کی مگر بات نہ ہو پائی، انشاء اللہ پھر سہی...... پاکیزہ پڑھ کر ہمیشہ ہی بہت مزہ آتا ہے۔ تمام مصنفات بہت اچھا لکھ رہی ہیں...... رائٹرز کے انٹرویو بھی بہت پسند آتے ہیں۔“ (پیاری غزالہ مختصر سے خط کا شکریہ! تفصیلی تبصرہ بھی ضرور بھیجو)

٭ ڈاکٹر ممتاز ضیا، ضیاالدین اسپتال سے۔ ”حسبِ معمول تم نے جو کچھ کہا بہت اچھا کہا اگر ہم نہ کسی کے لینے میں رہیں گے نہ دینے میں تو حقوق العباد کیسے ادا ہوں گے۔ جن کی ادائیگی نہایت ضروری ہے۔ شاید لوگوں کے دلوں میں تمہاری بات اتر جائے، آمین۔ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے ذکر سے سرفراز ہوتے ہوئے آگے بڑھے۔ آخری امید کی قسط بہت ایمان افروز تھی۔ قیصرہ حیات بہت اچھے موضوع کو لائی ہیں، گزارش ہے کہ اگر انگریزی جملوں کا استعمال نہ کریں تو ان کا یہ پیغام زیادہ لوگوں کو فائدہ پہنچائے گا (جی ہاں آپ کا مشورہ پہنچایا جا رہا ہے) ابھی امید باقی ہے۔ بہت اچھی کاوش ہے، موضوع کے لحاظ سے خاص کر۔ اُف عظمیٰ تمہارا بہت شکریہ انتظار ختم کروایا اور بہت پیاری کوریج کی پتا چلا کہ...ہوئی تاخیر تو کچھ باعث تاخیر بھی تھا...... مگر تصویریں ذرا زیادہ ہوتیں تو زیادہ اچھا تھا خیر قبضہ گروپ اور اس عذرا کی بچپن کی ہمجولیوں کے باوجود ہم اپنا مکھڑا دکھانے میں کامیاب تو ہو ہی گئے۔ شکریہ عظمیٰ...... ویسے تم واقعی باجی ہو...... اس طرح شہزادوں اور شہزادیوں کی شادی کے لیے دعا گو رہو اور دعائیں وصول کرو...... عذرا کی چوٹی کے ذکر نے تو ہمیں بھی پتھر کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے عذرا کو ان کی نیک نیتی کا صلہ پیاری سی بیٹی، بہو کے روپ میں عطا فرمائی' امید ہے فاطمہ بھی اپنی ان امی کا حق پوری طرح ادا کرے گی۔ اللہ تعالیٰ عذرا اور معراج صاحب کو ذیشان اور فاطمہ کی خوشیاں دکھائے، آمین۔ شادی کے احوال سے تفصیلات پڑھ کر ہمارا دل دھڑک کر رہ گیا کہ کہیں عذرا بھی لندن کو پیاری نہ ہو جائیں رضوانہ کی طرح...... ذیشان، فرحان، عذرا اور سیمین کی محبت اچھی لگی۔ عذرا کی سمدھن سے تمہاری یادگار ملاقات خوب رہی اور پیاری عقیلہ تو واقعی سونے کی ڈلی کی طرح ہی چمک رہی تھیں۔ کیا بات ہے کسوٹی کو بہت پریشر میں رکھتی ہو، معصوم بچی، تم سے پوچھ کر کھاتی ہے پھر بھی تم اعتراض کرتی ہو، بچے کہیں اجازت لے کر آئس کریم کھاتے ہیں...... شادی کے احوال پر اتنا لکھا جا سکتا ہے کہ پھر بہنوں کی محفل میں صرف ہم ہی ہوں گے۔ (دیگر خطوط کا بھی ایسا ہی انداز ہے کہ اکثر بہنیں تو تبصرہ لکھنا ہی بھول گئی ہیں) ہالہ احمد کی کہانی خاص نہ لگی حالانکہ یہ اچھا لکھتی ہیں، متاعِ دل میں شکر ہے انتہائی معصوم دُرِ یکتا بخیریت محفوظ ہاتھوں میں پہنچ گئی۔ اب صلح تو ہو ہی جائے گی، میاں، بیوی کی۔ اسٹیل کی پتیلی ایک اچھے موضوع پر بہت اچھے انداز میں لکھی گئی۔ اعتبارِ وفا کچھ تو آگے بڑھی اس کا ٹیمپو ذرا تیز ہو تو اچھا ہو جائے گا۔ شیریں حیدر ــــ اپنے مخصوص انداز میں بہت اچھا لکھ رہی ہیں۔ یہ قسط بھی خوب تھی۔ پردہ اور حسابِ دوستاں کا موضوع اچھا تھا اور اندازِ بیان بھی...... اے عشق تیرے ہیں کھیل عجب پر دو تین اقساط کے بعد تبصرہ کریں گے ابھی تو کرداروں کا تعارف ہو رہا ہے۔ نایاب جیلانی کی کہر میں اچھے انداز میں اختتام پزیر ہوئی۔ اقبال بانو دلچسپ تحریر لے کر آئیں۔ عنوان سے تو لگتا ہے مسٹر اے ڈی کامیاب ہو جائیں گے ایک خیال یہ بھی آتا ہے کہ یہ شاید ان کا بہروپ ہو۔ رخ چوہدری سے ملاقات اچھی رہی۔ اللہ تعالیٰ انہیں صبر عطا کرے، آمین۔ اختر شجاعت کا مضمون بہت بصیرت افروز تھا۔ اللہ انہیں جزا عطا کرے، آمین۔ شائستہ زریں کا سروے ایک نئی تبدیلی کے ساتھ اچھا لگا۔ اب باری ہے بہنوں کی محفل کی...... ذکیہ بلگرامی جو ہماری دوست بھی ہیں ان کے لیے دعائیں۔ ہم نے عظمیٰ کو بہت فون کیا اجیہ کی مبارک باد کے لیے مگر انہوں نے اٹھایا نہیں۔ (عظمیٰ کا نیا فون نمبر آپ مجھ سے لے لیجیے گا) مسز تنویر بخاری کا اور تمہارا مشورہ اور پیغام ماؤں کے لیے بہترین ہے۔ آج کل بچوں کی تربیت اور دینی تعلیم کی طرف ماؤں کا رجحان ہی نہیں ہے۔ نور افشاں، بیٹا میرے خطوط پسند کرنے کا شکریہ...... امینہ کو محفل میں دیکھ کر خوشی ہوئی۔ شہلا نواز کی رائے کام والیوں کے لیے سو فی صد درست ہے۔ ہاں ہم نے عذرا سے بھی درخواست کی ہے کہ وہ پاکیزہ میں کسی بہانے آئیں، بے شک ان کا دوبارہ انٹرویو ہی کیوں نہ ہو (جی ضرور ہو جائے ان کا انٹرویو دوبارہ) عظمیٰ کو بھی باقاعدگی کے ساتھ شامل پاکیزہ کریں، آخر دلچسپ تحریریں اور دلچسپ لوگوں پر ہم بہنوں کا بھی تو حق ہے۔“ (جی ضرور تبصرے کا شکریہ)

٭ امینہ عندلیب، سلانوالی سے۔ ”سب سے پہلے ذیشان رسول کا احوال پڑھا جس میں لکھی جھلک سے معلوم ہوا کہ

عذرا رسول صاحبہ کے بیٹے کی ولیمے کی میزبان انجم انصار سب سے پہلے پہنچ گئی تھیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ لوگوں میں آپس میں کتنے قریبی تعلقات ہیں۔ عظمیٰ آفاق کی مزے دار تحریر نے ہم سب کو بھی اسی محفل میں پہنچا دیا۔ اختر شجاعت نے بہت اچھا لکھا۔ شائستہ زریں کا سروے تو ہمیشہ ہی اے ون ہوا کرتا ہے۔ یہ جان کر بہت خوشی ہو رہی ہے کہ ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی کی یادوں کی مالا شروع کی جا رہی ہے۔ تمام بیمار بہنوں کے لیے صحت کلی کی دعائیں اور اپنی دعاؤں میں آپ سب مجھے بھی یاد رکھیے گا۔" (امینہ...... تم کو ہماری ہر قاری بہن یاد رکھتی ہیں۔ عذرا رسول کے بیٹے کی ولیمے کی تقریب میں میری میزبان کی حیثیت سے شرکت نہ صرف عذرا کو اچھی لگی بلکہ ان کی بڑی ممانی نے بھی اس بات کو بے حد سراہا۔ اور یہ بات تم کو بھی اچھی لگ رہی ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ پرانی دوستیاں۔۔۔ کسی طرح بھی قرابت داریوں سے کم نہیں ہوا کرتی ہیں)

٭ مدیحہ زہرہ، گلشن آباد کراچی سے۔ "پہلے میں پرانے پاکیزہ خرید کر پڑھا کرتی تھی...... مگر جب جلترنگ بہت اچھا لگنے لگا تو میں باقاعدگی سے پاکیزہ خریدنے لگی...... مجھے شیریں حیدر کی تحریریں بہت اچھی لگتی ہیں۔ آپ یہ بات ان کو بتا دیں۔ تازہ شمارے میں تو ذیشان رسول کی شادی کے احوال کے بارے میں کیا کہوں کہ کتنا اچھا ہے۔ عظمیٰ آفاق کی تحریر میں نہ بناوٹ ہے نہ تکبر ہے اور نہ ہی خود اپنے منہ میاں مٹھو والی بات ہے...... اور میں یہ بات جانتی ہوں کہ جو دل کے اچھے ہوتے ہیں، وہ اپنے قلم کے بھی سچے ہوتے ہیں۔ میں نے اپنے بیٹے کو بتایا کہ دیکھو بیٹا یہ ذیشان میاں نے پہلے اپنی تعلیم مکمل کی پھر جج کیا اور اب ان کی شادی ہوئی ہے۔ میرا بیٹا کہنے لگا...... امی یہ بھائی تو بہت اچھے ہیں۔ انجم باجی آپ میری دلی مبارک باد عذرا رسول تک پہنچا دیں۔" (پیاری مدیحہ اس محفل میں خوش آمدید...... تمہاری پیار بھری مبارک باد جب میں نے عذرا رسول تک پہنچائی تو وہ جواباً تمہیں دعائیں دے رہی تھیں)

٭ **سمعیہ صدیقی**، لاہور سے۔ "پاکیزہ میں ذیشان کی شادی کا مزیدار حال پڑھا...... میں بھی حجاب لیتی ہوں اور ماشاء اللہ میری سب نندیں بھی حجاب لیتی ہیں اس لیے مجھے حجاب لینے والی شخصیات بہت پسند ہیں...... عذرا آنٹی کو بہت، بہت مبارک ہو اتنی پیاری سی دلہن...... اور عظمیٰ آپی آپ کا بے حد شکریہ کہ آپ نے ہمیں شادی کی تقریب کی سیر کروا دی...... اور انجم آنٹی...... آپ کو میں عرصہ دس سال سے پڑھ رہی ہوں اور مجھے آپ کی باتیں بہت اچھی لگی ہیں...... اور عذرا کی بہو واقعی بہت پیاری ہے......" (آپ کی مبارک باد میں نے عذرا تک پہنچا دی ہے اور وہ جزاک اللہ کہہ رہی ہیں)

٭ افسر سلطانہ، کراچی سے۔ "انجم جو آپ نے کہا وہ ہم سب کے دل کی آواز ہے۔ جزاک اللہ تنہائی کے تمنائی زندگی کی رعنائیوں کا گلا خود ہی گھونٹ ڈالتے ہیں اور اچھی سی عظمیٰ دل خوش کر دیا...... تمہاری کھٹی میٹھی تحریر نے مزہ دوبالا کر دیا۔ تصاویر زیادہ اچھی تھیں یا تمہاری تحریر...... اندازہ کرنا مشکل ہو گیا...... عذرا رسول اور معراج صاحب کو ایک بار پھر دلی مبارک باد...... ہالہ احمد، فرحین اظفر اور ثمینہ عظمت کے افسانے اچھے لگے۔ اقبال بانو بور نہیں کرتیں۔ رخ چوہدری کا انٹرویو تصویر کے بغیر بھی خوب رہا...... تصاویر ہوتیں تو چار چاند لگ جاتے۔ شمع ہدایت، اختر شجاعت دل سے سجا کر فیض یاب کرتی ہیں۔ سلسلے وار ناولز میں نگہت سیما کو سب سے پہلے پڑھتی ہوں۔ زندگی خاک نہ تھی غالباً اگلے ماہ اختتام پزیر ہو گی۔ شیریں حیدر کو اپنی بات کہنا آتی ہے۔ سروے میں شریک زوجین کے ساتھ معروف فنکار کیا اپنا وجود رکھتے ہیں؟ مصنفات، شاعرات اور پاکیزہ قارئین کی سرگرمیاں پڑھ کر جہاں خوشی ہوئی وہیں اپنی نسیم نیازی کا پرس اور جیولری چھن جانے کا افسوس ہوا۔ جان کا صدقہ مال...... اللہ بہتر نوازے گا۔ سعدیہ عزیز کی والدہ اور تمام مرحومین کی مغفرت کی دعائیں۔ اور جو بیمار بھی ہیں اسپتالوں میں گھروں میں...... اللہ رب العالمین سب کو صحت کلی عطا فرمائے، آمین۔ عظمیٰ کی مرتب کردہ پاکیزہ ڈائری پڑھنے میں اس لیے بھی مزہ آتا ہے کہ اس میں سب کی پسند سٹ جاتی ہے۔" (پرخلوص تبصرے کے لیے جزاک اللہ)

٭ قانتہ رابعہ، گوجرہ سے۔ "یکم ستمبر کو پاکیزہ منگوایا۔ ابھی بہنوں کی محفل، جلترنگ اور عذرا کے ولی عہد کی شادی کا حال پڑھا ہے۔ عظمیٰ کی تحریر جب بھی میں نے پڑھی ہے، مجھے اس میں فطری سادگی اور روانی نظر آئی ہے۔ جب تحریر میں تصنع یا بناوٹ آ جائے ہر جگہ اپنے آپ کو برتر ثابت کرنے کا خبط ہو تو تحریر دل میں جگہ نہیں بنا سکتی۔ عظمیٰ کی تحریر کا وصف یہ ہے کہ مذاق میں ہی سہی یہ اپنے آپ کو پیچھے رکھتی ہے۔ فطری بے ساختگی ہے اس لیے پڑھنے کا لطف آ جاتا ہے...... بہت سی باتیں کوئی اور لکھنے والی ہوتی تو نہ لکھتی...... بہت سی وجوہات کی بنا پر لیکن عظمیٰ نے سب کچھ بہت اچھے انداز سے لکھا۔ عظمیٰ سے میری

درخواست ہے صرف سفرناموں یا آنکھوں دیکھے حال کے لیے ہی قلم کو مخصوص نہ کرے بلکہ حقیقی واقعات، حقیقت افسانے سے زیادہ دلچسپ ہوتی ہے بھی لکھے کہ اس کے لیے مطلوبہ صفت (مشاہدہ پلس جزیات نگاری) اس کے لیے اندر بدرجہ اتم موجود ہے۔ اللہ اس کے قلم کو نظر بد سے بچائے اور ایک نہ ایک تحریر کو خالص اپنے لیے پسند کرے...... جب کوئی عمرہ یا حج پر جانے کی توفیق ہو تو اس کا سفرنامہ انشاء اللہ بہت اچھا ہوگا...... انشاء اللہ...... میں گواہی دیتی ہوں۔'' (مجھے تو لگتا ہے کہ یہ خط پڑھ کر عظمیٰ خوب موٹی ہو جائے گی۔ دعاؤں کے لیے جزاک اللہ)

٭ شگفتہ شفیق، کراچی سے۔ ''ماہ ستمبر 2015ء کا پاکیزہ اس قدر پیارا لگا ہے کہ وقت کی کمی کے باوجود میں تو مجبور ہو گئی ہوں کہ ضرور ہی بہت، بہت ساری تعریفیں اور مبارک باد دوں۔ اللہ مبارک کرے...... عظمیٰ آفاق نے اس عمدگی سے لکھا ہے کہ ہمیں یہی امید ہے کہ دور دراز رہنے والی جو بہنیں شادی میں شریک نہ ہو سکی ہوں گی وہ بھی آنکھوں دیکھا حال پڑھ لیں گی۔ خوب صورت تصاویر اور تفصیلات سے آراستہ عظمیٰ کی مبارک باد بہت پسند آئی۔ ویلڈن عظمیٰ...... انجم انصار صاحبہ کی روشن تحریروں سے ہمیشہ میں نے رہنمائی حاصل کی ہے۔ انہوں نے اس بار مجھے کچھ کہنا ہے میں بہترین تجاویز دی ہیں۔ جس پر ہم ہمیشہ سے عمل پیرا رہتے ہیں۔ اور حامی ہیں کہ دوستوں کے بغیر زندگی کا کوئی تصور نہیں میرے پاس...... رشتے داریاں پیچھے رہ جاتی ہیں یار سوہنے کے مقابلے میں خیال رہے کہ یہ یار سوہنا سے مراد سکھی سہیلی اور ہم راز دوست لیا جائے (بالکل) سارے افسانے ایک سے بڑھ کے ایک رہے...... شیریں حیدر کا منی ناول خوب رہا...... شائستہ زریں حسب معمول شاندار ترین سروے لائیں...... جلترنگ پڑھ کر بہت لطف آیا اور بہنوں کی محفل کے دو بار پڑھ کر مزے لوٹے گئے۔ پڑھ کے سب بہنوں کے احوال کا علم ہوا۔ بہت اچھا لگا۔ اور ہاں کارنرز پر لگی ہوئی شاعری بہت اچھی لگتی ہے ضرور لگایا کریں۔'' (بہت شکریہ)

٭ نسیم ماپارا، کراچی سے۔ ''دلہن سے سجا ہوا شمارہ بڑا اچھا لگا۔ ابتدا ذیشان میاں کی شادی کا آنکھوں دیکھا حال سے کی۔ ماشاء اللہ عظمیٰ آفاق نے اپنے قلم کا جادو خوب چلایا اور پوری تقریب ہم نے دولھا، دلہن اور تمام مہمانوں کے ساتھ جیسے گزاری خدا نظر بد سے اس خوب صورت جوڑی کو بچائے اور معراج صاحب اور عذرا کو ان کی بہت سی خوشیاں دیکھنی نصیب ہو، آمین۔ تمام سلسلے وار ناول مست خرامی سے اپنی منزلوں کی طرف رواں دواں ہیں، فرحین اظفر کی اسٹیل کی چیلی کی کھنک نے بہت متاثر کیا...... نفیسہ سعید ابھی امید باقی ہے نے یہ پیغام دیا کہ ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی۔ اختر شجاعت نے محبت الٰہی کے بڑے خوب صورت راز افشا کیے۔ رخ چوہدری نے بہت اچھی سی بزم سجائی، ہماری نزہت سے درخواست ہے کہ اس مسند پر سب کی پیاری انجم انصار کو بھی بٹھایا جائے۔ کیا خیال ہے؟ (ابھی پہلے میری مصنفات تو آ جائیں) جلترنگ کے تمام خاکوں نے مزہ دیا۔ بہنوں کی محفل میں جو بہنیں بیمار ہیں اللہ انہیں صحت و تندرستی عطا کرے۔ آمین، جاتے، جاتے تمام اہل اسلام کو عیدالاضحیٰ کی پیشگی مبارک باد...... اور بہنوں سے درخواست ہے کہ ڈیپ فریزر کا پیٹ بھرنے سے بہتر ہے کہ قربانی کے اصل مفہوم کو سمجھیں۔'' (جی بالکل)

٭ حمنہ احمد، لاہور سے۔ ''پہلی مرتبہ کسی رسالے میں رابطہ کر رہی ہوں اور اس کی اصل وجہ عظمیٰ آفاق کا دلچسپ انداز میں لکھا گیا ذیشان کی شادی کا احوال ہے...... پڑھ کر بے حد، بے حد مزہ آیا کہ اس سے قبل بہت سے احوال پڑھے ہیں...... مگر اس کو پڑھ کر تو قاری اپنے آپ کو تقریب کا حصہ سمجھنے لگا۔ انجم باجی آپ کے جلترنگ میں بہت شوق سے پڑھتی ہوں، میری شادی کو نو سال ہو گئے ہیں۔ مگر پاکیزہ سے غافل نہیں رہی اور اب میں بھی تحریری طور پر اس کارواں میں داخل ہونا چاہتی ہوں......'' (خوش آمدید پیاری حمنہ تمہیں شامل کر کے مجھے دلی خوشی ہو رہی ہے ہاں آئندہ بھرپور تبصرے کے ساتھ شریک ہونا)

٭ فیروزہ بیگم، کراچی سے۔ ''محترمہ عذرا رسول کو بہت مبارک باد...... بہو پیاری ملی ہے، عظمیٰ نے بے حد مزیدار انداز میں شادی کی تقریب کی تصویر کھینچ دی ہے...... مزاح نگاری کے تڑکے نے علیحدہ لطف دیا ہے مگر عظمیٰ کو تو ہم نے دیکھ رکھا ہے۔ دبلی پتلی سی ہے...... یہ اتنی موٹی تصویر کیسے لگ گئی۔ (دراصل عظمیٰ کی تصویر شادی کے گروپس میں نہیں تھی۔ انہوں نے جلد بازی میں جو بھیجی وہ لگا دی گئی...... مگر حقیقت یہ ہے کہ عظمیٰ کہیں بھی موٹی نہیں لگتی ہے، یہ شاید قریب سے لی گئی تصویر ہوگی) اس احوال کے بعد شیریں حیدر کا ناول اچھا لگا۔ بہنوں کی محفل پسند آئی اور روحانی مشورے بہترین لگے۔ ہاں بزم پاکیزہ اور رخ چوہدری کا انٹرویو بھی پسند آیا۔'' (نوازش)

٭ ساجدہ بتول، راجن پور سے۔ ''باجی پاکیزہ میں میرا خط شائع ہوا جس کی مجھے اتنی زیادہ خوشی ہوئی کہ میری بیٹی

مجھ سے کہنے لگی کہ بہنوں کی محفل فوٹو اسٹیٹ کروا کے آپ کے کمرے میں لگوا دوں...... یہ محفل مجھے بے حد ہی پسند ہے۔ اس شمارے میں، میری پسندیدہ رائٹر عظمٰی آفاق نے مجھے بہت خوشی دی...... اتنا مزے کا شادی کا احوال لکھا ہے اور بیچ بیچ میں اتنی ہنسی کی باتیں ڈالی ہیں کہ یہ حال ہم سب نے ہنستے مسکراتے ہوئے پڑھا ہے۔ ذیشان اور فاطمہ کو دعائیں...... میں آپ سے کہہ رہی ہوں کہ عظمٰی سے کہیں کہ وہ ناول لکھے پاکیزہ میں۔'' (پیاری ساجدہ اس دفعہ تو آپ نے عظمٰی کے علاوہ کسی کہانی کے بارے میں کوئی رائے نہیں دی ہے۔ مجھے اس وقت بہت زیادہ خوشی ہوگی کہ آپ ہمارے پورے پرچے پر اپنی رائے دیں۔ دولھا، دلہن آپ کی پُرخلوص محبت پر شکریہ کہہ رہے ہیں)

✿ اُمِ ایمان قاضی، کوٹ چھٹہ سے۔ ''سب سے پہلے بہنوں کی محفل کو ہمیشہ کی طرح رات میں پڑھا ہے۔ ہر ماہ قاری بہنوں سے ہونے والی اس ملاقات میں ایک الگ ہی مزہ ہے۔ علیل بہنوں کے لیے شفا اور جن بہنوں کے عزیز و اقارب اس دنیا سے چلے گئے ان کے لیے مغفرت کی دعا ہے۔ ذیشان رسول کی شادی کی خوب صورت تصاویر کے ساتھ عظمٰی کی تحریر نے گویا چار چاند لگا دیے۔ عظمٰی کی بھی تصویر رنگین ہوتی تو زیادہ اچھا لگتا۔ عذرا رسول اپنی ہمیشہ والی ڈیسنٹ لک میں بہت اچھی لگیں۔ دیگر رائٹرز سے بھی خوب ملاقات رہی اور دلہن، دولھا تو ماشاء اللہ ہیں ہی خوب صورت...... ہالہ احمد کی ہلکی پھلکی تحریر اچھی لگی۔ واقعی دوسروں پر تنقید دنیا کا سب سے آسان ترین کام ہے اور اپنی اصلاح سب سے مشکل...... متاعِ دل میں مکافات کا عمل شروع ہونے کو ہے۔ فرحین اظفر کی تحریر اچھی تھی۔ جو لوگ مادی اشیا کو انسانی جذبات پر ترجیح دیں ان کا انجام تو ایسا ہی ہوتا ہی ہے۔ اعتبارِ وفا کی یہ قسط بھی تسلسل بھرے تجسس کے ساتھ رہی...... شیریں حیدر! اُف بہت نازک موضوع پر قلم اٹھایا آپ نے یہ ماؤں کی غفلتیں کیسی کیسی قیامتیں لے کر آتی ہیں۔ دُرِ ثمن کی تحریر کا آغاز تو اچھا ہے۔ ثمینہ عظمت علی کی ہلکی پھلکی کہانی اچھی تھی۔ نایاب جیلانی نے انسانی رویوں کی شدت کو دکھاتے ہوئے اچھا اختتام کیا...... مگر مجھے لگا ان کو فاطمہ کو ماہر سے معافی مانگتے اور اپنے رویے کو مثبت انداز میں ڈھالتے دکھانا چاہیے تھا۔ اقبال بانو کی تحریر پر تبصرہ مکمل ہونے کے بعد...... رائٹرز سے جب بھی ملاقات ہو مجھے بے حد اچھا لگتا ہے۔ رخ کی باتیں پڑھ کر بھی اچھا لگا۔ ہر ماہ کسی رائٹر سے ملاقات ہو تو کیا کہنے...... شمع ہدایت محبت الٰہی ایک خوب صورت سلسلہ جو کچھ دیر کے لیے اپنا احتساب کرنے پر مجبور کر دیتا ہے کہ ہم نے کیا محبت الٰہی کا حق ادا کیا اور کس منہ سے اپنے مالک کے سامنے جائیں گے؟ شائستہ کا سروے اس بار دلہن نمبر کے حساب سے تھا اچھا لگا۔ پاکیزہ ڈائری ہمیشہ سے زیادہ اچھی لگی۔ آپا آپ یقین کریں جلترنگ میں واجدہ کا کردار پڑھ کر مجھے بھی ایک کردار یاد آیا۔ ایسے لگا آپ نے اسی کے اوپر ہی لکھا ہو یہ سب...... سب سے زیادہ مزہ جمیلہ آپا کے خیالات اور عادات پڑھ کر آیا۔'' (شکریہ)

✿ شمع ملک، رحیم یار خان سے۔ ''ماہ ستمبر کا پاکیزہ، دلہن نمبر کے حساب سے ٹاپ پر رہا۔ سرورق پر نیناں کے دونوں نیناں بہت خوب صورت تھے۔ مجھے کچھ کہنا ہے میں باجی انجم انصار نے درست کہا کہ ہمیں ایک دوسرے کے پاس آنا جانا چاہیے۔ عظمٰی آفاق سعید کو ذیشان کی شادی کا اتنا اچھا احوال لکھنے پر مبارک باد دیتی ہوں...... تصویروں میں مجھے تو سب سے زیادہ باجی عذرا رسول کی تصویر اچھی لگی۔ کیونکہ ہر تصویر میں ان کے سر پر دوپٹا (چادر) موجود رہا۔ حالانکہ سنا ہے کہ ان کے بال بہت لانبے ہیں۔ جلترنگ حسبِ معمول بہت زبردست تھا۔ شمع ہدایت میں محبت کے حوالے سے بہت خوب صورت لکھا گیا۔ بہنوں کی محفل میں نور افشاں شیخ شکار پور، کا تبصرہ خوب تھا۔ میں اکثر گنگناتی ہوں میں عائشہ اعوان کا شعر بہت اچھا لگا۔ آخری امید کی تیسری قسط بھی بہت اچھی تھی۔ منی ناول زندگی خاک نہ تھی۔ زبردست جا رہا ہے۔ کوئی اور کرے تو بہت مزاحیہ اور دلچسپ تحریر تھی۔ ہلکی پھلکی اور خوب صورت انداز والی اس تحریر نے بہت ہنسایا۔ محبت یہ نہیں ہوتی، پردہ اور حساب دوستاں پسند آئیں۔ مگر جس کہانی نے زیادہ متاثر کیا وہ تھی خاموش محبت۔ الفاظ جیسے موتی پروئے ہوں پھر منظر کشی، گلگت کے پہاڑوں اور پانی کے جھرنوں کا ذکر، کچھ ماضی کی یادیں تازہ کر گیا۔ ایک تو پوچھنا ہے کہ بزمِ پاکیزہ میں کتنے سوال بیک وقت بھیج سکتی ہوں (درجن بھر بھی سوالات بھیج سکتی ہیں۔ میں آہستہ، آہستہ لگاتی جاؤں گی) اور دوسرا یہ کہ اگر کوئی افسانہ بھیجا جائے تو آپ کے نام ڈائریکٹ بھیج دیں یا ادارے کے نام پر......'' (جس طرح آپ مناسب سمجھیں...... دونوں صورتوں میں وہ میرے پاس ہی آئے گا)

✿ خولہ عرفان، کراچی سے۔ ''رسالے کا مطالعہ مکمل کر چکی ہوں علاوہ دو ناول کے۔ سرورق پر موجود گہرے آسمانی رنگ میں ملبوس ماڈل کو دیکھ کر جو ٹھنڈک کا احساس اجاگر ہوا تھا آپ کا اداریہ پڑھ کر وہ گہرے سکون میں ڈھل گیا اور جب مطالعے کا

سفر آگے بڑھ کر اللہ مبارک کرے کے نفسِ مضمون پر پہنچا تو معلوم ہوا کہ یہ آپ کی شخصیت کا حسن تھا جو رسالے کا احاطہ کیے ہوئے تھا۔ ایک لمحہ کو ایسا لگا کہ وہاں تو ذیشان رسول صاحب کی بارات ہے اور یہاں مصنفین ستاروں کی صورت میرے گھر میں موجود ہیں۔ آپ کے ساتھ ادب کی اور بھی معتبر ہستیوں کو دیکھنے کا اعزاز حاصل ہو گیا۔ عظمیٰ آفاق صاحبہ نے بہت اچھی تصویر کشی کے ساتھ شادی کا احوال قلمبند کیا ہیں۔ یقین جانیں طبیعت ہشاش بشاش ہو گئی عذرا رسول صاحبہ سمیت آپ سب مصنفین کا دیدار کر کے دعا کرتی ہوں جلد آپ سے ٹیلی فونک یا بالمشافہ ملاقات بھی ہو سکے، آمین۔ آگے بڑھی تو خوب صورت افسانوں اور ناولوں کی قطار کو اپنا منتظر پایا۔ پہلے سارے افسانے زیرِ مطالعہ لائی پھر ناول اور ناولٹ، نایاب جیلانی کا کہر میں کہانی کے تقاضوں کے عین مطابق اختتام پذیر ہوا...... ام ثمامہ کی خاموش محبت موضوع اور اس کی مناسبت سے لفظوں کا انتخاب خوب تھا البتہ ایک جگہ نور نامہ کا لہجہ اور الفاظ پہاڑی لوگوں کے اندازِ گفتگو کی عکاسی کرتے نظر نہیں آئے۔ جہاں وہ پلوشہ سے کہتی ہے کہ یہ لوگ یہاں اس جنت نظیر وادی میں چند دن گھومنے تو آسکتے ہیں مگر اماری طرح رہ نہیں سکتے ویسے کہانی اور اندازِ بیان دونوں جاندار تھے۔ اقبال بانو صاحبہ کا دلہن میں لے کے جاؤں گا بہت اچھی تحریر لگی۔ کچھ کچھ اندازہ ہو رہا ہے کہ اگلی قسط میں کیا ہوگا۔ ثمینہ عظمت علی کا حسابِ دوستاں بھی نیا اور مختلف موضوع تھا پسند آیا۔ روشانے عبدالقیوم کا محبت یہ نہیں ہوتی، فرحین اظفر کا اسٹل کی پتلی اور نفیسہ سعید کا ابھی امید باقی ہے تینوں مختلف موضوع لیے بہترین تحریریں تھیں۔'' (تفصیلی تبصرے کا شکریہ)

٭ عزیکہ عرفان، سعودی عرب سے۔ ''میرے شوہر عرفان نے پاکیزہ حاصل کرنے کے لیے نہ جانے کتنے چکر لگائے...... تب کہیں جا کر مجھے پاکیزہ ملا ہے...... اور میں پہلی دفعہ کسی بھی ڈائجسٹ کے لیے اپنی رائے دیتے ہوئے یہ کہنا چاہتی ہوں کہ ہمیں عظمیٰ آفاق کی تحریریں بے حد، بے حد پسند ہیں۔ اور انہوں نے شادی کا مزے دار حال لکھ کر نہ صرف ہماری شرکت کروادی...... بلکہ ہمیں خوش بھی کر دیا ایسی ہنستی مسکراتی تحریریں ہمیں بے حد پسند ہیں۔'' (پیاری عزیکہ اس محفل میں خوش آمدید...... عرفان بیٹے کا بھی شکریہ کہ وہ تمہارا اتنا خیال رکھتے ہیں اور ہاں آئندہ پاکیزہ کے لیے تمہارا بھرپور تبصرہ ہونا چاہیے...... ہاں عظمیٰ شکریہ کہتی ہیں)

٭ نائلہ بلیغ الرحمٰن، بہاول پور سے۔ ''ہر ماہ کی طرح اس بار بھی شمارہ اعلیٰ ترین تھا۔ مجھے کچھ کہنا ہے میں آپ نے زبردست باتیں کی ہیں، میں تو پہلے ہی یہ شوشا چھوڑ چکی ہوں اپنی دوستوں میں کہ جب آپ سیڑھیاں چڑھتے وقت ریلنگ کا سہارا لینے لگیں تو سمجھ لیں کہ بڑھاپا آیا ہی چاہتا ہے اور باجی یقین مانیں میری ایک دوست نے تو ڈر کے مارے ریلنگ پکڑنا ہی چھوڑ دی ہے۔ آدم سے انسان تک، قانتہ رابعہ کی اچھی کاوش تھی۔ شائستہ انجم کی ضرورت مند حسبِ حال تھی اور اچھی تھی۔ عقیلہ حق کی عید مبارک حقیقت سے دور لگی مگر لکھنے کا انداز اچھا تھا۔ مگر اس دنیا میں تو کچھ بھی ہو سکتا ہے ناں...... شیریں حیدر زبردست لکھتی ہیں، ماشاء اللہ۔ محترمہ شمیم فضل خالق صاحبہ کی بھی تحریر بہت اعلیٰ تھی۔ چلو شکر ہے کہ نشانہ فٹ لگا ورنہ ہیرو، ہیروئن کی ایسی کی تیسی ہو جاتی...... میمونہ صدف کی کاوش یہ تیری ہے، بہترین تحریر تھی۔ بخیل ایک سبق آموز افسانہ تھا اللہ تعالیٰ ہم سب کو اسی طرح نیکیاں کرنے کی توفیق دے، آمین۔ جلترنگ ہمیشہ کی طرح اعلیٰ اور ہنسنے والا تھا۔'' (شکریہ)

٭ فرخندہ جعفری، گاؤں مدینہ سیداں سے۔ ''آپ نے ماہِ اگست میں میری صحت کے لیے دعا کی اور قاری بہنوں سے بھی دعا کروائی۔ آپ سب کی دعاؤں کی وجہ سے میں کچھ لکھنے کے قابل ہوئی ہوں۔ آپ کا بہت شکریہ میرا شعر بھی پاکیزہ میں لگانے پر شکریہ...... آپ ڈائجسٹ کے پیپر زبڑھا دیں۔ تمام لکھاری بہنوں کو بہت، بہت مبارک باد، سب ماشاء اللہ بہت اچھا لکھ رہی ہیں۔'' (اللہ آپ کو کلی صحت دے آپ کی حوصلہ افزائی آئندہ بھی ہو گی)

٭ حمیرا، بفرزون کراچی سے۔ ''مجھے کبھی کسی ڈائجسٹ میں خط لکھنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ لیکن پاکیزہ ڈائجسٹ کو اپنی دوست کے گھر وقت گزاری کے لیے پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ آنٹی آپ کا رسالہ بہت اچھا ہے اس میں خطوط بھی لکھے جاتے ہیں۔ اسی لیے میں نے بھی ایک خاص وجہ سے آپ کو خط لکھا ہے۔ (خوش آمدید) کیونکہ مجھے قسط وار ناول بغیر شروع سے پڑھے مزہ نہیں آتا لہٰذا میں نے افسانے پڑھنے شروع کر دیے۔ آنٹی موسم گل پڑھنے کے بعد مجھے اندازہ ہوا کہ واقعی ہم اپنی زندگیوں میں اتنے مگن ہوتے ہیں کہ آخرت ہمیں یاد ہی نہیں رہتی۔ صرف دنیا کو ہی سب کچھ سمجھنے والوں کے لیے تسنیم منیر علوی کا یہ افسانہ اچھا لگا۔ لیکن جس افسانے نے مجھے خط لکھنے پر مجبور کیا ہے وہ ریحانہ حسن کا شائع ہونے والا وارث افسانہ پڑھ کر میں

حیران رہ گئی گویا یہ بالکل سچی کہانی لگی۔'' (پسندیدگی کا شکریہ)

٭ حمیرا انو شین، منڈی بہاؤ الدین سے۔ ''باجی اس مرتبہ پورے رسالے کی جان اور شان ذیشان رسول کی شادی کا احوال تھا۔ تصاویر ایسی کہ بار، بار دیکھنے کو دل مچلے اور عظمیٰ کے قلم نے تصور کی آنکھ سے ہمیں سب کچھ دکھا ڈالا۔ انجم باجی آپ بہت گریس فل اور پیاری لگ رہی ہیں۔ رفاقت جاوید بہت ڈیسنٹ لگیں۔ عقیلہ حق بھی پیاری لگ رہی تھیں جبکہ نگہت غفار سادہ سے سوٹ میں بہت سادہ لگیں۔ تصاویر آگے کی طرف جانے ہی نہیں دے رہیں جب بھی رسالہ کھولتی ہوں تصویروں پر نگاہیں جم جاتی ہیں۔'' (پسندیدگی کا شکریہ)

٭ ستارہ آمین کومل، پیر محل سے۔ ''سرورق سے پس ورق تک زبردست، ذیشان رسول کی شادی کا احوال ویلڈن عظمیٰ آفاق زبردست فوٹوز بہت اعلیٰ تقریباً سب لیکن جو چیز مجھے متاثر کر گئی وہ تھا پردہ عذرا رسول اور بہن، بھابیوں وغیرہ کے ڈھکے سر...... اب ہو جائے تبصرہ...... شیریں حیدر کا ناول پڑھ کر رونگٹے کھڑے ہو گئے اللہ توبہ ہے، دُرِ ثمن بلال شاباش ہے لڑکی بہت شکریہ ہمارے لیے لکھنے کا آغاز ہی بہت اچھا ہے۔ متاع دل میں شکر ہے دُر یکتا کو اشعر لے گیا اب آگے سب اچھا ہو جائے گا۔ نایاب جیلانی، اقبال بانو، بہت سا پیار و دعائیں۔ قیصرہ حیات اور نگہت سیما ویلڈن آل دا بیسٹ سات کے سات افسانے بہت اچھے تھے ثمینہ عظمت کی حاضری اچھی لگی۔ ام ثمامہ، نفیسہ سعید واہ جی واہ ایسے ہی لکھتی رہیں۔ ہالہ احمد بہت اچھا سبق دیا۔ فرحین اظفر کی اسٹیل دی چیلی نال چھا گئے او...... پردہ نائس تحریر...... واور رخ چوہدری سے ملاقات، نزہت اصغر جیتی رہیں آپ دل خوش کر دیا۔ بہنوں کی محفل سے نازنین آفریدی، کوثر خالد، صائمہ سجاد بخش کی غیر حاضری گراں گزری...... واہ فاطمہ چوہدری گڑیا تم نے تو دل خوش کر دیا اپنی حاضری لگوا کر اور مبارک باد قبول کرو پہلی تحریر ہی سندِ قبولیت پا گئی۔ پیار بھری تھپکی بہت سی دعائیں تمہارے لیے۔ بہنوں کو دلی عید مبارک باد بوٹیاں کھانے میں ہتھ ہولا رکھنا سب اپنے معدے پر دھیان دینا ہاہاہا...... ویسے نزہت اصغر جیسے رخ چوہدری کے ساتھ ملوایا میرا ابھی دل کیا کہ کسی نہ کسی رائٹر کے ساتھ میں بھی حاضر ہو جاؤں۔ تحریری ملاقات کر و دوں آپ کا کیا خیال ہے انجم آپی (انٹرویو کارنر میں شرکت ہو سکتی ہے) عظمیٰ آپس کی بات میرے سر پر بھی پودینے کی گتھی ہے۔'' (پسندیدگی کا شکریہ، گڑیا سر پر بال ہونے چاہئیں کم ہوں یا زیادہ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا)

پیاری بہنو! تحریری یا زبانی میری کوئی بات آپ کو گراں گزری ہو تو اس کی معافی کے بعد...... آیئے پہلے درودِ پاک پڑھتے ہیں اور پھر دعا مانگتے ہیں...... یا اللہ، یا رحمٰن، یا رحیم، یا کریم...... میرے جسم کو شفا اور دل کو اپنی ذات کا یقینِ کامل اور آنکھوں کو نورِ بصیرت عطا فرما اور جب تک میں زندہ رہوں، اپنے ذکر کو صبح شام میری زبان پر جاری فرما دے اور ایسی جگہ سے مجھے رزق دے جو بلا رکاوٹ ملتا ہی رہے۔ یا رب العالمین مجھ سے، میری اولاد سے اور میرے تمام عزیز و اقارب سے ہمیشہ، ہمیشہ راضی رہنا...... اور ہر گناہ، ہر غلطی اور ہر کوتاہی کو معاف کرنا اور ہمارے عیبوں کی پردہ پوشی کرنا، اپنی نظر میں چھوٹا مگر دوسروں کی نظر میں بڑا بنا دینا...... اور دونوں جہاں میں مجھے خیر عطا کرنا کہ بے شک تو سب سے بڑھ کر رحم کرنے والا ہے اور تیری ثنا سب سے بڑی اور تیری پناہ عزت والی ہے۔ اس لیے صرف اپنا محتاج کرنا اور ہمیشہ، ہمیشہ اپنی شان کے حساب سے ہم سب پر اپنا رحم، کرم اور فضل کرنا اور ازل سے ابد تک سب کو معاف کرنا کہ بے شک میرا رب ہر چیز پر قادر ہے اور میرا رب برکت اور بلندی والا ہے۔

دعا گو

آپ کی اپنی باجی

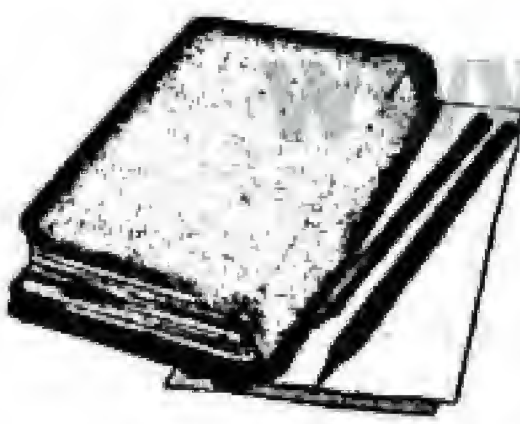
انجم انصار



**پاکیزہ میں خط لکھنے کا پتا**

مدیرہ ماہنامہ پاکیزہ۔ 63.c فیز III ایکسٹینشن، ڈیفنس۔ مین کورنگی روڈ۔ کراچی۔ پوسٹ کوڈ 75500

فون نمبر 021-35804200 , 021-35895313 EXT 107,118



# پاکیزہ ڈائری

عظمیٰ آفاق سعید

## حمدِ ربِ ذوالجلال

اے رب میں کم سخن ہوں یہ اظہارِ حال ہے
لکھوں میں تیری حمد یہ دل میں خیال ہے
رحمٰن ہے رحیم ہے تو ذوالجلال ہے
تیری ہو کیا مثال کہ تو بے مثال ہے
کہتا ہوں لاالہ تو رکھتا ہوں یہ یقین
اِک ربِ کائنات ہی لازوال ہے
وہ لفظ دے کہ میں تیری مدحت رقم کروں
ہونٹوں پہ یہ دعا ہے، یہ دل میں خیال ہے
اِک تیرا نور ہی مرے پیشِ نظر ہے آج
جانِ حزیں کو ذکر تیرا اندمال ہے
ذرہ ہوں کائنات کا میں ربِ کائنات
میں جو بھی کہہ رہا ہوں یہ تیرا کمال ہے
تیرے سوا کسی پہ بھروسا نہیں مجھے
مجھ کو یقین ہے تجھے میرا خیال ہے

شاعر: محسن علوی

مرسلہ: شازیہ محبوب...... کراچی

## نعتِ رسولِ مقبول ﷺ

سب کچھ خدا سے مانگ لو عشقِ نبیؐ میں ڈوب کر
دونوں جہاں سنوار لو عشقِ نبیؐ میں ڈوب کر
پھول کھلیں چمن، چمن مہکے ہر اِک کلی، کلی
نعتِ نبیؐ لکھو اگر عشقِ نبیؐ میں ڈوب کر
دل کی سیاہی ڈھل گئی شامِ الم بھی ڈھل گئی
روشن حیات ہوگئی عشقِ نبیؐ میں ڈوب کر
وہ اِک نگاہِ شوق تھی لمحوں میں سرنگوں ہوئی
روضے پر جب پڑی نظر عشقِ نبیؐ میں ڈوب کر
دل کو سرور مل گیا روح بھی پُرسکوں ہوئی
صلی علیٰ کہا تھا جب عشقِ نبیؐ میں ڈوب کر
نور کی اِک کرن ملی روشن ہوئی تھی کائنات
ساری حیات جب کٹی عشقِ نبیؐ میں ڈوب کر
سجدے کروں میں رات دن بھیجوں درود اور سلام
جان بھی دوں تو کچھ نہیں، عشقِ نبیؐ میں ڈوب کر
غیرِ خدا کے سامنے کرنا کبھی نہ سر کو خم
دل میں رہے نہ کوئی غم عشقِ نبیؐ میں ڈوب کر
اے دلِ مضطرب تجھے کیوں نہ سکھاؤں ایک بات
سیرتِ مصطفیٰ پہ چل عشقِ نبیؐ میں ڈوب کر
موت ہے کیا حیات کیا عقدہ کبھی نہ کھل سکا
پالے تو رازِ زندگی عشقِ نبیؐ میں ڈوب کر
کیسی ملی حیاتِ نو میرا نصیب دیکھیے
چپکے سے آنکھ موند لی عشقِ نبیؐ میں ڈوب کر

کلام: ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی، کراچی

## ایک ہنر

حضرت امام جعفر صادقؒ فرماتے ہیں۔ بچہ دنیا میں صرف ایک ہنر لے کر آتا ہے اور اسی ایک ہنر سے اپنی ماں سے سب کام کروا لیتا ہے۔ اس لیے اپنے رب کے سامنے رونا سیکھو اور اپنے رب کو منالو، بے شک تمہارا رب ستر ماؤں سے زیادہ پیار کرنے والا ہے۔ سبحان اللہ......

نایاب کرن صدیقی، کمالیہ، ضلع ٹوبہ ٹیک سنگھ

## امیر المومنین حضرت عمر فاروقؓ

## حضرت خولہ بنت ثعلبہؓ کا مقام

ایک عورت اپنے ہاتھ میں لاٹھی لیے راستہ ڈھونڈ رہی تھی، وہ زمانے کی مصیبتوں کی ماری ہوئی تھی۔ اس نے حضرت عمر فاروقؓ کو جو لوگوں کے درمیان کھڑے

تھے روکا اور ایک طرف لے گئیں۔ حضرت عمر فاروقؓ قریب ہوئے کندھے پر ہاتھ رکھا اور اپنے کان اس کی طرف لگائے۔ حضرت عمر فاروقؓ نے کافی دیر تک اس کی نحیف آواز کی طرف کان لگائے رکھے۔ اس وقت تک انحراف نہیں کیا جب تک اس کی ضرورت کو پورا نہیں فرمایا۔ اس کے بعد جب حضرت عمر فاروقؓ لوگوں کی طرف واپس آئے کافی دیر سے کھڑے انتظار کررہے تھے تو کسی آدمی نے کہا۔ ''اے امیر المومنینؓ آپ نے اس بڑھیا کی خاطر قریش کے آدمیوں کو روکے رکھا۔'' حضرت عمر فاروقؓ نے فرمایا ''تیرا ناس ہو جانتے بھی ہو کہ یہ بڑھیا کون تھی؟'' اس آدمی نے کہا۔ ''میں نہیں جانتا۔'' حضرت عمر فاروقؓ نے فرمایا۔ ''یہ وہ خاتون ہیں جن کا شکوہ اللہ تعالیٰ نے ساتویں آسمان پر سنا۔ یہ خولہ بنت ثعلبہ تھیں، خدا کی قسم اگر وہ رات تک میرے پاس سے نہ جاتیں تو میں بھی ان کی ضرورت پوری کرنے تک نہ لوٹتا۔''

مرسلہ: امینہ عندلیب، سلانوالی

## غزل

دھوکا اس سے جو کھایا تو آنکھ بھر آئی
روگ دل کو لگایا تو آنکھ بھر آئی
برس رہا ہے ساون حسین موسم ہے
جو ساتھ اس کا نہ پایا تو آنکھ بھر آئی
کسی انعام کی صورت ملا اچانک تھا
اسی کو پا کے گنوایا تو آنکھ بھر آئی
وہ جس کی خاطر زمانے کو میں بھلا بیٹھی
تماشا اس نے دکھایا تو آنکھ بھر آئی
جو مجھ سے پوچھے بنا سانس تک نہ لیتا تھا
اسی نے جی کو جلایا تو آنکھ بھر آئی
میرے نام کی جپتا تھا رات دن مالا
جو بھولنے پہ وہ آیا تو آنکھ بھر آئی
اس سے ملنے کی خواہش بڑی تھی دل کو مرے
نہ کوئی راستہ پایا تو آنکھ بھر آئی
وہ ہنس پڑا تھا سن کے مرا فسانۂ دل
مذاق اس نے اڑایا تو آنکھ بھر آئی
جو چھوڑتا ہی نہیں تھا کسی بھی پل مجھ کو
ملا جو بن کے پرایا تو آنکھ بھر آئی
عزیز جس کو زمانے سے ہم نے جانا تھا
فریب اس سے ہی کھایا تو آنکھ بھر آئی
کسی بھی غم کو میں نے کبھی نہ گردانا
روتے اس کو جو پایا تو آنکھ بھر آئی
انا کی جنگ میں وہ مجھ کو ہار کے خوش ہے
شگفتہ دل کو بتایا تو آنکھ بھر آئی

شاعرہ: شگفتہ شفیق، کراچی

## ایک دن

حرم کے سامنے ہوں گی میں اِک دن
حالِ دل اپنا کہوں گی سب میں اِک دن
تیری چوکھٹ پر رکھ دوں گی جبیں اپنی
تجھے روکے منالوں گی میں اِک دن
تو میرا رب ہے مجھ کو چاہتا ہے
کرے گا نور سے روشن جیون میرا اِک دن
تو مجھ سے راضی ہوگا اتنا یقین ہے
اسی آس پر آؤں گی تیرے گھر میں اِک دن
بخش دے گا تو مجھے بھی روزِ محشر
یہ وعدہ تجھ سے لینے آؤں گی اِک دن
تیری حمد و ثنا کہتی ہوں مولا
سناؤں گی حرم میں جا کے اِک دن

کلام: عالیہ ضیا، کراچی

## عقل اور علم

ہمیں ہر اس شے سے محبت کرنی چاہیے جو محبت کرنے کے لائق ہو اور اس چیز سے نفرت کرنی چاہیے جو قابلِ نفرت ہو لیکن یہ اس صورت میں ممکن ہے جب ہمارے پاس دونوں کا فرق کرنے کے لیے عقل کی دولت اور علم کا شوق ہو۔

از: حلیمہ سعدیہ، کمالیہ

## میری ہم جولیاں

☆ امینہ عندلیب، سلانوالی

دعاؤں کی اے بہار سلامت سدا رہو
میری سانسوں کی ہر پکار دیتی ہے یوں صدا

☆ جیا عباس، تلہ گنگ

تیرے نام کو سلام فنِ گلفام کو سلام
تیرے مقام کو سلام تیرے کلام کو سلام

☆ عالیہ بشیر، اسلام آباد

اِک نعت لکھو پھر سے جو دل میں سما جائے
پاکیزہ سی محفل میں تیرا نام نظر آئے

☆ مصباح علی، فیصل آباد

تجھے چاہتے ہیں ہم سراہتے ہیں ہم
پڑھتے ہیں تیری تحریر کو دل جمعی کے ساتھ

☆ سنبل ملک، لاہور

کہاں ہو تم کو ڈھونڈ رہی ہے
یہ بہاریں یہ سماں

از: کوثر خالدہ، جڑانوالہ

## انعام یافتہ تحریر

## محاوروں کا صحیح استعمال

1۔ چور کی داڑھی میں تنکا......

ایک پولیس نے چور پکڑا پھر خوب تلاش کیا مگر انہیں چور کی داڑھی میں تنکا نہیں ملا۔ کیونکہ چور کی داڑھی ہی نہیں تھی۔

2۔ ہوش کے ناخن لینا......

ہوش کے ناخن لے کر انسان کو سمجھ نہیں آتی کہ کس حوش کے پاس جائے۔

3۔ بھاگتے چور کی لنگوٹی......

آج کل بھاگتے چور نے لنگوٹی پہننا چھوڑ دی ہے۔ وہ آج کل پورے کپڑے پہنتے ہیں۔

4۔ عقل سے پیدل......

عقل سے پیدل چلنے کے لیے کہنا نفسیاتی مریض ہونے کی نشانی ہے۔ وہ کون سا بس میں سفر کرتی ہے۔

5۔ اونچی دکان پھیکا پکوان......

میں نے سوات میں اونچی دکان پر پھیکا پکوان چکھا...... کیونکہ پکوان کو کنگ آئل پھیکا ہی ہوتا ہے، جاہلو!

6۔ بھینس کے آگے بین بجانا......

مجھے بھینس کے آگے بین بجانا پسند نہیں...... اس لیے میں بکری کے آگے اور پیچھے بین بجاتی ہوں۔

از: نازیہ نزی، نوشہرہ کینٹ

## بکرا نامہ

قیمت اپنی گائے نے لکھ رکھی تھی ستاوے ہزار
ساتھ ہی تاکید یہ تھی کہ بات اس کی مان جاؤں
یہ ہدایت دیکھ کے میں نے یہ پوچھا گائے سے
تیری قربانی کروں یا میں تیرے قربان جاؤں

☆☆☆

ایک بکرے نے کہا بکری سے اے جانِ عزیز
اب کے ہم بچھڑے تو شاید کبابوں میں ملیں

☆☆☆

بکرا تلاش کر نہ قسائی کو کال کر
اس بار ہلکا جیب کو تُو حسبِ حال کر

پروین افضل شاہین، بہاول نگر

## زندگی

کوئی لمحہ
ایسا گلاب ہو
کوئی لمحہ
ایسا اسیر ہو
یہ جو
تیرے میرے ہے درمیان
نہ کوئی
ریاضتوں کی زنجیر ہو
تیری ہر خوشی
تیری ہر ادا
میری زندگی کی تحریر ہو

شاعرہ: صائمہ سجاد بنگش، کوہاٹ



# جلترنگ

انجم انصار

## عیدی

نسرین کی منگنی کو پانچ سال ہوگئے تھے، ہر چھ مہینے کے بعد یوں لگا کرتا تھا کہ اب ٹوٹی کہ تب ٹوٹی!

ایسی بات بھی نہیں تھی کہ یہ منگنی غیر خاندان میں ہوئی ہو یا دل پر پتھر رکھ کر کی گئی ہو۔ رضیہ اور رقیہ دونوں بہنوں نے بڑی محبت سے اپنے بچوں کی یہ منگنی کی تھی۔ طے یہ پایا تھا کہ ساجد کو نوکری ملتے ہی شادی ہوجائے گی۔

منگنی کے ایک سال بعد ہی ساجد کو نوکری مل گئی۔ رضیہ نے اپنی آپا رقیہ سے کہا۔ ''اب اپنی امانت اپنے گھر لے جاؤ۔ نسرین نے بی اے بھی کرلیا ہے، بی اے کے بعد بیاہ ہوجانا چاہیے۔''

''اے لو! اتنی جلدی کیسے کرلوں شادی، ابھی تو اس کے پاس پیسے بھی جمع نہیں ہوئے ہیں۔ نسرین تو بی اے کر کے بھی خاصی نالائق ہے، تم اس کو ایم اے کرادو۔''

''مگر میں یہ تو تم سے نہیں کہہ رہی کہ دھوم دھڑ کے سے شادی کرو۔ بس سادگی سے کرلو..... منگنی کے بعد یوں بھی لڑکیاں خاصی نفسیاتی ہوجاتی ہیں۔ دونوں گھرانوں کی کوئی بھی بدمزگی ان کے دل کو دہلا کر رکھ دیتی ہے۔''

''کہہ دیا ناں......! میں ابھی اپنے ساجد کی شادی اتنی جلدی نہیں کرنے کی۔'' رقیہ آپا نے تنک کر کہا۔

''تو پھر منگنی کیوں کی تھی۔ نسرین تو ہرگز آگے نہیں پڑھے گی، وہ بدشوق ہے۔''

''تمہیں جلدی ہے، تو توڑ دو یہ منگنی اور کہیں اور کرلو۔''

رقیہ آپا کی یہ بات بیچاری رضیہ کو لرزا کر رکھ دیتی تھی اور تب اس سے ایک لفظ بھی نہیں بولا جاتا تھا۔

یونہی پانچ سال گزر گئے۔ ساجد کی دو مرتبہ ترقی بھی ہوگئی۔ نسرین اپنی بات پر قائم رہی اور آگے پڑھ کر نہیں دیا۔ اس کے بی اے کے پرچے تو گیس پیپرز والوں کی وجہ سے اچھے ہوگئے تھے اور اب وہ آگے رسک نہیں لے سکتی تھی کہ پڑھنے کا شوق بالکل بھی نہیں تھا۔

ایم اے کا نام سن کر ہی اس کو چکر سا آتا تھا اور اس کی سہیلیوں نے اسے یہ بات اچھی طرح سمجھادی تھی کہ نام کے ساتھ اگر بی اے کی ڈگری ہو تو کم عمر لڑکی کا تصور آتا ہے اور اگر ایم اے، ایم فل کی ڈگری لگی ہو تو کسی عمر والی خاتون کا احساس ہوتا ہے جو کہیں لیکچر دینے جارہی ہے۔ رضیہ نے پانچ سال انتظار بہت کرلیا تھا۔ اب ان میں ہمت تھی نہ سکت...... نسرین کے ساتھ کی سب ہی لڑکیاں خیر سے بیاہی جاچکی تھی۔

رضیہ نے اپنی آپا کے سامنے بھاری جہیز اور سلامی میں اسکوٹر دینے کے ٹریلر دکھانے شروع کیے تو رقیہ نے کہا۔

''اچھا عید کے بعد شادی کرلیتے ہیں۔''

رقیہ کا ہامی بھرنا تھا۔ رضیہ بھی خوش ہوگئیں اور مارے خوشی کے...... ایک بھاری سی ساڑی اپنی بہن کو گفٹ کردی۔

نسرین بھی خوش تھی...... عید کے بعد شادی ہورہی ہے اور عید سے پہلے عیدی آئے گی۔ منگنی کے بعد یہ پہلی عیدی تھی جس کے لانے کا ان کی خالہ نے اقرار کیا تھا۔

نسرین مارے خوشی کے سب سہیلیوں کے ہاں فون کررہی تھی کہ اس کی عیدی آنے والی ہے۔

سہیلیاں اپنی، اپنی عیدیوں کی تفصیل اسے بتارہی تھیں۔ جس سے اس کے تصورات کی اڑانیں بھی خوب اونچی ہورہی تھیں۔

''اماں میرا خیال ہے میرے لیے خالہ پانچ ریشمی

اور پانچ کاٹن کے سوٹ لائیں گی، ہر سوٹ کے ساتھ میچنگ جیولری ہوگی۔ میک اپ کا سامان، سینڈل، چوڑیاں اور گولڈ کی چین تو ضرور ہوگی کہ ساجد بھی ہر وقت اپنے گلے میں پہنے رہتے ہیں۔''

اماں نے اس کی باتیں سنیں تو ہنس کر بولیں۔

''اری پاگل ہورہی ہے کیا..... تیری خالہ کوئی بری تھوڑی لے کر آرہی ہیں جو اتنی ڈھیر ساری چیزیں لے کر آئیں گی۔''

''مگر میری سہیلیوں کی عیدی تو ایسے ہی آتی ہے۔''

''جھوٹ بولتی ہوں گی تیری سہیلیاں.....'' اماں نے اسے حوصلہ دیتے ہوئے کہا۔

''میں نے خود دیکھی ہے ان کی عیدی۔ اس میں جھوٹ بولنے کی تو کوئی بات ہی نہیں ہے۔''

''تمہاری خالہ کنجوس ہیں، وہ اتنی عیدی نہیں لائیں گی۔''

''ساجد بھی کنجوس ہے کیا؟''

''ساجد کی اپنے گھر میں نہیں چلتی..... جو ماں، بہنیں کہہ دیتی ہیں وہی ماننے کا عادی ہے۔''

''مگر میری تو بڑی بھاری بے عزتی ہوجائے گی۔ جب میری سہیلیوں کو پتا چلے گا کہ پانچ سال کی منگنی میں پہلی مرتبہ عیدی آئی اور وہ بھی تھرڈ کلاس سی۔'' نسرین نے روتے ہوئے کہا۔

''تم کہہ دینا، خالہ نے کیش میں پانچ ہزار روپے بھجوادیے ہیں کہ جو دل چاہے لے لو۔'' اماں نے پھر تسلی کے پھائے رکھے۔

اور پھر نسرین کی عیدی آگئی۔ سوئیاں، چینی، کھجلہ، پھینی ہر شے آدھا، آدھا کلو کے قریب تھی۔

''یہ سب کیا ہے؟'' نسرین نے حیرت سے پوچھا۔

''تمہاری عیدی ہے تاکہ عید میں جب ہم تمہارے گھر آئیں تو تم مزے، مزے کی چیزیں ہمیں پکا کر کھلاؤ۔'' خالہ ہنس، ہنس کر کہہ رہی تھیں۔

اور نسرین آنکھوں میں آنسو بھر کے کبھی ماں کو دیکھ رہی تھی تو کبھی خالہ کو! اور خالہ کی ہنسی رکنے میں نہیں آرہی تھی۔ ایسی عیدی تو کبھی اس کی کسی سہیلی کی نہیں آئی تھی۔

اماں کو کمرے میں لے جا کر پوچھا۔ ''کیا ایسی بھی عیدی ہوتی ہے؟'' تو اماں نے اپنے آنسو پیتے ہوئے کہا۔

''ہاں ایسی بھی عیدی ہوتی ہے، تمہاری خالہ رقیہ کی عیدی پہلی مرتبہ ایسی ہی آئی تھی۔'' اور شاید بعض دکھ اور غم اس وقت تک ختم نہیں ہوتے..... جب تک کہ ویسے ہی دکھ ہم کسی دوسرے کو دے کر اسے دکھی نہ کردیں۔

## بے اختیاری میں

بقرعید آنے سے پہلے ہی بکروں کا ذکر ہر گھر میں ہونے لگتا ہے۔ پندرہ دن پہلے یہ بکرے ہر گلی محلے میں دکھائی دینے بھی لگتے ہیں..... کوئی بے شک اپنا بکرا چند گھنٹے پہلے ہی لائے مگر وہ بکروں کی قیمتیں پوچھنا پہلے سے ہی شروع کردیتا ہے۔

دبلے پتلے، ناتواں سے بکرے ظاہر ہے سستے ہوتے ہیں اور صحت مند، تگڑے اور اونچے بکرے مہنگے ہوتے ہیں۔ گویا یہ سب جانتے ہیں کہ قربانی کا جانور اچھا ہونا چاہیے مگر سب اپنی، اپنی جیب کو دیکھ کر قربانی کرتے ہیں۔ اس لیے جہاں تین، ساڑھے تین ہزار کا لاغر سا بکرا لوگ گود میں لے کر آتے ہیں، وہاں تین لاکھ کے بکرے بھی نظر آتے ہیں۔ جو تخت پر بیٹھتے ہیں، بادام پستے چباتے ہیں، پانی کی جگہ شربت پیتے ہیں، ان کی مزید خوبیاں بھی ایسی ہوتی ہیں جو اخبارات میں ان کی تصاویر کے ساتھ شائع ہوتی ہیں۔ حد تو یہ ہے کہ ٹی وی کے مختلف چینلز بھی ان کو کھاتے، پیتے، سوتے، جاگتے دکھاتے ہیں۔

بقرعید سے پہلے اور بقرعید کے ہفتہ دس دن بعد تک بکروں سے متعلقہ گفتگو ہونٹوں پر چڑھی ہوتی ہے۔ نہیں یہ بیس ہزار والا ہے، ارے نہیں اس کے تو پانچ بھی بہت ہوں گے، کتنا کمزور ہے۔ یہ بات جو میں بتانے والی ہوں، وہ بقرعید کے تیسرے دن کی ہے۔ اس شب ایک شادی میں جانا ہوا..... ملنے والوں کی بیٹی کی شادی تھی۔ جانا بھی ضروری تھا جیسے ہی میرج ہال میں قدم رکھا سامنے

صوفے پر دولھا بیٹھا ہوا نظر آیا۔ انتہائی چھوٹے قد کا...... بے حد دبلا سا دولھا جو دیکھنے پر ایسا لگ رہا تھا کہ کوئی مریض اپنے اسپتال سے بھاگ آیا ہو...... بے حد لاغر ہونے کے باوجود اس نے شیروانی بھی پہن لی تھی اور وہ بھی انتہائی فٹ...... اور شیروانی کے بٹن حلق تک لگائے ہوئے وہ عجیب سا لگ رہا تھا۔ پانچ ہزار والا بکرا، بے اختیار میرے منہ سے نکلا اور فوراً ہی اپنی آواز اپنے حلق میں گھونٹ لی کہ کسی کے دولھا کو ایسے تھوڑی کہتے ہیں مگر جو لہجے اور گفتگو بقرعید کے دنوں پر زبان پر چڑھ جاتی ہے وہ اتنی آسانی سے تھوڑی اترتی ہے، ہے ناں۔

## ندامت

نہ جانے ایسا کیوں ہوتا ہے؟ (میں سوچ، سوچ کر تھک چکی ہوں) میرے ساتھ ہی ایسا ہوتا ہے یا دیگر خواتین کے ساتھ بھی۔ اس کا مجھے علم نہیں مگر میرے ساتھ ایسا ہمیشہ ہوتا ہے۔ (پریشانی کی بات تو ہے ناں)

میں جب بھی کسی جگمگاتی سی تقریب میں جانے کا قصد کرتی ہوں تو اپنے آپ کو خوب سنوارا کرتی ہوں۔ بال پن سے لے کر اونچی ایڑی کے سینڈل تک کی میچنگ کا خیال رکھتی ہوں۔ لباس کا انتخاب ہمیشہ اعلیٰ کرتی ہوں۔ (کہ میاں جانی کا بڑا سا بوتیک ہے) اور جب تیار ہو کر اپنے اوپر ناقدانہ نگاہ ڈالتی ہوں تو میرا انگ، انگ تعریف کا مستحق ہوتا...... گھر کے لوگ میری تیاری کا فائنل پروگرام دیکھ کر ہی واہ، واہ کے نعرے بلند کرنے لگتے ہیں۔ (ایسا ہمیشہ ہوتا ہے)

''اللہ بھابی! آج تو کئی قتل ہو جائیں گے، ایمان سے، آپ کی ساڑی بڑی بمبار لگ رہی ہے۔'' بڑی نند کھلے دل سے تعریف کرتی ہیں۔

''واہ...... ہر کپڑا میری بٹی پر بجتا ہے، آج کی تقریب میں میری بٹی سے اچھا کوئی نہیں لگ سکتا......'' سسر صاحب کی رائے شفقت میں ڈوبی ہوتی ہے۔

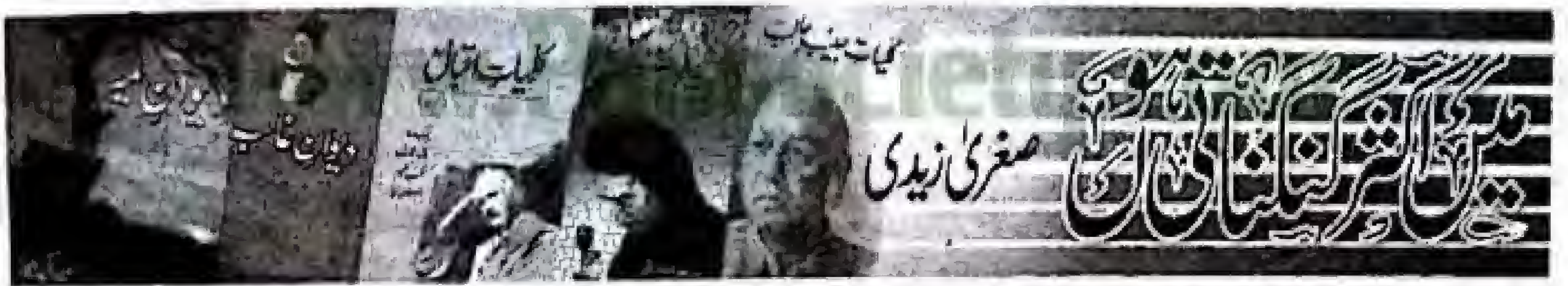
''بچی بات ہے! میری بہو جو بھی پہن لے کھل اٹھتی ہے۔'' ساس کا محبت بھرا انداز بھی...... کانوں میں رس گھولتا ہے اور سب سے بڑی بات کہ میاں جانی کی سرگوشیاں بھی ساتویں آسمان پر پہنچا دیتی ہیں۔ اس سے کسی ولیمے کی تقریب میں جاتے ہوئے میں اپنے آپ کو کسی نئی نویلی دلہن سے کم نہیں سمجھتی مگر جب کسی تقریب میں پہنچتی ہوں تو اپنا خوب صورت لباس اپنی ہی نظروں میں حقیر نظر آنے لگتا ہے۔ خوب صورت جیولری معمولی سی لگتی ہے۔ بے انتہا توجہ سے کیا گیا میک اپ بھونڈا سا لگتا ہے، اردگرد کی نظریں تمسخر آمیز دکھائی دینے لگتی ہیں۔ اگر کوئی ارے یا واہ کا نعرہ بلند کر کے گفتگو کا آغاز کرنا چاہتا ہے تو اس کی کمینگی کا اندازہ اس کے شائستہ جملوں کی ادائیگی کے باوجود رہتا ہے۔ سنواری ہوئی، بل کھاتی لٹ جو گھر میں حسن کا اضافہ نظر آتی تھی، وہ محفل میں تماشا اڑانے والوں کا ساتھ دیتی ہے، رخساروں کو چومنے کے بجائے سرعام ڈستی ہے۔ قدرے چوڑی کمر جو گھر میں کمریا نظر آتی ہے، میرج ہال میں کمرا دکھائی دینے لگتی ہے۔ نازک سراپوں کے مابین اپنی جسامت بے ڈھنگی اور... بدوضع محسوس ہوتی ہے۔

میری مسکراہٹ کا انداز جو میاں جانی کو از حد پسند ہے، وہ خرانٹ سا ہو جاتا ہے۔ (حقیقت بھی یہ ہے کہ ساری حسیناؤں کو کچا چبا جانے کو دل چاہتا ہے)

ایسے موقع پر لوگوں کے نغمہ بار جملے میرے کانوں میں زہر سا گھول دیتے ہیں۔

اپنے سے زیادہ اچھے چہرے اور قیمتی ملبوسات دیکھ کر طبیعت میں تناؤ اور کھنچاؤ بڑھ جاتا ہے۔ ٹھمکتی ہوئی چال بتدریج پٹکتی ہوئی چال تک جا پہنچتی ہے۔ مسکراہٹ زہر آلود ہو جاتی ہے۔ آنکھوں سے نفرت کی چنگاریاں پھوٹنے لگتی ہیں، تب میں بد ہیئت سراپے اور بدشکل چہرے کو چھپاتے، چھپاتے تھک جاتی ہوں۔ تقریب کے اختتام تک میں مہمان خواتین سے چھپنے لگتی ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر ایسی تقریبات میں، میں میزبانوں کو خدا حافظ کہے بغیر لوٹ آتی ہوں اور اکثر و بیشتر نیوتے کا لفافہ دینا تک بھول جاتی ہوں مگر اپنی اس بھول پر مجھے کوئی ندامت نہیں ہوتی۔

☆☆☆




☆ ناعمہ تحریم...... کراچی

کیا خاک وہ جینا ہے جو اپنے ہی لیے ہو
خود مٹ کے کسی اور کو مٹنے سے بچالو

☆ مریم کاشف...... حیدرآباد

میں جھوٹ بول کے دریا عبور کر جاتا
مجھے ڈبو دیا سچ بولنے کی عادت نے

☆ ماہ رخ...... لطیف آباد

پہچان آدمی کی نہیں سہل آج بھی
ایک آدمی چھپا ہوا ہر آدمی میں ہے

☆ مریم کاشف...... حیدرآباد

کتابیں ،تتلیاں، پر، پھول ،بچے
مرا بچپن ہے بستے میں مقید

☆ سامعہ ملک پرویز...... بھیرہ خان پور

صفِ دشمناں کو خبر کرو ضبط کمال ہے مجھ میں
اک ہی آن میں پلٹ دوں کایا ایسا جلال ہے مجھ میں

☆ نازیہ...... نوشہرہ کینٹ

میرا تجھ سے اٹوٹ رشتہ ہے
تو بحرِ علم ہے اور میں ہوں علم کا طالب

☆ جبین نیاز...... ملتان

اے دل تجھے دشمن کی بھی پہچان کہاں ہے
تو حلقۂ یاراں میں بھی محتاط رہا کر

☆ نورافشاں شیخ...... شکارپور

اس دنیا میں کون کرے وفا کسی سے فراز
ہیں دل کے دو حروف وہ بھی جدا جدا

☆ فردوس شاہی...... لاڑکانہ

یہ کہہ رہی ہے تمہیں چھو کے آنے والی ہوا
اداس میں ہی نہیں، بے قرار تو بھی ہے

☆ سیما ممتاز عباس...... لاڑکانہ

اس عید پہ بھی ہم نہ ملیں گے تو کیا ہوا
جذبوں میں ہو خلوص تو عیدیں ہزار ہیں

☆ عروسہ شہوار، کالا گوجراں جہلم

تحفہ میری انا کا اچھا دیا گیا
مجھ کو ہی میری ذات میں الجھا دیا گیا
تا معتبر رہے جو الفاظ دیر تک
پیغام آشنائی انہی میں دیا گیا

☆ فریدہ جاوید فری...... لاہور

لہو کا رنگ یہ ہرگز نہیں ہے سچ بتا ظالم
یہ کس کا پھول سا دل تو نے پیروں سے کچل ڈالا

☆ اُم ایمان...... کوٹ چھٹہ

مرے ہاتھوں کو قدرت نے ہنر کچھ ایسا بخشا ہے
کبھی کھو کر بناتا ہوں کبھی پا کر بناتا ہوں
میں جب بھی ٹوٹ جاتا ہوں کسی سے کچھ نہیں کہتا
میں چکنا چور ہو کر بھی نئے منظر بناتا ہوں

☆ شہلا محمود...... واہ کینٹ

جانِ کومل سراب ہو گئے ہو
پوری زندگی کا خواب ہو گئے ہو
جس کو پڑھنا بہت ہی مشکل ہے
تم تو ایسی کتاب ہو گئے ہو

☆ صائمہ سجاد بنگش...... کوہاٹ

عید آئی تو بڑے درد لے کر آئی ہے
یہ شبِ وصل ہے یا دکھ کہ نارسائی ہے

☆ نگینہ ضیا...... کیماڑی

وہی بے بسی، وہی بندشیں وہی الجھنیں اے زندگی
میں ابھی تلک نہ سمجھ سکی تو نصیب ہے کہ نصاب ہے

# خوش ذائقہ — پاکیزہ بہنیں

## بہاری بوٹی

پیاری بہنو......قربانی کے گوشت سے جب تک تکے اور بہاری بوٹی نہ بنے مزہ نہیں آتا، اس لیے اس دفعہ میں یہ ترکیب آزماؤں گی آپ بھی ٹرائی کریں۔

اجزا: گوشت کے پارچے ،ایک کلو۔ کچا پپیتا، ایک چوتھائی کپ یعنی دو کھانے کے چمچ بھی ہو سکتا ہے۔(ویسے میری پڑوسن نے پکے پپیتے کے چھلکوں سے بھی یہ بنائی تھی) نمک، مرچ حسب ذائقہ۔ گرم مسالا پاؤڈر، ایک چائے کا چمچ۔(بہتر ہے گھر میں پیس کر استعمال کریں)

ترکیب: گوشت کے پارچوں پر تمام مسالے کم سے کم پانچ گھنٹے کے لیے لگا کر رکھ دیں۔ پھر اسے کڑاہی میں تھوڑا سا تیل ڈال کر بھوننے رکھ دیں جب پانی خشک ہو جائے اور پارچے گل بھی جائیں تو پیاز کے لچھوں، ہری چٹنی یا رائتے کے ساتھ سرو کریں......میدے کے ورقی پراٹھے خوب مزہ دیں گے۔ کچھ لوگ سیخوں پر چڑھا کر کوئلے پر بھی انہیں سینکتے ہیں۔

مرسلہ: نیلوفر خان، بہارہ کہو

## جھٹ پٹ تکے

اجزا: ایک کلو گوشت کی چھوٹی بوٹیاں کر کے اس میں دہی کے ساتھ تکہ مسالا مکس کر کے میرینٹ کر کے رکھ دیں۔ دو گھنٹے بعد پریشر ککر میں گوشت ڈالیں اور تین کپ پانی ڈال کر پریشر دے دیں۔ دس پندرہ منٹ کے پریشر کے بعد دیکھیں اگر پانی باقی ہے تو خشک کر لیں بوٹیاں گل جانے پر کوئلے کی دھونی دے دیں۔ طریقہ بہت آسان ہے۔ کوئلے کو آنچ پر رکھ کر لال انگارہ کر لیں اب پیاز کے چھلکے یا روٹی کے ٹکڑے پر رکھ کر یا لیموں کے اوپر رکھ کر ذرا سا تیل ٹپکا دیں اور ڈھکن فوراً بند کر دیں۔ تکے تیار ہیں۔

مرسلہ: نفیسہ آرا، راس الخیمہ

## کوفتہ پلاؤ

اجزا: روکھا قیمہ، آدھا کلو۔ پسا گرم مسالا، ایک چائے کا چمچ۔ نمک، سرخ مرچ، لہسن، ادرک پیسٹ، ایک، ایک کھانے کا چمچ۔ ہرا دھنیا، پودینہ، ہری مرچ تینوں چیزیں ملا کر ایک پیالی لے لیں۔ آدھا قیمہ میں ڈلے گا آدھا تیاری پر۔ پیاز ایک درمیانی۔ تیل، حسب ضرورت۔ سفید زیرا اور دھنیا بھون کر پیس لیں۔ ایک، ایک کھانے کا چمچ۔ ڈبل روٹی کا ایک سلائس۔ بیسن، ایک کھانے کا چمچ توے پر سنہرا کر لیں۔ ثابت گرم مسالا جس میں دو تین عدد تمام چیزیں شامل ہوں۔

ترکیب: قیمہ میں تمام مسالا پیس کر...آدھا، آدھا ملا لیں مگر ہر چیز باریک پسی ہوئی ہو یہاں تک کہ قیمے کے ساتھ ایک دفعہ سب کچھ چاپر میں ڈال کر ملا لیں۔ ڈبل روٹی کے سلائس دودھ میں بھگو کر نرم کر کے قیمہ میں ملائیں اور چھوٹے، چھوٹے کوفتے بنا لیں۔ اب اسے فریج میں رکھ دیں۔ ایک طرف چاول صاف کر کے بھگو دیں دوسری طرف ایک دیگچی میں پیاز باریک، باریک کاٹ کر گولڈن کر لیں۔ تھوڑی پیاز نکال لیں تھوڑی دیگچی میں ہی رہنے دیں۔ اب اس میں لہسن ادرک ثابت گرم مسالا (حسب ضرورت) اور نمک مرچ ڈال کر بھونیں پھر کوفتے ڈال دیں اور ہلکے چمچ سے چلائیں۔ نمک اپنے اندازے سے رکھیے گا کیونکہ کوفتے بھی شامل ہیں......کوفتے گل جائیں تو چاول ڈال دیں اندازے کے طور پر آپ کی انگلی کے ایک پور جتنا پانی چاولوں

کے اوپر ہو...... جس طرح یخنی پلاؤ بناتے وقت اندازہ رکھتی ہیں پانی خشک ہونے پر چاولوں کو دم پر رکھ دیں۔ تیاری پر ثابت ہرا مسالا ڈال دیں۔ رائتے، ہری چٹنی یا لہسن، مرچ کی چٹنی کے ساتھ سرو کریں۔

مرسلہ: روبینہ حنیف، کراچی

## ہنٹر بیف

یوں تو ہنٹر بیف بڑی خاص ترکیب سے بنایا جاتا ہے نرم بھی ہو اور ہیک بھی نہ آئے مگر آج ہم بہت آسان گھریلو سی ترکیب بتا رہے ہیں۔

اجزا: گوشت، (گائے یا اونٹ کا) ایک کلو کا ثابت ٹکڑا بغیر چکنائی کا۔ نمک، اجینوموتو، حسب ذائقہ۔ کالی مرچ، آٹھ سے دس۔ ثابت سبز الائچی، چار سے پانچ۔ لیموں، دو عدد۔ ہری مرچ، چار سے چھ۔

ترکیب: ایک دیگچی میں ثابت گوشت صاف کر کے تین جگ پانی ڈال کر چولھے پر رکھ دیں۔ اب اس میں بتائے گئے مسالے ڈالیں اور لیموں دو پیس کر کے ڈال دیں۔ ڈھکن بند کر درمیانی آنچ پر پکنے دیں۔ گھنٹے بھر تو ضرور پکے گا۔ پانی خشک ہونے لگے تو گوشت کے گلنے ہونے (نرم ہونے) کا یقین کر کے بقیہ پانی سکھالیں اب اسے جالی پر رکھ کر ٹھنڈا کرلیں تاکہ اچھی طرح خشک بھی ہوجائے۔ باریک پارچے کاٹ کر سرو کریں۔ سینڈوچ یا برگر بنا کر سلاد کے ساتھ کھائیں یا مزید ذائقہ دینے کے لیے چلی گارلک مایو ساس یا تارتر ساس (جو مایونیز اور کریم باہم ملا کر بہ آسانی بن جائے گا) کے ساتھ سرو کریں۔ اس کی باریک اسٹرپس نوڈلز اور پاستا کے ساتھ بھی کھائی جاسکتی ہیں۔

مرسلہ: عرشیہ جنید، کراچی

## انڈوں کا حلوا

اجزا: پاؤڈر ملک، دو کپ (سوکھا)۔ انڈے، چھ عدد۔ چینی، تین کپ۔ گھی، حسب پسند۔ الائچی، چار پانچ عدد۔ (چھلکا ہٹا کر کوٹ لیں)

ترکیب: دیگچی میں گھی ڈال کر کڑکڑائیں اور ملک پاؤڈر ہلکی آنچ پر بھون لیں۔ انڈے اور چینی اچھی طرح مکس کر کے اب دیگچی میں ڈالیں اور پھر بھونیں جب گولڈن ہونے لگے اور سب کچھ یکجان ہوجائے تو گہرے برتن میں نکال کر چمچ کی مدد سے اوپر سطح ہموار کرلیں۔ اب اس پر میوہ چھڑک دیں اور ٹھنڈا ہونے پر سرو کریں۔ مزیدار حلوا تیار ہے۔

مرسلہ: بینا عباس، کراچی

☆☆☆

## پاکیزہ آپی کے آزمودہ نسخے

☆ایک چمچ اسپغول کا چھلکا نیم گرم (بالائی نکلا) دودھ میں رات سوتے وقت ڈال کر پینے سے قبض کی شکایت دور ہوتی ہے۔

☆کالی مرچ، سونف، اجوائن، سونٹھ اور سفید زیرہ، ایک، ایک ٹی اسپون لے کر پیس کر پاؤڈر بنالیں اور ہر کھانے میں دو چٹکی چھڑکیں۔ ہاضمے کی تکلیف کبھی نہیں ہوگی۔

☆سردیوں کی آمد آمد ہے، خصوصاً زیادہ ٹھنڈے علاقوں میں رہنے والوں کے لیے مفید نسخہ ہے کہ چھوٹے بچوں کو نہلانے سے پہلے گرم پانی میں اجوائن کی پوٹلی (جیسے دو کھانے کے چمچ اجوائن کسی کپڑے میں سی لیں) ڈال دیں اور اس پانی سے نہلائیں سردی کا اثر نہیں ہوگا۔

☆نومولود بچوں اور ان کی ماؤں کو بھی قابل برداشت گرم پانی میں اجوائن کی پوٹلی ڈال کر نہانا چاہیے۔ نہانے کی جگہ (غسل خانے وغیرہ) اور باہر کا درجۂ حرارت ایک جیسا رکھیں تو بچہ کبھی سردی نہیں کھاتا۔ براہِ راست ہوا میں نہ نکلیں بلکہ اچھی طرح خود بھی پہنیں اور بچوں کو بھی اوڑھا لپیٹ لیں...... روزانہ بچوں کا نہلانا بے احتیاطی نہیں ہے بلکہ گرم اور سرد کا خیال نہ رکھنا بے احتیاطی بلکہ بے وقوفی ہے۔

مرسلہ: ثنا مرتضیٰ، کراچی



# حسن نکھار لے

ماہ جبیں

حسین اور جاذبِ نظر بہنو! اپنا خیال خود رکھنا ہر کسی کا حق ہے۔

سجنا، سنورنا اچھا لگنا انسانی فطرت ہے مگر اس میں اصراف اور نمود و نمائش کا عنصر بالکل نہیں ہونا چاہیے۔ بیوٹی ٹپس یا خوب صورت بننے کے مشورے دینا بہت آسان ہوتا ہے...... مگر ذہن میں یہ ضرور رکھنا چاہیے کہ ایسے مشورے اور تراکیب ہوں جو بہ آسانی قابلِ عمل ہوں لیکن جہاں ضروری ہو اور قابلِ برداشت بھی ہو تو خرچ بھی ضرور کریں۔ مگر پہلے اپنی ترجیحات کا تعین بھی ضروری ہے۔

آج کل اگرچہ ٹی وی کے ہر چینل پر اس قسم کے پروگرامز آتے رہتے ہیں۔ مگر ہمارے پیارے قارئین کی کافی عرصے سے فرمائش بھی چلی آرہی تھی کہ بیوٹی ٹپس اور حسن کے نکھارنے کے مشوروں سے سجا سلسلہ پاکیزہ میں پھر سے شروع کریں۔ سو قارئین کی فرمائش سر آنکھوں پر...... ان صفحات پر آپ کو معلومات کے ساتھ، ساتھ آپ کے کیے گئے سوالات کے جواب اور مسائل کا حل بھی ملے گا۔ تو چلیں سب سے پہلے آپ ہی کے کچن سے اسکرب کی اشیا تلاش کر کے جلد کی صفائی کے طریقے بتاتے ہیں۔

## چینی کا اسکرب......

دو ٹیبل اسپون چینی (shugar) لے کر دو ٹیبل اسپون پانی کے ساتھ ملا کر چہرے، گردن اور ہاتھوں پر ہلکے، ہلکے سے انگلیوں سے مساج کریں۔ انگلیوں کی حرکت نیچے سے اوپر کی جانب ہو...... آج کل ویسے بھی ٹی وی پر مساج کے اتنے طریقے آتے ہیں کہ لڑکیاں انگلیوں اور ہاتھوں کی حرکت دیکھ کر سیکھ جاتی ہیں۔ دس منٹ تک یہ مساج کرنے سے جلد کے مردہ خلیے اور گرد و غبار نکل جاتا ہے پھر پانی سے چہرہ گردن اور ہاتھ دھولیں۔ نمایاں فرق محسوس ہوگا۔

## (روا) سوجی اور دودھ کا اسکرب:

دو ٹیبل اسپون سوجی، آدھا کپ دودھ میں بھگو کر ایک پیسٹ سا بنالیں اب اس سے مساج کریں۔ یہ ابٹن کی طرح ہوجائے گا۔ دس سے پندرہ منٹ چہرہ گردن، بازو ملتی رہیں۔ اسکرب میں کہنیوں کو ہرگز مت بھولیں۔ ٹی وی دیکھنا بہت ضروری ہو تو وہیں چادر بچھا کر بیٹھ جائیں اور اپنا کام کرتی رہیں۔ رات سونے سے پہلے اپنی ذات کے لیے تیس منٹ نکالنا کوئی مشکل کام نہیں...... موبائل پر گیم کھیلنے کے بجائے اپنی جلد کے نکھار پر توجہ دیں۔

## آسان نسخے......

☆ باورچی خانے میں کام کرنے کے دوران اپنا خیال یوں رکھیں کہ ٹماٹر کا ایک ٹکڑا لے کر چہرے اور ہاتھوں پر اچھی طرح دس منٹ تک ملیں پھر منہ ہاتھ دھولیں۔ ہاتھوں میں مرچوں کے نہ ہونے کا یقین کر کے یہ عمل کریں ورنہ نتائج مختلف بھی ہوسکتے ہیں۔

☆ نچوڑے ہوئے لیموں یعنی رس نکال لیا گیا ہو اور چھلکے باقی ہوں تو ایک دم ڈسٹ بن کی نذر مت کریں بلکہ اسے چہرے پر گردن، انگلیوں کی پشت پر اور کہنیوں اور گٹوں پر رگڑیں پھر دس، پندرہ منٹ بعد دھولیں۔

☆ نہایت خشک اور کھردری جلد کے لیے......

دودھ کی بالائی ایک ٹی اسپون، ہلدی، چٹکی بھر، لیموں کے دو تین قطرے یہ سب مکس کر کے رات کو چہرے اور ہاتھوں پر لگائیں اور اچھی طرح مل کر جذب کریں۔ صبح نیم گرم پانی سے دھوڈالیں۔ بالائی چہرے پر لگا کر دھوپ میں جانے سے پرہیز کریں۔

☆☆☆

# بزمِ پاکیزہ پاکیزہ بہنیں

پہلا انعام یافتہ سوال
☆ نگینہ ضیا بخش ...... کراچی
سوال: کچھ لوگوں کے پیٹ کا کیڑا اُن کے دماغ میں چلا جائے تو......؟
جواب: وہ سارا بھوسا کھا جاتا ہے۔

دوسرا انعام یافتہ سوال
☆ نور افشاں ...... شکارپور
سوال: اگر کسی سے کوئی کڑوا کسیلا سچ کہہ دیا جائے تو پھر......؟
جواب: اسے فوراً اپنے گھر کی جانب دوڑ لگانی ہوگی۔

☆ سونا ...... لاہور
سوال: جب لوگ تعلق توڑنے پر آمادہ ہوں تو یہ بات کیسے پتا چلتی ہے؟
جواب: ان کے اندازِ گفتگو میں سب سے پہلے فرق آ جاتا ہے۔

☆ امینہ عندلیب ...... سلانوالی
سوال: بہت سے لوگوں کو پڑھنا چاہیے...... مگر......؟
جواب: وہ لکھ رہے ہیں۔

☆ نجمہ اصغر ...... کراچی
سوال: کہتے ہیں کہ محبت کمر کے درد کی طرح ہوتی ہے...... واقعی؟
جواب: ہاں، ایکسرے میں بھی دکھائی نہیں دیتی مگر ہوتی ہے۔

☆ زریں زبیر کوٹھاری ...... کراچی
سوال: زندگی کب خوب صورت لگتی ہے؟
جواب: جب ہم خوش ہوتے ہیں۔

☆ شگفتہ ناصر ...... فیصل آباد
سوال: نفسا نفسی اور برق رفتاری کے اس دور میں...... اور کیا نیا ہوگا؟
جواب: ہم ایک دوسرے کو یہ سوچ کر بھی کھو دیا کریں گے کہ اس نے میری تصویر کو لائک نہیں کیا تو میں کیوں کروں۔

☆ ساجدہ ظفر ...... کمالیہ
سوال: امیر روٹی کھاتا ہے جب بھوک لگے، غریب روٹی کھاتا ہے جب مل جائے، باجی آپ کب روٹی کھاتی ہیں؟
جواب: میں روٹی نہیں کھاتی، چاول کھاتی ہوں۔

☆ ایمن زرناب ڈوگر ...... ٹوبہ ٹیک سنگھ
سوال: آج کے انسان کا سب سے بڑا مسئلہ کیا ہے؟
جواب: آج کے انسان کے ہر گھر کا اپنا الگ، الگ مسئلہ ہے جیسے اس وقت میرا اچار جر نہیں مل رہا ہے...... اور میرے دونوں موبائل فون مرے پڑے ہیں۔

☆ ناعمہ تحریم ...... کراچی
سوال: ناپسندیدہ مہمانوں کی دعوت پر ایسی کون سی ڈش بناؤں کہ جسے کھا کر ہر مہمان کہے...... کہ......؟
جواب: اب ان کی کوئی دعوت قبول ہی نہیں کرنی چاہیے...... کہ پتا نہیں کیا مرچوں بھری آگ بھون کر کھلا دی۔

☆ فلک بنت ندیم ...... حیدرآباد
سوال: عیدِ قرباں پر کس قسم کے لوگ ناراض ہو جاتے ہیں؟
جواب: جن کے ہاں ہم ہمیشہ ہڈیاں اور چھیچھڑے بھیجا کرتے ہیں۔

☆ مریم کاشف ...... حیدرآباد

سوال: سالگرہ بہانہ ہے پیسے بٹورنے کا یہ سچ ہے کیا؟

جواب: پیسے بٹورنے کے تو بہت سے بہانے ہیں......سالگرہ تو اس کی ایک چھوٹی سی کڑی ہے۔

☆ ماہ رخ......حیدر آباد

سوال: غموں کی دھوپ سے بچنے کے لیے کون سی چھتری استعمال کی جائے؟

جواب: زریں اقوال کی چھتری ہر جگہ دستیاب ہے۔

☆ مہ وش سمرن......سیالکوٹ

سوال: وہ آیا......اس نے دیکھا......اور......؟

جواب: نظر لگا کر چلا گیا......اور ہم سب کو بریانی کھا کر ہیضہ ہو گیا۔

☆ پروین افضل شاہین......بہاول نگر

سوال: شادی سے پہلے میرے میاں میرے لیے آسمان سے تارے توڑ کر لانے کے لیے بھی تیار رہتے تھے مگر اب وہ درخت سے لیموں توڑ کر لانے کے لیے بھی تیار نہیں ہیں۔ آخر اس کی کیا وجہ ہے؟

جواب: پہلے وہ صرف جھوٹے تھے اب وہ کاہل بھی ہو گئے ہیں بلکہ بڑا کاہل ہو گئے ہیں۔

☆ صائمہ سجاد بخش......کوہاٹ

سوال: اب کی بار آتے دو دیکھتی ہوں کہ کیسے نہیں دیتے؟

جواب: اب کی بار میاں جی پردیس سے آئیں تو پاسپورٹ کو چولھے میں جلا دو......تاکہ جو کمائیں... تمہارے ہاتھ پر رکھیں۔

☆ طیبہ عنصر مغل......راولپنڈی

سوال: جب میاں جانی اپنے موبائل پر پاس ورڈ لگائیں اور کینڈی کرش کے آگے ہم نظر آئیں تو بتائیں ناں ہم کیا کریں؟

جواب: کرنا کیا ہے، بس میاں جی کی سہیلیوں پر گہری نظر رکھو۔

☆ ارم کمال......فیصل آباد

سوال: وہ اپنی ہر بات پر غرور کرتے ہیں، میں انہیں کیسے سمجھاؤں؟

جواب: تم انہیں بتا دو کہ غرور ایسی بیماری ہے جو صرف کم ظرف کو ہی ہوا کرتی ہے۔

☆ مس انعم......نیو کراچی

سوال: پاکستانی فنکاروں نے بھارت جا کر کیا کھویا کیا پایا؟

جواب: جو گاجر اور لوکی کے حلوے میں ڈالا جاتا ہے وہ کھویا کھایا اور نان کے ساتھ پایا کھایا......اس سے زیادہ مجھے کیا پتا......کیا میں وہاں فلمیں بنا رہی ہوں۔

☆ عروسہ یعقوب......لاہور

سوال: اسکول کی چھٹیوں میں جب اضافہ ہوتا ہے تو اس کی سب سے زیادہ خوشی کس کو ہوتی ہے؟

جواب: بچوں سے زیادہ ٹیچرز کو......چلو کچھ دنوں تو سر درد سے نجات ملی۔

☆ سعدیہ ہما شیخ......ڈی جی خان

سوال: شعر مکمل کریں۔

جو گرم پانی میں ایلفی ڈال کر نہاتے ہیں فراز؟

جواب: وہ لوگ کبھی ٹوٹ کے بکھرا نہیں کرتے

☆ منور شہزادی......گوجرانوالہ

سوال: کیا مرنے کے لیے زہر کی ضرورت لازمی پڑتی ہے؟

جواب: نہیں، بعض مرتبہ لوگوں کے زہریلے لہجے بھی مار دیا کرتے ہیں۔

☆ ساجدہ بتول......راجن پور

سوال: کسی کے دل میں اترنے کے لیے کون سی سیڑھی استعمال کروں؟

جواب: اچھے اخلاق کی۔

☆ عرشیہ جنید......کراچی

سوال: اس ماہ میرے ایک اپنے نے مجھے بہت رُلایا......آخر کیوں؟

جواب: اپنے وہ نہیں ہوتے جو رونے پر آتے ہیں یار رُلاتے ہیں جبکہ اپنے وہ ہوتے ہیں جو رونے ہی نہیں دیتے۔



# روحانی مشورے

ادارہ

## شادی کے بعد کی دعائیں

دلہن کو چاہیے کہ نماز کی باقاعدگی کرے...... روزانہ شکرانے کے نفل ادا کرے اور دعا سے پہلے اور آخر میں درودِ ابراہیمی لازمی پڑھے...... اور پھر یہ دعا مانگے۔

''اے اللہ! میرے اور میرے شوہر کے دل میں محبت اور الفت ایسے بھر دے اور ہمارے دلوں کو ایسے ملا دے جیسے آپ نے حضرت محمد ﷺ اور حضرت خدیجہؓ کے دلوں کو ملا دیا تھا اور اے اللہ......! میرے اور میرے شوہر کے دلوں کو ایسے ملا دے جیسے آپ نے حضرت محمد ﷺ اور حضرت عائشہؓ کے دلوں کو الفت و محبت سے ملا دیا تھا۔''

''اے اللہ! جس طرح آپ نے اپنے کرم سے ہمیں دنیا میں اکٹھا فرما دیا، جنت میں بھی ہم دونوں کو اکٹھا فرما۔''

''اے اللہ! مجھے اپنے شوہر کے لیے دنیا و آخرت دونوں میں آنکھوں کی ٹھنڈک بنا۔''

''اے اللہ! مجھے ایسی بیوی بنا جو شوہر کے نیک کاموں میں اس کی مدد کرنے والی ہو۔''

''اے اللہ! تو مجھے اپنی اطاعت اور اپنے شوہر کی جائز باتوں میں اطاعت کرنے والی بنا اور نیک بنا اور اے اللہ...... مجھے شوہر کو خوش کرنے والی بنا، جب بھی وہ مجھے دیکھے تو خوش ہو اور شوہر کے مال، عزت اور راز کی حفاظت کرنے والی بنا، آمین یارب العالمین۔''

یہ دعائیں تہجد کی نماز کے بعد اور ہر فرض نماز کے بعد اسی طرح رمضان المبارک میں سحر و افطار کے وقت، دورانِ حج و عمرہ، حجازِ مقدس کے مبارک مقامات پر اور چلتے پھرتے خوب، خوب مانگنی چاہئیں۔ اگر اللہ تبارک و تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے مسلمان بیوی کو یہ نعمتیں عطا فرما دیں تو گویا پورے خاندان اور آنے والی نسلوں کو دنیا و آخرت کی بھلائی مل گئی۔

1۔ ہر فرض نماز کے بعد دعا ضرور قبول ہوتی ہے اس لیے فرض نماز کے بعد اہتمام سے دعا مانگنی چاہیے۔

2۔ دعا شروع کرنے سے پہلے اللہ رب العزت کی خوب حمد و ثنا کرے، پھر نبی کریم ﷺ پر درود شریف بھیجے...... پھر اپنے لیے، گھر والوں کے لیے، محلے والوں کے لیے اور سارے عالم کے مسلمانوں کے لیے دعا مانگے پھر کافروں کی ہدایت کے لیے دعا مانگے جہاں، جہاں مسلمان پریشانیوں، بلاؤں اور مصیبتوں میں ہیں ان کے لیے بھی خوب عافیت کی دعائیں مانگے۔

3۔ کم از کم روزانہ بیس پچیس منٹ دعا ضرور مانگے، اگر ایک ساتھ نہ ہو سکے تو تقسیم کرلے، ایسے وقتوں پر جو زیادہ مصروفیت کے نہ ہوں مثلاً فجر و عصر کی نمازوں کے بعد پانچ، پانچ منٹ، عشا کی نماز کے بعد دس منٹ، تہجد میں اٹھنے کی توفیق ہو تو اس میں بھی خوب دعا مانگے، کتنے افسوس کی بات ہے کہ سہیلیوں، بہنوں سے فون پر بات کرتے ہوئے کتنا وقت لگ جاتا ہے، شادی، دعوتوں، محفلوں میں کتنا وقت ہم اپنا کھو دیتے ہیں لیکن بیس منٹ دو ہاتھ پھیلائے ہوئے اپنے مالک رحیم و کریم آقا سے مانگتے ہوئے اکتاتے ہیں حالانکہ وہ آقا ایسا ہے کہ مانگنے والے تھک جائیں لیکن وہ دیتے دیتے نہ تھکے۔

دنیا میں جس سے بھی مانگا جائے وہ ناراض ہوتا ہے اور اللہ جل جلالہ سے نہ مانگا جائے تو وہ ناراض ہوتا ہے۔

اس لیے شروع میں گھڑی دیکھ کر زبردستی اپنے آپ

کو پندرہ بیس منٹ بٹھائے رکھیں اور اللہ تبارک وتعالیٰ سے خضوع وخشوع کے ساتھ مانگنے کی عادت ڈالیں۔

## بیوی رات کو اٹھ کر اللہ سے یہ دعا مانگے

میاں بیوی میں محبت پیدا کرنے کا آسان نسخہ یہ ہے کہ دونوں ایک دوسرے کے لیے دعائیں کرتے رہیں، انشاء اللہ تعالیٰ چند دنوں میں ایسی محبت پیدا ہو جائے گی کہ جس کا دونوں کو وہم وگمان بھی نہیں ہوگا۔

یاد رکھیے......! اینٹ کو اینٹ سے ملانے کے لیے سیمنٹ کی ضرورت ہے، لکڑی کو لکڑی سے ملانے کے لیے کیل کی ضرورت ہے، کاغذ کو کاغذ سے ملانے کے لیے گوند کی ضرورت ہے لیکن دو دلوں کو ملانے کے لیے اللہ تبارک وتعالیٰ کے خاص فضل کی ضرورت ہے...... اس کے لیے ظاہری تدبیر بیوی کی طرف سے اطاعت شوہر کی ہر بات پر ''جی ہاں'' ''جی ہاں'' ''اچھا'' ''آئندہ نہیں ہوگا۔'' ''آئندہ نہیں ہوگا'' ''جیسے آپ کہیں گے ویسے ہی کروں گی۔'' اس طرح کے کلمات کہنا ہے۔ اتنی میٹھی باتیں کرنے والی بیوی سے کون شوہر ناراض ہوسکتا ہے مگر ایک بہت پیاری عادت آپ نے اپنے میں اور ڈالنی ہے کہ روزانہ سورۂ بقرہ پڑھنی ہے۔ بے شک روزانہ پوری نہ پڑھ سکیں تو چند صفحات ہی روزانہ پڑھ لیں مگر پڑھنی ضرور ہے پھر آپ خود اللہ کا کرشمہ دیکھیں گی۔

حدیث میں آتا ہے۔

''قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے میں محمد ﷺ کی جان ہے کہ شیطان اس گھر میں ٹھہر نہیں سکتا جس گھر میں سورۂ بقرہ تلاوت کی جائے۔''

## خوف و پریشانی کو امن میں بدلوانے کے لیے یہ دعا مانگنی چاہیے

گھر کے تمام افراد کو رات کو سونے سے پہلے یہ دعا مانگنی چاہیے۔ نیا چاند دیکھ کر بھی یہ دعا لازمی مانگنی چاہیے۔

ترجمہ: ''اے اللہ! (ہم درخواست کرتے ہیں کہ) تو ہمارے تمام عیوب کی پردہ پوشی فرما اور ہمارے خوف وپریشانی کو امن میں بدل دے۔''

## جب مغرب کی اذان سنیں تو یہ دعا مانگیں

''اے اللہ! یہ تیری طرف سے رات کے آنے اور دن کے جانے اور تیرے پکارنے والوں کی پکار کا وقت ہے (اس کی برکت سے) تو ہمیں معاف کردے۔''

نوٹ: (یورپی ممالک جہاں اذان کی آواز سنائی نہیں دیتی...... وہ مغرب کے وقت جب نماز پڑھیں تو اس سے پہلے یہ دعا ضرور مانگیں)

## دو دعائیں

سخت سے سخت مشکل کے وقت ان دعاؤں کے ساتھ اللہ سے لو لگانا بڑے خیر وبرکت کا باعث ہے۔

1۔ سرور کائنات ﷺ کی ایک دعا کو جو حضور ﷺ سخت مشکل کے وقت فرماتے، حضرت قبلہؓ نے یوں تعلیم فرمائی۔

یَا اَللّٰہُ یَا رَحْمٰنُ یَا رَحِیْمُ
یَا حَیُّ یَا قَیُّوْمُ بِرَحْمَتِکَ اَسْتَغِیْثُ

2۔ جناب رسول کریم ﷺ نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو یہ دعا سکھائی اگر تم بھنور میں پڑ جاؤ (سخت مشکل میں) تو یہ پڑھا کرو۔ ہر قسم کی بلا دور ہوگی۔

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
وَلَاحَوْلَ وَلَاقُوَّۃَ اِلَّابِاللّٰہِ الْعَلِیِّ الْعَظِیْمِ

حضور ﷺ نے کیا خوب فرمایا، دعا مومن کا ہتھیار ہے دین کا ستون، آسمان کا نور ہے۔

☆☆☆




# شوابے
# ہومیو کلینک





اس بات کی ضرورت کافی عرصے سے محسوس کرائی جارہی تھی کہ کسی مستند ادارے کے تحت ماہر تجربہ کار ہومیو پیتھک ڈاکٹروں کا بورڈ ہو جو لوگوں کی صحت کے مسائل کو اپنی ماہرانہ رائے اور تجربے کی روشنی میں نہ صرف حل کرے بلکہ ان کی رہنمائی بھی کرے۔ لہٰذا اس سلسلے کے تحت ہماری کوشش ہوگی کہ ہم آپ کو مختلف امراض کے متعلق آگاہی بھی فراہم کریں اور آپ کے جو صحت کے مسائل ہوں اس کو بورڈ کے ماہر و تجربہ کار ڈاکٹرز کے ذریعے حل کرائیں تاکہ آپ کا معیارِ صحت بلند ہو لہٰذا آپ کے جو بھی صحت کے مسائل ہیں انہیں ہمیں اس پتے پر لکھ بھیجیں، ڈاکٹر حامد جنرل ہومیو پرائیویٹ لمیٹڈ آرام باغ روڈ کراچی 74200۔ ہم ماہنامہ پاکیزہ کے ذریعے آپ کی بیماری کے متعلق آپ کی رہنمائی کریں گے لیکن اس کے لیے اپنا مکمل نام، عمر، پتا اور جو کام کرتے ہیں اس کے متعلق، ازدواجی حیثیت، بیماری کے متعلق، کب سے ہوئی، کیا علاج کیا؟ کسی قسم کی کوئی رپورٹس ہوں تو اس کی فوٹو کاپی جو پڑھنے کے قابل ہوں ساتھ بھیجیں تاکہ صحیح تشخیص کی جاسکے اور دوا بھی صحیح تجویز ہو۔

## لیکوریا اور سر بھاری ہونا

### سدرۃ المنتہیٰ۔ قصور

میرا مسئلہ لیکوریا ہے جو 9-8 سال پرانا ہے۔

## ٹوکن
### برائے شوابے ہومیو کلینک
**نومبر** 2015

اپنا مسئلہ اس ٹوکن کے ساتھ روانہ کریں۔ ٹوکن کے بغیر آئے ہوئے مسئلوں پر توجہ نہیں دی جائے گی۔ اپنا مسئلہ جس مہینے بھیجیں اسی مہینے کا ٹوکن استعمال کریں۔

نام: ____________

پتا: ____________

____________

میری کمر اور ٹانگوں میں درد رہتا ہے اور سانس بھی تھوڑا تھوڑا پھولتا ہے۔ تھکاوٹ بہت جلد ہو جاتی ہے سارے جسم میں درد رہتا ہے۔ پیریڈ ڈیٹ سے آٹھ دس دن بعد آتے ہیں۔ مجھے خارش اور جلن بہت ہوتی ہے۔ مہربانی کرکے اچھی سی دوا تجویز کریں تاکہ میں جلد ٹھیک ہوسکوں۔ دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ میرا سر اکثر بھاری رہتا ہے، اس دوران میری گردن میں بہت درد ہوتا ہے ساتھ ہی کمزوری بھی محسوس ہوتی ہے۔ ایسے لگتا ہے کہ کندھوں میں کھنچاؤ ہو رہا ہے۔ جبکہ میری نظر بالکل ٹھیک ہے، نہ سر میں درد ہوتا ہے بس سر بھاری رہتا ہے، اگر نیچے منہ کرکے پڑھوں یا لکھوں تو گردن درد کرتی ہے، زیادہ دیر سر کو جھکایا نہیں جاتا۔ جب صبح سو کر اٹھو تو کمر میں درد ہوتا ہے لگتا ہے کہ سارا جسم اکڑ گیا ہے، گھنٹے آدھ گھنٹے بعد آہستہ آہستہ ٹھیک ہو جاتا ہے۔ میرا رنگ پیلا سا رہتا ہے۔ کوئی ایسی دوا تجویز کریں کہ میرے چہرے کی رنگت گلابی ہو جائے۔ ڈاکٹر صاحب کیا دونوں امراض کی دوائیاں اکٹھی کھا

سکتے ہیں؟

جواب: آپ اپنا بلڈ پریشر چیک کرائیں۔ 5 دن تک مختلف اوقات میں۔ بلڈ کے ٹیسٹ Hb% اور Serum Calcium بھی کرائیں۔ ذہنی کوفت سے اپنے آپ کو دور رکھیں، خوش وخرم رہیں۔ صبح سویرے اٹھ کر باغ میں چہل قدمی کریں، متوازن غذا دودھ، انڈا، گوشت، سبزیاں اور فروٹ وغیرہ کھائیں۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی Magnesium Phos Pentarkan Ptk60 کی ایک ایک گولی دن میں تین مرتبہ کھائیں۔ Kreosotum 30، Rhustox 30، Gelsemium-30 کے 3 سے 5 قطرے آدھا گلاس پانی میں ڈال کر دن میں 3 مرتبہ پییں۔ ادویات پیریڈ کے دوران بھی لے سکتی ہیں اور ایک ساتھ بھی لے سکتی ہیں۔ ایک ماہ بعد رزلٹ سے مطلع کریں۔

## بچی میں بھوک کی کمی

### وحیدہ رحمان۔ سیالکوٹ

میں گزشتہ کئی سالوں سے پاکیزہ کی خاموش قاری ہوں اور میو پیتھک کلینک بھی بڑے شوق سے پڑھتی ہوں۔ میں اپنی بیٹی کا مسئلہ لے کر آپ کے پاس حاضر ہوئی ہوں۔ اس کی عمر ڈھائی سال ہے۔ پیدائش کے فوراً بعد وہ بہت بیمار ہوگئی تھی۔ شروع کے پورے چھ ماہ اس کو موشن لگے رہے۔ کئی دفعہ اس کو اسپتال ایڈمٹ کرانا پڑا۔ اس نے میرا فیڈ بھی نہیں کیا۔ بازاری دودھ جو ڈاکٹر نے لکھ کر دیا تھا جب وہ پیتی تھی تو آدھا باہر نکال دیتی تھی اور صرف آدھا ہضم کر پاتی تھی۔ ہم نے اس کا بہت علاج کروایا۔ تقریباً چھ ماہ کے مستقل علاج سے وہ تندرست ہوگئی۔ اب مسئلہ یہ ہے کہ وہ بہت ہی زیادہ کمزور ہے اس کا وزن اور قد بہت کم ہے۔ کھانے پینے کی طرف اس کی توجہ بالکل بھی نہیں ہے۔ کھانے پینے میں صرف وہ بھینس کا




دودھ پیتی ہے یا کبھی کبھار تھوڑا سا فروٹ کھا لیتی ہے۔ اس کی عمر کے کئی بچے قد اور وزن میں اس سے کافی بڑے لگتے ہیں۔ میں چاہتی ہوں کہ باقی بچوں کی طرح اس کا قد اور وزن بھی مناسب ہو جائے اور کھانے سے بے رغبتی بھی ختم ہو جائے۔ آپ سوچ نہیں سکتے کہ میں کتنی پریشان ہوں۔ برائے مہربانی آپ اس کے لیے اچھی سی دوا تجویز کر دیجئے۔

جواب: ہر ماں اپنے بچے کی بھوک کے متعلق فکرمند رہتی ہے۔ بچی چپس، ٹافی، چاکلیٹ، بسکٹ تو نہیں کھاتی؟ خاص طور پر کھانے سے پہلے۔ اکلوتی ہے اور پھر دادا دادی، چچا، ماموں یا نانا نانی وغیرہ اس کو اس قسم کی چیزیں تو نہیں دیتے، ضرور نوٹ کریں۔ خاندانی قد وقامت کے حساب سے بھی بچیوں کا قد اور وزن ہوتا ہے۔ ویسے ہمیں یہ لگتا ہے کہ بچی میں خون کی کمی بھی ہے۔ بچی کو ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی Ferr. Met 30 اور Calc phos 30 کے 5,5 قطرے آدھا کپ پانی میں ڈال کر دن میں 3 مرتبہ دیں اور ایک ماہ بعد طبیعت سے مطلع کریں۔

## لیکوریا

### شمائلہ رشید۔ لودھراں

میں آپ کی خدمت میں پہلی دفعہ حاضر ہو رہی ہوں۔ میرا مسئلہ لیکوریا ہے جو کہ بچپن سے ہے جس کی وجہ سے میری کمر میں درد رہتا ہے۔ میں نے اس کی بہت سی دوائیاں بھی لیں لیکن کوئی افاقہ نہیں ہوا۔ اسی وجہ سے میں بہت کمزور ہوتی جا رہی ہوں، رنگ بھی بہت ڈم ہوتا جا رہا ہے اور اب ہونٹ کے اوپر بال بھی آنے لگ گئے ہیں اس وجہ سے میں بہت پریشان ہوں۔ پلیز کوئی اچھی سی دوا تجویز کریں۔ بہت شکر گزار ہوں گی۔

جواب: لگتا ہے کہ آپ کے مینسز میں بھی خرابی




ہے اسی وجہ سے رنگ اور ہونٹوں کے اوپر بالوں کا مسئلہ بھی ہو گیا ہے۔ ذہنی تفکرات سے بچیں، کھلی ہوا میں چہل قدمی کیا کریں۔ متوازن غذا کا استعمال کریں۔

ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی دوا Megnesium Phos Pentarkan Ptk-60 کی ایک ایک گولی دن میں تین مرتبہ استعمال کریں۔

## شوہر کی بیماری

### ف ا۔ صادق آباد

ہماری بیٹی کی پیدائش کے بعد میرے شوہر بیمار ہو گئے۔ زیادہ دوائی کھانے یا کسی ایسے تعویز سے جو اکثر ان کے گھر والے کرواتے تھے اور دوائی زیادہ ٹھنڈی کھانے سے ان کو اندرونی کمزوری ہو گئی جس کی وجہ سے میں دوبارہ ماں نہ بن سکی، میں صادق آباد میں رہتی ہوں۔ ہر اچھے ڈاکٹر سے اپنے شوہر کا علاج کروایا لیکن میرے شوہر دوائی کھاتے ہیں تو بواسیر ہو جاتی ہے پھر وہ علاج چھوڑ دیتے ہیں۔ اب دو سال ہو گئے ہیں میرے پیشاب میں تکلیف رہتی ہے اور میرا جسم باہر کی طرف آتا جا رہا ہے چلنے پھرنے میں مشکل اور گھر کے کام کاج نہیں کر پاتی، میں نے آج سے تقریباً تین سال پہلے خط لکھا تھا آپ نے جو دوائی بتائی تھی جو میری بیٹی کے لمبے قد کے لیے تھی اس سے فائدہ ہوا، اس یقین سے میں آپ کو دوبارہ خط لکھ رہی ہوں۔ آپ مہربانی فرما کر میری تکلیف کا کوئی علاج بتائیں۔ جس سے میں ٹھیک ہو جاؤں اور میرے شوہر بھی۔

جواب: یہ ہمارے معاشرے کا المیہ ہے کہ ہم مرد کی کمزوری کو چھپاتے اور عورت کی کمزوری کو اُچھالتے ہیں اور اس کو اُچھالنے میں زیادہ ذمہ دار عورت ہی ہوتی ہے۔ آپ نے یہ نہیں لکھا کہ آپ کے شوہر کس بیماری میں مبتلا ہوئے اور انہوں نے کون سی دوائیں کھائیں جس کے بعد ان کا یہ حال ہوا۔ اپنے میاں صاحب کو ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی Damiana Pentarkan Ptk-40 ہر کھانے کے آدھے گھنٹے بعد آدھا کپ میں ۱۵ قطرے دن میں 3 مرتبہ اور ساتھ Zincum Met-30 کے ۵ قطرے ایک گھونٹ پانی میں دن میں 3 مرتبہ دیں۔ ایک ماہ بعد کیفیت سے مطلع کریں، اس دوران ازدواجی تعلق میں احتیاط کریں۔ آپ کے رحم میں ورم اور سوزش ہو گئی ہے جس کی وجہ سے ایام میں دقت ہوتی ہے اور چونکہ وہ اپنی جگہ سے ہل گیا ہے لہٰذا آپ کو اٹھنے بیٹھنے اور چلنے میں تکلیف محسوس ہوتی ہے۔ آپ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی Magnesium Phos Pentarkan PTK-60 ایک ایک گولی دن میں 3 مرتبہ لیں۔ Lillium Tig-30 کے 5,5 قطرے آدھے گلاس پانی میں تین مرتبہ لیں۔ ایک ماہ بعد کیفیت سے مطلع کریں۔

## نفسیاتی مسائل اور ابا کا ہیپاٹائٹس سی

### عروبہ خوش بخت۔ اسلام آباد

آپ نے مجھے کچھ ادویات تجویز کی تھیں۔ اللہ کے کرم سے اب مجھے سر کے سُن ہونے، کان میں سیٹی بجنے میں افاقہ ہے۔ لیکن اب مجھے غصہ آنے لگا ہے.... بہت زیادہ اور غصہ نکال نہیں سکتی تو رونے لگتی ہوں۔ اب چیزیں رکھ کر بھولنا بھی کم ہو گیا ہے۔ آپ نے وزن کم کرنے کے لیے کچھ نہیں بتایا تھا۔ چہرے کے دانے تو کریم لگانے سے کم ہو گئے لیکن چہرے کے بال ٹھیک نہیں ہوئے۔ ایام میں بے قاعدگی اور اس کی وجہ سے ہونے والی پرابلم کے لیے بھی کچھ بتائیں۔ بہت سی پریشانیوں میں گھر میں پڑی رہتی ہوں اور کچھ زیادہ حساس بھی ہوں تو زیادہ اثر لیتی ہوں۔ دوسرا مسئلہ میرے والد

صاحب کا ہے کہ 2012 میں سب سے چھوٹے بھائی کی وفات کے صدمے سے ابھی تک نہیں نکلے۔ میرے والد جن کی عمر 52 سال ہے Chain smoker ہیں، ان کی اس عادت کو ختم کرنے کے لیے ہم نے بہت چیزیں آزمائیں مگر کوئی فرق نہیں پڑا، آپ کوئی دوائی بتا دیں، ان کو Diabetes اور HCV ہے۔

جواب: اللہ آپ کو مکمل صحت و تندرستی دے اور آپ کے مسائل کو حل کرے، آمین۔ آپ بھی اللہ سے دعا کرتی رہیں، صلوۃ الحاجات پڑھ کر دعا کریں۔ انشاء اللہ مسائل حل ہو جائیں گے۔ شوہر میں سب سے بڑی خصوصیت اس کا محنتی ہونا ہے یعنی کمانے والا ہو حلال کی، شریف ہو، دیندار ہو، صحت مند اور سمجھدار ہو۔ باقی دنیاوی تعلیم جتنی بھی ہو وہ ایک یقیناً اضافی خوبی ہو گی۔ لہٰذا اپنے ذہن کو کنٹرول کریں، عمر نکلنے میں دیر نہیں لگتی اور پھر ذہنی مسائل اور پیدا ہو جاتے ہیں۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی Magnesium Phosp Pentarkan کی ایک گولی دن میں ۳ مرتبہ لیں۔ Asteria rub. 30، Oleum Jecoris-30 5,5 قطرے آدھا گلاس پانی میں دن میں تین مرتبہ لیں۔ جو دوائیاں پہلے سے استعمال کر رہی ہیں ان کو ابھی استعمال کرتی رہیں۔ لگتا ہے کہ آپ کے والد مایوس ہیں۔ ان کو کہیے کہ مایوسی کرنا اللہ کا انکار ہے جو کفر ہے۔ سب کچھ کرنے والی اللہ کی ذات ہے اس کی طرف رجوع ہوں، نماز، ذکر اور قرآن کی تلاوت کریں۔ پانی زیادہ پییں تاکہ گردے صحیح کام کریں، کیلا، پالک، ٹماٹر، میٹھی چیزیں اور مرغن چیزوں کا استعمال ختم کریں، ہلکا شوربا چپاتی کھائیں۔ مچھلی کھائیں اور ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات استعمال کریں۔ Syzygium Jamboq، Chelidonium-Q کے ۱۰، ۱۰ قطرے ایک گلاس پانی میں جبکہ Merc.cor-30 کے 5,5




قطرے آدھے گلاس پانی میں دن میں تین مرتبہ دیں۔ ایک ماہ بعد رپورٹ کرا کر حالات سے مطلع کریں۔

## کمر درد

### جمیلہ بیگم۔ گلشن اقبال، کراچی

میری کمر میں درد ہے۔ میں نے پہلے کوئی دوائی نہیں لی۔ درد بہت پرانا ہے۔ 20 سال پہلے x-ray کیا تھا تو میرے (Disc) ہل گئے تھے۔ میں بیلٹ لگاتی ہوں جو وقتی علاج ہے۔ میرے Base Maker لگا ہوا ہے اور کوئی رپورٹ نہیں ہے۔ دوائی بھی پہلے کوئی نہیں کھائی۔ شوگر مجھ کو نہیں ہے۔ بلڈ پریشر بھی ٹھیک ہے بس کمر میں درد ہے ..... اس کی دوا بتا دیں آپ کی شکر گزار ہوں گی۔ میری ہڈیاں بھی بڑھ رہی ہیں۔ میرے کولہے کی ہڈی بڑھ گئی ہے اور میرے چہرے پر سیدھی طرف آنکھ کے نیچے کی ہڈی بھی بڑھ گئی ہے انہیں روکنے کے لیے کوئی دوائی ہے تو وہ بھی بتا دیں۔

جواب: ہم نے آپ کو پہلے بھی کہا تھا کہ آپ کلینک آ جائیں کیونکہ آپ کو بہت سارے مسئلے ہیں اور غالباً سال پہلے کی بات ہے۔ تین ماہ تک ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات کھائیں اور اس کے بعد حال بتائیں۔ Cimicifuga-30, Arnica-30, Calc.Phos-30 کے ۱۰، ۱۰ قطرے آدھے گلاس پانی میں ہر تین گھنٹے بعد پییں۔

## ناک کی ہڈی اور لکنت

### شاہینہ اختر۔ اٹک

محترم ڈاکٹر صاحب پاکیزہ میں آپ کا کالم میں بہت شوق سے پڑھتی ہوں۔ آپ جس طرح لوگوں کی خدمت کر رہے ہیں وہ قابلِ ستائش ہے۔ میرا مسئلہ کچھ

یوں ہے کہ میرا بیٹا جس کی عمر سولہ سال ہے اسے ناک کا مسئلہ کافی عرصے سے ہے۔ E.N.T سے چیک کروایا تو ڈاکٹر کہتے ہیں کہ ناک کی ہڈی ٹیڑھی ہے، آپریشن کروانا پڑے گا لیکن میں اپنے بیٹے کا آپریشن کروانا نہیں چاہتی۔ میں چاہتی ہوں کہ مسئلہ دوائیوں سے ٹھیک ہو جائے کیونکہ بچے کا مسئلہ جوں جوں پرانا ہوتا جارہا ہے بچے کو معدے کا پرابلم ہوتا جارہا ہے کیونکہ ہر وقت بلغم گلے میں گرتا ہے۔ آپ سے گزارش ہے کہ بچے کے لیے اچھا سا نسخہ تجویز کردیں اور ہماری تسلی کے لیے یہ بھی بتادیں کہ کیا ہومیوپیتھی میں بڑھی ہوئی ہڈی یا ٹیڑھی ہڈی کا علاج موجود ہے؟ کیا ہم آپریشن سے بچ سکتے ہیں؟ کیونکہ میں بہت زیادہ پریشان ہوں۔ کیا یہ مسئلہ موروثی بھی ہوسکتا ہے؟ کیونکہ میری بھی ناک کی ہڈی کافی عرصے سے بڑھی ہوئی ہے اور ڈاکٹر نے مجھے بھی آپریشن کا بتایا ہے۔ میری عمر چالیس سال ہے۔ میں نے کوئی خاص دوائی وغیرہ نہیں لی۔ ڈاکٹر صاحب آپ سے گزارش ہے کہ آپ میرے اور میرے بیٹے کے لیے الگ الگ دوائی تجویز کردیں بہت مہربانی ہوگی۔ دوسرا مسئلہ میرے چھوٹے بیٹے کا ہے۔ اسے لکنت کا مسئلہ ہے "ز" کو صحیح ادا نہیں کرسکتا۔ اس کے لیے کوئی اچھی سی دوا تجویز کردیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اجرِ عظیم عطا کرے، آمین۔

جواب: آپ ماں بیٹا نیم گرم پانی میں نمک ڈال کر ناک میں پانی چڑھائیں۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی Cinnaboris Pertarkan pt-30 کی ایک گولی دن میں تین مرتبہ بچے کو جبکہ آپ خود 2 گولیاں دن میں تین مرتبہ لیں۔ آپ Teucrium marum-30 کے 7 قطرے دن میں تین مرتبہ پانی سے لیں اور Thuja-Q کا ایک قطرہ ناک میں ڈالیں (دونوں نتھنوں میں) اس کے ڈالنے سے جلن ہوگی جس کو برداشت کرنا ہوگا۔ الحمد للہ ہومیوپیتھی میں اس کا بہترین علاج ہے۔ شروع میں ہی رجوع کرنا چاہیے، لکنت کے مسئلے کے لیے پوری ہسٹری لکھیں کہ کب، کیوں اور کیسے ہوئی۔ مکمل تفصیل لکھیں تو دوا بھی تجویز کردیں گے۔

## نوجوانوں کی بری عادت

داؤد ضیاء۔ لاہور

مجھے بہت شرمندگی سے بتانا پڑ رہا ہے کہ میں برے کاموں کے بھنور میں پھنس گیا ہوں۔ پہلے میں ان چیزوں سے بہت دور تھا، نمازیں پڑھتا تھا، لیکن بری صحبت نے مجھے بگاڑ دیا ہے۔ میرا مسئلہ یہ ہے کہ میری ٹانگوں اور پنڈلیوں میں درد اور کھنچاؤ رہتا ہے اور سستی بہت چڑھی رہتی ہے، دل کرتا ہے بس لیٹا رہوں۔ میں اندر سے کمزور ہوتا جارہا ہوں۔ میرے ابو آرمی میں میجر ہیں اور مجھے SSG کمانڈر بنانا چاہتے ہیں۔

جواب: شریف، سمجھدار، پڑھے لکھے ماں باپ کی اولادیں دوستوں کی بری صحبت، ٹی وی، فلموں اور نیٹ کے ذریعے ہی بگڑتی ہیں اور پھر چونکہ والدین سے کمیونیکیشن نہیں ہوتا اس لیے یہ عادت پختہ ہو جاتی ہے۔ ان سے توبہ کریں، برے دوستوں کی صحبت کو بالکل ترک کردیں۔ اچھی معلوماتی چیزوں پر توجہ دیں۔ صبح سویرے اٹھ کر ورزش کریں۔ متوازن خوراک استعمال کریں۔ مرغن غذائیں، فاسٹ فوڈ سے بچیں، نماز کی پابندی کریں۔ روزے رکھا کریں۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی دوا Bufo-30 کے ۱۰ قطرے دن میں تین مرتبہ استعمال کریں۔ ایک ماہ بعد حال بتائیں۔

☆☆☆